اِدھر ہم
اُدھر تم
احمد رضا خان قصوری

اِدھر ہم، اُدھر تم

ایک تاریخی دستاویز

احمد رضا قصوری

برٹینیکا پبلشنگ ہاؤس

۸۵ ڈی 1 مین بلیووارڈ گلبرگ III لاہور

ضابطہ

نام کتاب : اِدھر ہم اُدھر تم

مصنف : صاحبزادہ احمد رضا قصوری

ناشر : برٹینیکا پبلشنگ ہاؤس

پرنٹر : نقوش پریس لاہور

تعداد : ایک ہزار

قیمت : ۱۵۰ روپے

فہرست

انتساب

- ان بے نام سپاہیوں کے نام، جن کی قربانیوں سے پاکستان بنا۔
- ان سیاسی کارکنوں کے نام، جنھوں نے پاکستان بنانے میں اپنی جان اور مال کی قربانیاں دیں۔
- ان شہداء کے نام، جنھوں نے مشرقی پاکستان کی سرحدوں کی حفاظت، متحدہ پاکستان کو برقرار رکھنے اور نظریہ پاکستان کے تحفظ کے لیے اپنے خون کا نذرانہ پیش کیا۔
- قوم کے اُن بیٹوں اور رہنماؤں کے نام، جنھوں نے پاکستان کی اسلامی اور نظریاتی اساس اور جمہوری عمل کو برقرار رکھنے میں ہر قسم کی قربانیاں دیں۔
- اُن مجاہدین کے نام جو ہر آمریت اور ہر استبدادیت کے خلاف ہمیشہ صف آرا رہے۔
- اپنی والدہ مرحومہ کے نام، جن کی تربیت کی وجہ سے مجھے آمریت اور جمہوری روایات کو پامال کرنے والوں کے خلاف تن تنہا نبرد آزما ہونے کا حوصلہ اور طاقت عطا ہوتی۔
- اپنے شہید والد کے نام جنھوں نے اپنی جان کا نذرانہ پیش کر کے تاریخِ پاکستان میں انمٹ نام چھوڑا۔

میرے ان بھائیوں کے نام جن کی محبت اور یک جہتی نے میرے عزم اور استقلال میں قوت پیدا کی۔

احمد رضا قصوری (مصنف)

ایڈووکیٹ سپریم کورٹ

رضا قصوری اینڈ ایسوسی ایٹ

۴۴ سیکٹر 7/E اسلام آباد فون 822677

احمد رضا قصوری

احمد رضا قصوری ۱۹۴۰ء میں قصور میں پیدا ہوئے، سنٹرل ماڈل سکول لاہور سے میٹرک اور گورنمنٹ کالج لاہور سے بی۔اے پاس کیا۔ یونیورسٹی لاء کالج سے ایل ایل بی کی ڈگری حاصل کی۔ یونیورسٹی آرڈی ننس کے خلاف، احتجاجی تحریک کے دوران دو دفعہ ایوب دور حکومت میں گرفتار کیے گئے۔ ۱۹۶۳ء میں اسی آرڈی ننس کے خلاف احتجاج کے سلسلے میں یونیورسٹی سے نکالے جانے والے پہلے طالب علم تھے۔ جس کا حکم اس وقت کے گورنر نواب آف کالاباغ نے دیا تھا وہ پنجاب یونیورسٹی کی کرکٹ ٹیم کے بھی رکن تھے۔ انگریزی مباحثوں میں انھوں نے قومی سطح پر گیارہ انعام حاصل کیے۔ وہ آر سی ڈی یوتھ آرگنائزیشن کے صدر اور ترک کلچرل آرگنائزیشن کے سیکرٹری رہے۔ احمد رضا قصوری پاکستان پیپلز پارٹی کے بانی ارکان میں سے تھے۔ پیپلز پارٹی کے قیام کا اعلان بھی ان کے گھر واقع قصور سے ہوا۔ وہ پاکستان پیپلز پارٹی کی اساسی آئینی دستاویز لکھنے والوں میں سے ایک تھے۔ نومبر ۱۹۶۸ء میں صدر ایوب خان نے جن آٹھ قومی لیڈروں کو گرفتار کیا ان میں احمد رضا قصوری بھی شامل تھے۔ جس کے نتیجے میں ان کے خلاف عوامی تحریک برپا ہوتی۔ ۱۹۷۰ء میں جب قومی انتخابات ہوئے تو وہ قومی اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے۔ ان کے مقابلے میں میاں جمیل احمد شرق پوری اور عارف افتخار تھے۔

۱۹۷۰ء کے الیکشن کے بعد انھوں نے پریس کی آزادی کی تحریک کا آغاز کیا تحریک اس قدر شدید تھی کہ بالآخر فوج کو شہر کا انتظام سنبھالنا پڑا۔

احمد رضا قصوری وہ واحد ایم این اے تھے جو ذوالفقار علی بھٹو کی واضح دھمکی

اور ہدایات کی خلاف ورزی کرتے ہوئے ڈھاکہ میں قومی اسمبلی کے اجلاس

۳ مارچ ۱۹۷۱ء میں شرکت کے لیے گئے تھے مسٹر بھٹو نے پی پی پی کے چیئرمین کی

حیثیت سے اعلان کیا تھا کہ جو قومی اسمبلی کے اجلاس میں شرکت کے لیے جائے گا

اس کی ٹانگیں توڑ دی جائیں گی اور جو وہاں جائے صرف جانے کا ٹکٹ لے کر جائے

اس کی واپسی ممکن نہ ہوگی۔ یہیں سے دونوں کے درمیان اختلاف کا آغاز ہوا۔ احمد

رضا قصوری نے بھٹو کے آمرانہ اور فسطائی طرزِ عمل کی مخالفت شروع کی۔ احمد رضا

قصوری نے اسمبلی کے اندر اور باہر ہر جگہ بھٹو کے آمرانہ رویّے کو للکارا۔ احمد رضا

قصوری نے نہ تو ۱۹۷۳ء کے آئین کے حق میں کبھی ووٹ دیا اور نہ اس پر دستخط

کیے بلکہ انھوں نے حزبِ اختلاف کی نمائندگی کرتے ہوئے اس پر ایک تاریخ ساز

خطاب کیا۔ وہ پاکستان کے اس تاریک ساز دور میں شہری آزادیوں کے تحفظ

کی جنگ لڑنے والوں میں ممتاز ترین تھے۔ وہ واحد رکن اسمبلی تھے جن کی تین ماہ

کے لیے رکنیت سپیکر نے معطل کر دی تھی۔ جو بھٹو کی ہدایات پر محض اس کی

مخالفت کرنے کا نتیجہ تھا۔ ان پر پہلے قاتلانہ حملے میں انہیں تین گولیاں لگیں

جب کہ ان کے بھائی خضر حیات شدید زخمی ہوئے۔ شادمان لاہور کے قاتلانہ

حملے میں وہ معجزانہ طور پر بچ گئے مگر ان کے والد گرامی نواب محمد احمد خان شہید

ہو گئے۔ احمد رضا قصوری کو متعدد بار گرفتار کیا گیا اور پانچ مرتبہ جیل ہوئی۔

"سردارانِ پنجاب" کے نام سے کرنل میسی اور سر گرفن کی انگریزی

کتاب میں احمد رضا قصوری خاندان کا ذکر بھی موجود ہے۔ مغل عہد میں پنجاب

میں یہ خاندان حکمران تھا۔ والدہ کی طرف سے ان کی نسبت نواب آف لوہارو

کے خاندان سے ہے۔ ان کے ایک خالو زاد اب بھی نواب آف لوہارو ہیں۔ ان

کے ایک ننھیالی رشتے دار نواب احمد الدین احمد خان ہماچل پردیش کے گورنر

ہیں۔ یو پی کے ممتاز مسلم لیگی رہنما اور آل انڈیا مسلم لیگ میں قائد اعظم کے بعد سب سے با اثر شخصیت نواب محمد اسماعیل ان کے رشتے کے ماموں تھے جو نواب شیفتہ کی اولاد میں سے تھے۔ نواب شیفتہ مرزا غالب کے دوستوں میں سے تھے۔ احمد رضا قصوری کے خاندان نے سیاست، اعلیٰ سرکاری ملازمتوں، علمی اور فکری میدان میں بھی کارہائے نمایاں سرانجام دیے۔

احمد رضا قصوری نے متعدد ممالک کی سیاحت بھی کی۔ برطانیہ، امریکہ، کینیڈا میکسیکو، فرانس، جرمن، سوئٹزرلینڈ، ایران، سعودی عرب، مصر اور بنگلہ دیش کے انھوں نے متعدد دورے کیے۔ انھوں نے میکسیکو میں پارلیمانی امور سے متعلقہ ایک کانفرنس میں پاکستان کی نمائندگی کی۔ اسمبلی میں وہ متعدد پارلیمانی کمیٹیوں کے رکن رہے۔ انھوں نے دارالعوام کے کمیٹی روم میں دارالعوام کے ارکان کو بھی خطاب کیا۔ نیز لنکن ان، لندن یونیورسٹی اور مانچسٹر یونیورسٹی میں بھی خطاب کیا۔

امریکہ میں کولمبیا یونیورسٹی، ڈلور یونیورسٹی، سٹین فورڈ یونیورسٹی، برکلے یونیورسٹی، کیلی فورنیا یونیورسٹی میں بھی خطاب کیا۔ پاکستان کے آئین اور سیاسی ارتقا کے موضوع پر انھوں نے کینیڈا کے اراکین پارلیمنٹ کے علاوہ یونیورسٹی میں بھی خطاب کیا۔

احمد رضا قصوری امور خارجہ کے ماہر ہیں۔ دو بار عمرہ کی سعادت حاصل کی۔ ان دنوں سپریم کورٹ پاکستان میں وکالت کر رہے ہیں۔

۱۹۷۶ء میں احمد رضا قصوری کی شادی سید عطاء اللہ شاہ بخاری کے بھائی سید عنایت اللہ شاہ بخاری کی بیٹی فہمیدہ بخاری سے ہوئی۔ جو ممتاز ماہر تعلیم ہیں۔

عرضِ ناشر

قوموں کی زندگی میں چالیس سال کوئی عرصہ نہیں ہوتا۔ قیامِ پاکستان کے چالیس سال بعد اگر ہم اپنے ماضی کا تجزیاتی جائزہ لیں تو دیکھیں گے کہ کئی تند و تیز ہوا کے جھونکے وطنِ عزیز کو لرزاں کر گئے۔ اس ملک کے حصول کی جد وجہد سالوں پر نہیں صدیوں پر محیط ہے۔ لاکھوں فرزندانِ توحید نے اپنے لہو سے اس کی آبیاری کی۔ ان گنت کلیاں پھول بننے سے پہلے مرجھا گئیں۔ لاکھوں نوجوانوں نے اپنے لہو کا نذرانہ پیش کیا۔ کتنی ہی ممتائیں اپنے جگر کے ٹکڑوں سے محروم ہو گئیں۔ سہاگ اجڑے اور راہنما اپنی کاوشوں میں عمرِ عزیز سے اس کی تاریخ کے اوراق کو ارغوانی کر گئے۔ تاکہ حصولِ آزادی کا یہ قافلہ رواں دواں رہے۔ محمد بن قاسم عالمِ جوانی میں جس قافلہ کا سالار بنے اور قائداعظم محمد علی جناح نے جس خواب کو حقیقت کا روپ دیا صدیوں پر محیط اس تاریخ کو ان چند اوراق میں بیان کرنا ممکن نہیں۔

بہر حال ماضی کے حقائق کو ضبطِ تحریر میں لانا تاریخ ہے اور قومیں جو اپنی تاریخ کو یاد نہیں رکھتیں اور اس سے سبق حاصل نہیں کرتیں مٹ جاتی ہیں۔ تاریخ کا مطلب قصہ کہانی یا دلچسپ اور ہیبت ناک واقعات کا محض دہرانا نہیں ہوتا۔ بلکہ حقائق پر مبنی وہ تمام حالات و واقعات ہوتے ہیں جن سے مثبت

اور منفی اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ اس میں جہاں غیر اہم کارناموں کا ذکر ہوتا ہے وہاں لغزشوں اور کوتاہیوں کا جائزہ بھی شامل ہوتا ہے اور ان ہی تجربات سے حاصل شدہ نتیجہ کی روشنی میں ہمیں اپنے حال اور مستقبل کی راہوں کو متعین کرنا چاہیے اور اگر بد قسمتی سے تاریخ کا مطالعہ اس حوالے سے نہ کیا جائے تو نتائج انتہائی بھیانک نمودار ہوتے ہیں۔ اس میں زیر بحث اداروں اور افراد کو اپنے استحقاق کے بجائے اپنے احتساب سے منسوب کرنا چاہیے۔ اگر کسی فرد کو تاریخ کے حوالے سے زیر بحث لایا جائے تو اس کے معتقدین اور مخالفین کو غیر جانبداری کے ساتھ صرف ایک قاری کی حیثیت سے اس کا مطالعہ کرنا چاہیے۔ جذباتی لگاؤ شاید اس عظیم مقصد سے دور لے جائے جس سے سبق حاصل کر کے حال اور مستقبل کو سنوارا جا سکتا ہے۔

ستر کی دہائی اور اس سے چند سال پیشتر کے حالات خاص طور پر پاکستان کی ہیئت اور نقشہ میں تبدیلی کا باعث بنے وہ پاکستان جو مسلمانانِ ہند نے عظیم قربانیاں دے کر حاصل کیا تھا۔ اور وہ نقشہ جو حکیم الامت علامہ اقبال نے اپنی فکر سے تخلیق کیا اور متعدد راہنماؤں نے اپنی کاوشوں کو شامل کر کے اس کٹھن سفر کو قائد اعظم محمد علی جناح کی والہانہ قیادت میں طے اور دنیا کے نقشہ پر ایک نیا سبز ہلالی پرچم بلند کیا مگر جب سیاست کاروں اور غیر ملکی طاقتوں کی ریشہ دوانیوں سے دولخت ہوا تو یہ جگر خراش سانحہ کوئی معمولی واقعہ نہ تھا جو بھلایا جا سکے۔ یہ مرحلہ کیوں آیا؟ اس نقشہ میں تبدیلی کیوں کر ظہور پذیر ہوئی؟ وہ کون سے کردار تھے جو اس سازشں کا حصہ بنے؟ انھیں ایسا کرنے سے کیا مفاد حاصل ہوا؟ کیا یہ تبدیلی یکدم کسی سوچ کا نتیجہ تھی یا کوئی بڑی سازش اس کا باعث بنی؟ یہ وہ سوالات ہیں جو جواب چاہتے ہیں۔ ان سوالات کا جواب محب الوطن

پاکستانی جاننا چاہتا ہے گزشتہ کئی برسوں سے اس موضوع پر بیشتر مضامین اور کتابیں قارئین کو پڑھنے کو ملیں جنھیں باآسانی تین اقسام میں تبدیل کیا جاسکتا ہے۔

اولاً : ان اصحاب کی لکھی ہوئی کتابیں جو خود اس دور میں اہم حیثیت سے حکومت کے کسی نہ کسی شعبہ سے تعلق رکھتے تھے چنانچہ ان کا مطمع نظر عمومی طور پر یہ دکھائی دیتا ہے کہ وہ تاریخی واقعات اور حقائق کو اپنے پس منظر میں عیاں کرنا چاہتے ہیں اور واقعات کی کڑیاں جوڑ کر یہ تاثر دینا چاہتے ہیں کہ وہ تو اچھا ہی چاہتے تھے مگر دوسرے "سب اچھا" میں لگے ہوئے تھے اس طرح وہ بری الذمہ ہونے کے جتن کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ لیکن شاید یہ ان کی بھول ہے، تاریخ ایک تسلسل کا نام ہے جو وہی تسلیم کرتی ہے جس کی بنیاد حقائق پر ہو۔

ثانیاً : وہ سیاسی مبصرین ہیں جنھوں نے بلاشبہ اپنی اپنی بصیرت اور سمجھ کے مطابق حالات کا تجزیہ بڑے اچھے انداز میں کیا۔ گو اندازِ فکر سے اختلاف ہونا اصولِ جمہوریت، ہے مگر بہر حال ان کی کاوشوں کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا اور تیسری قسم ان اصحاب کی ہے جو مخصوص سیاسی نقطۂ نظر رکھنے کی وجہ سے تاریخ کو اسی حوالے اور فکر کے تابع لاکر حالات کا تجزیہ کرتے رہے ہیں۔

ان تمام حالات کو مدنظر رکھتے ہوئے ہم نے اس ضرورت کو محسوس کیا کہ عوام کو ایک ایسی معتبر اور حقائق پر مبنی دستاویز پیش کی جائے جس میں نہ صرف مذکورہ سوالات کا جواب تاریخ کے حوالے سے ملے بلکہ مزید حقائق اور واقعات کا بھی صحیح علم ہو سکے اس سلسلہ میں کافی غور وفکر کے بعد اور ستر کی منتخب اسمبلی کے ممبران کی طویل فہرست اور اس کی کارروائیوں پر مبنی رپورٹوں کی چھان بین کرنے کے بعد ایک نام بڑا واضح دکھائی دیا اور وہ نام تھا جناب احمد رضا خان قصوری کا۔

جناب احمد رضا خان قصوری صاحب پیپلز پارٹی کے بانی ارکان میں سے تھے۔ بھٹو صاحب سے والہانہ لگاؤ رکھتے تھے۔ حتیٰ کہ پیپلز پارٹی کے قیام کا اعلان ان کے گھر قصور میں ہوا۔ پھر آخر کیا ہوا کہ وہ حزبِ اختلاف میں چلے گئے۔ چنانچہ ہم نے قصوری صاحب سے رابطہ قائم کیا کہ وہ تاریخ کے حوالے سے ان واقعات کو قارئین کے سامنے لائیں۔ ان قربانیوں اور کاوشوں کا ذکر کریں جو پاکستان کو بچانے کے لیے کی گئیں۔ زیرِ مطالعہ کتاب اس سلسلہ کی ہی ایک کوشش ہے۔

اس سلسلہ کی سب سے اہم بات یہ ہے کہ اس کے مصنف اس سارے المیہ کے عینی گواہ ہیں اور اس سانحہ کے ایک اہم کردار کے انتہائی قریب رہے ہیں وہ اس کردار کے باطن تک سے آگاہ تھے۔ انھوں نے قتلِ مشرقی پاکستان میں جو کردار ادا کیا اور بنگلہ دیش منظور کرواکے جس طرح اپنے اور اس کے استحکام کی راہ ہموار کی۔ احمد رضا قصوری اور ذوالفقار علی بھٹو کے تعلقات کے تناظر میں یہ کہانی بھی پڑھی جا سکتی ہے۔

یہ کتاب ایک ایسی دستاویز ہے جس میں ہم ذوالفقار علی بھٹو کے ساتھ ساتھ کتنی اور کرداروں کا بھی چہرہ دیکھیں گے۔

انوار اصغر سید

ناشر

برٹینیکا پبلشنگ ہاؤس لاہور

فون 8754413/877292

ٹیلیکس 44-44-444 ملک (پی۔کے)

خاندانی پس منظر

جدِ امجد

مسلمان ہونے کے ناطے یہ ہمارا عقیدہ ہے کہ کسی ایک قبیلے کو کسی دوسرے قبیلے پر اور کسی ایک شخص کو کسی دوسرے شخص پر کوئی فوقیت حاصل نہیں۔ اگر اسلام میں کسی شے کی بنیاد پر فوقیت ہے تو وہ صرف تقویٰ ہے۔ اور یا پھر پرہیزگاری اور خدمت خلق ہے۔ لیکن اس کے باوجود اسلام میں بھی قبیلے رائج ہوئے اور قبیلے جو رائج ہوئے اور جن کا ذکر تاریخوں میں آتا ہے ان قبیلوں سے لوگوں کا ناتہ صرف اس لیے قائم کیا گیا کہ ایک پہچان ہو سکے لہٰذا صرف پہچان کی حد تک تو قبیلوں کا ذکر کیا جا سکتا ہے لیکن محض کسی قبیلے سے تعلق اور ناتہ رکھنے کی وجہ سے فوقیت کا دعویدار ہونا یہ اسلام کے بالکل منافی ہے۔ میرا بھی لہٰذا ایسے ہی ایک تاریخی قبیلے سے تعلق ہے۔ میں آج اپنے قبیلے کے بارے میں اسی حوالے سے اظہار خیال کروں گا۔ اس کا ذکر ایک مشہور و معروف تصنیف (PUNJAB CHIEFS) میں ہے جو انگریزی زبان میں سر لیپل ایچ

گرفن اور کرنل میسی نے مشترکہ طور پر لکھی ہے۔ اس کتاب کا اردو ترجمہ "تذکرہ روسائے پنجاب" کے نام سے سید نوازش علی نے کیا ہے اور اس کے صفحہ ۵۲۶ پر میرے خاندان اور میرے آباؤ اجداد کے بارے میں لکھا گیا ہے۔

"خوشیگی افغان تقریباً ۱۵۲۶ء میں اپنی خانہ جنگیوں اور آئے دن کے جھگڑوں سے تنگ آکر اپنے وطن یاگستان اور ریکا توت سے جو افغانستان میں واقع ہیں کوچ کر کے پنجاب کی طرف آنے لگے تو اتفاقاً ان کی ملاقات شہنشاہ بابر کے ساتھ ہوگئی جس نے سلطان سلیم خان جیسے قابل کمانڈر کے تحت بہت سے چست و چالاک ہتھیار بند اور تلوار کے دھنی دیکھ کر اپنی فوج میں یہ وعدہ کر کے داخل کر لیا کہ دہلی کے مالیہ کی ایک چوتھائی ان کے حوالے کر دی جائے گی۔ چنانچہ بیان کیا جاتا ہے کہ اس وعدے کے مطابق ایک سند لکھ دی گئی۔ اس وعدہ کے ایفاء کی غرض سے خوشیگی افغانوں نے بادشاہ مذکور کے ساتھ مل کر پانی پت کے میدان میں دشمن کا نہایت بے جگری سے مقابلہ کیا اور ان میں سے سات سو جوان میدان جنگ میں مارے گئے۔ اس جانثارانہ خدمت کی وجہ سے مغل بادشاہ آگے چل کر خوشیگی افغانوں کی خاص طور پر خدمت اور قدر و منزلت کرتے رہے اور ان کو بڑے ذمہ دار عہدے دیتے رہے۔ جب ۱۵۶۹ء میں شہنشاہ اکبر کے یہاں شہزادہ سلیم (جو آگے چل کر شہنشاہ جہانگیر کے نام سے مشہور ہوا) پیدا ہوا، اس کی پیدائش کی خوشی میں ایک نہایت عالی شان تقریب کا اہتمام کیا گیا تو اس موقع پر خوشیگی حاضر نہ ہو سکے اور انہوں نے دیر کر دی کیونکہ وہ بنگال کی فتوحات میں معروف تھے۔ یوں ابوالفضل اور ٹوڈرمل کو خوشیگیوں کے خلاف شہنشاہ کے کان بھرنے کا موقع ہاتھ آگیا۔ انہوں نے شہنشاہ کو بدظن کرنے کے لیے اس کی خدمت میں عرض کیا کہ یہ لوگ ارادتاً حاضر نہیں ہوئے لہٰذا شہنشاہ نے حکم صادر کر دیا کہ خوشیگی افغانوں کی جاگیروں میں آہستہ آہستہ کمی کر دی جائے۔ ادھر ان لوگوں نے اس عذر کے ساتھ اپنے وطن واپس جانے کا پروگرام بنایا کہ ہندوستان کی آب و ہوا انہیں راس نہیں۔ انہوں نے اس انتقال مکانی کی اجازت بھی حاصل کر لی بلکہ شہنشاہ نے یہ حکم دیا کہ خوشیگی دارالحکومت سے دور جہاں چاہیں اپنی رہائش اختیار کر لیں۔ اس کا آخر کار یہ نتیجہ ہوا کہ ۱۵۸۰ء

کے قریب خوشیگی قوم کا تمام کا تمام تُمن دہلی سے کوچ کر کے ابوالفضل کی معیت میں جسے اس قوم کو کسی موزوں مقام پر آباد کرنے کے لیے مقرر کیا گیا تھا۔ اس مقام پر آ گیا جہاں پر شکر پور قصور کے کھنڈرات آج بھی موجود ہیں۔

یہاں آباد ہونے کے بعد راج رائے سنگھ نے جو اس وقت اس علاقہ کا ناظم تھا۔ ان خوشیگی افغانوں سے ایسے ڈاکوؤں اور لٹیروں کے خلاف مدد مانگی جو اس کو اس علاقہ سے مالیہ جمع نہیں کرنے دیتے تھے۔ چنانچہ خوشیگی افغانوں نے ان ڈاکوؤں کے سرغنہ کو جس کا نام پیرا بلوچ ساکن چونیاں تھا کو زندہ گرفتار کر لیا اور یوں ان ڈاکوؤں سے اس علاقہ کو محفوظ کر دیا۔ اس شاندار خدمت کے صلہ میں شہنشاہ اکبر نے راجہ رائے سنگھ کو تو دہلی طلب کر لیا اور ستلج اور راوی کے درمیانے علاقہ کو جو چالیس لاکھ روپے کی مالیت کا تھا علی الدوام نواب نذر بہادر خان تمن زئی خوشیگی کو عطا کر دیا جو میرے خاندان کے جد امجد بھی تھے"۔

یہ خیال کیا جاتا ہے کہ اس جاگیر کے ملنے پر خوشیگی سرداروں نے نئے شہر کی بنیاد رکھ دی۔ عربی زبان میں قصر کے معنی محل کے ہیں اور اس کی جمع قصور (یعنی محلات) ہونے کی وجہ سے یہ نیا شہر قصور مشہور ہوا۔ نواب نذر بہادر خان کی وفات کے بعد نواب شمس الدین اور نواب قطب الدین علی الترتیب وادی کانگڑہ جوناگڑھ سورت اور ٹھٹھہ کے فوجدار مقرر ہوئے اس کے بعد انہوں نے جتور گڑھ کے قلعہ کا محاصرہ اور بعد ازاں اس کو فتح کرنے کے صلہ میں ہانسی اور حصار بھی بطور جاگیر وصول کیے۔ قطب الدین خان نے راکھن اور بیجاپور کی لڑائیوں میں بھی نمایاں خدمات سرانجام دیں۔

شہنشاہ اورنگ زیب کے زمانے میں نواب خان زادہ خان خلف زئی ڈیرہ دین پناہ کا فوجدار تھا۔ اس کے علاوہ اس خاندان کے کئی ارکان بڑی بڑی منصب داریوں مثلاً شش ہزاری اور ہفت ہزاری پر فائز تھے۔

جب سلطنت مغلیہ میں زوال کے آثار نمودار ہوئے تو نواب حسین خان خلف زئی اور لاہور کے مغل گورنر نواب عبدالصمد خان کے درمیان بڑی دشمنی پائی جاتی تھی چنانچہ ان دونوں میں بہت سی لڑائیاں ہوئیں لیکن ان تمام میں خوشیگی افغان ہی فتحیاب رہے۔ مگر جب ان روہیلہ افغانوں کو جو ہندوستان اور افغانستان کے درمیان تجارت کرتے تھے۔ خوشیگی افغانوں نے قتل کیا اور قصور سے نکال دیا تو عبدالصمد خان نے انہیں اپنی فوج میں بھرتی

کر دیا اور ستر ہزار آدمیوں کی معیت میں سردار فاضل خان ترین افغان ناظم چونیاں ریاست قصور پر حملہ کر دیا۔ اس نازک وقت میں خوشیگی افغان صرف دس ہزار آدمی اکٹھے کر سکے مگر اس کمی کے باوجود انہوں نے دشمن کا خوب ڈٹ کر مقابلہ کیا لیکن ان کے پارسا راہنما نواب حسین خان خلف زئی خوشگی کمان دار جسے سیادی فیاض منش مؤدب سادات کرم براہ میدان قریب میدان کارزار میں شہید ہو جانے سے میدان مصاف گاہ کا پہلو بدل گیا۔ یہ تقریباً ۱۷۲۰ء کا واقعہ ہے جب ہرچوکی چونیاں کے مقام پر خوشیگیوں کو شکست ہوئی اور فریقین کے تقریباً بڑے بڑے منصب دار میدان میں کام آئے یعنی نواب حسین خان اور خان قطب الدین خان جو میرے خاندان کی نویں پشت میں بزرگ تھے شہید ہو گئے۔

جب نادر شاہ نے ہندوستان پر حملہ کیا تو خوشیگی افغانوں نے مغل شہنشاہوں کے ساتھ اپنی گزشتہ وفاداری کے خیال سے تہارہ کے مقام پر اسے روکا جہاں نواب شہزاد خان خلف زئی جس نے عیسیٰ خان بیخ اچھوت کو مار کر اقوام بھڑانڑ کو اس کے جنگل سے آزادی دلائی، اس معرکہ میں مارا گیا اور خوشیگی پٹھانوں کے بہت سے بہادر بھی کام آئے۔ بعدازاں جب احمد شاہ ابدالی مرہٹوں سے لڑنے کے لیے پنجاب میں وارد ہوا تو نواب ولی داد خان خلف زئی نے جو میرے خاندان کا براہ راست بزرگ تھا، اپنے جانثاروں کے ساتھ خود کو احمد شاہ ابدالی کے سامنے پیش کیا اور پانی پت کے مشہور تاریخی میدان جنگ میں نہایت شجاعت کے جوہر دکھائے۔ جس کے صلہ میں شہنشاہ مذکورہ نے ان کو نواب اور سیف الدولہ کے خطابات، ایک اصفہانی تلوار اور ایک بڑی قیمتی خلعت عطا کی۔

نواب ولی داد خان کی وفات کے بعد ۱۷۶۴ء میں سردار ہری سنگھ بھنگی اور جسا سنگھ آہلووالیہ نے قصور پر حملہ کیا اور شہر کو آگ لگا دی جس کے نتیجے میں بہت سی قیمتی کتب اور دستاویزات ضائع ہو گئیں۔ اس حملہ میں بڑے بڑے دلیر خوشیگی بھی مارے گئے اور جو زندہ بچ رہے وہ مفلسی اور پریشانی کی زندگی گزارنے پر مجبور ہو گئے۔

اس زمانہ میں نواب ولی داد خان کے بیٹے سردار شہباز خان نے اپنے کچھ رشتہ داروں کو اپنے اردگرد جمع کرنے اور نواب مظفر خان سدوزئی سے جو اس وقت گورنر ملتان تھا۔ مدد حاصل کرنے کی کوشش مگر بیشتر اس کے کہ وہ قصور کو دوبارہ حاصل کر لیتا۔ سردار گنڈا سنگھ اور جھنڈا سنگھ بھنگی نے شہر پر قبضہ کر لیا اس پر سردار شہباز خان نے پلٹے کر اٹاری اور ڈنڈیا نوالی پر حملہ کر کے قبضہ کر لیا اور وہاں ایک قلعہ اور تھانہ قائم کر لیا۔

سردار شہباز خان نے دریائے ستلج کے اردگرد کچھ مضافات پر بھی قبضہ کر لیا اور شل مذکورہ کے سرکردہ سردار ہیرا سنگھ کو قتل کر دیا۔ اس کے بعد جب سردار گلاب سنگھ نے اس کو مطلوبہ جاگیر قصور پر

بحال کیا تو اس نے بھنگی سرداروں کے مملوکہ تھانے پر بھی قبضہ کر لیا اور اس طرح تمام افغان ۱۲۱۹ ہجری میں ریاست قصور پر قابض و خود مختار ہو گئے۔ جب شاہ زمان نے پنجاب پر حملہ کیا اور وہ قصور پہنچا تو اس نے سردار شیر باز خان خلف زئی کو خلعت عطا کی اور بعد ازاں جب ۱۷۹۹ء میں مہاراجہ رنجیت سنگھ نے بھنگیوں پر چڑھائی کر کے لاہور پر حملہ کیا تو شیر باز خان نے اس کے خلاف لڑائی کی اس طرح مہاراجہ مذکور کو سخت خفا کر لیا۔ سردار گلاب سنگھ بھنگی کی نشہ کی حالت میں وفات ہوئی تو سکھوں نے رل چھوڑ دیا۔ بعد ازاں سردار شیر باز خان نے سکھوں کا ڈٹ کر مقابلہ کیا۔

میں یہاں اسی بات کا ذکر کرنا بھی مناسب سمجھتا ہوں کہ جہاں سکھ فتوحات کرتے ہوئے تمام صوبہ سرحد اور کابل تک جا پہنچے۔ ہمارے بزرگوں یعنی قصور کے پٹھانوں نے ان کا بڑی بے جگری سے مقابلہ کیا اور تاریخ شاہد ہے کہ کبھی تو سکھ قصور کے پٹھانوں کو مارتے مارتے للیانی تک چھوڑ جاتے تھے اور کبھی قصور کے پٹھان سکھوں کو مارتے مارتے شاہ عالمی کے دروازے تک چھوڑ جاتے اور یہ سلسلہ بڑی مدت تک جاری رہا، یہ بات عام مشہور ہے کہ قصور میں ایک مقام قتل گڑھی ہے جہاں ایک جنگ ہوئی جس میں پانچ چھ ہزار افراد شہید ہوئے لیکن قصور کے پٹھانوں نے بڑی بے جگری اور جرأت کے ساتھ سکھوں کا مقابلہ کیا اور وہ سکھ شاہی کے سامنے سرنگوں نہیں ہوئے۔ قصور مغلوں کے زمانے میں ایک ریاست تھی جس کا صدر مقام قصور ہی تھا اور اس کی سرحدیں ملتان تک اور ہانسی، حصار تک پھیلی ہوئی تھیں۔ یہاں ہمارے بزرگ حکومت کرتے تھے۔ اور اس ریاست کا صوبہ دار پنجاب سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ بلکہ یہ براہِ راست مرکز کی زیر نگرانی تھی۔ اس کا تعلق دہلی کے فرمانروا کے ساتھ ہوا کرتا تھا۔ اس ریاست کا آخری سردار نواب حسین خان خویشگی تھا جو نواب عبدالصمد خان (صوبہ دار پنجاب) کیساتھ جنگ کرتے ہوئے ہرچوکے کے مقام پر شہید ہوئے اور ان کی شہادت کے بعد قصور کی ریاست کی حیثیت ختم ہو گئی۔ اس کے بعد جاگیرداریاں شروع ہو گئیں اور مغلوں نے بلا شبہ بڑی جاگیریں عطا کیں لیکن جاگیرداریاں بھی سکھوں کے زمانے میں ختم ہو گئیں اس کے باوجود قصور کے پٹھانوں نے سکھوں کا ڈٹ کر مقابلہ کیا اور ان کے آگے سرنگوں نہیں ہوئے۔

جہاں تک انگریزوں کے زمانے میں ہمارے خاندان کا تعلق ہے تو ہمارے کئی ایک بزرگ اس زمانے میں آنریری لائف مجسٹریٹ رہے۔ ہمارے گاؤں کے اندر ہی باقاعدہ جوڈیشنل حوالات تھی، ہمارے بزرگ حتیٰ کہ میرے والد اپنے گھر کے اندر ہی عدالت لگاتے تھے۔ میرے دادا لائف مجسٹریٹ تھے اور وہ پنجاب بھر میں

واحد ایسے آنریری مجسٹریٹ تھے جنہیں حکومت نے دفعہ ۳۰ ضابطہ فوجداری کے تحت اختیارات دے رکھے تھے اور وہ آنریری سول جج بھی تھے۔ یہ بات بھی اس لیے اہم ہیں کہ انگریز عام طور پر ہندوستان کے روسا کو آنریری مجسٹریٹ تو مقرر کر دیتے تھے مگر وہ انہیں سول جج مقرر نہیں کرتے تھے۔ میرے والد مرحوم آنریری مجسٹریٹ تھے اور میرے بزرگوں نے ریاست کے زمانے میں اور جاگیرداروں کے زمانے میں اور اس کے بعد بھی علاقہ کے عوام کی خاصی خدمت کی اور آج بھی جب ہم اس علاقہ میں گھومتے پھرتے ہیں تو ہمیں کسی سے خوف نہیں آتا کیونکہ ہمارے بزرگوں نے کسی سے کوئی زیادتی نہیں کی بلکہ انہوں نے انصاف پورا تول کر دیا چنانچہ ہمیں یہ خوف یا خطرہ نہیں ہوا کہ کوئی شخص ہمارے بزرگوں کی کسی زیادتی یا فیصلہ کے خلاف احتجاج کرتے ہوئے آج ہمارے گریبان میں ہاتھ ڈال دے گا۔ ہمارے بزرگوں نے علاقہ کے لوگوں کی فلاح و بہبود کے لیے ہمیشہ بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ انہوں نے علاقہ کی ترقی کے لیے باقاعدہ منصوبہ بندی کی تھی۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ آج بھی ہمارا علاقہ میں ایک وقار اور عزت ہے اور لوگ ہمیں ایسی ہی نظروں سے دیکھتے ہیں۔

ہمارے خاندان کے ایک اور بزرگ میرے دادا مرحوم خان بہادر نواب شیر باز خان سی آئی ای کے چچازاد بھائی خان بہادر نواب شہباز خان خلف زئی خویشگی آنریری ایکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر قصور مقرر ہوئے اور وہ تاحیات میونسپل کمیٹی کے صدر بھی رہے گویا قصور کے عوام نے ہمارے خاندان پر اس حد تک اعتماد کیا کہ وہ ان کو زندگی بھر بلامقابلہ ہی منتخب کرتے رہے۔

میرے والدین

میرے والد صاحب نواب محمد احمد خان ۱۹۰۲ء میں قصور میں پیدا ہوئے وہ میرے دادا نواب خان بہادر شیر باز خان (سی آئی ای) کے دوسرے نمبر کے صاحبزادے تھے۔ انہوں نے ابتدائی تعلیم چیفس کالج یعنی ایچی سن کالج لاہور سے حاصل کی اور پھر ۱۹۲۲ء میں وہ حصول تعلیم کے لیے ہی انگلستان روانہ ہو گئے جہاں انہوں نے ایڈنبرا یونیورسٹی میں تعلیم کا سلسلہ جاری رکھا۔ میرے دادا خان بہادر نواب شیر باز خان (سی آئی ای) کی ۱۹۲۶ء میں وفات ہو گئی ان کو میرے والد کو تعلیم ادھوری چھوڑ کر واپس وطن آنا پڑا۔ واپسی پر میرے والد کی شادی ۱۹۲۸ء میں میری والدہ یعنی صاحبزادی میمونہ بیگم بنت نواب حسام الدین مرزا لوہارو سے طے ہوئی۔ میرے والد نے تقریباً ۳۰ برس کے لگ بھگ بحیثیت آنریری فرسٹ کلاس مجسٹریٹ خدمات انجام دیں اور کچھ اس انداز سے کہ

انہوں نے اس تمام عرصہ میں تنخواہ تو ایک طرف رہی سرکاری دوروں کے سلسلہ میں کبھی ٹی اے ڈی اے تک وصول نہیں کیا۔ قیام پاکستان کے وقت میرے والد کو ایک نہایت اہم ڈیوٹی سونپی گئی۔ ان کو باؤنڈری کمیشن کی فورسز اور سول انتظامیہ کے درمیان رابطہ آفیسر مقرر کیا گیا اور ان کی زیر قیادت اور نگرانی مسلمانوں کے قافلے ہندوستان سے پاکستان لائے جاتے اور یہاں سے سکھوں اور ہندوؤں پر مشتمل قافلے ہندوستان بھیجے جاتے۔

یہ ڈیوٹی میرے والد صاحب قصور کے گرد و نواح میں واقع ہندوستان کے اضلاع میں انجام دے رہے تھے۔ قصور کا علاقہ پنجابی زبان میں "ان ماجھا" کا علاقہ ہے۔ یہاں سکھ بڑی تعداد میں آباد تھے اور وہ اپنی دولت اثر و رسوخ اراضی اور جائیداد کے اعتبار سے بھی خاصی اہمیت رکھتے تھے۔ لیکن جب تک میرے والد آنریری مجسٹریٹ کے طور پر اپنے فرائض انجام دیتے رہے انہوں نے نہ صرف ایک غیر جانبدار منصف کے فرائض انجام دیئے بلکہ وہ ایک انتہائی فعال اور مضبوط منتظم بھی تھے۔ انہوں نے اپنے زیر اثر علاقے میں بڑے وقار اور افتخار سے کام کیا، وہ جس علاقے کے آنریری مجسٹریٹ تھے اسی علاقے کے وہ رئیس تھے اور حکومت نے ان کو خاطر خواہ اختیارات دے رکھے تھے۔ آج بھی ہمارے گاؤں میں جو ڈیشنل حوالات ہے جو اس زمانے کی قائم ہے۔ میرے والد، دادا اور پر دادا جو اپنے اپنے زمانے میں آنریری مجسٹریٹ رہے وہ اپنے فرائض کچہری یا عدالت میں جا کر انجام نہیں دیتے تھے بلکہ وہ عدالت خود اپنے گھر میں لگایا کرتے تھے۔ چنانچہ میرے والد نے اپنے زیر اثر علاقے یعنی اپنے ماجھے میں سکھوں کو اپنے تدبر، فراست اور دانشمندی کے ساتھ خوب قابو میں کر کے رکھا ہوا تھا۔ لہٰذا جب تقسیم ہند ہوئی اور وہ علاقے کٹ کر بھارت کو مل گئے جن کے بارے میں توقع تھی کہ یہ پاکستان کو مل جائیں گے۔ وہاں یہ شدید خطرہ پیدا ہو گیا کہ اب وہاں خون خرابا ہو گا۔ ان ہی دنوں میرے والد سو باؤنڈری کمشن فورسز اور سول انتظامیہ کے درمیان رابطہ افسر مقرر کیے گئے چنانچہ وہ لوگ جب میرے والد کو فوج کے ساتھ جیپ میں اگلی سیٹ پر بیٹھے ہوئے دیکھتے تو آپس میں ایک دوسرے سے پوچھتے کہ کہیں ان کا علاقہ پاکستان میں تو نہیں چلا گیا۔ وہ میرے والد کو ایم اے خان کہا کرتے تھے اور ان پر نفسیاتی طور پر میرے والد کی دہشت طاری رہتی تھی۔ میں مبالغہ نہیں کرتا لیکن یہ تاریخی حقیقت ہے کہ ہمارے علاقہ قصور میں اور خاص طور پر ان علاقوں میں جو میرے والد کی زیر نگرانی تھے، وہاں پر پورے برصغیر میں سب سے کم قتل و غارت ہوئی۔ وہ نہ صرف لاکھوں مسلمانوں کو عزت اور سکون کے ساتھ پاکستان بحفاظت لائے بلکہ انہوں نے لاتعداد ہندوؤں اور سکھوں کو بھی پاکستان سے بھارت پہنچایا۔ انسانی خدمت کی ایسی مثال کم ہی ملے گی کہ کسی ایک شخص نے ایسے وقت جبکہ انسان ایک دوسرے کے

خون کے پیاسے تھے۔ بلا امتیاز مذہب و نسل محض انسانیت کے نام پر خون خرابہ کو روکا اور امن کا پرچم بلند کیے رکھا۔

لارڈ ماؤنٹ بیٹن جب گورنر جنرل (بھارت) کی حیثیت سے قصور کے بعض فساد زدہ علاقوں میں آئے تو انہوں نے امدادی کیمپوں کا معائنہ بھی کیا۔ وہ میرے والد کے انسان دوستی کے جذبہ کو دیکھ کر اور اس انتظام کو دیکھ کر جو میرے والد نے ان کیمپوں میں آنے والے لاکھوں پناہ گزینوں کے لیے کر رکھا تھا۔ بے حد متاثر ہوئے اور لطف کی بات یہ ہے کہ جب فوٹوگرافروں نے ان کی لارڈ ماؤنٹ بیٹن کے ساتھ تصویریں بنانے کی کوشش کی تو میرے والد ایک طرف ہٹ گئے۔ جب لوگوں نے اصرار کیا کہ یہ سارا آپ کا انتظام اور حسن تدبیر ہے جس کی تعریف لارڈ بیٹن کر رہے ہیں لہٰذا آپ ان کے ساتھ تصویر بنوائیں تو میرے والد نے ان کو جواب دیا۔ میں نے یہ سب کچھ اخبار میں اپنی تصویریں شائع کرانے کے لیے نہیں کیا بلکہ میں تو ایسی باتوں سے گریزاں اور خوفزدہ رہتا ہوں، میری تو خواہش یہ ہے کہ میری یہ کاوش باری تعالیٰ قبول فرمائیں۔ میں نے یہ سب کچھ انسان ہونے کی حیثیت سے اپنے سکون قلب اور ضمیر کو مطمئن کرنے کے لیے کیا ہے۔

میں زندگی میں بے شمار لوگوں سے ملا ہوں۔ ان میں ہر عمر اور ہر سطح کے لوگ شامل ہیں۔ میں نے بہت بڑے بڑے لوگوں کو بہت چھوٹی چھوٹی باتیں اور حرکتیں کرتے دیکھا ہے لیکن میں پورے یقین کے ساتھ کہتا ہوں کہ میں نے جو سکون اور ٹھہراؤ اپنے والد کی شخصیت میں دیکھا وہ بہت ہی کم شخصیات کے پاس دیکھنے کو ملا۔ اس کی بنیادی وجہ شاید یہی تھی کہ ان پر خدا کی ذات نے اس قدر کرم کر رکھا تھا اور انہوں نے عمر بھر عام آدمی کی خدمت کے لیے جس ایثار اور خلوص کا مظاہرہ کیا تھا یہ سب اس کا اثر تھا کہ ان کے چہرے پر ہر وقت ایک عجیب طرح کا نور اور دبدبہ نظر آتا تھا۔

میرے والد نے جہاں عدلیہ اور انتظامی امور میں اپنی صلاحیتوں کا لوہا منوایا اور گرد و نواح کے لوگوں کو ان سے فیضیاب ہونے کا موقع ملتا رہا وہاں انہوں نے سیاسی لحاظ سے بھی ایک بھرپور اور فعال کردار ادا کیا۔ چلتے چلتے میں یہ بھی عرض کر دوں کہ مشہور زمانہ جناح سکندر پیکٹ ۔ جس میں یہ طے پایا تھا کہ وہ مسلمان جو یونینسٹ پارٹی میں شامل ہیں، وہ پنجاب کی حد تک یونینسٹ رہیں گے لیکن مرکز کی سیاست میں ان کا رویہ اور کردار مسلم لیگ کے شانہ بشانہ ہوگا۔ اس معاہدے کے طے پانے میں میرے والد کا بڑا نمایاں ہاتھ ہے اور کون نہیں جانتا کہ اس پیکٹ کی مدد سے مسلم لیگ کو بے پناہ سیاسی قوت میسر آئی ۔ اصل میں بات یہ تھی کہ میرے والد سکندر حیات

کے نوجوانوں میں ایک طرح کے دست راست تھے، اور وہ پنجاب کے جن نوجوانوں کو پسند کرتے تھے ان میں میرے والد بھی شامل تھے اس کی ایک وجہ یہ تھی کہ میرے دادا کے بھائی خان بہادر نواب شہباز خان رجو میونسپل کمیٹی قصور کے تاحیات صدر رہے، ان کا اور سر سکندر حیات کا آپس میں گہرا اور دیرینہ یارانہ تھا اور یہ بھی ایک عجیب حسن اتفاق ہے کہ میرے والد پنجاب کے ایک مشہور زمیندار تھے۔ تو ان کے سسرال یعنی میری والدہ کے ماموں نواب اسماعیل خان کی پوزیشن مسلم لیگ کی اعلیٰ کمان میں بڑی نمایاں تھی۔ ایک طرف وہ یوپی مسلم لیگ کے تاحیات صدر تھے۔ اور تاریخ کا شعور رکھنے والے جانتے ہیں کہ آل انڈیا مسلم لیگ کی جان دراصل یوپی مسلم لیگ ہی تھی۔ نواب اسماعیل خان آل انڈیا مسلم لیگ کی الیکشن کمیٹی کے صدر بھی تھے اور قائداعظم محمد علی جناح کی نگاہوں میں موصوف کی کس قدر عزت و منزلت تھی اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ قائداعظم عام طور پر ہر شخص کو اس کا آدھا نام لے کر پکارتے مگر نواب صاحب وہ واحد شخص تھے جنہیں قائداعظم پورے نام سے پکارتے تھے۔ اور اس بات کی تصدیق اصفہانی صاحب نے Quaid-i-Azam Jinnah. As I know him میں کی ہے اور نواب صاحب ہی واحد شخصیت ہیں جو قائداعظم کو مسٹر جناح کہہ کر مخاطب ہوتے تھے۔ چونکہ نواب اسماعیل کی سگی بھانجی میرے والد کے ساتھ بیاہی جا چکی تھی، لہٰذا میرے والد اپنے اس منفرد مقام کی وجہ سے فریقین یعنی سر سکندر حیات اور نواب اسماعیل خان کے درمیان گویا ایک پل بن گئے اور یہ دونوں حضرات میرے والد کے توسط ہی سے ایک دوسرے کے ساتھ رابطہ رکھے ہوئے تھے۔ جس کے نتیجہ میں وہ افہام و تفہیم پیدا ہوئی جو بالآخر جناح سکندر پیکٹ کی بنیاد بنی اور مجھے یہ کہنے میں کوئی تامل نہیں کہ اس افہام و تفہیم کو آگے بڑھانے اور مضبوط بنانے میں میرے والد نے نہایت سرگرمی سے اہم کردار ادا کیا۔

میرے والد کو یہ شرف بھی حاصل ہے کہ ۱۹۴۰ء میں انہوں نے اس اجلاس میں باقاعدہ طور پر شرکت کی جس میں ۲۳، مارچ کو منٹو پارک میں تاریخی قرارداد پاکستان منظور کی گئی، اس کے علاوہ ۱۹۳۵ء میں انہوں نے لکھنؤ سیشن میں بھی شرکت کی۔ لکھنؤ سیشن کے بارے میں میرے والد صاحب نے ایک بار نہایت ہی دلچسپ واقعہ سنایا جسے اصفہانی صاحب نے قائداعظم کے بارے میں اپنی کتاب میں رقم کیا ہے۔

لکھنؤ کنونشن میں جانے سے پہلے قائدین راجہ صاحب محمود آباد کے پیلس میں بیٹھے ہوئے تھے کہ اسی اثنا میں نواب اسماعیل خان راجہ صاحب کے بیڈ روم میں داخل ہوئے وہ حسب معمول اچکن، پاجامہ زیب تن کئے ہوئے تھے اور انہوں نے سر پر سمور کیپ پہن رکھی تھی۔ قائداعظم بھی وہیں تشریف رکھتے تھے۔ جب

نواب صاحب سب سے علیک سلیک کر چکے تو قائداعظم نے کہا۔

Nawab Sahib, you look very elegant, in this cap.

اس پر نواب صاحب نے کہا

Why don't you try on your head, Mr. Jinnah

اس پر قائداعظم نے ان کی ٹوپی لے کر اپنے سر پر رکھی اور پھر اپنی کرسی سے اٹھ کر بیڈ روم میں موجود قدِ آدم آئینہ کے روبرو جا کر کھڑے ہو گئے۔ انہوں نے ایک گہری نظر اپنے سراپا پر دوڑائی اور واپس آ کر اپنی نشست پر بیٹھ گئے اور پھر اپنے ساتھیوں سے مخاطب ہو کر بولے۔

Gentlemen, how do I look like?

جس پر تمام نے نہایت تحسین کی نظروں سے قائد کی طرف دیکھا اور ہر ایک نے تعریفی کلمات کہے۔ متفقہ رائے یہی تھی کہ یہ ٹوپی قائد کو بہت بھلی اور خوبصورت لگتی ہے اور یہ آپ کی شخصیت کے عین مطابق ہے لہٰذا یہ طے پایا کہ قائداعظم کنونشن میں وہی ٹوپی پہن کر جائیں گے۔

قائداعظم نواب اسماعیل خان کی سمور کیپ پہن کر کنونشن میں کیا آئے کہ بس کایا پلٹ گئی۔ کنونشن کے بعد منعقد ہونے والے لکھنؤ کے جلسہ عام میں ہزاروں کی تعداد میں افراد سمور کیپ اوڑھ کر شریک ہوئے اور یوں نواب اسماعیل خان کی سمور کیپ نے جناح کیپ کا روپ اختیار کر لیا۔

میری والدہ کا تعلق اپنے ددھیال کی طرف سے نواب لوہارو کے خاندان سے ہے اور اپنی والدہ کی طرف سے میری والدہ کا تعلق نواب محمد اسماعیل خان سے ہے جو قائداعظم محمد علی جناح کے دست راست رہے ہیں اور جو تا زندگی یوپی مسلم لیگ کے صدر رہے اور جو آل انڈیا مسلم لیگ ایکشن کمیٹی کے صدر تھے۔ اس اعتبار سے آل انڈیا مسلم لیگ میں ان کی مسلم لیگ میں نمبر ۲ پوزیشن تسلیم کی جاتی تھی۔ لہٰذا میری والدہ کا ننھیال یعنی نواب اسماعیل خان اور ان کے آباؤ اجداد کا ہندوستان میں مسلمانوں کی سیاسی جدوجہد اور علمی و ادبی میدان میں ایک نمایاں کردار رہا ہے۔ جہاں تک نواب اسماعیل کا تعلق ہے تاریخ کا عام طالب علم بھی ان کی سیاسی حیثیت سے باخبر ہے اور ہر شخص جانتا ہے کہ ہندوستان میں مسلمانوں کی جدوجہد آزادی میں ان کا ایک نمایاں مقام ہے۔ نواب اسماعیل خان نے ۱۹۰۰ء میں ایم اے کینٹیب کیا اور بار ایٹ لاء کرنے کے بعد ہندوستان واپس آنے کا ارادہ کیا تو واپسی پر نواب صاحب کے والد نواب اسحاق خان جو اس وقت بہت بڑے منصب پر فائز تھے۔

یعنی اودھ ہائی کورٹ کے جج تھے۔ انہوں نے موتی لال نہرو کو بلا کر کہا کہ میرا بیٹا بیرسٹری کر کے انگلستان سے واپس آیا ہے لہٰذا اس کو مہربانی کر کے وکالت کی تربیت دی جائے، تو نواب محمد اسماعیل خان نے موتی لال نہرو کے جونیئر کی حیثیت سے تقریباً تین سال تک نہرو خاندان کے آبائی گھر (آنند بھون) میں رہے اور اس سے انہوں نے وکالت کے پیشہ کے اسرار و رموز کی آگاہی اور تربیت حاصل کی۔ اسی ناطے سے جواہر لعل نہرو نواب صاحب کو چچا کہا کرتا تھا۔ بلکہ پورے نہرو خاندان میں نواب صاحب کو ایک بزرگ کی حیثیت حاصل تھی۔

میری والدہ کے ننھیال کے خاندان نے تعلیم کے میدان میں بھی مسلمانانِ ہند کی بے پناہ خدمت کی نواب اسماعیل خان بذاتِ خود علی گڑھ یونیورسٹی جو کہ بلاشک و شبہ ہندوستان کے مسلمانوں کے سیاسی شعور کا منبع اور سیاسی جدوجہد کا مرکز تھی۔ دو بار وائس چانسلر رہے۔ ان کے والد نواب محمد اسحاق خان کا علی گڑھ یونیورسٹی کے بانیوں میں ایک منفرد مقام ہے بلکہ یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ علی گڑھ یونیورسٹی کے خواب کو شرمندۂ تعبیر کرنے میں مرحوم کا بڑا ہی نمایاں اور مؤثر کردار رہا، نواب اسحاق خان کے والد نواب مصطفےٰ خان شیفتہ تھے جو شہرہ آفاق شخصیت ہیں، یہ وہی شیفتہ ہیں جن کے بارے میں مرزا غالب کا کہنا ہے کہ میں نے آج تک اپنا کوئی شعر شیفتہ کو دکھائے بغیر لوگوں کے سامنے نہیں پڑھا۔ اس سے بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ شیفتہ کا اردو زبان و ادب میں کیا مقام ہے اور اگر میں یہ کہوں کہ موجودہ اردو زبان ہمارے ننھیال سے ہی پروان چڑھی تو یہ کوئی غلط بات نہیں ہوگی۔

میری والدہ کا ددھیال یعنی نواب لوہارو خاندان کا تاریخی سلسلہ کچھ اس طرح ہے کہ ترک نسل کے دو بھائی قاسم جان اور عارف جان مہم جوئی کرتے ہوئے روسی ترکستان سے نکلے اور گھومتے پھرتے ہوئے ہندوستان میں آ گئے اور دہلی میں مقیم ہو گئے ان میں سے ایک کے نام پر آج بھی دہلی میں ایک مشہور و معروف گلی — "گلی قاسم جان" ہے اور یہ وہی گلی ہے جس کے ارد گرد اردو زبان و ادب کے حوالے سے نمایاں سرگرمیاں اپنے عروج پر رہیں۔ قاسم جان کی اولاد سے ہی لوہارو خاندان ہے جو لوہارو کی ریاست سے منسوب ہو کر لوہارو خاندان مشہور ہوا۔ چنانچہ نواب احمد بخش خان سے لوہارو خاندان کی ریاست کا سلسلہ شروع ہوا، اور ان کو اس خاندان کا جدِ امجد بھی کہا جا سکتا ہے کیونکہ ریاست اور حکومت کا سلسلہ ان سے جا شروع ہوا۔ نواب احمد بخش کے والد قاسم جان ایک عرصہ تک اٹک کے علاقے کے گورنر رہے اور نواب احمد بخش خان اٹھارویں صدی کے نصف

میں اٹک کے قلعے ہی میں پیدا ہوئے اور آگے چل کر فرمانروا فیروز پور اور لوہارو مقرر ہوئے اور انہوں نے ہی لوہارو کی ریاست کی بنیاد رکھی۔

نواب احمد بخش خان کے بیٹے نواب شمس الدین نے جنگ آزادی میں ایک بہت ہی بڑا کردار ادا کیا اور ان کا مقام یوں نمایاں ہوتا ہے کہ وہ پہلے ہندوستانی نواب تھے جنہوں نے انگریز کے ستبداد کا مقابلہ کیا۔ اور اپنے ایک ساتھی کو حکم دے کر انہوں نے دہلی کے برطانوی ریذیڈنٹ جنرل ولیم فریزر کو قتل کرا دیا جس شخص نے نواب موصوف کے حکم پر برٹش ریذیڈنٹ ولیم فریزر کو قتل کیا اس کا نام کریم خان میو ہے۔ کریم خان کو تمام علاقہ میورٹ اور میو قوم کا ہیرو گردانا جاتا ہے اور آج بھی اس کا چرچا لوک داستانوں اور گیتوں میں پایا جاتا ہے۔

آخر کار نواب شمس الدین خان نواب فیروز پور جھرکا اور لوہارو اور کریم خان میو کو گرفتار کیا گیا۔ ۱۸۳۵ء کے اوائل ہی میں ایک جعلی قسم کا عدالتی ٹربیونل قائم کیا گیا جس میں منصف کے فرائض راس کالون کو دیئے گئے۔ رس کالون نے بغیر قانونی تقاضوں کا احترام کرتے ہوئے غیر قانونی طور پر نواب موصوف اور کریم خان میو کو موت کی سزا سنا دی۔ ۳ر اکتوبر ۱۹۳۵ء کو نواب شمس الدین خان کو پھانسی پر چڑھایا گیا اور ۲۶ر اگست ۱۸۳۵ء کو کریم خان میو کو تختہ دار پر چڑھا دیا گیا۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ نواب موصوف نے ولیم فریزر کو کیوں قتل کیا؟ ولیم فریزر ایک نہایت ہی سنگدل، بے رحم، ظالم اور ایک بہت ہی غیر منصف قسم کا حاکم تھا۔ جس نے خوبصورت عورتوں کا حرم بنایا تھا۔ اس کے ظلم و تشدد کی کہانیاں دہلی اور دہلی کے گرد و نواح میں پھیلی ہوئی تھیں۔ نواب شمس الدین خان نے جب یہ محسوس کیا کہ خلق خدا اس کے ظلم سے تنگ آ چکی ہے تو نواب موصوف جو مسلمان صفت نیک انسان تھا اس نے فیصلہ کیا کہ اس ظالم درندے کو جس نے خلق خدا کا جینا دوبھر کر دیا ہے اس کو صفحۂ ہستی سے مٹا دیا جائے لہٰذا ان کے حکم پر کریم خان میو نے ۱۸۳۵ء میں ولیم فریزر کو قتل کر دیا اور اس کے بعد مسلمانان ہند میں آزادی کی ایک شمع روشن ہوئی اور یہ آنے والے حالات میں یعنی ۱۸۵۷ء میں رونما ہونے والے جنگِ آزادی کے ماحول میں ان دونوں بزرگوں کی جرأت کو تسلیم کیا گیا اور ان بزرگوں کی جرأت مندی کے قصے کہانیوں کو مشعلِ راہ کی حیثیت اختیار ہو گئی۔

نواب موصوف کی پھانسی کے واقعہ کا آنکھوں دیکھا حال ایک انگریز ٹامس بیکن نے یوں بیان کیا ہے۔

A day before the execution, the Nawab was asked if he wished to see his wife and daughters. Declining the offer, he admonished the man for mentioning the zanana. The mere idea of Their Highness coming as ordinary women was simply unimaginable· it would be below their dignity and the honour of Shamsuddin. He retained his pride even in the face of death. On the day of his execution (Oct. 3 1935) he went through the morning rituals of ablution and prayers and attired himself in a spotless suit of white muslin. Lieut. Thomas Bacon goes on to say that the Nawab resigned himself to his fate, took refuge in his pride and became quite stoical and indifferent. He gave a few articles of dress, such as scarf cumberband, etc. to his servants and quietly got into his planquin and was carried off to the scaffold attended by Thomas Matcalfe under a strong armed escort of soldiers.

ON THE GALLOWS

At the square, outside Kashmiri Gate where the scaffold was fixed, the Nawab was received by Magistrate Frascott Coming out of the planquin, the Nawab stood straight and looked around as if he was acknowledging the still and silent greetings of the troops massed in Hollow square. With an air of complete indifference, he asked Metcalfe and then advanced towards the gallows with a princly gait. With firm steps he mounted the ladder and with perfect calmness submitted his neck to have the rope adjusted but suddenly drew back on NOT that the man was of sweeper caste. Are you mehtar? Quickly, the man brought the red cap down over the Nawab's face and instantly the trap

اسی خاندان کے ایک اور بزرگ نواب علاؤالدین خان علائی نے اردو ادب میں ایک منفرد مقام حاصل کیا اور آج اردو دان طبقہ بخوبی جانتا ہے کہ نواب صاحب نے جدید ادب کو بلاشبہ نئی جہتوں سے روشناس کرایا۔ ایک اور منفرد بزرگ نواب سرامیرالدین خان تھے۔ انہوں نے ہندوستان کے راجوں اور مہاراجوں میں ایک نمایاں مقام حاصل کیا اور وہ مقام یہ تھا تمام راجے اور نواب بلا امتیاز مذہب یا ریاست ان کو اپنا

چاچا کہا کرتے تھے اپنے باہمی تنازعات کے حل کے لیے ان سے ہی رابطہ کرتے اور ان کا فیصلہ دل و جان سے قبول کرتے۔ اسی خاندان کے ایک اور بزرگ جن کا حال ہی میں ہندوستان میں انتقال ہوا اور جو اس خاندان کے آخری نواب تھے کیونکہ پھر پاکستان کا قیام معرض وجود میں آگیا اور ریاستیں ختم ہوگئیں۔ نواب امین الدین خان جو میری والدہ کے کزن تھے۔ ان کو مہاراجہ جے پور جو ان کے دیرینہ ساتھی تھے اپنے ہمراہ لے گئے اور انہوں نے ان کو پاکستان آنے نہیں دیا۔ اپنا ایک محل ان کے حوالے کیا اور پھر اپنی کابینہ میں انہیں ہوم منسٹر بنایا۔ پھر ہندوستان کی حکومت نے انہیں ہماچل شملہ کا گورنر بنایا اور وہ چار سال وہاں گورنر رہے۔ یہ بات دلچسپی سے خالی نہ ہوگی کہ جب معاہدہ شملہ کے لیے آنجہانی اندرا گاندھی اور مرحوم ذوالفقار علی بھٹو شملہ آئے تو اس وقت نواب موصوف ہی شملہ کے گورنر تھے۔ اس کے بعد ان کو مشرقی پنجاب میں گورنر بنا دیا گیا اور اسی حیثیت سے وہ اس دارِ فانی سے کوچ کر گئے۔ میرا اپنا خیال ہے کہ اگر وہ زندہ رہتے تو عین ممکن تھا کہ حکومت ان کو صدارت کا منصب بھی پیش کر دیتی۔

مختصراً میری والدہ کے دودھیال اور ننہال کا یہ خاندانی پس منظر ہے۔

میرے والد کی شادی ہوئی تو بارات میرٹھ گئی اور اس مکان پر گئی جسے ہندوستان کی تاریخ میں ایک نمایاں مقام حاصل ہے اور یہ (مصطفےٰ کیسل) MUSTFA CASTLE کے نام سے مشہور ہے۔ جسے نواب اسماعیل خان کے والد نواب اسحاق خان نے تعمیر کرایا تھا اور اپنے والد نواب مصطفےٰ خان شیفتہ کے نام سے اسے موسوم کیا گیا۔ یہ مکان ہندوستان کی تمام بڑی، بڑی سیاسی، سماجی، علمی اور تہذیبی تحریکوں کا مرکز رہا ہے۔ لوگ جانتے ہیں کہ تحریک آزادی کے جیالے راہنما علی برادران اسی گھر میں اپنے رفقاء کار کے ساتھ ملاقات کیا کرتے تھے اور یہیں ان کے اجلاس ہوتے تھے۔ آل انڈیا مسلم لیگ کی مرکزی کمیٹی کے تاریخی اجلاس بھی اسی گھر میں ہوتے رہے۔ خود قائداعظم محمد علی جناح جب ادھر آتے تو کئی کئی دن تک ان کا قیام بھی اسی مکان میں نواب اسماعیل خان صاحب کے ہمراہ ہوتا۔

اسی گھر میں میرے والد کی بارات گئی اور وہیں سے میری والدہ رخصت ہوئیں میرے والدین کا نکاح مولانا عبدالحامد بدایونی نے پڑھایا جو اپنے زمانے کی مقتدر مذہبی شخصیت تھیں اور عجیب حسن اتفاق ہے کہ نکاح نامہ پر مولانا محمد علی جوہر نے بطور گواہ دستخط کیے تھے۔

میری والدہ صاحبزادی میمونہ بانو بیگم کے نکاح کے گواہوں میں مولانا محمد علی جوہر بھی شامل تھے۔

میں یہاں یہ بھی بتاتا چلوں کہ میری والدہ نے مولانا محمد علی جوہر کی بیگم کا دودھ پیا۔ یعنی مولانا جوہر کی بیٹی گلنار (جنہیں ہم گلنار خالہ کہتے ہیں) اور میری والدہ آپس میں دودھ شریک بہنیں اور دوپٹہ بدل ہیں۔ گلنار خالہ کی شادی شعیب قریشی سے طے پائی تھی جو لیاقت علی خان شہید کی کابینہ میں وزیر اور بعد میں سفیر رہے۔ میں اپنے خاندانی پس منظر کے حوالے سے ایک بات کا بطور خاص یہاں ذکر کرنا چاہتا ہوں کہ جب مغل حکومت مرکز میں کمزور ہونا شروع ہوئی اور اس کے نتیجہ میں سازشوں اور بغاوتوں کا ایک سلسلہ چل نکلا تو پنجاب کے علاقہ میں بندہ بیراگی نے مسلمانوں کا وسیع پیمانے پر قتلِ عام شروع کر دیا اور اس نے اس حد تک ظلم و تشدد کا بازار گرم کیا کہ مسلمانوں نے قافلوں کی صورت میں یا تو دہلی اور یوپی کا رخ کیا اور یا پھر وہ افغانستان کی طرف چل نکلے، ان حالات میں ہمارے ہی خاندان کے ایک بزرگ نواب شمس الدین خان (جن کا تعلق میرے ددھیال سے تھا) جنہیں مغل حکومت نے کانگڑہ کی فوج کا کمانڈر مقرر کیا تھا۔ ان کی جرأت مندانہ، دلیرانہ اور غازیانہ کارروائی کے نتیجہ میں بندہ بیراگی کی سرکوبی کی گئی۔ نواب موصوف نے بندہ بیراگی کو کانگڑہ کے پہاڑوں میں زندہ گرفتار کر لیا اور پھر مغل دربار میں پیش کر کے بعد میں اس کو اس کے انجام تک پہنچایا۔

اپنے اس بزرگ کی جرأت مندانہ کارروائی کو تاریخ کے وسیع تناظر میں یوں دیکھتا ہوں کہ اگر بندہ بیراگی کو بروقت لگام نہ دی جاتی اور اس کی ظالمانہ سرگرمیاں اسی طرح جاری رہتیں تو یقیناً پنجاب سے مسلمانوں کا وسیع پیمانے پر اخراج یا انخلاء ہو جاتا اور یوں یہاں مسلمان اقلیت میں ہو جاتے اور پھر ۱۹۴۷ء میں پنجاب پاکستان کا اس بنیاد پر صوبہ نہ بن سکتا کہ یہاں مسلمانوں کی اکثریت ہے۔ چنانچہ میں اپنے تجزیہ میں اس بات کا اضافہ بھی کروں گا کہ ہمارے بزرگوں نے نہ صرف برصغیر کے مسلمانوں اور اسلام کی خدمت بلکہ ان کا ہر اعتبار سے تحفظ بھی کیا اور اس کی گواہی تاریخ کے اوراق میں جابجا موجود ہے۔ ایک ایسی ہی گواہی نواب اسماعیل خان کی ذات گرامی ہے جو قائداعظم محمد علی جناح کے قابل اعتماد ساتھی اور مسلم لیگ کے صف اول کے راہنما تھے۔ میں پورے اعتماد اور یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کی تحریک سے لیکر ۱۹۴۷ء میں حصول آزادی تک ہر مرحلہ پر ہمارے خاندان نے گرانقدر خدمات انجام دیں اور آزادی کی مشعل کو روشن رکھنے کے لیے اپنا لہو تک پیش کرتے ہے

دریغ نہیں کیا۔

میرے خاندان کی عسکری خدمات

میں اپنے خاندان کے فوجی و عسکری پس منظر کے بارے میں بھی کچھ کہنا چاہوں گا۔ جیسا کہ میں پہلے بیان کر چکا ہوں کہ ہمارے خاندان کا تعلق بنیادی طور پر سپاہ گری سے تھا۔ ہم لوگ اپنے آبائی علاقہ لیقاتوت کو خیرباد کہہ کر جب ہندوستان میں وارد ہوئے تو تلوار کے زور پر اپنا راستہ خود بنایا اور پھر جب ہم نے پنجاب میں اپنے قدم مضبوطی سے جما لئے تو یہ بھی طاقت اور تلوار کے زور پر۔!

مغلوں کے زمانے میں میرے آباؤ اجداد نے جو عسکری و فوجی خدمات اور معرکے انجام دیئے اس کا اندازہ تو اس زمانے کی مشہور تاریخی کتاب "مآثر الامراء" اس کا ترجمہ تین جلدوں میں عثمانیہ یونیورسٹی نے کیا۔ پڑھنے سے ہوتا ہے۔ یہ کتاب اس زمانے کے مشہور و معروف تاریخ دان صمصام الدولہ نواب شاہ نواز خان نے قلمبند کی ہے۔ مصنف نے اس کتاب میں اس زمانے کے ہندوستان کی سطح کے مغل دور کے ان اکابرین کا ذکر کیا ہے جو ثقافتی، علمی اور فوجی اعتبار سے نمایاں مقام رکھتے تھے۔ مثلاً اس کتاب میں بہرام خان، عبدالرحیم خان خاناں، راجہ مان سنگھ، تیتو میر، فیضی، ابوالفضل، احمد لاہوری (جس نے تاج محل کا نقشہ پاس کیا)، صیاد مہدی خواجہ (جو مغل مکتب مصوری کا موجد ہے) جیسی جلیل القدر شخصیات کا تذکرہ ہے اور یہ بات دلچسپی سے خالی نہ ہوگی کہ اس کتاب میں لگ بھگ درجن سے زائد ایسے اکابرین ہیں جن کا تعلق ہمارے خاندان سے ہے اور جو ہمارے جدِ امجد تھے اور یہ اکابرین اپنی فتوحات کے سلسلے میں بنگال، بہار، حصار، آسام اور سورت تک گئے اور انہوں نے اپنی شجاعت و جرأت مندی سے اپنی عسکری ہنرمندی کا لوہا منوایا، اور یہ بھی ایک عجیب حسن اتفاق ہے کہ یہ لوگ جب فوج سے ریٹائرڈ ہوتے تھے تو پھر یہ لوگ اپنی باقی زندگی قصور میں آکر گزارتے ان میں سے بیشتر کے مزار آج بھی وہاں موجود ہیں۔ بہت سے لوگوں کو یہ جان کر حیرت ہوگی بہرحال میرے لیے یہ بات انتہائی مسرت اور کسی قدر فخر کا باعث ہے کہ پاکستان کی سب سے زیادہ مشہور کیولری رجمنٹ (ٹینک رجمنٹ) یعنی نمبر ۵ رسالہ جس

کو ہم "PROBYON HORSE" سے بھی منسوب کرتے ہیں اس رجمنٹ کی تشکیل میں میرے خاندان کا بڑا ہی اہم حصہ ہے۔ میرے پاس اور میرے خاندان کے پاس تمام دستاویزات موجود ہیں کہ ۱۸۵۶ء کے اوائل میں اس رسالہ کو تشکیل دیا گیا۔

جنگ آزادی میں چونکہ بنگالی ٹراپس نے علم بغاوت بلند کیا تو "بنگال رجمنٹ کو ختم کر کے اسے نمبر ۵ رسالہ کے طور پر تشکیل دیا گیا۔ اس رجمنٹ کو بنانے کی ذمہ داری سب سے پہلا ایک شخص کیپٹن ویلز نامی کو سونپی گئی۔ کیپٹن ویلز سر جان لارنس (جو ۱۸۴۸ء میں پنجاب کا پہلا لیفٹیننٹ گورنر اور بعد میں وائسرائے ہندوستان بھی مقرر ہوا) کا ملٹری سیکرٹری تھا۔ وہ ابھی اس رسالہ کو تشکیل دینے میں مصروف تھا کہ اس دار فانی سے چل بسا۔ پھر یہ ذمہ داری کیپٹن ڈائیٹن پروبن کو سونپ دی گئی یہ وہی کیپٹن ہے جو بعد میں آگے چل کر فیلڈ مارشل ڈائیٹن پروبن کے نام سے برطانوی فوج کا مشہور جرنیل بنا۔ اس کو یہ اعزاز بھی حاصل ہوا کہ اس نے دو بار وکٹوریہ کراس (ڈبل وی سی۔ بار) حاصل کیا۔ چونکہ یہ رسالہ اس کے دور اور نگرانی میں تشکیل پایا لہٰذا اس کو اس کے نام سے ہی منسوب کیا گیا۔ یعنی پروبن ہارس — ساہیوال کا مشہور گاؤں پروبن آباد اسی رجمنٹ کی نسبت سے ہے اور اس کی ملکیت ہے اور اسی گاؤں میں اس رجمنٹ کے گھوڑے پالے جاتے ہیں۔

ہمارے خاندان کے ایک بزرگ نواب نظام الدین خان پروبن ہارس کے سب سے پہلے ہندوستانی رسالدار میجر مقرر ہوئے اس زمانے میں چونکہ باقاعدہ کمیشن تو ملتا ہی نہیں تھا لہٰذا یہ عہدہ ہی بہت زیادہ قابلِ ذکر تصور کیا جاتا تھا، البتہ بعد میں ان کو آنریری کیپٹن مقرر کیا گیا اور ۱۸۵۸ء کے بعد جب ملکہ وکٹوریہ کو ہندوستان کی ملکہ بھی مقرر کیا گیا تو اس کو یہ شوق چرایا کہ بکنگھم پیلس میں کچھ ہندوستانی سٹاف بھی رکھا جانا چاہیئے لہٰذا جو سٹاف اس کے لیے منتخب ہوا، اس میں نواب نظام دین خان آنریری کیپٹن کو ملکہ وکٹوریہ کے اے ڈی سی کے طور پر ہندوستان سے بھجوایا گیا اور وہ اس منصب پر دو تین سال بڑے احسن طریقے سے اپنے فرائض انجام دیتے رہے۔ پروبن ہارس کے ہال میں آج بھی نواب نظام دین خان کی قد آدم تصویر آویزاں ہے بلکہ ان کا یونیفارم بھی ایک تاریخی اثاثہ اور یادگار کے طور پر محفوظ کیا گیا۔ بعد میں میرے ایک ماموں کرنل نجم الدین مرزا نے بھی اس رجمنٹ کی کمان کے فرائض انجام دیئے اور میرے والد مرحوم ۱۹۲۸ء میں دو سال کے لیے پروبن ہارس کے ساتھ

بطور آفیسر منسلک رہے۔ کیونکہ انگریز حکمرانوں کی روایت تھی کہ وہ روساء کی اولاد کو خاندانی رجمنٹوں کے ساتھ کچھ عرصہ کے لیے وابستہ کر دیتے تھے تاکہ ان خاندانوں اور رجمنٹوں کے باہمی تعلقات اور روابط استوار رہیں۔ واضح رہے کہ جنرل حاجی افتخار، جنرل یوسف اور جرنل گل حسن، جنرل شمشں کلو، جنرل شاہ رفیع عالم وغیرہ کا تعلق اسی رجمنٹ سے ہے۔ یہ ہماری خاندانی رجمنٹ ہے، اس کی تشکیل کے کاغذات آج بھی ہمارے خاندان کی تحویل میں ہیں۔

اپنے خاندان کا پس منظر بیان کرنے کے بعد اب میں پورے وثوق اور اعتماد سے یہ بات کہہ سکتا ہوں کہ ہم لوگ ایسے نواب نہیں جن کو انگریز آقاؤں نے مخصوص خدمات کے عوض میں جاگیریں اور مربعے دے کر نوابوں کی صف میں لا کھڑا کیا تھا۔ ہم انگریز کے ڈپٹی کمشنر اور سپرنٹنڈنٹ پولیس کی رپورٹوں کی بنیاد پر نواب نہیں بنے بلکہ تقریباً ساڑھے چار سو سال سے نوابی ہمارے خاندان میں چلی آ رہی ہے۔ جو ہمیں اپنے کردار اور جرأت رندانہ کی وجہ سے حاصل ہوئی اور جس کو خود انگریزوں نے تسلیم کیا۔

مجھے اس حقیقت پر بڑی حد تک اطمینان ہے کہ برصغیر کی سیاسی، ادبی اور فکری تحریکوں میں جن مسلمان اکابرین نے نمایاں اور گرانقدر خدمات انجام دیں ان سے میرا کسی نہ کسی طور ناتہ اور تعلق بنتا ہے۔ لیکن میں ایک بات کی وضاحت کرنا ضروری سمجھتا ہوں اور وہ یہ کہ مجھے اس نسبت پر خدا کا شکر ہے میں اس کے حضور سراپا تشکر ہوں کہ اس کی رحمتوں کے طفیل میں برصغیر کے ایک ممتاز اور معزز خاندان میں پیدا ہوا لیکن جہاں تک اس نسبت پر فخر یا احساس برتری کرنے کا تعلق ہے تو میں خود کو اس بارے میں بالکل الگ تصور کرتا ہوں۔

ساری دنیا جانتی ہے کہ میں نے اپنی سیاست کے باب میں کبھی اپنے خاندانی افتخار اور برتری کو مرکز نہیں بنایا۔ میں نوابوں اور جاگیرداروں کے خاندان سے تعلق رکھنے کے باوجود خود کو ایک عام انسان سمجھتا ہوں اور عام شہری کے مسائل کا حل ہی میری سیاست کا مرکزی نقطہ ہے یعنی میں عام کسان، مزدور، محنت کش، تانگے والے، نان، رکشا والے اور غریب آدمی کے ساتھ زیادہ منسوب رہنے کا متمنی اور خواہاں ہوتا ہوں۔

میرے آبائی شہر قصور کی ایک عظیم صوفی اور بزرگ ہستی بابا بلھے شاہ ہیں جو کسی تعارف کے

محتاج نہیں، اپنی عوام دوست سیاست اور فقیرانہ طرز فکر و عمل کے حوالے سے سیاسی حلقوں میں مجھے بابا بلھے شاہ کا ملنگ بھی کہا جاتا ہے۔

میں بڑے اعتماد اور وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ میرے خون کی گردش اور قوت میں ان عظیم ہستیوں کا اثر اور مزاج موجود ہے جنہوں نے برصغیر پاک و ہند کے سیاسی و فکری افق پر انقلابی کردار ادا کیا اور یہی وہ احساس ہے جو مجھے ہمیشہ زندگی میں آگے کی طرف بڑھنے اور مسلسل پیش رفت کرنے پر مائل کرتا رہا ہے۔ جبر اور گھٹن کے انتہائی نامساعد حالات میں، میں نے سچائی کی آواز اٹھانے کی جو جرأت کی میرے خیال میں وہ اسی خاندانی پس منظر اور نسبت کا منطقی نتیجہ ہے۔

میں اور میرے بھائی

میرے والدین کی شادی خانہ آبادی کے بعد اللہ تعالیٰ نے ان کو یکے بعد دیگرے چھ بیٹوں سے نوازا۔ میرے سب سے بڑے بھائی کا نام صاحبزادہ سکندر حیات خان ہے۔ انہوں نے ۱۹۵۲ء میں مقابلہ کا امتحان پاس کر کے پاکستان کی سول سروس اختیار کی اور آج کل ایڈیشنل سیکرٹری کے عہدے پر فائز ہیں اور انکم ٹیکس ٹریبونل کے سب سے سینئر ممبر ہیں۔ اپنے مضبوط کردار، جرأت مندانہ رویہ اور بہترین انتظامی صلاحیتوں کی بنا پر ان کی شخصیت بیوروکریسی کے حلقوں میں خوب جانی پہچانی جاتی ہے۔ ان کے بارے میں لوگوں کا تاثر ہے کہ وہ اپنے سرکاری امور میں کسی سے کسی قسم کا سمجھوتہ یا رو رعایت نہیں برتتے اور خلاف ضابطہ کوئی کام نہیں کرتے۔ یہ ایک عجیب اتفاق بلکہ ستم ظریفی ہے کہ ان کی ان تمام صلاحیتوں کے ہر سطح پر اعتراف کے باوجود ان کو کوئی ایسا مقام نہیں دیا جا رہا، جس کے وہ بجا طور پر حقدار ہیں۔ شائد اس کا ایک سبب یہ ہو کہ بعض لوگ صاحبزادہ کی انصاف پسندی اور غیر جانبداری سے خوفزدہ ہوں۔

میرے دوسرے بڑے بھائی صاحبزادہ میجر علی رضا خان ہیں جنہوں نے ۱۹۵۱ء میں کمیشن حاصل کیا۔ پاکستان ملٹری اکیڈمی میں قائداعظم بنیر ہولڈر تھے اور ان کے ساتھی سکواڈرن کیڈٹ تھے آگے چل کر لیفٹیننٹ جنرل شمس کلو کے نام سے مشہور ہوئے اور دوسرا اسکواڈ کیڈٹ بریگیڈیئر افضل خان، کہنے کا مقصد یہ ہے کہ وہ بھی ایک جیالا اور بانکا فوجی افسر تھا لیکن

اپنی صاف گوئی اور راست بازی کے باعث وہ ترقی سے "محروم" رہے۔ ان کی اصول پسندی کی اس سے بڑی کیا مثال دی جا سکتی ہے کہ ۱۹۷۱ء کی جنگ کے بعد جن چند لوگوں نے استعفے پیش کیے ان میں یہ بھی شامل تھے۔ لاہور چھاؤنی میں انہوں نے جنرل گل حسن کو اپنا استعفیٰ براہ راست پیش کرتے ہوئے احتجاجاً کہا تھا۔

General! Twice I have been deceived in uniform. I don't want to be deceived third time. I want to lay off this burden. I want to go home and join my people so that I can give vent to my feelings.

میرے تیسرے بھائی صاحبزادہ خضر حیات خان ہیں وہ ضلع قصور کی ایک معروف اور ہر دلعزیز سماجی شخصیت ہیں، علاقہ کے ہر قریہ اور ہر گاؤں میں لوگوں کی ایک بڑی تعداد ان کی مداح ہے۔ موصوف نے پندرہ سولہ سال کی عمر میں سے ہی سوشل ورک شروع کر دیا تھا۔ تقسیم ہند کے وقت وہ بھی نوعمر ہی تھے لیکن انہوں نے انسان دوستی اور ہمدردی کے جذبہ کے تحت ایک کیمپ، ہسپتال قائم کیا اور ڈاکٹروں کی کمی کے باعث بعض اوقات خود ہی مریضوں کو سنبھالنے لگ جاتا۔ اس کے بعد جب بھی ہنگامی صورت حال ہوئی اور سرحدوں پر جنگ کے بادل اُمڈے، خضر حیات خان نے علاقہ کے لوگوں کو محفوظ مقامات پر پہنچانے کے لیے سر دھڑ کی بازی لگا دی تھی کہ جنگ کے علاقہ یعنی زیرو لائن سے وہ پاک فوج کے شہیدوں کی جسدِ خاکی اٹھا کر لاتے رہے اور ان کو پورے احترام اور اہتمام سے سپردِ خاک کرتے رہے یہ ان کی عوامی شخصیت کا ایک کمال ہے کہ دونوں جنگوں کے دوران میں انہوں نے قصور شہر کے اندر چوری کی ایک واردات نہیں ہونے دی۔ چنانچہ گزشتہ الیکشن میں انہوں نے ایم این اے کی نشست کے لیے حصہ لیا تو قصور شہر میں انہیں چودہ ہزار ووٹ کی سبقت رہی مگر یار لوگوں نے دیہات میں اور خصوصاً خواتین کے پولنگ اسٹیشنوں پر دھاندلی کر کے بظاہر انہیں ہرا دیا۔ یہاں میں یہ بھی بتاتا چلوں کہ خضر حیات نے اپنی درویشانہ روش پر چلتے ہوئے الیکشن میں ایک پیسہ خرچ نہیں کیا اور صرف خدا پر توکل اور عوام سے محبت پر بھروسہ کیا۔
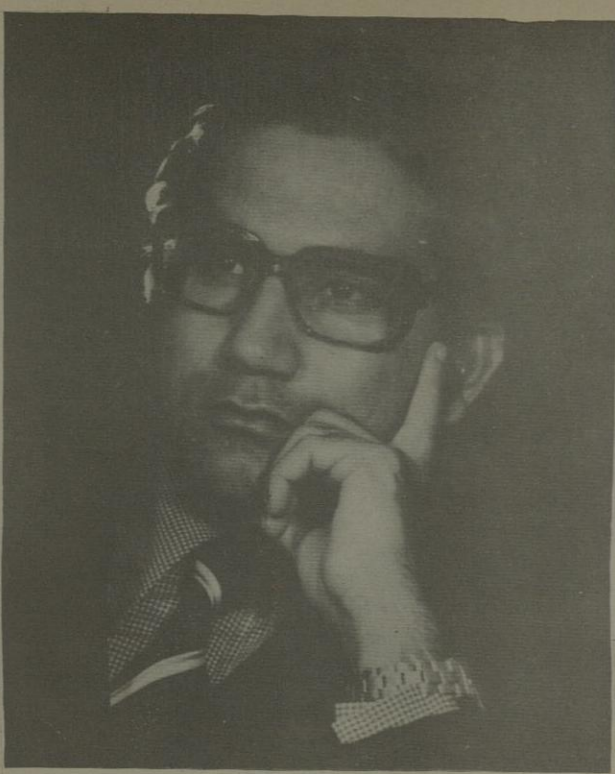
بنگلہ دیش "ادھر ہم ادھر تم" کے نعرے کی پیداوار ہے، احمد رضا قصوری

روس اور بھارت پان اسلامزم کی تحریک سے بوکھلا اٹھے تھے

ملتان ۵ نومبر (نمائندہ خصوصی) قومی اسمبلی کے رکن مسٹر احمد رضا قصوری نے کہا ہے کہ بنگلہ دیش کو تسلیم کرنا قائد اعظم کے گلشن کو دو ٹکڑے کرنا ہے۔ گذشتہ روز بار ایسوسی ایشن سے خطاب کرتے ہوئے انہوں نے کہا کہ اسلامی نظریات پر قائم پاکستان سے پان اسلام ازم کی جو تحریک اٹھی اس نے روس کو چونکا دیا، روس میں پانچ مسلم ریاستیں ہیں اور اس کو خطرہ پیدا ہوا کہ اسلامی نظریات کی یلغار ٹینکوں اور توپوں سے بھی نہ رکے گی۔ اور آدھے سے زیادہ روس اس کی لپیٹ میں آجائے گا۔ بھارت کو یہ خطرہ پیدا ہو گیا ہے کہ اسلامی مملکت پاکستان میں اگر ایک قائد اعظم اور پیدا ہو گیا تو بھارت کے دس کروڑ مسلمان غلام نہیں رہ سکیں گے احمد رضا قصوری نے کہا کہ روس اور بھارت نے اکٹھے مل کر اس اسلامی مملکت کو دو ٹکڑوں میں تقسیم کر دیا۔ اور ہم نے بھی "ادھر تم ادھر ہم" کا نعرہ لگا کر انہیں موقع دیا کہ وہ اپنی توپوں اور ٹینکوں سے مشرقی پاکستان کو فتح کر لیں۔ انہوں نے کہا کہ ہم بنگلہ دیش کو کبھی تسلیم نہیں کریں گے۔ اور اس کے خلاف جدوجہد جاری رکھی جائے گی سابق مرکزی وزیر قانون میاں محمود علی قصوری نے بار سے خطاب کرتے ہوئے بنگلہ دیش سے متعلق سوالات کا جواب دینے سے انکار کر دیا انہوں نے کہا کہ وہ آئین کے متعلق عوام کی رائے عامہ بیدار کرنے آئے ہیں وزیر اعظم کو آئینی سمجھوتہ کی رو سے جو لامحدود اختیارات دیئے گئے ہیں اس سے یہ آئین نہ تو پارلیمانی رہا ہے اور نہ فیڈرل۔

۱۹۶۸ء میں لاہور ایئر پورٹ پر بھٹو کی آمد۔

احمد رضا قصوری اور حفیظ قریشی ایڈووکیٹ نمایاں ہیں

۱۹۷۴ء میں گلاسیکو کے لارڈ میئر اور مقامی ممتاز پاکستانی جناب بشیر مان مصنف کے ساتھ۔

۲۲ جون ۱۹۶۶ء کی ایک یادگار تصویر، جب مسٹر بھٹو ایوب خان کی وزارت سے نکالے جانے
کے بعد لاڑکانہ جاتے ہوتے ریلوے مال گودام میں رُکے اور وہ اس وقت زار و قطار رو رہے تھے۔
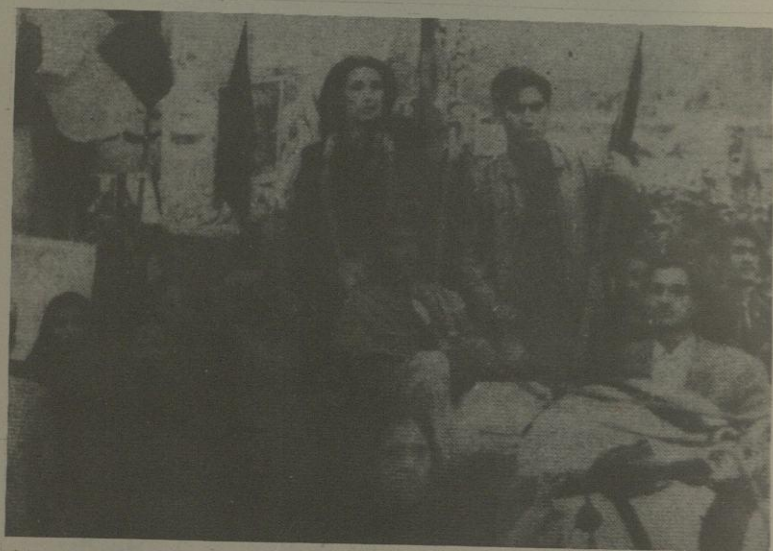
فروری ۱۹۶۹ء میں شاہراہ قائداعظم لاہور پر بھٹو کی رہائی کے لیے
ایک جلوس کی قیادت کرتے ہوتے احمد رضا قصوری اور بیگم بھٹو۔

نواب آف کالا باغ کے عہد کی یادگار یونیورسٹی آرڈی ننس کا کالا قانون
کے خلاف احتجاج کے دوران ممتاز طالب علم لیڈر مرحوم بارک اللہ خان
اور احمد رضا قصوری کو الفلاح بلڈنگ شاہراہ قائداعظم لاہور
پر پولیس گرفتار کر رہی ہے۔ ۳ نومبر ۱۹۶۳ء

کالے قانون یونیورسٹی آرڈی ننس کے خلاف تحریک۔
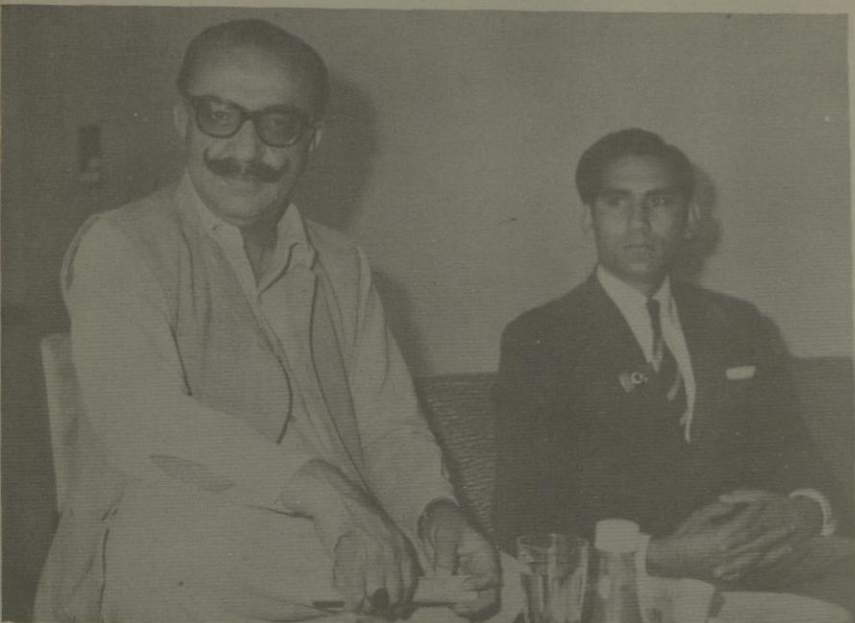
۱۹۶۸ء گجرات میں رسول بخش تالپور اور مصنف
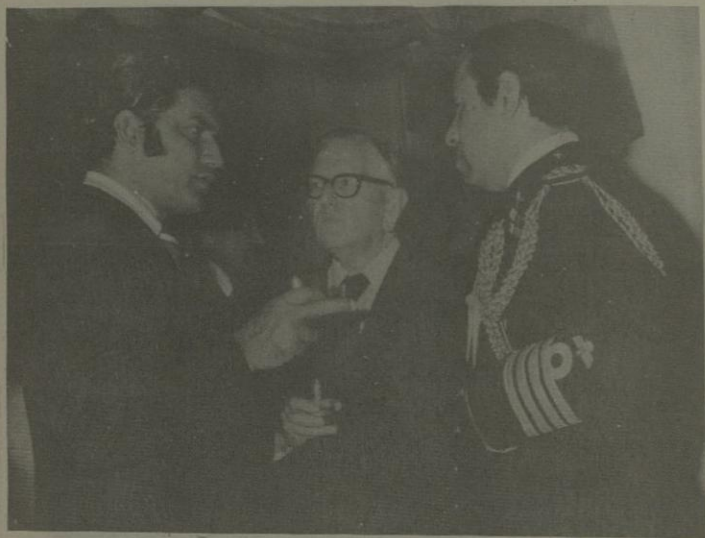
۱۹۷۶ء میں یوم پاکستان کی ایک تقریب پاکستانی سفارت خانہ لندن۔
ایڈمرل طارق کمال خان اور مصنف۔

اپریل ۱۹۷۶ء میں میکسیکو قومی اسمبلی کے پارلیمانی وفد میں پاکستان کی نمائندگی کرتے ہوئے مسٹر امین الحق
سیکرٹری نیشنل اسمبلی احمد رضا خان، ملک انور علی نون، راجہ بھٹی انٹر پارلیمنٹ یونین کانفرنس میں۔

افواج پاکستان میں مشہورِ زمانہ (5TH PRODYNS HOURSE) کی
سو سالہ تقریبات میں جنرل محمد موسیٰ خان، نواب محمد احمد خان۔ جنرل حاجی افتخار۔

میرے چوتھے بھائی صاحبزادہ شبیر علی خان ایڈووکیٹ ہیں۔ مجھے اعتراف ہے کہ وہ میرے بھائی ہونے کے ساتھ ساتھ میرے سیاسی ساتھی بھی ہیں۔ انہوں نے میرے سیاسی سفر میں ہر قدم پر پوری استقامت اور اعتماد کے ساتھ میرا ساتھ دیا۔ آزمائش اور ابتلا کی ہر گھڑی اور مرحلہ پر وہ میرے شانہ بشانہ رہے۔ وہ سپریم کورٹ کے وکیل ہیں اور لاہور میں پریکٹس کرتے ہیں۔

میرا پانچواں نمبر ہے اور میرے چھوٹے بھائی صاحبزادہ مصطفےٰ خان قصوری ہیں۔ وہ ہماری آبائی جائیداد کوٹ ناصر خان (جو ہمارے لکڑدادا کے نام سے مشہور ہے) اور ساہیوال میں موجود خاندانی اراضی کی نگہداشت اور دیکھ بھال کرتے ہیں۔ وہ بڑے ترقی پسند کاشتکار ہیں اور ان کی شادی معروف شاعر جمیل الدین عالی کی بڑی صاحبزادی حمیرا سے ہوئی ہے۔ ویسے بھی جمیل الدین عالی صاحب ہمارے خالو ہوتے ہیں اور ان سے ہمارا قریبی خاندانی رشتہ ہے اور لوہارو خاندان کے مایہ ناز چشم و چراغ ہیں۔

میں پورے اعتماد اور وثوق کے ساتھ برملا کہہ سکتا ہوں کہ ہمیں گھر کا ماحول انتہائی مثبت، خوشگوار اور حوصلہ افزا میسر آیا۔ والدین نے ہماری ہر خواہش پوری کی اور حقیقت تو یہ ہے کہ ہم کو بچپن میں کسی مرحلہ پر محرومی یا کسمپرسی کا کوئی حقیر سا تجربہ بھی نہیں ہوا۔ ہمیں بہترین تعلیم دلائی گئی۔ ہمارے والدین ہمارے لیے شفقت اور ایثار کا ایک پیکر بنے رہے اور جب ہم نے ذرا ہوش سنبھالا تو وہ ہم سے ہمارے دوستوں کی طرح پیش آنے لگے اور زندگی کے ہر معاملہ میں ہم ان کی راہنمائی اور مشورہ کے طلبگار رہتے تھے۔

حقیقت تو یہ ہے کہ میری والدہ کی شخصیت بڑی دل آویز اور ولولہ انگیز تھی۔ وہ بڑی ہمہ صفت اور متاثر کرنے والی خاتون تھیں اور میری شخصیت میں جو ایک جرأت رندانہ ہے وہ میری والدہ سے ہی مجھے حصہ میں ملی ہے۔ میں پورے وثوق کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ میری والدہ کی زندگی کی کتاب میں خوف و ہراس جیسا کوئی لفظ نہیں تھا بلکہ وہ اس کے مفہوم سے نا آشنا تھیں۔

بچپن اور تعلیم

سکول سے کالج تک

میری ولادت ۲ ستمبر ۱۹۳۸ء کو حضرت بابا بلھے شاہ کی نگری سوہنے شہر قصور میں ہوئی۔ بچپن کے ایام قصور ہی میں گزارے۔ میری والدہ نے قصور ہی میں مجھے ایک عام سے (ٹاٹ برانڈ) سکول میں داخل کرا دیا۔ حالانکہ جیسا کہ میں عرض کر چکا ہوں کہ میرے والد تو چیفس کالج کے پڑھے ہوئے تھے۔ دراصل میری

والدہ نے قصداً مجھے اور میرے بھائیوں کو مقامی پرائمری سکولوں میں اس لیے داخل کرایا کہ ان کے خیال کے مطابق ہمارا گھر کا ماحول جہاں ہمارا بیشتر وقت گزرتا تھا وہ خاصا امیرانہ ہے۔ لہذا اگر یہ بچے عوامی سکولوں میں جائیں گے تو یہ عام آدمی کی زندگی اور ماحول سے بخوبی واقف ہو سکیں گے اور یہ تجربہ ان کو مستقبل میں ان مسائل کو حل کرنے میں بڑی مدد دے گا۔ میں پورے وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ میری والدہ واقعی ایک انقلابی ذہن رکھنے والی خاتون تھیں جنہوں نے آنے والے وقت کا ادراک اور اندازہ بخوبی کر لیا تھا۔ شاید اس کی بنیادی وجہ یہ بھی تھی کہ انہوں نے جس گھر میں آنکھ کھولی اور پرورش پائی وہاں تاریخ تشکیل پا رہی تھی اور ان کا ماحول ایسا تھا جہاں آنے والے دنوں کی چاپ با آسانی سنی جا سکتی تھی۔ چنانچہ ان کی ایک شدید خواہش یہ بھی تھی کہ ان کا کوئی ایک بیٹا اپنے ننھال کے نقش قدم پر چلے یعنی عوامی شخصیت بنے۔ یہی وجہ ہے کہ جب میں نے اپنے طور پر سیاسی میدان میں اترنے کا فیصلہ کیا تو میری والدہ نے از حد مسرت کا اظہار کیا اور وہ یہ بھی نہیں چاہتی تھی کہ ان کی ساری اولاد سرکاری ملازمت اختیار کرے اور عمر بھر بیوروکریٹ بنی رہے۔

مجھے سکول کے زمانے کا ایک واقعہ یاد ہے۔ ہمارے ایک سکول ٹیچر (ماسٹر) سردار علی صاحب ہوا کرتے تھے۔ انہوں نے مجھے دوسرے عام بچوں میں گھلنے ملنے نہیں دیا۔ وہ مجھے کلاس سے اٹھا کر ہیڈ ماسٹر کے کمرے میں لے جاتے اور وہاں ایک کرسی پر بٹھا کر مجھے پڑھانے لگے۔ جبکہ سکول کے دوسرے تمام بچے فرش پر ٹاٹ پر بیٹھ کر سبق یاد کیا کرتے تھے۔ یہ سلسلہ چند دن تک جاری رہا۔ ایک دن میرے والد سکول تشریف لائے اور جب انہوں نے دیکھا کہ مجھے ماسٹر سردار صاحب نے ہیڈ ماسٹر کے کمرے میں کرسی پر بٹھا رکھا ہے تو انہوں نے ماسٹر صاحب سے اس کی وجہ دریافت کی۔ ماسٹر صاحب نے جواباً کہا: حضور جماعت کا ماحول اچھا نہیں اور ایسا ہرگز نہیں کہ آپ کا صاحبزادہ وہاں عام لڑکوں کے ساتھ بیٹھ سکے لہذا اسے ان سب سے الگ رکھنے کے لیے میں اس کو یہاں بٹھا کر پڑھاتا ہوں۔ یہ سن کر میرے والد نے بڑی سنجیدگی سے کہا: ایسا کر کے آپ میرے بچے کی شخصیت کی نشوونما میں کوئی مدد نہیں کر رہے۔ میں نے تو اپنے بچوں کو اس سکول میں داخل ہی صرف اس لیے کرایا کہ وہ یہاں آ کر ٹاٹ پر بیٹھیں اور زندگی کو قریب سے دیکھ کر محسوس کر سکیں اور ان کو عام بچوں کی مشکلات کا احساس ہو۔ آپ مہربانی کر کے اسے اس کی کلاس کے کمرے ہی میں بٹھایا کریں۔

پھر ایک اور واقعہ یاد آتا ہے۔

ہمارے ایک ہندو ٹیچر (ماسٹر) رام داس ہوا کرتے تھے جو مجھے گھر پر آکر ریاضی کی ٹیوشن پڑھایا کرتے تھے۔ کیونکہ اس مضمون میں، میں ذرا کمزور تھا۔ وہ مجھے کئی دن سے ایک پہاڑہ یاد کرا رہے تھے جو مجھے یاد نہیں ہو رہا تھا۔ چنانچہ ماسٹر رام داس نے مجھے سزا دینے کے لیے مرغا بن جانے کا حکم دیا میں مجبوراً مرغا بن گیا اور پہاڑہ دہرانے لگا۔ جب میں تکلیف کے مارے ذرا نیچے جھکنے لگتا تو وہ فوراً میری کمر پر چھڑی کی ایک ضرب لگاتے اور کہتے: اوپر ہو جاؤ، اسی دوران میں، میں نے اپنے والد کے قدموں کی چاپ سنی، وہ ادھر ہی آرہے تھے جہاں ماسٹر صاحب مجھے مرغا بنا کر پہاڑہ یاد کرا رہے تھے میرا خیال تھا کہ اب جب وہ ادھر آئیں گے تو ضرور ماسٹر صاحب سے پوچھیں گے کہ انہوں نے مجھے یعنی احمد رضا قصوری کو مرغا کیوں بنا رکھا ہے۔ میں نے محسوس کیا کہ ماسٹر صاحب بھی کچھ پریشان سے ہو گئے۔ اس دوران میں میرے والد کے قدموں کی چاپ اور زیادہ نزدیک ہو گئی اور یقین کیجیے میرے والد بڑے وقار اور رعب سے اپنے نپے تلے قدم اٹھاتے، میرے نزدیک سے خاموشی سے گزرتے ہوئے اندر دالان میں چلے گئے۔ انہوں نے ماسٹر صاحب سے اس سلسلہ میں بات کرنا تو الگ۔ میری طرف بھرپور نظر سے دیکھنا تک مناسب خیال نہیں کیا۔

مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ ماسٹر رام داس کو اس زمانے میں پانچ روپے بطور ٹیوشن فیس ملتے تھے جس میں سے وہ ڈیڑھ دو روپے ہمیں ہی کھلا دیا کرتے تھے۔ تقسیم ہند کے وقت میں اگرچہ کم عمر ہی تھا مگر میں نے قصور شہر میں قتل و غارت کے بعض مناظر دیکھے اور پھر لٹے پٹے قافلوں کو آتے بھی دیکھا یہ سب کچھ میرے ذہن میں آج بھی محفوظ ہے اور میں کئی بار انہیں یاد کر کے سوچتا ہوں کہ کیا حضرت انسان اس حد تک۔ درندگی اور ظلم کا مظاہرہ بھی کر سکتا ہے اور پھر میرا ایمان اس بات پر مزید مضبوط اور پختہ ہو جاتا ہے کہ واقعی انسانیت اور درندگی میں بس ایک بال برابر فرق موجود ہے۔ اگر انسان اپنے مقام سے بال برابر ہٹ جائے تو وہ وحشی انسان ہو جاتا ہے۔

ان ہی پرآشوب دنوں کی بات ہے ایک دن میں اور میرے والدات کے وقت دریائے ستلج کے پل کی طرف جا رہے تھے کہ ایک قافلے کی آمد کی اطلاع ملی۔ ظاہر ہے اس کے لیے فوری طور پر

انتظامات کرنے تھے۔ میرے والد جیپ میں بیٹھے اور اس طرف روانہ ہو گئے ان کے پیچھے دو تین ٹرک تھے جن میں بستر اور کھانے پینے کا سامان تھا۔ جب ہم لوگ دریائی علاقے کی طرف بڑھے تو اچانک ایک طرف سے سرکنڈوں کے جھنڈ میں سے سرسراہٹ کی آوازیں سنائی دیں۔ میرے والد نے جیپ روک لی اور جب ہم آگے بڑھے اور روشنی پھینکی تو میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے کہ وہاں چند بے آسرا اور مصیبت زدہ خواتین و بچے تھے جن کے تن پر مناسب کپڑے بھی نہیں تھے۔ بچے سردی سے ٹھٹھر رہے تھے اور عورتوں نے انہیں بمشکل اپنے ساتھ لپٹا رکھا تھا۔ خوف، تکلیف اور سردی کے مارے ان پر ایک طرح کی غنودگی بلکہ بے ہوشی طاری تھی۔

میرے والد نے آگے بڑھ کر بڑی شفقت اور محبت کے ساتھ پہلے تو ان کو لحاف اور کپڑے دیئے اور پھر انہیں گرم گرم دودھ کے پیالے دیئے۔ کچھ دیر بعد ان کو ذرا ہوش آیا تو انہوں نے خوف اور بے یقینی کے عالم میں پوچھا ؛ ہم کہاں ہیں، آپ لوگ کون ہیں؟ یہ سن کر میرے والد نے کہا ؛ تم فکر نہ کرو، اب تم لوگ محفوظ ہو، تم پاکستان میں ہو، تب ان آفت زدہ لوگوں نے جس طرح خدا کا شکر ادا کرتے ہوئے میرے والد کو دعائیں دیں اور جیسے انہوں نے اپنے نئے ملک پاکستان کی خیر کی دعائیں مانگیں۔ وہ سب ناقابل بیان ہیں۔ یہ ایسا جذباتی اور رقت انگیز منظر تھا کہ میں اس کو آج تک فراموش نہیں کر سکا۔

اور بھی ایسے بے شمار واقعات ہیں کہ اگر میں بیان کرنے لگوں تو سننے والے حیران رہ جائیں، میں بیان نہیں کر سکتا کہ پاکستان بنانے میں ہم نے کیا کیا دیکھا، لوگ کیسے کیسے آگ اور خون کے سمندر کو پار کر کے اس دھرتی تک پہنچے، انہوں نے اپنی جان اور جسم پر کیسے کیسے زخم سہے، اور کیسے ایک ہلالی پرچم کے لیے لوگوں نے اپنی زندگی بھر کی متاع اور عمر بھر کے خواب قربان کر دیئے۔ یہ سب کچھ میں نے ایک نوعمر بچے کی حیثیت سے اپنے والد کے ہمراہ اپنی آنکھوں سے دیکھا۔

پاکستان، اسلام اور آزادی کا جو مفہوم مجھے ۱۹۴۷ء میں لٹے پٹے اور بے آسرا قافلوں کو دیکھ کر معلوم ہوا وہ مجھے ساری عمر یاد رہے گا۔ اس یاد اور احساس ہی نے مجھے آگے چل کر اپنے محبوب وطن کی خدمت اور اس کے غریب عوام کے لیے کچھ کر گزرنے کا ایسا جذبہ اور ہمت عطا کی جو میری زندگی کا سب سے قیمتی اثاثہ اور عظیم متاع ہے۔ ان دنوں ہی مجھے احساس ہوا کہ برصغیر کے غریب مگر غیور

مسلمانوں نے اپنے وطن اور اپنی آزادی کے لیے کیسی بے مثال اور عظیم قربانیاں دی ہیں، وہ ایک عرصہ تک ہندوؤں کے استبداد اور انگریز کی غلامی کا نشانہ بنے رہے مگر جب وہ قائداعظم کی ولولہ انگیز قیادت میں ایک عظیم مقصد اور نصب العین کے لیے متحد ہو کر اٹھ کھڑے ہوئے تو کیسے دیکھتے ہی دیکھتے ایک شاعر کا خواب حقیقت کا روپ دھار گیا اور کیسے دنیا کے نقشہ پر ایک عظیم اسلامی مملکت کا نقشِ جمیل ابھرا۔ میں نے یہ بھی جان لیا کہ پاکستان دنیا بھر کے مسلمانوں کے لیے ایک دارالامان اور امن کدہ ہے اور یہ ایک عظیم اسلامی اتحاد اور ہندوستان کے مسلمانوں کے لیے ڈھال اور وحدت کے لیے نکتہ آغاز ثابت ہوگا۔ یعنی یہ پاکستان پورے عالم اسلام کا قلعہ اور حصار ثابت ہوگا۔

میں آج بھی پورے صدقِ دل کے ساتھ محسوس کرتا ہوں کہ پاکستان صرف ہمارا وطن ہی نہیں یہ ہماری شناخت ہے، ہمارا حوالہ ہے، ہماری پہچان ہے، ہمارا تعارف ہے، ہمارا گھر ہے اور سچی بات تو یہ ہے کہ ہماری جان ہے اس کے بغیر ہماری زندگی کا کوئی تصور جنم لے ہی نہیں سکتا۔ یہ بات اپنی جگہ درست اور صحیح ہے کہ پاکستان بنا تو کئی گھر اجڑ گئے اور بے شمار خاندان ایسے تباہ ہوئے کہ قیامت تک کے لیے ان کی دہلیزوں پر تالے پڑ گئے لیکن اس صورت حال کو یوں دیکھنا ہوا کہ انقلاب ایسے ہی آتے ہیں، انقلاب بیک وقت تخلیق اور تباہی لاتا ہے، ہر زندہ قوم کو اپنے وجود اور اپنے تشخص کے لیے ایسی آزمائش اور دور ابتلاء کے مراحل سے بہر حال گزرنا ہی پڑتا ہے۔ مجموعی طور پر دیکھا جائے تو پاکستان کے قیام سے اس خطہ کے مسلمانوں کو ایک خود مختار اور آزاد ریاست کے اندر رہتے ہوئے اپنے نظریہ اور نصب العین کے حصول کے لیے جدوجہد کرنے کا ایسا موقع میسر آیا جس کے لیے نہ جانے دنیا کی کتنی قومیں ترستی ہیں۔ آج کوئی بھی شخص ذاتی حیثیت میں جو کچھ بھی ہے، خواہ وہ سیاست دان ہے یا استاد، صحافی ہے یا فنکار، جرنیل ہے یا بیوروکریٹ، کسان ہے یا ہنرمند، بہرحال جو کچھ بھی ہے ۔ یہ سب پاکستان کے صدقے اور طفیل میں ممکن ہو سکا ہے۔

یہاں یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ اگر پاکستان نہ بنتا تو آج کا جرنیل متحدہ ہندوستان کی آرمی میں صوبیدار میجر یا کوئی بہت زیادہ تعلیم یافتہ اور با اثر ہوتا تو کیپٹن یا میجر ہوتا، آج کا سیکرٹری دہلی کے سیکرٹریٹ میں آفس سپرنٹنڈنٹ ہوتا اور آج کا کروڑ پتی زیادہ سے زیادہ انار کلی کے چوک میں کھڑا سر مہ، برانده اور دندا سہ بیچنے کے لیے گلا پھاڑ پھاڑ کر آوازیں لگا رہا ہوتا اور اسی طرح آج کا سیاستدان

کسی رائے بہادر تولہ رام کی پارٹی کے جلسہ کے لیے دریاں اور قناتیں اٹھانے کا کام کر رہا ہوتا۔ بہرحال اس کے سوا کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ آج ہمیں جو عزت، شہرت اور امتیاز حاصل ہے وہ سب پاکستان کا مرہون منت اور اس کے توسط سے ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ میری اس سوچ کا مرکز میرے وہ مشاہدات اور تجربات ہیں جو اگرچہ تقسیم ہند کے وقت مجھے نسبتاً کم عمری میں حاصل ہوئے مگر جن کی شدت اور صداقت میں آج بھی کوئی کمی نہیں آئی اور جن سے انحراف کرنے کا مجھے کبھی بھی حوصلہ نہیں ہوا۔

میں اپنی بات کو یوں بھی کہنے کی کوشش کروں گا کہ میں نے بچپن ہی میں لوگوں کو پاکستان کے لیے قربانیاں ہی نہیں بلکہ اپنا سب کچھ نچھاور کرتے دیکھا ہے اور پھر ان لوگوں کو انتہائی کسمپرسی اور مایوسی کے عالم میں جس طرح اپنے وطن کی تعمیر کے لیے کمربستہ دیکھا ہے۔ میں نے سرحد پار کر کے پاک سرزمین کو بوسہ دینے والوں کی اشکبار آنکھوں میں لازوال چمک دیکھی جو اس امر کی مظہر تھی کہ سب کچھ لٹا کر بالآخر وہ اپنے گھر پہنچ گئے ہیں جہاں سب کچھ ان کا اپنا ہے۔ ان کے لیے آزادی کی نعمت اور تشخص کی عظمت ہے ۔! ان کے اس احساس کو دیکھنے کے بعد مجھے بچپن ہی سے پاکستان برصغیر بلکہ دنیا بھر کے مسلمانوں کے اتحاد کا مظہر محسوس ہونے لگا اور میں نے اس کی خدمت کے لیے خود کو کمربستہ کرنے کا ارادہ کر لیا۔

۱۹۴۸ء میں ہمارا گھرانہ قصور سے نقل مکانی کر کے لاہور چلا آیا۔ میرے بڑے بھائی اس وقت گورنمنٹ کالج میں پڑھتے تھے اور ہاسٹل میں مقیم تھے۔ میرے والدین کا خیال تھا کہ اب بچے بڑے ہو رہے ہیں اور ان کو لاہور ہی میں حصول تعلیم کے لیے ٹھہرنا ہوگا لہٰذا اپنے بچوں کی سہولت کو مدِنظر رکھتے ہوئے انہوں نے لاہور منتقل ہونے کا فیصلہ کر لیا تھا۔

لاہور آنے کے بعد شروع میں ہم ۵/۳ ذیلدار پارک فیروزپور روڈ اچھرہ میں آباد ہوئے یہاں ہمارے گھر کے بالکل ساتھ ہی مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کا گھر تھا لیکن ان دنوں وہ جماعتی ہنگاموں اور سیاسی مجلس آرائی سے محفوظ تھے اور پوری یکسوئی کے ساتھ دینی امور میں مصروف رہتے تھے۔ ان کے بڑے بیٹے (غالباً فاروق مودودی) میرے ہم عمر تھے اور انہیں محلہ کے سب بچے گوگو میاں کہا کرتے تھے۔ ہم لوگ اچھرہ کے کھلے چٹیل میدان میں کڑی دوپہروں میں لکڑی کے تین ڈنڈے گاڑھ کر

ٹینس کی گیند سے کرکٹ کھیلا کرتے تھے۔

میں نے کئی بار دوسرے بچوں کے ہمراہ اس مسجد میں نماز ادا کی جہاں مولانا مودودی اپنے دو تین ساتھیوں کے ہمراہ آیا کرتے تھے۔ بارہا ہم نے انہیں سلام کیا اور انہوں نے ازراہِ شفقت ہمارے سروں پر ہاتھ پھیرا اور دعائیں دیں۔

مجھے یہاں نورالدین اسلامیہ ہائی سکول اچھرہ میں داخل کرا دیا گیا اور یہیں اس سکول میں آٹھویں کلاس تک پڑھتا رہا اور پھر میں یہ سکول چھوڑ کر سنٹرل ماڈل ہائی سکول میں چلا گیا۔ جو میٹرک کی سطح کی تعلیم کے لیے پورے پنجاب میں بے پناہ شہرت رکھتا تھا۔ یہاں مجھے خدا کے فضل و کرم سے بڑے محنتی اور قابل استاد میسر آ گئے لیکن میں خاص طور پر یہاں دو اساتذہ کا ذکر کروں گا ایک تو جناب شمشاد حسین لودھی جو ریاضی پڑھاتے تھے اور دوسرے عبدالعزیز جو ایم اے علیگ تھے اور وہ ہمیں انگریزی پڑھایا کرتے تھے۔ ان سے میں نے جو اکتسابِ علم کیا وہ آج بھی میرا سرمایہ ہے اور ان کی توجہ سے مجھے آگے چل کر علمی میدان میں بڑی حوصلہ افزائی میسر آئی۔ اپنے سکول کے زمانے میں مجھے کرکٹ کھیلنے کا شوق تھا اور میں اپنے سکول کی کرکٹ ٹیم میں شامل تھا میں نے اس دور میں کرکٹ کا کلر بھی حاصل کیا۔

یہاں مجھے اپنے سکول کے زمانے کا ایک قصہ یاد آ رہا ہے۔ کیونکہ میرا گھر سکول سے خاصا دور تھا لہٰذا میں دوپہر کا کھانا اپنے ساتھ ہی لے جایا کرتا تھا گھر پر ٹانی اور سویلے کے جو ڈبے خالی ہو جاتے تھے، میری والدہ انہیں سنبھال کر رکھ دیتی تھیں اور مجھے سکول جاتے وقت ایسے ہی کسی ایک ڈبے میں کھانا دے دیا کرتی تھیں جو میں سکول میں تفریح کے پیریڈ میں یعنی آدھی چھٹی کے وقت کھا لیا کرتا تھا، لیکن دو تین دن تک ایسا ہوتا رہا کہ جب میں کھانے کا ڈبہ نکالنے کے لیے بستہ میں ہاتھ ڈالتا تو وہاں کچھ نہ ملتا۔ ! دراصل مجھے سکول میں اور کلاس میں نیا لڑکا سمجھ کر کوئی ساتھی شرارت کر رہا تھا۔ تیسرے چوتھے دن میرے صبر کی انتہا ہو گئی تو میں نے قدرے غصہ سے اپنے ساتھی جاوید محمد علی (جو آجکل امریکہ میں سینئر انجینئر ہے) سے پوچھا، مگر اس نے لاعلمی کا اظہار کیا، میں نے تقریباً دانت پیستے ہوئے کہا، کوئی بات نہیں، چند دن کی بات ہے، جب میں یہاں ذرا سیٹ ہو گیا تو سب کو انگلیوں پر نچاؤں گا۔ تم لوگ جانتے نہیں میں کیا ہوں! یہ سن کر جاوید محمد علی نے شرارت

سے کہا: اچھا۔ پھر تم آپ سے ڈرنا چاہیے تم تو استاد پیڈرو نکلے۔

"استاد پیڈرو" کا پس منظر یہ ہے کہ دراصل یہ ایک انگریزی فلم کا مشہور کردار تھا جو ہر فن مولا تھا اور اس کے آگے سب لوگ پانی بھرتے تھے۔ فلم کا نام بھی یہی تھا اور جوان دنوں لاہور میں بڑی مقبول ہوئی تھی۔

جاوید نے مجھے استاد پیڈرو محض مزاحاً کہا تھا مگر دیکھتے ہی دیکھتے میں اسی خطاب سے اب جانا جانے لگا کہ لوگ میرا اصل نام بھول گئے اور میں سارے سکول میں استاد پیڈرو کے نام سے مشہور ہو گیا۔ ان ہی دنوں کی بات ہے، میرے والد نے میرے سکول آنے کا پروگرام بنایا تو میں نے ان سے کہا: جب آپ میرے سکول آئیں گے تو درختوں کے پتے بھی آپ کو میرا نام بتائیں گے؟ وہ ایک دن سکول آئے اور چند لڑکوں سے پوچھا' احمد رضا' کہاں ہے، مگر کسی نے تسلی بخش جواب نہ دیا بلکہ اکثر نے تو لاعلمی کا اظہار کر دیا۔ شام کو میں گھر واپس گیا تو والد صاحب نے مجھے بلایا اور سارا واقعہ سن کر کہا! تمہیں اس قدر جھوٹ بولنے کی بھلا کیا ضرورت تھی!

میں سارا معاملہ سمجھ گیا، میں نے پوچھا! آپ نے میرا نام کیا لیا تھا۔ تب وہ حیران ہو کر بولے۔ کیوں! میں نے احمد رضا ہی پوچھا تھا، میں نے ان سے فوراً کہا۔ بس یہی تو گھپلا ہو گیا۔ احمد رضا کو کوئی نہیں جانتا۔ آپ استاد پیڈرو کا پوچھتے اور پھر دیکھتے۔؟

اسی زمانے میں میرا ایک دوست عارف ہوا کرتا تھا۔ جو بعد میں سینئر سول سرونٹ ہوا اور آج کل غالباً ورلڈ بنک سے وابستہ ہے۔ ایک دوست اقبال معین ہوا کرتا تھا جو آج کل جوائنٹ سیکرٹری (انٹرنل فنانس) ہیں، یہ دونوں بڑے ذہین طالب علموں میں سے تھے۔

میں تعلیم پر توجہ تو دیتا تھا مگر میں کتابی کیڑا نہیں بن سکا اور نہ ہی میں ایسا بننا چاہتا تھا۔ میں کھیلوں اور دوسری غیر نصابی سرگرمیوں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا کرتا تھا۔

غرض وہ ایک خوبصورت اور سنہری دور تھا۔ جو اب تو ایک خواب محسوس ہوتا ہے۔ بے فکری اور بے پرواہی میں میٹرک کا زمانہ گزر گیا۔ یعنی میں میٹرک پاس کرنے کے بعد گورنمنٹ کالج لاہور کی تاریخی درس گاہ میں داخل ہو گیا۔

جب آتش جوان تھا

یہاں آکر مجھے ایک فوری اور بڑا فائدہ یہ ہوا کہ اس وقت میرے بڑے بھائی خضر حیات وہاں کے سینئر سٹوڈنٹ تھے اور کالج میں بڑے مقبول تھے۔ لہٰذا جہاں جاتا میرا تعارف بس یہی تھا: ان سے ملیے۔ یہ خضر حیات کے چھوٹے بھائی ہیں، مجھے اس سے بے حد خوشی ہوتی مگر میں نے جلد ہی کالج میں اپنا مقام اور تعارف بنا لیا۔ یہاں میں ایک دلچسپ حقیقت کی نشاندہی کروں (جو غالباً گورنمنٹ کالج کی تاریخ میں ایک منفرد ریکارڈ بھی ہوگا) ۱۹۴۵ء سے ۱۹۶۱ء تک یعنی تقریباً سولہ سترہ سال تک کے عرصہ میں ہم چھ بھائیوں میں سے ایک نہ ایک ضرور اس عظیم درس گاہ میں موجود رہتا۔

میں نے کالج کے مباحثوں اور تقریری مقابلوں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لینا شروع کر دیا، میں نے جلد ہی کل پاکستان کی سطح کے تقریری مقابلوں میں حصہ لینا شروع کر دیا اور کئی بار انعامات حاصل کیے۔ حتیٰ کہ ایک دور آیا اور اس کی گواہی اس زمانے کے سٹوڈنٹ آج بھی دیں گے کہ گورنمنٹ کالج کے مباحثے جن کو پورے برصغیر میں ایک شہرت حاصل ہے، میری موجودگی کے بغیر ادھورے اور نامکمل تصور کیے جاتے تھے۔ طلباء اور مہمان انتظار کرتے تھے کہ کب میں سٹیج پر آتا ہوں اور یقین جانیئے جب میں تقریر کرنے کے لیے ہال کے اندر داخل ہوتا تھا تو دونوں طرف کھڑے لڑکے لڑکیاں پرجوش تالیوں سے میرا استقبال کیا کرتے تھے۔ میں اس وقت بھی صرف اپنے کالج نہیں بلکہ یونیورسٹی کی سطح پر بھی مقبول تھا، آپ جانتے ہیں کہ لاہور کالجوں کا شہر ہے اور اس وقت کوئی ایسا کالج نہیں تھا جہاں میرا نام لیا جائے اور لوگ مجھے نہ پہچانیں۔

گورنمنٹ کالج کے مباحثے اور ان میں میری مقبولیت میرا بھرپور تعارف بن گئے بلکہ جب میں کالج کو خیرباد کہہ کر عملی زندگی میں داخل ہوا تو اس وقت بھی یہی تعارف میری پہچان اور میرا حوالہ بنا رہا۔ میں جہاں کہیں بھی جاتا مجھے کوئی نہ کوئی شخص ایسا ضرور مل جاتا جو مجھے گورنمنٹ کالج کے مباحثوں کے حوالے سے پہچان لیتا۔

سچی بات تو یہ ہے کہ گورنمنٹ کالج نے میری شخصیت کو ابھارنے اور اجاگر کرنے میں بنیادی

کردار ادا کیا، خود مجھے شدت سے احساس تھا کہ یہ وہ عظیم درس گاہ ہے جس نے علامہ اقبال، فیض ڈاکٹر عبدالسلام، سر فضل حسین اور سر سکندر جیسے قدآور لوگ پیدا کئے ہیں۔

گورنمنٹ کالج ۱۸۶۴ء کو نئے سال کے پہلے دن لیفٹیننٹ گورنر پنجاب کے حکم پر قائم کیا گیا جو آگے چل کر ایشیاء کی ممتاز درس گاہ بنا اور اس کے پہلے پرنسپل Dr. LEITNER مقرر ہوئے جو عربی اور اسلامی قوانین کے سکالر تھے۔ وہ اپنا چارج سنبھالنے آئے تو ان کے سامنے راجہ بھون سنگھ حویلی میں واقع ضلع سکول کی عمارت تھی جس کی اوپر کی منزل کے چند کمرے بطور ہاسٹل استعمال ہوتے تھے۔ ضلع سکول کے ہیڈ ماسٹر BEDDY بھی کالج کے اساتذہ کی مدد کیا کرتے تھے۔

پہلی کلاس نو طلباء پر مشتمل تھی اور یہ تمام ایف اے میں پڑھتے تھے اور اس کا الحاق کلکتہ یونیورسٹی کے ساتھ کیا گیا تھا۔ ہر طالب علم کو پندرہ روپے ماہانہ کا وظیفہ بھی ملتا تھا، اور ان نو طلباء میں سے دو کچھ عرصہ کے بعد چھوڑ کر چلے گئے کیونکہ ان کو کوئی سرکاری نوکری مل گئی تھی۔ گورنمنٹ کالج اپنی موجودہ عمارت میں اکتوبر ۱۸۷۶ء میں منتقل ہوا، اور اس سے پہلے مختلف جگہوں پر کام کرتا رہا۔ شروع میں ہاسٹل کی سہولت نہیں تھی ۱۸۹۷ء میں کارڈینگل ہوسٹل تعمیر ہوا (یہ وہی تاریخی ہاسٹل ہے جہاں علامہ اقبال رہ چکے ہیں) جبکہ اس کا شمالی حصہ بعد میں تعمیر ہوا۔ ۱۸۶۴ء سے ۱۸۹۶ء تک ڈاکٹر LEITNER پرنسپل رہے اور اس کے بعد ریاضی کے پہلے پروفیسر LEIWS نے یہ منصب سنبھال لیا۔

جہاں اب اوول اور ٹاور ہے وہاں لیموں اور سنگتروں کے پودے تھے جہاں طلباء اور شہد کی مکھیاں اپنی لمبی گرمی کی دوپہریں گزارتے تھے۔

کالج کا میگزین راوی ۱۹۰۰ء میں P.S. ALLEN کی ادارت میں شروع ہوا تب یہ سال میں ایک بار منظر عام پر آیا کرتا تھا۔

گورنمنٹ کالج کے نامور پرنسپلوں میں

Prof. Garret Prof. Sondhi, Prof. A.S. Bokhari,
Prof. Dickenson, Prof. Lt.Karamat Prof.Siraj uddin
Prof. Khawaja Manzoor Hussain Dr. Nazir Ahmed

کے نام لیے جا سکتے ہیں۔

اس عظیم درس گاہ نے پورے برصغیر کی زندگی کے ہر شعبہ میں قیادت فراہم کی گویا یہ قیادت کی نرسری تھا اور مجھے اس تاریخی حقیقت کا بڑی شدت سے احساس تھا۔ چنانچہ میں نے طے کر لیا کہ میں بھی اپنے پیش روؤں کے نقش قدم پر چلوں اور عملی زندگی میں نام پیدا کروں۔

میرے زمانے میں گورنمنٹ کالج کے جن اساتذہ نے مجھے متاثر کیا ان میں ڈاکٹر نذیر احمد سرفہرست ہیں۔ وہ ایک درویش منش اور انتہائی قابل استاد تھے اور اپنے طلباء کو اولاد کی طرح تصور کرتے تھے۔ طلباء بھی ان سے حد درجہ محبت کرتے تھے اور اس کا اظہار اس وقت ہوا، جب گورنر نواب کالاباغ نے ان کا تبادلہ کر دیا۔ یہ خبر سنتے ہی طلباء سراپا احتجاج بن کر کالج سے باہر نکل آئے حتیٰ کہ نواب کالاباغ کو ڈاکٹر صاحب کے تبادلہ کے آرڈرز واپس لینے پڑے۔ یہاں یہ وضاحت ضروری ہے کہ اس وقت گورنمنٹ کالج کے طلباء کے سڑکوں پر نکلنے کا کوئی تصور ہی موجود نہیں تھا۔

مجھے ڈاکٹر عبدالحمید نے بھی بے حد متاثر کیا جو ہسٹری ڈیپارٹمنٹ کے سربراہ بھی تھے اور آج جو مجھے تاریخ کے مضمون سے دلچسپی اور لگاؤ ہے وہ ان کی شخصیت کا مرہون منت ہے وہ ۱۸۵۷ء سے ۱۹۴۷ء تک کے دور پر ایک اتھارٹی تسلیم کیے جاتے تھے۔ خاص طور پر وہ (مسلم نیشنل موومنٹ) یعنی مسلم شخصیات کے سوانح، کردار، خدمات اور انفرادیت کو اتنے خوبصورت اور بھرپور انداز سے پیش کرتے تھے کہ بلاشبہ میں اس سے متاثر ہوتا گیا اور میرے ذہن نے تاریخ کے حوالے سے ان کی شخصیت سے گہرا اثر قبول کیا۔

مجھے وہ وقت اچھی طرح یاد ہے جب بنیادی جمہوریتوں کا نظام متعارف کرایا جا رہا تھا اور اس سلسلہ میں بڑی سرگرمی سے کام ہو رہے تھے۔ وزراء اور سرکاری افسروں کے گروپ مختلف جگہوں پر لوگوں سے خطاب کر کے انہیں اس نظام کے "ثمرات" کے بارے میں بتایا کرتے تھے۔ لہٰذا گورنمنٹ کالج میں جو گروپ آیا اس میں منظور قادر، لیفٹیننٹ جنرل کے ایم شیخ اور ایک اور وزیر جن کا نام اب ذہن میں نہیں آ رہا۔ شامل تھے۔ ہال میں تقریب کا اہتمام کیا گیا تھا، میرا اس زمانے میں ایک سٹائل تھا جسے آپ میری عادت بھی کہہ سکتے ہیں اور وہ یہ کہ میں تقریب میں اس وقت جایا کرتا تھا جب اس کی کارروائی شروع ہوئے چالیس پچاس منٹ گزر جاتے۔ چنانچہ جب میں ہال میں داخل ہوا تو اس وقت منظور قادر تقریر کر رہے تھے اور کھچا کھچ بھرے ہال

میں مکمل سکوت طاری تھا۔ میں آگے بڑھا تو کالج کے لڑکے لڑکیوں نے مجھے دیکھتے ہی تالیاں بجانا شروع کر دیں اور جب میں دو تین منٹ کے بعد اگلی صف میں جا کر ایک کرسی پر بیٹھ گیا اور تالیوں کا شور ٹھہر گیا تو منظور قادر نے اپنی تقریر کا سلسلہ جوڑتے ہوئے میری طرف اشارہ کر کے کہا:

"آج اس نوجوان کی مقبولیت دیکھ کر مجھے اس پر رشک آ گیا ہے اور میرا جی چاہتا ہے کہ کاش جب میں گورنمنٹ کالج میں پڑھتا تھا تو اس نوجوان جتنا ہی مقبول ہوتا۔"

اس زمانے کے اور بھی بے شمار واقعات بیان کیے جا سکتے ہیں مگر میں یہاں صرف روزنامہ مشرق لاہور میں شائع ہونے والی ایک رپورٹ کا یہ اقتباس پیش کرنا چاہوں گا۔

مباحثہ کا ایک دلچسپ فیچر یہ بھی تھا کہ گورنمنٹ کالج کے ایک مشہور و معروف طالب علم احمد رضا خان نے اپنے مخصوص انداز سے خطاب کیا، احمد رضا کالجوں کی دنیا کی ایک جانی پہچانی شخصیت ہیں، شاید ہی کوئی ایسا مباحثہ ہو، جہاں احمد رضا موجود نہ ہوں اور حاضرین کی طرف سے انہیں اظہار خیال کی دعوت نہ دی جاتی ہو۔ بلکہ انہیں تقریر کرنے پر مجبور نہ کیا جاتا ہو۔ گورنمنٹ کالج میں تو ان کے بغیر مباحثوں میں وہ رنگ ہی نہیں پیدا ہوتا جو کالج کی ایسی مجالس کا طرۂ امتیاز ہے۔

گورنمنٹ کالج کی ایک نہایت دلچسپ اور یادگار روایت زیر تعلیم اور فارغ التحصیل طلباء کے درمیان مباحثہ کی تقریب ہوا کرتی تھی۔ اس تقریب کی اہمیت اور جاذبیت کا اندازہ اس امر سے لگایا جا سکتا ہے کہ لوگ اس تقریب کا دعوت نامہ یا داخلہ پاس حاصل کرنے کے لیے باقاعدہ تگ و دو کیا کرتے تھے۔ میں نے کئی بار اس مباحثہ میں حصہ لیا مگر وہ انگلش مباحثہ مجھے کبھی نہیں بھولتا جس کا موضوع تھا۔ (Lassi is better than CocoCola)
یعنی لسی کو پرانے کلچر کی عکاسی کرنا تھا اور کوکاکولا نئی تہذیب کی علامت تھا۔ چنانچہ پرانے طلباء یعنی فارغ التحصیل طلباء کی طرف سے لسی حق میں بولنے والوں کے قائد منظر علی خان تھے۔ (جو مشہور طالب علم لیڈر طارق علی خان کے والد ہیں۔) اور مظہر علی خان بطورِ سوشلسٹ

دانشور مشہور تھے اور آج بھی ان کی وجہ شہرت یہی ہے۔ موصوف اگرچہ بظاہر کھدر کی شلوار قمیض میں ملبوس تھے مگر باہر ان کی مرسڈیز گاڑی کھڑی تھی جس میں سوار ہو کر وہ آئے تھے۔ انہوں نے ایک نہایت دھواں دھار تقریر کی۔

ڈائس پر مباحثہ کے موضوع اور عنوان کی نسبت سے کوکا کولا کی بوتل اور پیسی کا گڑوا اور مدھانی بھی رکھے گئے تھے۔ منظہر علی خان نے جوش خطابت میں آگے بڑھ کر کوکا کولا کی بوتل اٹھا کر فرش پر پٹختے ہوئے کہا:

"یہ گندا پانی جس کے لیے ہمارے غریب عوام کی خون پسینے کی کمائی کو بیدردی سے بہایا جاتا ہے۔ ایک طرف قوم غربت اور افلاس کا شکار ہے اور دوسری طرف کوکا کولا کی عیاشی ہو رہی ہے۔"

غرض انہوں نے اپنی لفاظی اور جذباتی باتوں سے مجمع لوٹ لیا اور لوگوں نے باقاعدہ پرجوش انداز میں نعرے لگانے شروع کر دیئے۔ ظاہر ہے کہ ان کا مقصد بھی یہی تھا کہ حاضرین کی حمایت حاصل کی جائے۔

وہ سٹیج سے رخصت ہوئے تو میرا نام پکارا گیا، ظاہر ہے میرے اوپر بڑی بھاری ذمہ داری آن پڑی تھی۔ میں نے حوصلے اور تحمل سے کام لیا اور سٹیج پر آ کر تقریر کا آغاز کرتے ہوئے کہا۔

مجھ سے پہلے جو صاحب تقریر کر کے گئے ہیں ان کی وجہ شہرت ان کا سوشلسٹ ہونا ہے جس کے معنی سرخا ہیں۔ اور سرخے تین قسم کے ہوتے ہیں یعنی چقندری سرخا، شلغمی سرخا اور تربوزی سرخا، ۔ یعنی تربوزی سرخا وہ ہے جو باہر سے مسلم لیگی یعنی سبز اور اندر سے سوشلسٹ یعنی سرخ ہو۔ گویا اس میں اتنی اخلاقی جرأت نہیں ہوتی کہ وہ کھل کر اپنے نظریات اور خیالات کا اظہار کر سکے۔ شلغمی سرخا وہ ہے جو اوپر سے سرخ ہو اور اندر سے سفید۔ یعنی جو فیشن کی حد تک تو سوشلسٹ ہو اور چین اور روس سے مراعات حاصل کرے لیکن اندر سے سرمایہ دار ہو۔ ان کے بچے بھی پاکستان میں نہیں پڑھتے بلکہ انگلستان جاتے ہیں اور یہ خود مرسڈیز گاڑیوں میں سفر کرتے ہیں۔ چقندری سرخا وہ ہے جو اندر اور باہر سے سرخ ہو لیکن اگرچہ اغ

کے کر تلاش کیا جائے تو پورے ملک میں ایک چقندری سرخا نہیں ملے گا اور اگر کوئی
ہے تو میں اس کی جرأت کو سلام کرتا ہوں۔ البتہ ملک میں شلغمی سرخوں کی بھرمار ہے
جن کی بھرپور اور مکمل نمائندگی قائد ایوان کرتے ہیں۔"
میرا یہ کہنا تھا کہ ہال تالیوں اور سیٹیوں سے گونج اٹھا، کانوں پڑی آواز سنائی نہ دیتی تھی
جب پانچ چھ منٹ مسلسل تالیاں بجتی رہیں تو مظہر علی خان بطورِ احتجاج اٹھ کر ہال سے باہر
چلے گئے۔
یہ تھا میرا انداز اور سٹائل جو شروع دن ہی سے جرأت مندانہ انداز تھا۔ میں دل
کی بات کو زبان پر لائے بغیر نہیں رہ سکتا اور مجھے یہ اعتراف کرتے ہوئے مسرت ہوتی ہے
کہ اپنی قوت گویائی یا خطابت کا جو مظاہرہ میں نے ایک زمانہ میں عوامی، سیاسی جلسوں اور
خاص طور پر قومی اسمبلی کے فورم پر کیا اس کی ابتدائی تربیت اور اعتماد مجھے گورنمنٹ کالج کے
مباحثوں ہی سے میسر آیا۔
گورنمنٹ کالج کے زمانہ طالب علمی کا ایک اور یادگار سلسلہ گورنمنٹ کالج بمقابلہ اسلامیہ
کالج کرکٹ میچ ہوا کرتا تھا اور شاید اب بھی ہے۔ اس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ جیسے
انگلستان میں آکسفورڈ اور کیمبرج کے درمیان بوٹنگ (کشتی رانی) کا مقابلہ پانی میں کم اور
کناروں پر کھڑے طلباء کے درمیان زیادہ ہوتا ہے۔ اسی طرح ان دونوں کالجوں کا کرکٹ میچ
وکٹ پر کم اور گراؤنڈ کے باہر بیٹھے طلباء کے درمیان زیادہ کھیلا جاتا تھا۔ دونوں طرف سے ہزاروں
کی تعداد میں طلباء جمع ہو جاتے تھے جن میں پچاس پچاس ساٹھ ساٹھ سال کے فارغ التحصیل طلباء
بھی شامل ہوتے تھے۔ ان میں سے بیشتر تو خوشی اور اظہار مسرت کے طور پر ناچتے بھی تھے۔
اور ساتھ ساتھ اپنے زمانے کے کرکٹ کے ریکارڈ بھی سناتے تھے۔ میں نے یہ میچ گراؤنڈ
کے اندر بھی اور گراؤنڈ کے باہر بھی۔ یعنی میں بطور کھلاڑی وکٹ پر بھی گیا اور اپنی ہوٹنگ
پارٹی لے کر اس حد تک اودھم مچایا کہ مدمقابل ٹیم کے کھلاڑیوں کے لیے کھیلنا مشکل ہو
جاتا تھا۔ یہ میچ دیکھنے والے تجربہ کار اور ماہر کھلاڑیوں کا کہنا ہے کہ اس میچ میں پچاس رنز
بنانا مشکل ہے مگر کسی بھی ٹیسٹ میچ میں سنچری بنانا آسان ہے، کیونکہ یہ اعصاب اور

قوت برداشت کی جنگ تھی۔ اس موقع پر میری ہوٹنگ پارٹی کی کارکردگی نے بھی لاہور کے حلقوں میں میرا تعارف کرا دیا۔

گورنمنٹ کالج کی ٹک شاپ بھی اپنی نوعیت کا منفرد ادارہ تھا۔ عام مشہور رہے کہ اگر گورنمنٹ کالج کے کسی طالب علم نے "ٹک شاپ" پر کچھ دن نہیں گزارے تو اس نے زندگی میں کچھ نہیں سیکھا۔ میں ٹک شاپ پر بھی اپنا ڈیرہ جمایا کرتا تھا اور یہ سلسلہ کئی سال تک جاری رہا۔

گورنمنٹ کالج سے حسین یادیں لے کر میں یونیورسٹی لاء کالج میں چلا گیا۔ پہلا سال تو سکون سے گزر گیا یعنی ایف ای ایل پاس کر لیا۔ یہ نومبر ۱۹۶۳ء کی بات ہے مگر جب ہی طلباء میں بے چینی کی ایک لہر دوڑ گئی جس کا باعث یونیورسٹی آرڈی نینس تھا جسے عام طور پر کالا قانون کہا جاتا تھا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب ایوب خان نے سیاست دانوں اور سیاسی جماعتوں کو اپنے شکنجے میں بری طرح جکڑ رکھا تھا۔ لیکن جس قوت سے وہ خوفزدہ تھا وہ طالب علم برادری تھی۔ اس زمانے میں پروفیسر شریف سیکرٹری تعلیم تھے جو بے حد خوشامدی اور جی حضوری ٹائپ کا آدمی تھا۔ اس نے ہی یہ کالے قوانین تجویز کیے تھے اور مقصد طلباء کو قابو کر کے رکھنا تھا۔ یہ امر دلچسپی سے خالی نہیں ہوگا کہ اس زمانے میں ہی بعض دوسرے ایشیائی ملکوں میں ملکی معاملات میں طلباء کا اثرورسوخ بڑھنا شروع ہو گیا اور ان کے اثرات پاکستان میں بھی آپہنچے۔ اس کا تدارک اور سدباب کرنے کے لیے بھی یونیورسٹی آرڈی نینس کو بھی ضروری سمجھا گیا۔ لیکن اس کے خلاف ملک بھر میں رفتہ رفتہ ایک نفرت پھیلنے لگی۔ مشرقی پاکستان میں خاص طور پر اس کے خلاف بڑا سخت ردّعمل ہوا۔ کیونکہ وہاں پر تعلیمی اداروں کا ماحول مغربی پاکستان کے مقابلے میں بہت زیادہ ایڈوانس تھا۔ وہ لوگ زیادہ جمہوری مزاج کے تھے اور کسی بھی کالے قانون کے بارے میں وہاں پر ردعمل فوری طور پر دیکھنے میں آیا کرتا تھا۔

مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ ہمیں یعنی پنجاب یونیورسٹی کے طلباء کو مشرقی پاکستان کے طلباء نے چوڑیوں کا تحفہ بھیجا۔ کیونکہ پنجاب یونیورسٹی میں ابھی تک اس یونیورسٹی آرڈی نینس کے بارے میں کوئی جنبش نہیں ہوئی تھیں۔ ظاہر ہے کہ جب چوڑیاں آئیں تو ہمیں بھی غیرت

آئی اور پنجابی خون نے جوش مارا۔ چنانچہ ہم پہلے تو پنجاب یونیورسٹی کے کالجز میں نکلے رائے عامہ ہموار کی، آرڈی نینس کی ان شقوں کو طلباء کے سامنے کھول کر بیان کیا جو ان کے مفادات کے خلاف تھیں۔ اشتہار اور پمفلٹ بھی چھاپے۔ مغربی پاکستان کی دوسری یونیورسٹیوں سے رابطے کر کے دورے کیے۔

وہ مرا داخلِ زنداں ہونا

ابھی یہ سارا سلسلہ چل ہی رہا تھا کہ پنجاب یونیورسٹی میں الیکشن آ گئے۔ میں بھی اس میں سیکرٹری جنرل کے عہدے کے لئے بطور امیدوار حصہ لے رہا تھا۔ ابھی انتخابی مہم جاری ہی تھی کہ بارک اللہ خان (جن کا تعلق جماعت اسلامی سے تھا) کو یونیورسٹی سے نکال دیا گیا۔ میرا ہمیشہ کی طرح اس وقت بھی جماعت اسلامی کے ساتھ محبت کا کوئی رشتہ نہیں تھا۔ لیکن میں سوچتا تھا کہ ہر شخص کو اپنے نظریات اور اس کے لیے جدوجہد کرنے کا حق ہے۔ لہذا میں نے آگے بڑھ کر اس مسئلہ کو ایشو بنایا اور پھر الیکشن کا بائیکاٹ کر دیا اور پھر ۹ نومبر ۱۹۶۳ء کو میں نے ایک بہت بڑے جلوس کی قیادت کی اور جب یہ جلوس لے کر میں پنجاب اسمبلی کے سامنے آیا تو وہاں انتظامیہ نے ہمیں روکا۔ لاٹھی چارج ہوا، اور گولی چلی اور مجھ سمیت بہت سے طلباء کو گرفتار کر لیا گیا۔

اس سے پہلے جب یونیورسٹی سے جلوس چلا تو میں نے ایک ٹیکسی کی چھت پر کھڑا ہو کر ایک انتہائی جوشیلی اور جذباتی تقریر کی جس سے پنجاب یونیورسٹی اور سارے لاہور کے کالجوں سے آئے ہوئے ہزاروں طلباء کے مجمع میں آگ لگ گئی۔ جلوس روانہ ہوا اور ہم انارکلی پہنچے تو وہاں ایک شخص مصنوعی داڑھی مونچھ فروخت کر رہا تھا (وہ شاید اب بھی یہی کاروبار کرتا نظر آتا ہے)۔ میں نے اس سے کالی مونچھیں اور اپنے چہرے پر سجالی۔ اب صورتحال یہ تھی کہ میں جلوس کے آگے آگے اس مصنوعی مونچھ پر ہاتھ پھیر کر کہتا تھا "کالی مچھ دا، کالا قانون" — اور اس کے ساتھ ہی سارا جلوس بیک زبان ہو کر جواب دیتا، ہائے ہائے۔ آپ سمجھ ہی گئے ہوں گے کہ "کالی مچھ" سے مراد نواب کالا باغ تھا۔ جو اس وقت مغربی پاکستان

کے گورنر تھے۔

میری دیکھا دیکھی دوسرے لوگوں نے بھی مونچھ خریدنا شروع کر دی۔ دیکھتے ہی دیکھتے اس کی مانگ اتنی ہوئی کہ دو آنے کی مونچھ روپے میں بکنے لگی اور پھر بالآخر ختم ہو گئی۔ لطف کی بات یہ ہے کہ "کالی مونچھ" بیچنے والا بھی لاہور کی روایتی زندہ دلی کا مظاہرہ کرتے ہوئے یہ آوازیں لگا لگا کر مونچھ بیچ رہا تھا۔

وڈیاں دی گورنری
تے چھوٹیاں دا ماسا
لے لو مچھ۔ روپیہ روپیہ

اس جلوس میں ایوب خان کے خلاف بھی نعرے لگائے گئے اور پہلی بار پنجاب اور پنجاب کے دل لاہور میں عوام نے اتنے بڑے وسیع پیمانے پر ایوب اور انکا لا باغ کے خلاف سرعام نعرے لگتے تھے۔ پھر دیکھتے ہی دیکھتے یہ احتجاج یونیورسٹی آرڈی ننس تک نہیں رہا بلکہ یہ جمہوری حقوق کے لیے تحریک کی شکل اختیار کر گیا یہ وہ زمانہ تھا جب دولتانہ اور اس جیسے دوسرے لیڈر اپنے گھروں میں بیٹھے ایوب خان کا نام سنتے ہی کانپ جاتے تھے۔

گرفتاری کے بعد ہمیں پولیس اپنے ساتھ لے گئی اور اپنے مخصوص انداز میں تفتیش کرتی رہی بالآخر مجھے اور دیگر ساتھیوں کو ۲، ۲ سال کے لیے یونیورسٹی سے نکال دیا گیا۔ اس طرح ہم لوگ مغربی پاکستان یونیورسٹی آرڈی ننس کا پہلا شکار بنے لیکن اس واقعہ نے مجھے ملک گیر شہرت دی۔ میری گرفتاری اور جلسہ کی تقاریر اکثر اخبارات نے صفحہ اوّل پر شائع کیں اور پھر مقدمہ کی کارروائی بھی چھپتی رہی، اس طرح سزا ہوئی تو اس وقت میں پورے ملک میں طالب علم لیڈر کی حیثیت سے تعارف حاصل کر چکا تھا اور ملک کے دونوں صوبوں کے سیاسی اور تعلیمی حلقوں میں میرا نام اجنبی نہیں رہا تھا۔

ہمارے جلوس کے بعد مشرقی پاکستان سے ایک انتہائی پُر جوش اور ولولہ انگیز لہر اٹھی کیونکہ ہم نے ان کے جذبات پر جس طرح کے ردّ عمل کا اظہار کیا تھا وہ ان کی توقعات سے بڑھ

تھا۔ اس سے پنجابی طلباء کے وقار میں بے حد اضافہ ہوا، اور پھر مشرقی پاکستان کے طلباء نے ہمیں سلام کیا۔ مشرقی پاکستان کے عوام نے پنجاب یونیورسٹی اور اس کے بعد کراچی یونیورسٹی میں ہونے والے مظاہروں اور جلوسوں کا بڑا خیر مقدم کیا گیا۔ چنانچہ تاریخ میں یہ بات مشہور ہے کہ ایوب کی آمریت کے خلاف اور جمہوریت کے حق میں جن لوگوں نے سب سے پہلے آواز بلند کی، وہ ہم لوگ ہی تھے۔ یہ اور بات ہے کہ اس کے بعد آگے چل کر سیاسی جماعتوں نے اتحاد کیا اور ایوب خان کے خلاف منظم تحریک چلائی اور اس میں ٹریڈ یونین ازم کا عنصر بھی داخل ہو گیا۔

گرفتاری کے بعد ہمیں ۱۳ دن پرانی انار کلی کے تھانے کے حوالات میں رکھا گیا۔ اس حوالات میں اخلاقی ملزمان کو رکھنے کی گنجائش بھی سات یا آٹھ ہو گی لیکن ہم ۳۵ کے لگ بھگ طلباء تھے جنہیں اس حوالات میں بند رکھا گیا یعنی رات کو جب ہم سوتے تھے تو کسی کا سر کسی کی ٹانگوں میں ہوتا اور کسی کی ٹانگیں کسی کی چھاتی پر۔ افسوس کی بات یہ ہے کہ رفع حاجت کے لیے بھی اسی حوالات کے اندر انتظام تھا۔

مجھے یاد ہے کہ ہمارے ساتھیوں میں ایک سکندر جمالی تھے جو میر جعفر خان جمالی کے صاحبزادے تھے اور جنہیں پولیس نے غلطی سے گرفتار کر لیا تھا۔ گرفتار شدگان میں مونچھیں بیچنے والا بھی تھا۔ یہاں حوالات میں ہمارے طالب علم ساتھی نعرے مارتے ہوئے ہمارے لیے ناشتہ لایا کرتے تھے اور ان بے چاروں پر بھی پولیس لاٹھی چارج کرتی تھی۔ سکندر جمالی ہر صبح ناشتہ پر ساتھیوں سے کہا کرتے تھے بھائی۔ ثقیل غذا مت کھاؤ۔ بیت الخلاء پہلے ہی بہت خراب ہے۔

اور میں اس کو سمجھاتا، اگر ثقیل غذا نہیں کھاؤ گے تو زندہ کیسے رہو گے۔ یہاں معلوم نہیں کب تک رہنا ہو گا۔ ایسا نہ ہو کہ باہر نکلو تو گھر والے "گوتم بدھ" سمجھ کر پہچاننے سے انکار کر دیں۔ سکندر جمالی، میر ظفر اللہ جمالی اور تاج جمالی کے بڑے بھائی ہیں اور ان کو ان کے والد نے حکومت سے رابطہ کر کے دوسرے تیسرے دن رہا کرا لیا تھا کیونکہ وہ اس وقت ایم این اے تھے۔ وہ تو چلے گئے مگر ہم لوگ جتنے دن جیل میں رہے ان کی باتیں کر کے ہنستے رہے۔

میری تفتیش ہوئی اور پولیس والوں کا اندازہ (نادانستہ) یہ تھا کہ میں لفٹیننٹ ہوں اور وہ اسی مفروضہ کی بنیاد پر مجھ سے پوچھ گچھ کر رہے تھے۔ میں ان کو بار بار کہتا تھا کہ میں نہ تو لفٹیننٹ

ہوں اور نہ رائیٹسٹ ۔ میں تو ایکٹیویسٹ (ACTIVIST) ہوں۔ جو ہر حق بات پہ متحرک ہوتا ہے۔ میں کسی کا ایجنٹ نہیں اگر ہوں تو اپنے غریب طالب علموں کا ایجنٹ ہوں۔

تفتیش کے دوران ایک دن میں نے ڈی ایس پی سے کہا "آپ خود لفٹیسٹ کی تعریف کر دیں تاکہ اس کے مطابق میں خود کو بے گناہ ثابت کروں یا آپ کی تسلی کروں؟ - بہت دیر سوچنے اور بالآخر سر کھجاتے ہوئے ڈی ایس پی بولا: وہی تو ہوتے ہیں جو کافی ہاؤس میں بیٹھ کر بغیر دودھ کی کالی چائے پیتے ہیں اور لمبے بال اور قلمیں رکھتے ہیں اور حکومت پر تنقید کرتے رہتے ہیں۔ میں نے یہ سن کر کہا" جناب آپ کی تعریف کے مطابق تو میں بے گناہ ہوں ۔ یہ واقعہ بتانے کا مقصد یہ ہے کہ اس وقت پولیس کے تفتیشی افسروں کا ذہنی معیار یا سطح ایسی تھی اور ان کے نزدیک لفٹیسٹ کی یہ خوبیاں تھیں۔

حوالات میں تیرہ چودہ دن رہنے کے بعد ہماری ضمانتیں ہوگئیں اور اس کے بعد ابھی میں پولیس کی تحویل ہی میں تھا کہ مجھے نو نومبر کو حوالات کے اندر ہی چارج شیٹ کر دیا گیا جو لاء کالج کے پرنسپل شیخ امتیاز کے دستخط سے جاری کی گئی تھی۔ شیخ امتیاز کے بارے میں آج کی طرح اس زمانے میں بھی یہی تاثر تھا کہ وہ انتظامیہ کے حامی ہیں۔ یعنی جب استاد کا تصور ذہن میں لایا جاتا ہے تو ڈاکٹر نذیر سامنے آتے ہیں جو طلباء کے مفادات کے تحفظ کے لیے کوئی بھی قربانی دینے کو تیار تھے، وہ طلباء کے لیے ڈھال بن جایا کرتے تھے لیکن اس کے مقابلے میں شیخ امتیاز کا شمار ان لوگوں میں تھا جو طلباء کو کچل کر اور دبا کر حکومت کی نظروں میں اپنے نمبر بناتے تھے اور میرا تو ان کے بارے میں یہ تاثر ہے کہ وہ استاد کم اور ایس ایچ او زیادہ نظر آتے ہیں۔

چارج شیٹ پرانی انارکلی حوالات میں، ہمیں نو نومبر کو موصول ہوئی اور وہ کچھ اس طرح تھی۔

۱۔ آپ کو چار نومبر ۱۹۶۳ء کو تقریباً ساڑھے دس بجے مال روڈ پر ایک جلوس کی قیادت کرتے ہوئے دیکھا گیا۔ آپ ایک ٹیکسی کی چھت پر سوار تھے جس پر لاؤڈ اسپیکر نصب تھا۔ آپ نے یونیورسٹی آرڈی ننس کو منسوخ کرنے کا مطالبہ کرتے ہوئے نعرے بازی کی اور دوسرے طلباء کو بھی اس پر اکسایا۔

۲۔ ۴ نومبر ۱۹۶۳ء کو پولیس کی حراست سے ضمانت پر رہا ہونے کے بعد آپ دوسرے ہڑتالی لڑکوں کے ساتھ مل کر تقریباً سوا آٹھ بجے شب لاء کالج پہنچے اور آپ نے وہاں پر جاری ایوننگ کلاسز کو معطل کر ڈالا۔ آپ نے وہاں کالج انتظامیہ کے خلاف ایک انتہائی اشتعال انگیز تقریر کی اور طلباء کو ہڑتال کرنے کیلئے اُکسایا۔

۳۔ آپ نے ۵، نومبر ۱۹۶۳ء کو ایک بار پھر ہڑتالی طلباء کے جلوس کی قیادت کی۔ آپ نے دوسرے عناصر کے ساتھ مل کر کلاسوں میں موجود پرامن طلباء کو باہر نکالا اور پھر ان کی قیادت کرتے ہوئے یونیورسٹی سے ملحقہ گلیوں اور بازاروں میں ایک جلوس لے آئے۔

چارج شیٹ میں واضح طور پر کہا گیا تھا کہ ان الزامات کا جواب ۷۲ گھنٹے کے اندر اندر دیا جائے ورنہ کالج بدر کر دیا جائے گا۔

ظاہر ہے کہ پولیس کی حراست میں جہاں ایک چھوٹے سے کمرے میں ہم تقریباً ۳۲ طلباء رکھے گئے تھے (جبکہ اس میں بمشکل دس کی گنجائش تھی) میرے لیے اس چارج شیٹ کا جواب دینا ممکن نہیں تھا۔ جبکہ نوٹس میں دیئے گئے ۷۲ گھنٹے کے بعد بھی میں پولیس کی حراست میں ہی رہا۔ چنانچہ میرا جواب اور موقف سنے بغیر مجھے یونیورسٹی سے نکال دیا گیا۔ مجھے آج تک اس بات کی سمجھ نہیں آسکی کہ شیخ امتیاز صاحب نے یہ چارج شیٹ جاری کرنے کے بعد میرا جواب سنے بغیر مجھے کالج سے کیسے نکال دیا۔ وہ لاء کالج کے پرنسپل تھے ان کو تو معلوم ہونا چاہیئے تھا کہ قانون کا بنیادی اصول یہ تھا کہ کسی شخص کو سنے بغیر یعنی اس کو صفائی کا موقع دیئے بغیر اس کو سزا نہیں دی جا سکتی۔ اصل بات یہ تھی کہ انہوں نے صرف حکومت کو یعنی نواب آف کالاباغ کو خوش کرنے کے لیے ایسا کیا تھا۔ نواب کالاباغ نے اس واقعہ کو اپنی ذاتی انا کا مسئلہ بنا لیا تھا کیونکہ اس کی گردن پر صدر ایوب سوار تھا۔ حقیقت تو یہ ہے کہ ایوب آمریت کے سمندر میں ہم طلباء کا یہ جلوس ایک کنکر کی طرح گرا اور اس سے پیدا ہونے والا تلاطم دور دور تک محسوس کیا گیا۔ اس وقت بلکہ چاروں طرف سناٹا تھا۔ پنجاب یونیورسٹی کے اولڈ کیمپس سے اٹھنے والے نعروں نے حکمرانوں کی نیندیں حرام کر دیں۔ سارے ملک نے حیرت اور تعجب کے ساتھ اس واقعہ کو دیکھا اور لوگوں نے یوں محسوس کیا جیسے جن بوتل سے

باہر آگیا ہو۔

نواب کالا باغ کو اوپر سے احکامات دیئے گئے کہ اس جلوس کو نکالنے والے طلباء کو سخت سزائیں دی جائیں تاکہ دوسرے طلباء اس سے عبرت حاصل کریں۔ چنانچہ فیصلہ یہی کیا گیا کہ ہم لوگوں کو نکال دیا جائے گویا چارج شیٹ دینے سے پہلے ہی یہ فیصلہ کیا جا چکا تھا کہ ہم لوگوں کو کالج سے نکال دیا جائے۔ پولیس کی حوالات میں ہم پر جو تشدد ہوا سو ہوا، یہ ایک الگ کہانی ہے ہمیں اس بات کا زیادہ افسوس تھا کہ ہمارا پرنسپل (شیخ امتیاز) اس قدر مصلحت پسند اور کم حوصلہ والا شخص ہے کہ وہ حکومت کو اپنے طلباء کے مستقبل کے مفاد کو مدِنظر رکھتے ہوئے یہ بھی نہیں کہہ سکتا کہ لاء کالج میں قانون پڑھایا جاتا ہے لہٰذا یہاں کے طلباء کو غیر قانونی طور پر باہر نکال دینا سراسر زیادتی ہو گی اور یہ کہ ہمیں چارج شیٹ حوالات میں دی گئی جہاں اس کا جواب دینا تو دور کی بات ہے، روزمرہ کے معمولات کی ادائیگی ہی انسانی بس سے باہر کی بات ہے۔

بہر حال ہمیں یونیورسٹی لاء کالج سے دو سال کے لیے باہر نکال دیا گیا کیونکہ حکومت کو یہ بات قطعاً گوارا نہیں تھی کہ ہم یونیورسٹی میں رہتے ہوئے اپنے اثر و رسوخ سے طلباء کو متحد کریں اور ان کی صف بندی کر کے اسے حکومت کے خلاف ایک مضبوط محاذ بنا دیں۔ حکومت کو یہ بھی خطرہ تھا کہ اگر اس طرح ہڑتال کا سلسلہ چل نکلا تو دوسرے عناصر بھی اس سے شہہ پا کر اٹھ کھڑے ہوں گے اور یوں ماحول آمریت کی بجائے جمہوریت کے حق میں بننے لگے گا۔

اس واقعہ کے بعد طلباء میں میری مقبولیت میں بے حد اضافہ ہوا حتیٰ کہ میرے بارے میں نظمیں لکھی جانے لگیں۔ ہمارے ایک دوست جاوید اکرام شیخ[1] کی میرے بارے میں یہ نظم یونیورسٹی میں بڑی مقبول ہوئی۔

مسلماں میں نہیں باقی طریقہ سحر خیزی کا
یہ مسلم ہے جو اپنائے ہے طورا تبک چنگیزی کا
مخاطب ہوں میں تجھ سے کیونکہ تو صاحب بصیرت ہے
ہوا باطل تیرے دم سے ارادہ شر انگیزی کا

---

[1] استاد سیاسیات۔ گورنمنٹ کالج۔ لاہور

کیا جاوید تو نے خود کو اپنے حسنِ سیرت سے
دیا ہے درد گمراہ نوجواں کو رشک ریزی کا
کہیں گرما گئی محفل کو تیری شوخیٔ گفتار
کہیں شکوہ حریفوں کو ہے تیری کم آمیزی کا
نہ ہو گا پھر کوئی احمد رضا اس یونیورسٹی میں
مگر قصہ رہے گا یاد برسوں اس کی تیزی کا

میں یہاں یہ بھی بتاتا چلوں کہ ہماری اس ہڑتال اور جلوس کو نہ صرف قومی پریس اور حلقوں نے غیر معمولی اہمیت دی بلکہ عالمی سطح پر بھی اس کا خاصا چرچا ہوا، اور یوں پنجاب کے ایک سرے سے لے کر دوسرے سرے تک طلباء میں ایوبی آمریت کے خلاف ایک ہیجان سا پیدا ہو گیا۔

جیسا کہ میں پہلے بتا چکا ہوں کہ ہمیں صفائی کا موقع دیئے بغیر ہی یک طرفہ کارروائی کر کے یونیورسٹی لاء کالج سے دو سال کے لیے نکال دیا گیا تھا۔ لیکن ایک سال کے بعد حکومت نے اپنے طور پر ہی اس فیصلہ کو واپس لے لیا اور یوں میں دوبارہ لاء کالج میں آیا۔

مادرِ ملت کے حضور میں

انہی ایام میں یعنی اکتوبر ۱۹۶۴ء میں مادرِ ملت محترمہ فاطمہ جناح لاہور تشریف لائیں اس وقت وہ ایوب خان کے خلاف صدارتی الیکشن میں حصہ لینے کا فیصلہ کر چکی تھیں۔ میں نے اس موقع پر طلباء کا ایک بہت بڑا وفد تشکیل دیا جس میں پنجاب بھر کے کالجوں کے نمائندے شامل تھے۔ کیونکہ اس وقت تک میں ملکی سطح پر بطورِ طالب علم لیڈر متعارف ہو چکا تھا۔

مادرِ ملت کا قیام میاں بشیر احمد صاحب کی قیام گاہ پر تھا لہٰذا ۵ اکتوبر ۱۹۶۴ء کو میں اس وفد کو لے کر وہاں پہنچا۔ اس ملاقات کی رپورٹ اگلے روز (۶ اکتوبر) اخبارات میں شائع ہوئی۔ نوائے وقت لاہور نے اس کے بارے میں لکھا:

"خاتونِ پاکستان محترمہ فاطمہ جناح نے طلباء کو تلقین کی کہ وہ جذبات سے بالاتر ہو کر جمہوریت کی بحالی اور ملک کی خوشحالی کے لیے جدوجہد کریں، اور اس کے ساتھ

ساتھ اپنے مطالبہ کو فراموش نہ کریں ۔ فی الحال ان کا اولین مقصد حصولِ تعلیم ہے ۔
آج صبح مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن اور یونیورسٹی کے ملحقہ کالجوں کے طلباء کے ایک نمائندہ
سے باتیں کرتے ہوئے انہوں نے کہا کہ قیام پاکستان کے لیے طلباء کی قربانیاں تاریخ کا
سنہرا باب ہیں لیکن اب ملک کو خوشحال بنانے کی ذمہ داری طلباء پر عائد ہوتی ہے ۔
انہوں نے طلباء کو تلقین کی کہ وہ اپنی اس جدوجہد کے ساتھ ساتھ اپنی پڑھائی کا خاص
طور پر خیال رکھیں ۔ بہتر تو یہی ہے کہ طلباء صرف ہنگامی حالات میں آگے آئیں ۔ لہٰذا
زیادہ وقت مطالعہ میں صرف کریں ۔ انہوں نے طلباء کی جانب سے تعاون کی یقین
دہانی کا شکریہ ادا کیا ۔ اس سے قبل وفد کے قائد احمد رضا خان نے تقریر کرتے ہوئے
کہا کہ نہایت افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ جن طلباء نے تحریک پاکستان میں نمایاں
کردار ادا کیا اب ان پر طرح طرح کے قوانین ٹھونس کر ان کو تشدد کا نشانہ بنایا جا رہا ہے ۔
انہوں نے کہا کہ ان کا قصور صرف یہ ہے کہ انہوں نے آمریت کے خلاف آواز بلند کی ۔
چاہیئے تو یہ تھا کہ طلباء کے حقوق پامال نہ کئے جاتے ۔ ان کو مناسب تعلیمی سہولتیں فراہم
کی جاتیں تاکہ وہ قوم کے خادم بن سکتے لیکن موجودہ حکومت اس کے برعکس کام کر رہی ہے
انہوں نے طلباء برادری کی طرف سے مادرِ ملت کو اپنے بھرپور تعاون کا یقین دلایا ۔"

پرنسپل نہیں ۔ تھانیدار

ادھر یہ خبر چھپی اور اُدھر میں ۸ راکتوبر کو پرنسپل (شیخ امتیاز) صاحب سے جا کر ملا اور انہیں
بتایا کہ میری کالج بدری ختم کر دی گئی ہے ، لہٰذا اب مجھے داخلہ دیا جائے ۔ قارئین کو یہ جان کر حیرت ہو
گی کہ شیخ صاحب موصوف نے مجھے لاء کالج لاہور میں داخلہ دینے سے انکار کر دیا اور کہا کہ تم پشاور لاء کالج
میں جا کر داخلہ لو ۔ حالانکہ یہ ایک بنیادی اصول ہے کہ کسی طالب علم کو جس تعلیمی ادارے سے نکالا جاتا
ہے ۔ سزا کا عرصہ گزارنے کے بعد اس کو واپس داخلہ اسی تعلیمی ادارے میں دیا جاتا ہے اور یہ اس
طالب علم کا حق ہوتا ہے لیکن مجھے اس حق سے محروم کرنے کی کوشش کی گئی ۔ شیخ صاحب کے اس غلط
فیصلہ اور نامناسب رویہ پر طلباء میں غصہ کی لہر دوڑ گئی ۔ انہوں نے اپنے طور پر اس کا اظہار کیا اور

جب شیخ صاحب نے محسوس کیا کہ بات بگڑ جائے گی تو انہوں نے مجبوراً داخلہ دیدیا۔
میں اس کو اپنے لیے اللہ تعالیٰ کا ایک کرم اور انعام تصور کرتا ہوں کہ عین اس وقت سارے ملک پر ایوب آمریت کی دہشت طاری تھی۔ جمہوریت سسک رہی تھی، تعلیمی اداروں پر استبداد کے تالے پڑے ہوئے تھے اور چاروں طرف ایک گھمبیر خاموشی اور سناٹا طاری تھا۔ خدا نے مجھے اتنی ہمت اور حوصلہ دیا کہ میں پاکستان کے طالب علموں کی آواز بلند کروں۔ میں نے جمہوریت، سچائی اور قانون کی بالادستی، کی آواز اس گھٹن کے ماحول میں اٹھائی۔ یہی تشخص میرا سیاسی حلقوں میں تعارف اور حوالہ بنا اور یوں میں سیاست کے میدان پرخار میں اترا۔ میری بعض سیاسی جماعتوں کی طرف سے خاصی حوصلہ افزائی ہوئی لیکن میں نے کسی سیاسی جماعت میں شمولیت اختیار نہ کی۔ میں نے اپنی سوچ اور فکر کا مرکز پاکستان ہی بنا رکھا تھا۔

یہ اس زمانے کی بات ہے جب مادر ملت محترمہ فاطمہ جناح اپوزیشن کے متفقہ امیدوار کی حیثیت سے صدارتی الیکشن میں حصہ لے رہی تھیں اور وہ قوم کے سامنے جمہوری امنگوں کا پیکر بن کر نمودار ہوئی تھیں۔ وہ ایک لحاظ سے جبر کا نشانہ بنے ہوئے عوام کی آواز بن کر سامنے آئیں۔ میں نے پنجاب بھر کے طلباء کے ایک نمائندہ وفد کے ہمراہ ان سے ملاقات کی تھی اور ان کی بھرپور تعاون کا یقین دلایا تھا۔ اس کے بعد میں نے مغربی پاکستان "سٹوڈنٹس لیگ" تشکیل دی اور اس کے پلیٹ فارم سے مادر ملت کی بھرپور انداز میں حمایت شروع کر دی۔ ہم نے طلباء کی طرف سے ان کو وہی تعاون دیا جو وہ اس سے پہلے ان کے بھائی یعنی قائداعظم محمد علی جناح کو تحریک پاکستان کے دوران دے چکے تھے، گویا طلباء نے اپنا تاریخی کردار ادا کیا۔ ہم نے مادر ملت کے لیے قریہ قریہ کوچہ کوچہ عوام سے رابطہ کیا اور شمع جمہوریت کو کراچی سے لے کر پشاور تک لے گئے۔

اگرچہ انتخابی نتائج ایوب خان کے حق میں رہے کیونکہ اس نے بنیادی جمہوریت کے نظام کے ذریعے سہمے ہوئے، ڈرے ہوئے، خوفزدہ اور مایوس لوگوں کے ووٹ خرید لیے تھے۔ لیکن جہاں تک عوام الناس کا تعلق ہے۔ انہوں نے مادر ملت، قانون کی بالادستی اور جمہوریت کا ساتھ دیا اور اس جدوجہد میں ہم طالب علموں نے ان کے ہراول دستے کا کردار ادا کیا اور اس ہراول دستے کی قیادت کا اعزاز مجھے حاصل رہا۔ میں نے اس وقت کسی سیاسی جماعت کا ساتھ نہیں دیا تھا بلکہ میرے ذہن میں

یہ بات تھی کہ میں قائداعظم محمد علی جناح کی بہن اور مادر ملت کا ساتھ دے رہا ہوں کیونکہ میرے نزدیک وہ سچائی اور صداقت کی جیتی جاگتی علامت تھیں۔ وہ قومی یگانگت اخوت اور اتحاد کی نشانی تھیں۔

اس انتخابی اور عوامی مہم میں مادر ملت محترمہ فاطمہ جناح کے بعد جس شخصیت کو سب سے زیادہ پذیرائی میسر آئی تھی وہ حضرت حبیب جالب تھے۔ ان کی دو نظموں کو جو انہوں نے آئین کے بارے میں لکھی تھیں، یعنی؛

ایسے دستور کو، صبح بے نور کو
میں نہیں مانتا، میں نہیں جانتا

اور

بیس گھرانے ہیں آباد
اور کروڑوں ہیں ناشاد
ہم پر اب تک جاری ہے
کالی صدیوں کی بیداد
صدر ایوب زندہ باد

بیس روپے من ہے آٹا
اس پر بھی ہے سناٹا
گوہر، سہگل آدم جی
بنے ہیں، برلا اور ٹاٹا
ملک کے دشمن کہلاتے ہیں
کرتے ہیں جو ہم فریاد
صدر ایوب زندہ باد

یہ دو نظمیں اس دور میں بے پناہ مشہور اور مقبول ہوئی تھیں اور ان کے حوالے سے ہی حبیب جالبؔ کو ایک منفرد تشخص حاصل ہوا تھا۔

صدر ایوب خان اگرچہ انتخاب جیت گئے اور مادرِ ملت محترمہ فاطمہ جناح ہار گئیں لیکن حقیقت تو یہ ہے کہ محترمہ مادرِ ملت کی انتخابی مہم نے ایوبی آمریت کو اندر سے کھوکھلا کر کے رکھ دیا تھا۔ ایوبی آمریت کے جبر استبداد، استحصال کا اصل چہرہ عوام کو پہلی بار دیکھنے کا موقع ملا۔ گویا صدر ایوب کی نام نہاد مقبولیت اور جمہوریت کی قلعی پوری طرح کھل گئی اور یہیں سے اس کا زوال شروع ہوگیا۔

ملک کے اندر ایسے ہی حالات کا فائدہ اٹھاتے ہوئے بھارت نے پہلے رن آف کچھ پر حملہ کیا اور پھر ۶، ستمبر ۱۹۶۵ء کو بین الاقوامی سرحدوں کی خلاف ورزی کر کے اس نے بغیر اعلان جنگ کیے لاہور پر حملہ کر دیا۔ سترہ دن کی جنگ کے بعد 'سیز فائر' ہوا، اور اس کے بعد روس کی مداخلت سے وہ معاہدہ تاشقند طے پایا جس پر صدر ایوب اور بھارتی وزیر اعظم لال بہادر شاستری نے دستخط کیے۔ اس معاہدہ کے بارے میں پاکستان میں عمومی تاثر یہی تھا کہ ہم نے جو کچھ میدانِ جنگ میں پایا تھا، اسے کانفرنس کی میز پر گنوا دیا گیا۔ اس کے نتیجے میں ایک ملک گیر احتجاج کا سلسلہ چل نکلا اور دیکھتے ہی دیکھتے حکومت کے خلاف جلسہ جلوس شروع ہوگئے۔

جب میں اور بھٹو ملے

پہلی ملاقات اور رابطہ

لاء کالج سے قانون کی ڈگری حاصل کرنے کے بعد میں قصور چلا آیا تاکہ وہاں جاکر وکالت کا آغاز کرسکوں۔ یہ میری ایک دیرینہ خواہش تھی کہ اپنے علاقہ کے لوگوں کی خدمت کروں اور ان کے مسائل حل کرنے کے لیے ان کے ساتھ تعاون کروں۔ مجھے کچہریوں میں دھوپ اور سردی کے موسم میں پریشان حال پھرتے ہوئے لوگوں سے ہمدردی تھی اور میں چاہتا تھا کہ ان لوگوں کی ہمت اور حوصلہ بڑھاؤں قصور میں تقریباً چار سال تک میں وکالت کرتا رہا۔ میں نے محسوس کیا کہ غریب لوگوں کے مسائل تو میرے اندازے سے بہت زیادہ ہیں، ان گنت لوگ ایسے ہیں جو مقدمات میں پھنس کر اپنی دولت، صلاحیت، توانائی اور وقت ضائع کر رہے ہیں۔ میں نے حالات کا تجزیہ اور اپنے ارد گرد پھیلے ہوئے بے شمار عوامی مسائل اور امور کا جائزہ لینے کے بعد بالآخر عملی سیاست میں اُتر آنے کا فیصلہ کر لیا۔ اس خیال سے

پہلے تجربہ اور آزمائش کے طور پر میں نے ۱۹۶۷ء میں قصور بار ایسوسی ایشن کے انتخابات میں حصہ لیا، کالج کے زمانے کی شہرت اور اظہار کی جرأت میرے کام آئی اور میں بار کا بلا مقابلہ سیکرٹری منتخب ہو گیا۔

میں اگرچہ قصور میں وکالت کر رہا تھا مگر لاہور کے سیاسی حلقوں، تعلیمی اداروں اور خاص طور پر طالب علم برادری سے میرا رابطہ بدستور قائم رہا۔ میں گاہے بگاہے اپنی پیشہ ورانہ مصروفیات اور نجی معاملات کے سلسلے میں لاہور آتا رہتا تھا۔

معاہدہ تاشقند کے خلاف عوام میں جو شدید نفرت اور بے زاری پائی جاتی تھی، مجھے اس کا بڑی شدت سے احساس تھا۔ میں نے اس معاہدہ کے خلاف لاہور میں ایک جلوس کی قیادت کی تھی جس میں یوں تو بظاہر طلباء ہی شریک ہوئے تھے مگر حقیقت یہ ہے کہ شہریوں کی ایک بڑی تعداد اس جلوس میں شامل ہو گئی تھی۔ اس جلوس کی قیادت کرنے کے الزام میں مجھے پولیس نے گرفتار کر لیا تھا اور مجھ پر مقدمہ بھی چلایا گیا تھا۔ معاہدہ تاشقند کے خلاف عوام کا احتجاج دراصل ایوب آمریت کے خلاف عوام کے جذبات کا ہی ایک روپ تھا۔ ادھر دوسری طرف اس قسم کی خبریں بڑی شد و مد کے ساتھ سننے میں آ رہی تھیں کہ ایوب خان کی کابینہ میں وزیر خارجہ ذوالفقار علی بھٹو نے معاہدہ تاشقند کی پرزور مخالفت کی تھی اور ان کا موقف عوام کی اس سوچ کے نزدیک ترین بتایا جاتا تھا کہ "ہم نے جو کچھ میدانِ جنگ میں حاصل کیا اسے کانفرنس کی ٹیبل پر گنوا دیا"۔

اس سے پہلے اقوام متحدہ کی سلامتی کونسل میں وزیر خارجہ ذوالفقار علی بھٹو نے جس قدر گرمجوشی اور ولولہ انگیز طریقے سے پاکستان کے موقف کی وضاحت کی تھی اور خاص طور پر کشمیر کا ذکر کیا تھا۔ اس نے عوام کے ذہنوں میں بھٹو کی شخصیت کا ایک ایسا نقش اور خاکہ بنا دیا تھا جو انتہائی پرکشش اور سحر انگیز تھا اور لوگ رفتہ رفتہ ان سے محبت کرنے لگے تھے۔ اس کے دو اسباب تھے ایک تو یہ کہ بھٹو (جیسا کہ لوگوں کا خیال تھا) ایوب خان کے آمرانہ رویہ کا شکار ہو رہے تھے اور دوسرا یہ کہ بھٹو نے معرکہ ستمبر ۱۹۶۵ء کے بعد اقوام متحدہ میں پاکستان کی نمائندگی کرتے ہوئے بھارت کے ساتھ ایک ہزار سال تک جنگ کرنے کا اعلان واشگاف الفاظ میں کیا تھا۔ اہل پنجاب کو بھٹو کی یہ ادا بہت پسند آئی تھی کیونکہ وہ ہر اس شخص کو پسند کرتے ہیں جو بھارت کو للکارتا ہے، پنجاب نے

بھارت دشمن رویہ کو ہمیشہ ہی تحسین کی نظروں سے دیکھا ہے۔ اس کی جو سیاسی، سماجی یا نفسیاتی وجوہات ہیں یہاں ان کے تجزیہ اور جائزہ کا محل نہیں۔ بہر حال یہ ایک ایسی حقیقت ہے، جسے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

ابھی عوام میں بھٹو کی شخصیت اپنا مقام بنا ہی رہی تھی کہ اچانک ان کو ایوب خان نے حکومت سے علیحدہ کر دیا۔ سرکاری طور پر بتایا گیا کہ بھٹو نے ذاتی وجوہات کی بنا پر استعفیٰ دے دیا اور وہ اپنے کانوں میں ہونے اور رہنے والی تکلیف کا علاج کرانے کے لیے جرمنی جا رہے ہیں لیکن غیر سرکاری طور پر یہی مشہور تھا کہ بھٹو صاحب سے ان کی مرضی کے خلاف استعفیٰ لیا گیا ہے اور ان کو زبردستی وزارت سے علیحدہ کیا گیا ہے کیونکہ معاہدہ تاشقند کے موقع پر ان کا رویہ انتہائی غیر مناسب تھا ایک افواہ یہ بھی تھی کہ انہوں نے معاہدہ پر دستخط ہونے کے بعد بھارتی وزیر اعظم اور وزیر خارجہ سے ہاتھ ملانے کی سفارتی رسم بھی نہیں نبھائی تھی۔ بعض زندہ دل تو اس معاہدہ کے دستخط ہونے کی تقریب کے فوٹو میں سنجیدہ اور متفکر بھٹو کے چہرے کے خدوخال کو بھی معنی خیز اور آنے والے "برے" دنوں کی جھلک سے تعبیر کرتے تھے۔ اے بی اعوان نے جو ہوم سیکرٹری کی حیثیت سے وفد میں شامل تھے کہا کہ بھٹو ٹھیک رہتا تھا مگر جب کیمرے کے سامنے آتا تو سنجیدہ اور اداس ہو جاتا۔

جیسا کہ میں پہلے کہہ چکا ہوں کہ میرا لاہور کے سیاسی حلقوں سے بدستور رابطہ تھا اور یوں مجھے اہم خبریں حاصل ہوتی رہتی تھیں۔ جون کے وسط میں مجھے جو اہم خبر ملی وہ یہ تھی کہ بھٹو کا استعفیٰ منظور ہو گیا ہے اور وہ ۲۲ جون کو صبح ساڑھے نو بجے خیبر میل کے ذریعے لاہور آ رہے ہیں، یہ خبر سنتے ہی میرے دل میں بھٹو صاحب کے لیے محبت، ہمدردی اور حوصلہ افزائی کے جذبات ابھرے۔ میں نے اپنے طور پر فیصلہ کیا کہ بھٹو کا شاندار استقبال کیا جانا چاہیے حالانکہ یہ وہی بھٹو تھا جسے ۱۹۶۲ء میں، میں نے پنجاب یونیورسٹی کے اولڈ کیمپس کے سینٹ ہال میں اس وقت بھرے مجمعے میں اٹھ کر تقریر کرنے سے روک دیا تھا جب وہ ایوب خان کی حکومت کی پالیسیوں کے حق میں رائے عامہ کو ہموار کرنے کے مشن کے تحت ایک تقریب سے خطاب کر رہے تھے۔ اس تقریب میں میری بھٹو سے خاصی تو تو میں میں ہو گئی تھی اور میں ان کو (اس وقت) ایوب خان کا وزیر سمجھ کر ان سے الجھ پڑا تھا لیکن اب میرے دل میں اسی بھٹو کے لیے محبت اور چاہت کے جذبات اس لیے امڈ آئے تھے کہ وہ آمریت کے ایوان

سے باہر نکل آئے تھے۔ مجھے آمریت کے ترجمان وزیر کی بجائے بھٹو کا یہ روپ زیادہ پسند آیا جب وہ خاموش مسافر کی حیثیت سے پنجاب کے دل لاہور میں آ رہا تھا۔

مجھے جس روز یہ خبر ملی میں نے اسی روز حبیب جالب کو تلاش کرنا شروع کر دیا۔ تاہم تلاش بسیار کے بعد وہ ایک شام مجھے پاک ٹی ہاؤس میں مل گئے۔ میں چاہتا تھا کہ حبیب جالب کو بھٹو کی آمد کے موقع پر چند اشعار کہنے کے لیے تیار کروں اور مجھے یہ بھی معلوم تھا کہ حبیب جالب ایک خوددار، انا پرست اور درویش صفت شاعر ہیں۔ انہوں نے اگر ایک بار انکار کر دیا تو معاملہ بگڑ جائے گا۔ گفتگو کا آغاز بھٹو کی آمد کے ذکر سے ہوا، میں نے محسوس کیا کہ حبیب جالب بھٹو کے لیے نرم گوشہ رکھتے ہیں لہٰذا میں نے اپنا مدعا بیان کر دیا۔ وہ تیار ہو گئے۔ میں ان کو وہاں سے اپنے دفتر واقع ۴۵ مال روڈ پر لے گیا جہاں انہوں نے میری فرمائش پر ایک سادہ سے کاغذ پر پنسل سے چند اشعار لکھ کر دے دیئے جو لعد میں زبان زدِ عام ہو کر بہت مشہور ہوئے۔

دست خزاں میں اپنا چمن چھوڑ کر نہ جا

میں نے یہ نظم نوائے وقت پریس سے تقریباً دس ہزار کی تعداد میں چھپوائی اور دوسرے روز ہی اسے سارے لاہور کے تعلیمی اداروں اور ہوسٹلوں میں تقسیم کرا دیا۔ یہ نظم ایک طرح سے پوسٹر تھا کیونکہ اس پر بھٹو کی لاہور آمد کی تاریخ اور وقت بھی درج تھا۔ یہ اس نظم نما پوسٹر کا ہی اثر تھا کہ ۲۲ جون کو جب بھٹو لاہور پہنچے تو ریلوے اسٹیشن پر موجود پچاس ہزار کے لگ بھگ عوام جن میں سے اکثریت یونیورسٹی اور کالجوں کے طلباء کی تھی۔ میرے پرجوش نعروں کا جواب دیتے تھے۔ اس استقبال میں، میں نے خوب سرگرمی اور جوش سے حصہ لیا اور میں اس استقبال کا ایک غیر سرکاری آرگنائزر تھا۔

بھٹو صاحب کو حکومت نے مستعفی ہو کر اپنے گھر جانے تک پروٹول کے مطابق سیلون کی سہولت دے رکھی تھی چنانچہ جب گاڑی ریلوے اسٹیشن پر پہنچی تو بھٹو صاحب کے سیلون کو پولیس نے اپنی نگرانی میں لے لیا۔ بھٹو صاحب نے سیلون کی کھڑکی کا شیشہ ہٹایا اور چند لمحے دیکھنے کے بعد مجھے اندر آنے کا اشارہ کیا۔ عام حالات میں ممکن ہے کسی کو اندر جانے کی اجازت یا سہولت نہ دی جاتی مگر چونکہ انہوں نے خود بلایا تھا لہٰذا راستہ صاف کر دیا گیا اور میں سیلون کے

اندر گیا۔

میں نے بھٹو سے جاکر ہاتھ ملایا اور انہیں درخواست کی کہ وہ سیلون سے باہر آکر چند کلمات کہیں، کیونکہ لاہور اور مضافات سے آئے ہوئے ہزاروں افراد ان کی ایک جھلک دیکھنے اور ان کی زبان سے چند الفاظ سننے کو بے تاب ہیں۔ عین اس وقت جب بھٹو اٹھ کر شاید میرے ساتھ باہر آنے کو تیار ہی ہوئے تھے، اچانک ان کے سرکاری سٹاف میں شامل ایک "سفید پوش" نے ان کے کان میں انتہائی آہستگی سے کچھ کہا اور بھٹو میری طرف بے بسی کے ساتھ دیکھ کر رہ گئے، میں سمجھ گیا کہ کیا معاملہ ہے؟ — لہٰذا میں نے اصرار نہیں کیا۔

لاہور میں بھٹو کو اسی سہ پہر گورنر نواب آف کالا باغ نے کھانے یا چائے کی دعوت دے رکھی تھی۔ اور ان کا قیام فلیٹیز ہوٹل میں تھا۔ وہ سیلون سے باہر نکلے، لوگوں کے اژدہام کے باعث عام راستے سے جانا ممکن نہیں تھا۔ لہٰذا میں اور میرے چند ساتھی ان کو کسی نہ کسی طرح ریلوے اسٹیشن کے مال گودام میں لے آئے اور پھر فوراً ہی انہیں وہاں سے عقبی دروازے سے باہر لے گئے۔ اسی مال گودام میں اتفاق سے ایک فوٹو گرافر موجود تھا۔ جس نے اس تاریخی لمحہ کو اپنے کیمرہ میں محفوظ کر لیا۔ اسی جگہ وہ رومال ہزار روپے میں فروخت ہوا جس سے بھٹو نے اپنی آنکھوں کی نمی خشک کی تھی۔

بھٹو عوام کا جذبہ، ولولہ اور جوش دیکھ کر واقعی جذباتی ہو گئے تھے مگر وہ بول نہیں سکتے تھے۔ ایک گاڑی مال گودام کے عقبی دروازے پر لائی گئی اور ہم بھٹو صاحب کو فلیٹیز ہوٹل لے گئے۔ اس کے بعد مجھے بھٹو صاحب کا ایک خط ملا جس میں انہوں نے مجھے کچھ لکھا تھا۔ اس کے بعد میرا ان کے ساتھ خط و کتابت کا سلسلہ چل نکلا۔ میں نے (ممکن ہے بعض دوسرے لوگوں نے بھی) ان کے ذہن میں رفتہ رفتہ یہ خیال اور تصور ابھارنا شروع کر دیا کہ ملکی سیاست میں عوام کی بے پناہ مقبولیت کے باعث وہ (بھٹو) ایک اہم کردار ادا کر سکتے ہیں لہٰذا اس کے لیے ضروری ہے کہ وہ ایک نئی سیاسی پارٹی تشکیل دیں۔ جو روایتی اندازِ سیاست کی بجائے عوامی سطح پر اپنی جدوجہد کا آغاز کرے۔

اس وقت بھی صورت حال کچھ یوں تھی کہ نہ قوم ایوب خان کے ساتھ تھی اور نہ قوم اس زمانے کی متحدہ اپوزیشن کے ساتھ تھی۔ بلکہ قوم ایک تیسرا گروپ اور دھڑا بن کر خاموش تماشائی کی شکل

میں دور سے بیٹھی سیاسی تماشہ دیکھ رہی تھی اور یہ ایک ایسا وقت ہوتا ہے جب کہ ملک کے اندر کسی نئے سیاسی لیڈر کی آمد آمد ہوتی ہے۔ بھٹو صاحب ان حالات کو خوب اچھی طرح بھانپ چکے تھے۔ کچھ ہم نے بھی ان کے خون کو گرمایا اور ان کو ترغیب دی کہ اس تیسرے گروپ "خاموش اکثریت" کی توقعات پر پورا اتریں۔

گول باغ کی فرمائش

فیصلہ ہوا کہ ایک ٹسٹ ایکسر سائز یعنی (TEST EXERCISE) تجرباتی آزمائش کے طور پر ذوالفقار علی بھٹو کو لاہور بلایا جائے۔ چنانچہ ۲۲ جون ۱۹۶۷ء کو لاہور کے گول باغ (اب ناصر باغ) میں بھٹو صاحب کے ایک جلسہ عام کا پروگرام بنایا گیا اور اس کے لیے اس زمانے میں مصر اور اسرائیل کے درمیان لڑی گئی جنگ رمضان کے پس منظر میں خارجہ پالیسی کے تجزیہ کے لیے بھٹو صاحب کو تقریر کی دعوت دی۔ اس جلسہ کے انعقاد کے لیے دوستوں کی ایک ٹیم بنائی گئی جس میں ملک حامد سرفراز، فاروق بیدار، پرویز اختر، آفتاب ربانی، راجہ منور، خرم اور دوسرے کئی دوست شامل تھے۔ ہم نے مشترکہ طور پر اس جلسہ کے انتظامات شروع کر دیئے۔

جلسہ کا وقت حسب معمول شام کا تھا۔ لیکن دوپہر ہی سے زندہ دلان لاہور جوق در جوق جلسہ گاہ میں آنا شروع ہو گئے تھے۔ نوجوانوں کی ٹولیاں روایتی انداز میں بھنگڑا ڈالتی آرہی تھیں اور ہر زبان پر بھٹو ہی بھٹو تھا۔ تعداد کے اعتبار سے یہ ایک کامیاب جلسہ تھا لیکن ابھی جلسہ کی باقاعدہ کارروائی کا آغاز نہیں ہوا تھا کہ کنونشن مسلم لیگ کے گماشتوں نے اپنے غنڈوں کی مدد سے جلسہ میں بھگدڑ مچا دی۔ انہوں نے اس قدر اودھم مچایا کہ لاؤڈ اسپیکر کی تاریں کاٹ دیں اور پھر انتہا یوں کر دی کہ بجلی کی تاریں کاٹ کر باغ میں چھوڑے گئے پانی میں گرا دیں جس سے پانی میں کرنٹ آ گیا اور لوگ بے تحاشا خوف و ہراس میں جان بچانے کے لیے اِدھر اُدھر بھاگنے لگے۔ اسی اثنا میں انہوں نے مخالفانہ نعرے بلند کرنے شروع کر دیئے اور پھر وہ سٹیج پر موجود بھٹو پر حملہ آور ہوئے۔ ہم لوگوں نے اپنی جان کی پرواہ نہ کی اور بھٹو کو بچا کر باہر مال روڈ پر لے گئے جہاں ایک رکشہ والا کھڑا تھا۔ جس کا نام بعد میں معلوم ہوا کہ روشن علی تھا۔ ہم نے بھٹو

کو وہاں سے فوری طور پر گورنمنٹ کالج کے پرنسپل کے گھر پہنچا دیا کیونکہ اس کے سوا کوئی دوسرا چارہ نہیں تھا۔ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ غنڈے بھٹو کی جان کے در پے ہیں۔

بھٹو کو رکشہ میں بٹھا کر میں ایک بار پھر واپس باغ میں چلا آیا جہاں غنڈے دندناتے پھر رہے تھے۔ میں نے آگے بڑھ کر ان کی راہ میں مزاحمت پیدا کرنے کی کوشش کی تو وہ مجھ پر پل پڑے، میں اس پانی میں جا گرا جس میں بجلی کا کرنٹ تھا، لہٰذا مجھے بجلی کے جھٹکے لگے۔ مجھے چند ساتھیوں نے کسی نہ کسی طرح وہاں سے بچا کر باہر نکالا اور ریال روڈ پر واقع کافی ہاؤس لے آئے جہاں پر اس وقت شورش کاشمیری (مرحوم)، اور چند دوسرے اکابرین بیٹھے تھے۔ وہاں پہنچتے ہی میں بے ہوش ہو گیا۔ مجھے فوراً دوستوں نے ابتدائی طبی امداد دی اور یوں کچھ ہوش بحال ہوئے تو مجھے گھر پہنچا دیا گیا۔

ہماری جلسہ گاہ میں ہنگامہ آرائی کی گئی تھی لیکن انتظامیہ نے انتہائی مکاری اور چالبازی سے خود ہمارے خلاف مقدمات بنا دیئے۔ چنانچہ ہم دوستوں نے لاہور کے سیشن جج کی عدالت سے اپنی ضمانتیں قبل از گرفتاری کرا لیں اور یوں خود کو گرفتاری سے محفوظ کر لیا۔

ایوب حکومت چھوڑنے کے بعد بھٹو کا پنجاب میں یہ پہلا دھماکہ تھا۔ اگرچہ اس جلسہ میں وہ تقریر نہ کر سکے کیونکہ مائیکروفون کے تار کاٹ دیئے گئے اور جلسہ کا نظام درہم برہم کر دیا گیا تھا لیکن اس موقع پر عوام کے جوش و خروش، دلچسپی اور دوستانہ جذبات کے اظہار سے یہ بات ثابت ہو گئی تھی کہ لوگ بھٹو سے محبت کرتے ہیں اور پسند کرتے ہیں اور اس بات سے ہمیں اپنے اس خیال کو حوصلہ افزائی میسر آئی کہ نئی سیاسی جماعت پاکستان پیپلز پارٹی قائم کی جائے۔

بھٹو۔ بلھے شاہ کی نگری میں

۲۷، نومبر، ۱۹۶۶ء کو میں نے ذوالفقار علی بھٹو کو قصور یعنی بابا بلھے شاہ کی نگری آنے کی دعوت دی اور وہ اس کو قبول کرتے ہوئے اپنے چند ساتھیوں سمیت وہاں تشریف لائے۔ ان ساتھیوں میں خورشید حسن میر، حفیظ پیرزادہ، عبدالوحید کٹپر، غلام مصطفےٰ کھر، امیر بخش بھٹو وغیرہ شامل تھے۔ قصور میں بھٹو کی آمد سے پہلے ہی مقامی انتظامیہ نے دفعہ ۱۴۴ نافذ کر دی لیکن ہماری پرانی خاندانی حویلی میں اتنی گنجائش

ضرور تھی کہ عوام کی ایک بھاری تعداد اس میں جمع ہو جاتی۔ جلسہ ہونے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا لہٰذا ہم نے جلسۂ عام کے انتظامات کے تحت ہی اپنی حویلی کے اندر بھٹو صاحب کی تقریر کا انتظام کیا۔ لوگوں کے شوق کا یہ عالم تھا کہ بھٹو کی آمد سے پہلے ہی پورا صحن بھر گیا، چھتیں اور منڈیریں پُر ہو گئیں اور حویلی کے احاطہ میں جدھر نظر جاتی انسان ہی انسان نظر آتے۔ اس کے علاوہ حویلی کے باہر دیواروں پر بھی لوگ کھڑے تھے۔ سارا شہر قصور امڈ کر سڑکوں پر نکل آیا۔ حتیٰ کہ پولیس کو لاٹھی چارج کرنا پڑا لیکن لوگ دیوانہ وار ہماری حویلی کی طرف بڑھتے جہاں بھٹو تقریر کرنے والے تھے۔

بھٹو اتنے لوگوں کو دیکھ کر بجا طور پر خوش اور مطمئن ہوئے مگر میرے خیال میں وہ قدرے جذباتی بھی ہو گئے لہٰذا اپنی اس تقریر کے دوران انہوں نے پہلی مرتبہ خود اپنی زبان سے اس امر کا اظہار کیا کہ وہ بہت جلد ایک پارٹی بنانے والے ہیں جو ملکی سطح پر قائم کی جائے گی اور اس کا نام پاکستان پیپلز پارٹی ہو گا، لہٰذا میں بجا طور پر کہتا ہوں کہ پاکستان پیپلز پارٹی کی بنیاد میرے ہی گھر قصور میں رکھی گئی۔ کیونکہ میرے گھر میں ہونے والے اس اجتماع سے خطاب کرتے ہوئے بھٹو نے پہلی بار اس کے قیام کا اظہار اور اعلان کیا تھا۔ یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ قصور کوئی بہت بڑا شہر نہیں ہے لیکن اس میں عوام کی ایک بھاری تعداد نے شرکت کی تھی اور بڑے والہانہ انداز میں بھٹو کا استقبال کیا تھا۔ جس سے یہ بات ظاہر ہوتی تھی کہ مستقبل میں نہ صرف بڑے شہر بلکہ چھوٹے شہر اور قصبات سے بھی بھٹو کو بے پناہ جوش و خروش کے ساتھ خوش آمدید کہا جائے گا اور ان کی پارٹی کو مقبولیت حاصل ہو گی۔

جب میں نے بھٹو صاحب کو قصور آنے کی دعوت دی اور انہوں نے میری دعوت کو قبول کر لیا تھا تو مجھے احساس ہوا کہ اب کیا کیا جائے اور کیا کیا جانا چاہیئے، کیونکہ کوئی باقاعدہ تنظیم یا گروپ ایسا موجود نہیں تھا جو انتظامات میں میری مدد یا رہنمائی کرتا۔ بہر حال میں چونکہ ایک تربیت یافتہ سیاسی کارکن تھا، لہٰذا میں نے اپنی عقل و فہم سے کام لیتے ہوئے سب سے پہلے تقریباً دو ہزار اشتہار چھپوائے جن میں ذوالفقار علی بھٹو کی قصور میں آمد کا پروگرام تھا۔ اس اشتہار میں بھٹو کی شخصیت کو نہایت مؤثر اور پرکشش انداز میں ابھارا گیا تھا۔ یہ بات بتانے کی ضرورت نہیں کہ قصور ایک کاروباری شہر ہے اور ایوب خان کا دبدبہ اس وقت خاصا طاقتور تھا لہٰذا کوئی شخص آگے آ کر

کھلم کھلا دست تعاون بڑھانے کو بھی تیار نہ تھا۔ میں تن تنہا تھا اور میرے پاس یہ دو ہزار پوسٹر تھے جنہیں میں نے آغا شورش کاشمیری کے چٹان پریس سے چھپوایا تھا۔ آغا صاحب بڑے وضعدار اور دوستوں کے دوست آدمی تھے لہٰذا ایسے چھوٹے موٹے کام وہ رو داری میں ہی کر دیا کرتے تھے۔

رات ڈھلنا شروع ہوئی تو میں ذہنی طور پر اپنے منصوبہ پر عمل درآمد کرنے کے لیے تیار ہو گیا۔ میں نے اپنے ایک دیرینہ خدمت گار بابا کرم دین انصاری کی مدد سے اشتہار چسپاں کرنے کے لیے "لیٹی" تیار کی اور پھر جب سارا شہر قصور سو گیا تو میں سکوٹر پر سوار ہو کر شہر میں پوسٹر چسپاں کرنے کیلئے نکل کھڑا ہوا، صورت حال یوں تھی کہ میں سکوٹر چلا رہا تھا اور میرے پیچھے بابا کرم دین "لیٹی" کا ڈول اور پوسٹروں کا بنڈل احتیاط سے سنبھالے بیٹھا تھا۔ بابا کرم دین خاصا دراز قد تھا لہٰذا اس کو اشتہار چسپاں کرنے میں کوئی دقت نہیں ہو رہی تھی۔ ہم دونوں نے اہم مقامات اور نمایاں جگہوں پر ساری رات میں تقریباً اڑھائی تین سو اشتہار چسپاں کر دیئے۔ چنانچہ اگلی صبح جب اہل قصور گھروں سے باہر نکلے تو در و دیوار پر بھٹو کی آمد کے اشتہار سجے ہوئے دیکھ کر وہ انگشت بدنداں رہ گئے اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے لوگوں اور خاص طور پر نوجوان طلباء نے میرے گھر کا رُخ کرنا شروع کر دیا، کیونکہ اشتہار میری طرف سے جاری کیا گیا تھا اور میں قصور میں کوئی اجنبی یا نووارد تو نہیں تھا۔

میں نے اپنی حویلی میں ایک طرف اپنا ڈیرہ جما لیا۔ عام طور پر لوگ آتے تو بھٹو کی آمد کا پروگرام، جلسہ کی تفصیلات اور دوسری معلومات حاصل کرتے جس سے ان کے شوق اور دلچسپی کا بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا تھا۔ اس طرح میرے ڈیرے پر ہر صبح اور ہر شام رونق میں اضافہ ہوتا چلا گیا۔ عام طور پر لوگوں کی نفسیات یہی ہے کہ وہ اشتہار یا پوسٹر ضرور طلب کرتے ہیں شاید اس لیے کہ یہ مفت میں مل جاتا ہے۔ چنانچہ مجھ سے بھی یہی مطالبہ کیا جانے لگا۔ میری ہدایت پر بابا کرم دین نے وہ اشتہارات جو ظاہر ہے کہ ہم ایک ہی رات میں تمام کے تمام تو چسپاں نہیں کر سکے تھے۔ ان کے چار چار پانچ پانچ کے بنڈل بنا دیئے۔ چنانچہ جب کوئی آ کر پوسٹر طلب کرتا، میں بابا کرم دین سے پوچھتا: بابا کوئی اشتہار ہے؟ وہ میری ہدایت کے عین مطابق سنجیدگی سے انکار کر دیتا۔ ادھر پوسٹر مانگنے والے کا اصرار بڑھتا تو میں بابا سے پھر کہتا کہ وہ اندر جا کر دیکھے اگر کوئی بچا کھچا پوسٹر پڑا ہے تو اسے لا دے، وہ اندر جا کر تین چار پوسٹر لا دیتا۔

اس "اداکاری" کا مقصد ایک تو یہ تھا کہ لوگوں میں پوسٹر کی اہمیت کو اجاگر کیا جائے تاکہ وہ اسے محض ردی نہ سمجھیں اور دوسرا یہ کہ صرف ایسے لوگوں کو پوسٹر دیئے جائیں جو ان کو مناسب طور پر استعمال کریں اور ان مقامات پر بھی پوسٹر چسپاں ہو جائیں جہاں تک ہم نہیں پہنچ سکے۔ یہ طریقہ کار موثر رہا اور دیکھتے ہی دیکھتے نہ صرف قصور شہر بلکہ مضافات اور دوسرے شہروں کو جانے والی بسوں اور لاریوں پر بھی یہ پوسٹر چسپاں دکھائی دینے لگے جس سے بلاشبہ بھٹو کی مقبولیت میں گرانقدر اضافہ ہوا۔

ڈیرہ پر آنے والوں میں سے بعض کی خواہش تھی کہ انہیں استقبالیہ، انتظامیہ اور ایسی ہی قسم کی دوسری کمیٹیوں میں سے کسی ایک کمیٹی میں شامل کر لیا جائے۔ لیکن اس کے لیے بھی میں نے ان کو خوب احساس دلا کر اور اہمیت جتا کر شامل کیا۔ اگرچہ تمام کمیٹیوں میں گنجائش موجود تھی لیکن میں نے نہ تو کسی کو خود جا کر درخواست کی اور نہ ہی کسی کو بغیر روک ٹوک کے کسی کمیٹی میں شامل ہونے دیا۔ کیونکہ مجھے احساس تھا کہ اگر لوگوں کو بغیر کسی احساس یا رکاوٹ کے کوئی عہدہ یا ذمہ داری سونپ جائے تو وہ اس کی قدر نہیں کرتے اور اس کو بڑا نیم دلی کے ساتھ قبول کرتے ہیں جو ظاہر ہے کہ اس موقع پر میرے لیے قابل قبول بات نہیں تھی۔ لوگوں کے جوش و خروش اور گہما گہمی کے باعث دو تین دنوں میں ہی یہ تمام کمیٹیاں تشکیل دے دی گئیں۔

جب میرے پاس اڑھائی تین سو کے لگ بھگ کارکن جمع ہو گئے تو میں نے انہیں باقاعدہ پہلے تو نفسیاتی طور پر آگے بڑھنے کے لیے تیار کیا اور پھر انہیں باقاعدہ تربیت دی کہ کیسے مسٹر بھٹو کو خوش آمدید کہا جائے گا۔ کیسے ان پر پھول نچھاور کئے جائیں گے۔ کیا کیا نعرے لگائے جائیں گے اور کس موڑ پر ان کو کیسے آگے لایا جائے گا۔ چنانچہ یہ میری اس منصوبہ بندی اور لوگوں کے تعاون کا جیتا جاگتا ثبوت تھا کہ جب ذوالفقار علی بھٹو قصور پہنچے تو یوں محسوس ہوا جیسے بلھے شاہ کی نگری کا ہر باسی ان کو خوش آمدید کہنے کے لیے آ گیا ہے۔

بھٹو۔ بس بھٹو تھا

یہ ۱۴ اگست ۱۹۶۸ء کا واقعہ ہے۔ ظاہر ہے کہ یوم آزادی تھا اور پوری قوم یہ دن روایتی

جوش و خروش سے منا رہی تھی ۔ میں ان دنوں کراچی میں بھٹو صاحب کے پاس ہی تھا اور بھی چند دوست موجود تھے۔ پروگرام بنا کہ آج کے دن کی مناسبت سے بطور خاص مزار قائد اعظم پر حاضری دی جائے اور فاتحہ خوانی کی جائے۔ بھٹو صاحب نے بھی اس تجویز سے اتفاق کیا اور بخوشی چلنے پر تیار ہو گئے اور یوں تھوڑی ہی دیر کے بعد ہم لوگ چھ سات گاڑیوں میں ۔ ۷ کلفٹن سے مزار قائد روانہ ہو گئے۔

موسم بہت خوشگوار اور اجلا اجلا سا تھا۔ ہر شخص خوش تھا اور خاص طور پر بھٹو صاحب کا موڈ بہت اچھا تھا ۔ وہ بات بات پر چہک رہے تھے اور میں ان کی گاڑی میں ہی ان کے ہمراہ بیٹھا تھا۔ یونہی ہم مزار قائد پر پہنچے ۔ وہاں اور بھی بہت سے لوگ آجا رہے تھے ان لوگوں نے بھٹو کو دیکھا تو رک گئے اور یوں ایک اچھا خاصا مجمع لگ گیا۔ ہم نے جوتیاں مزار سے باہر اتار دیں اور اندر چلے گئے۔

فاتحہ خوانی کے بعد جب ہم باہر نکلے تو سب نے اپنے اپنے جوتے تلاش کر کے پہن لیے مگر میں نے دیکھا کہ بھٹو صاحب اِدھر اُدھر کچھ تلاش کر رہے ہیں اور جب غور سے دیکھا تو وہ ننگے پاؤں تھے۔ میں سمجھ گیا کہ انہیں ان کا اٹیلین جوتا نہیں مل رہا ۔ (وہ عموماً اٹلی کے جوتے ہی استعمال کرتے تھے) میں نے پھر بھی پوچھا۔ کیا بات ہے؟ مسکرا کر بولے : جوتا نہیں مل رہا۔

یہ سن کر باقی لوگ بھی متوجہ ہوئے، سب نے مل کر بھٹو صاحب کا جوتا تلاش کیا جو نہیں ملا۔ آخر مایوس ہو کر تلاش ترک کرنا پڑی، نہایت نفیس سوٹ میں ملبوس بھٹو ننگے پاؤں ہی چلنے والے تھے کہ ایک کارکن نے آگے بڑھ کر اپنی چپل پیش کی جو انتہائی معمولی تھی ۔ یہ چپل پہن کر بھٹو آہستہ آہستہ کار تک پہنچے اور جونہی کار روانہ ہوئی وہ بولے :

میری جوتیاں اسی آدمی نے چرائی ہیں ۔

میں نے حیرت سے کہا : وہ کیسے ؟

وہ مسکرا کر بولے : ورنہ اس کو کیسے معلوم ہوا کہ اس کا اور میرا پاؤں کا ناپ ایک ہی ہے میں نے جواب دیا : مگر اس کا خلوص ؟ تب انہوں نے ایکدم پینترا بدل کر قہقہہ لگاتے ہوئے کہا۔ مجھے معلوم ہے جس نے بھی میرے جوتے اٹھائے ہیں ۔ بڑی عقیدت اور محبت سے اٹھائے ہیں ۔! اور اس کے ساتھ ہی انہوں نے ڈرائیور سے کہا، علی احمد تالپور کے گھر چلو ۔

میر علی احمد تالپور ان دنوں ابھی پیپلز پارٹی میں شامل نہیں ہوئے تھے اور ان کی کوٹھی مزار قائد کے نزدیک ہی دادا بھائی نوراں جی روڈ پر واقع تھی میں نے اس اچانک فیصلہ پر انکی جانب حیرت سے دیکھا تو انہوں نے اسے بھانپتے ہوئے کہا۔

Do you know what is politics?

پھر میرا جواب سنے بغیر بولے:

Just wait I will show you..

اور پھر شیشے سے باہر جھانکتے ہوئے کراچی کے خوبصورت موسم سے لطف اندوز ہوتے لگے۔ میں نے یہی خیال کیا کہ آج بھٹو صاحب بہت اچھے موڈ میں ہیں۔ بس ذرا شغل کریں گے۔

میں ابھی تک کوئی فیصلہ نہیں کر پایا تھا کہ اچانک گاڑی میر صاحب کی کوٹھی میں داخل ہوئی جنہیں ہماری آمد کی خبر ہوئی' بڑی محبت اور خلوص کے ساتھ ہمیں خوش آمدید کہتے ہوئے اپنی لائبریری میں لے گئے کیونکہ بھٹو صاحب نے میر صاحب کے ساتھ ہاتھ ملاتے ہی ٹھیٹ سندھی میں کہا تھا: میں وہاں نہیں بیٹھوں گا جہاں تم سارے زمانے کے ساتھ بیٹھتے ہو۔ بلکہ میں آج وہاں بیٹھوں گا جہاں تم اکیلے ہوتے ہو۔"

اس پر زبردست قہقہہ پڑا اور یوں میر صاحب ہمیں اپنی لائبریری میں لے آئے۔ ایکدم میر صاحب نے بھٹو صاحب کو دیکھا اور دیکھتے ہی رہ گئے۔ بھٹو صاحب ننگے پاؤں تھے؛ مگر وہ آداب محفل کے پیش نظر خاموش رہے، ادھر بھٹو بھی تاڑ گئے کہ میر صاحب نے ان کے ننگے پاؤں دیکھ لیے ہیں۔ لہذا بلا توقف بولے، میر صاحب آپ پیپلز پارٹی میں شامل ہو جائیں۔ میر صاحب اس اچانک دعوت یا پیشکش کے لیے ذہنی طور پر تیار نہیں تھے لہذا وہ پہلے تو ششدر رہ گئے لیکن پھر بولے: سائیں، اس کی کیا ضرورت ہے؟ ابھی بھٹو کچھ کہنے ہی والے تھے کہ انہوں نے کہا: میرا چھوٹا بھائی تو پہلے ہی آپ کے ساتھ ہے بس یوں سمجھیئے وہ میں ہی ہوں۔ لیکن بھٹو بھی کچی گولیاں نہیں کھیلتے تھے۔ یہ سب کچھ نظر انداز کر کے بولے: میر صاحب آج تو آپ کو میری بات ماننا پڑے گی۔

میر صاحب نے مہمان کی عزت اور توقیر کا خیال رکھتے ہوئے رسماً کہا: اچھا ٹھیک ہے۔ سائیں۔ سوچتے ہیں۔ کچھ موقع اور وقت تو دیں آپ!۔

یہ سنتے ہی بھٹو صاحب نے نہایت سنجیدگی سے کہا: میر صاحب دیکھیے، میں نے کہا ہے ناں آپ کو میری بات ماننا پڑے گی۔ میں آج ننگے پیر گھر سے چلا ہوں، اور میں نے اپنے ساتھیوں سے کہا تھا کہ دیکھو آج میں میر صاحب کو راضی کرنے کے لیے ننگے پاؤں جا رہا ہوں، وہ مجھے مایوس نہیں کریں گے، ۔ اب آپ کی جو مرضی ۔ بہر حال میں گھر سے ننگے پاؤں آیا ہوں اور خالی ہاتھ واپس نہیں جاؤں گا ۔ میں تو اب یہاں سے نہیں اٹھوں گا ۔ اور یہ کہہ کر وہ باقاعدہ آلتی پالتی مار کر بیٹھ گئے اور کوٹ اتار کر نزدیک قالین پر رکھ دیا۔ اب مجھے خیال آیا کہ بھٹو نے مجھے گاڑی میں آتے ہوئے کیا کہا تھا! مجھ سمیت بھٹو کے ساتھ آنے والا ہر شخص حیران تھا اور دل ہی دل میں میر علی احمد تالپور کی سادہ دلی پر مسکرا رہا تھا۔ جو سر جھکائے پوری سنجیدگی سے سوچ میں غلطاں تھے۔ اسی اثنا میں چائے آگئی اور بھٹو نے کہا۔ بس میر صاحب ۔ آج سے آپ ہمارے ساتھ ہیں اور اسی خوشی میں یہ ٹی پارٹی ہے ۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ میر صاحب نے اپنی خاندانی شرافت اور اخلاق کی اعلیٰ روایات کا احترام کرتے ہوئے ایسے مہمان کی دل شکنی نہ کی اور آہستہ سے بولے ۔ سائیں جیسے آپ خوش ۔ ویسے ہم !

یہ سنتے ہی ہم سب نے ایک دوسرے کو مبارک باد دی۔ بھٹو صاحب انتہائی خوش اور مسرور تھے اور عین اس وقت جب انہوں نے میر صاحب کو گلے لگایا۔ مجھے دیکھ کر انہوں نے نہایت شرارتی بچے کی طرح آنکھ ماری میں نے سنجیدگی سے آنکھوں ہی آنکھوں میں ان کو داد دی۔

اب یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ میر علی احمد تالپور جیسی دبنگ اور ہر دلعزیز شخصیت کی پیپلز پارٹی میں شمولیت سے سندھ میں پارٹی کی جڑیں اور زیادہ مضبوط ہو گئیں۔ پھر ایک فائدہ یہ ہوا کہ میر صاحب کراچی کے مشہور ریسٹورنٹ "شنگریلا" میں دوپہر کو مستقل بیٹھا کرتے تھے۔ جہاں کئی ممتاز دانشور، ادیب اور مفکر آکر بیٹھتے تھے۔ اب میر صاحب نے وہاں پی پی کے حق میں بولنا شروع کر دیا۔ جس سے علمی و ادبی حلقوں میں پی پی کے وقار میں اضافہ ہوا۔

پیپلز پارٹی کا قیام

جب چراغ سے چراغ جلا

پاکستان پیپلز پارٹی اس کنونشن کے بعد معرضِ وجود میں آئی جو ۳۰ نومبر اور یکم دسمبر ۱۹۶۷ء کو منعقد ہوا، ظاہر ہے کہ ہر شخص کو اس کے علاقہ میں پارٹی کے قیام اور تشکیل کے لیے کنوینر مقرر کیا گیا چنانچہ مجھے قصور کا کنوینر مقرر کیا گیا۔ اسی طرح مظفر گڑھ میں ملک غلام مصطفےٰ کھر کے بھائی ملک غلام مرتضیٰ کھر کو یہ ذمہ داری سونپی گئی۔

جب ان لوگوں نے اپنے اپنے علاقہ میں پارٹی کو متعارف کرانے کے لیے کام شروع کیا اور لوگ بھٹو کی شخصیت میں بے پناہ دلچسپی لیتے ہوئے جوق در جوق پیپلز پارٹی کے کنوینروں

کے ساتھ رابطہ قائم کرنے لگے۔ تو بالآخر جنوری ۱۹۶۸ء میں پنجاب پیپلز پارٹی کے دورہ پنجاب کا اہتمام کیا۔ یہ دورہ ملتان سے شروع ہونا تھا۔ لہذا دورہ شروع ہونے سے دو تین دن پہلے ہم نے ملتان روانہ ہونے کا پروگرام بنایا۔ اس کے لیے ڈاکٹر مبشر حسن کی ایک جیپ سے جانے کا فیصلہ ہوا۔ چونکہ ڈاکٹر صاحب انجینئر ہیں لہذا انہوں نے سائیٹ وغیرہ پر جانے اور دوسری پیشہ ورانہ مصروفیات کے لیے ایک جیپ رکھی ہوئی تھی۔ یہی جیپ ہم ملتان لے جا رہے تھے۔ اس پر میں، ڈاکٹر مبشر حسن اور امان اللہ خان نکلے اور براستہ شیخوپورہ، فیصل آباد پہنچے (جو ان دنوں لائل پور تھا) وہاں ایک چوہدری یعقوب اعوان ایڈوکیٹ ہوا کرتے تھے ان کے ساتھ باہمی مشورہ سے طے پایا کہ دھوبی گھاٹ میں جلسہ عام منعقد کیا جائے گا۔ جلسہ کے بارے میں انتظامات کا جائزہ لیا گیا۔ وہاں شمیم احمد خان بھی تھے جو بعد میں پنجاب اسمبلی کے ڈپٹی اسپیکر بھی ہوئے، وہ یونیورسٹی کے دور میں ہمارے ساتھ ہی تھے، ان سے رابطہ کیا۔ انہوں نے بڑی محبت سے دھوبی گھاٹ کے جلسہ کی ذمہ داری قبول کی۔ وہاں سے ہماری آئندہ منزل جھنگ تھی، جہاں ہم نوابزادہ افتخار احمد انصاری سے جا کر ملے۔ ان سے بھی جلسہ اور بھٹو کے استقبال کی تفصیلات پر تبادلہ خیال کیا، وہاں سے ہم سرگودھا پہنچے وہاں چوہدری ظفر اللہ تھے (جو اب ہم میں موجود نہیں) وہ پرانے مسلم لیگی تھے۔ ان سے رابطہ قائم کیا اور ان کو اس بات پر رضامند کر لیا کہ بھٹو ان کی کوٹھی پر آرام کی غرض سے مختصر قیام کریں گے۔

یہ کام کر کے ہم جھنگ اور شورکوٹ کے راستے ملتان جا پہنچے۔

بھٹو بذریعہ ہوائی جہاز کراچی سے ملتان پہنچے۔ ہوائی اڈے پر ایک عظیم جم غفیر نے انہیں خوش آمدید کہا اور پھر ان کو کاروں کے ایک بڑے جلوس میں کھر ہاؤس لے گئے جو ملتان کینٹ کے علاقے میں واقع ہے۔ یہاں ان کا قیام اس وقت تک رہا جب تک وہ ملتان اور گرد و نواح کے دورے کرتے رہے۔ کھر ہاؤس کے چند کمروں میں ہم نے بھی ڈیرہ ڈال دیا اور بھٹو صاحب کے ساتھ اس دورہ میں شامل ہو گئے۔ جس نے ان کے سیاسی مستقبل پر بڑے گہرے اور دوررس اثرات مرتب کیے۔

ایوب خان سے پہلا معرکہ

بھٹو صاحب کا ملتان میں پہلا باقاعدہ فنکشن وہ استقبالیہ تھا جو ملتان کے شہریوں کی جانب سے ان کے اعزاز میں شیزان ہوٹل میں دیا جا رہا تھا۔ جب ہم وقت مقررہ پر بھٹو صاحب کو ساتھ لے کر وہاں پہنچے تو یہ دیکھ کر چونکے اور خبردار ہو گئے کہ ماحول کو غنڈہ عناصر خراب کرنے کے لیے کوشاں تھے۔ کنونشن مسلم لیگی ایم این اے اور ایم پی اے حضرات نے حق نمک ادا کرنے کے لیے اپنے علاقہ سے چن کر غنڈے اور بدمعاش یہاں جمع کر دیئے تھے۔ جو نہ صرف مخالفانہ نعرہ بازی کر رہے تھے بلکہ بھٹو کے استقبال اور ایک جھلک دیکھنے کے لیے آنے والوں کو ہراساں کر رہے تھے۔ جس سے خوف و ہراس کی کیفیت تھی اور وہاں میزبان سخت گھبرائے ہوئے تھے کیونکہ انتظامیہ بھی ظاہر ہے کہ ان غنڈہ عناصر کے لیے نرم گوشہ رکھتی تھی۔

ہم نے نہایت سکون اور اطمینان کے ساتھ اپنا کام جاری رکھنے کے لیے فیصلہ کیا اور یہی طے پایا کہ جب تک مخالفین کی طرف سے کوئی اقدام نہیں ہوگا ہم کارروائی سے گریز کریں گے، ہم بھٹو صاحب کو شیزان کے اندر لے گئے اور وہاں کے لان میں جلسہ کرنے کی کوشش کی۔ ابھی ابتدائی مرحلہ ہی طے ہوا تھا کہ وہاں موجود ان غنڈوں نے ہلڑ بازی شروع کر دی اور تقریب کو ناکام بنانے کی کوشش کی، اس مرحلہ پر میں آگے بڑھا کیونکہ یہ سب کچھ میرے ضبط سے باہر کی بات تھی۔ میں نے اپنے ساتھی (کمانڈوز) کی مدد سے ان غنڈوں کو دیکھتے ہی دیکھتے دھکے دے کر باہر نکال دیا جہاں سے انہوں نے پھر مخالفانہ کارروائی شروع کر دی۔

میں نے بھٹو صاحب کو شیزان کے ایک کمرے میں بند کر دیا اور باہر سے تالا لگا کر خود اپنے کمانڈوز کو ساتھ لے کر شیزان کی چھت پر چلا آیا۔ اس زمانے میں شیزان کی عمارت کے ساتھ ایک اور عمارت زیر تعمیر تھی جس کا خاصا سامان یعنی اینٹیں، گارڈر، پتھر، سریہ وغیرہ وہیں پڑا ہوا تھا۔ میں نے اللہ کا نام لے کر کارروائی کا آغاز کر دیا یعنی چھت پر سے غنڈوں پر پتھراؤ شروع کر دیا۔ چونکہ ہم بلندی اور اونچائی پر تھے لہٰذا ہمارے خلاف جوابی کارروائی مشکل تھی۔ اور ہمارا وار کاری تھا۔ وہ اس کے لیے تیار نہ تھے۔ لہٰذا جب چند غنڈے زخمی ہوئے اور

دوسروں نے ان کا خون بہتے دیکھا تو بھاگ نکلے۔ کیونکہ غنڈوں کا کوئی مذہب یا عقیدہ نہیں ہوتا۔ وہ تو چند ٹکوں کی خاطر مقابلہ پر اترتے ہیں اور جب اس کی جان خطرے میں آتی ہے تو دم دبا کر دوڑتا ہے۔ خون کا نذرانہ اور جان کی بازی تو وہی جیالے لگاتے ہیں جو اپنے عقیدہ اور نظریہ کے ساتھ وفاداری سے وابستہ ہوتے ہیں۔ ہم نے اس موقع پر پولیس کو بھی ساتھ رگڑ دیا، کیونکہ میرے نزدیک غنڈوں کو تحفظ دینے والا بھی غنڈہ ہی ہوتا ہے۔

ہنگامہ آرائی ختم ہوئی تو میں نے آکر کمرے کا تالا کھولا اور بھٹو کو کمرے سے باہر نکالا۔ وہ سخت پریشان اور گھبرائے ہوئے دکھائی دے رہے تھے۔ لیکن میں نے ان کو تسلی دی اور بتایا کہ غنڈے بھاگ گئے ہیں۔ اب آپ اطمینان سے عوام سے خطاب کریں جو آپ کے منتظر ہیں۔ واقعی بھٹو باہر لان میں آئے تو لوگوں نے ان کا پرجوش استقبال کیا اور بھٹو نے بھرپور انداز میں ان سے خطاب کیا۔ انہوں نے واضح طور پر کہا کہ وہ غنڈہ گردی کا مقابلہ کرنے کے لیے تیار ہیں۔

شیرزانؔ کے اس معرکہ نے سرکاری اور کنونشن لیگ حلقوں میں اضطراب پیدا کر دیا کیونکہ بھٹو نے ایک قدم آگے بڑھ کر ان کو پیچھے ہٹنے پر مجبور کر دیا تھا۔ ہم لوگوں نے اسی رات کو کھر ہاؤس میں اس کارروائی پر غور کیا تو مجموعی طور پر ہر شخص پرعزم اور پُرامید تھا لیکن یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے "دشمن" آج کی ہزیمت کا بدلہ چکانے کی کوشش کرے گا۔ اگلے دن ہم کو خانیوال جانا تھا اور پروگرام یہی تھا کہ راستے میں جناب بھٹو صاحب گاڑی روک کر لوگوں کو مختصر خطاب کرتے جائیں گے۔

مجھے بھٹو سمجھا گیا

اگلی صبح ناشتہ کے بعد ہم خانیوال کے لیے روانہ ہو گئے۔ اس زمانے میں اتنی گاڑیاں نہیں ہوا کرتی تھیں جتنی اب میسر ہوتی ہیں بمشکل دس پندرہ گاڑیوں کا قافلہ تھا جو کھر ہاؤس سے خانیوال کے لیے چلا۔ تمام دوست بڑے خوشگوار موڈ میں تھے۔ ہنسی مذاق ہو رہا تھا اور گزشتہ شام کی "گوریلا" کارروائی زیر بحث تھی میں جس گاڑی میں سوار تھا وہ سب سے آگے تھی۔ میرے پیچھے بھٹو صاحب کی گاڑی تھی۔ جیسے کھر چلا رہے تھے، میں اپنی گاڑی کی پچھلی نشست پر براجمان تھا اور میں نے نہایت اعلیٰ سوٹ زیب تن کر رکھا تھا اور ٹائی باندھ رکھی تھی۔ بالکل ایک پکنک کا سا ماحول تھا۔

ملتان شہر سے نکل کر ہم ہائی وے پر آئے اور تیزی سے خانیوال کی طرف چلے۔ راستے میں ایک چھوٹا سا قصبہ قادر پور (واں) آتا ہے، جس کے نزدیک پہنچے تو میں نے دور سے دیکھا کہ تقریباً ڈیڑھ دو سو آدمی سڑک کے کنارے جمع ہیں اور چند جھنڈے پیپلز پارٹی کے بھی لہرا رہے ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ بڑی حوصلہ افزاء بات تھی۔ لہٰذا میں نے قریب جاکر گاڑی روک لی۔ میری حیرت کی انتہا نہ رہی کہ جب میں نے گاڑی روکی۔ چالیس پچاس کے لگ بھگ آدمی مجھ پر جھپٹ پڑے۔ انہوں نے مجھے گھسیٹ کر کار سے باہر نکالا اور بغیر کچھ کہے سنے زدوکوب کرنا شروع کر دیا۔ میں سخت گھبرایا مگر بہرحال مجھے احساس ہو گیا تھا کہ ہم مخالفین میں گھر چکے ہیں جال میں پھنس گئے ہیں۔ میری گاڑی کے پیچھے ہی ظاہر ہے کہ تمام گاڑیاں رک گئیں تھیں اور جب انہوں نے میری پٹائی ہوتی دیکھی تو آہستہ آہستہ انہوں نے پیچھے ہٹنا شروع کر دیا۔

تھپڑوں، مکوں اور گھونسوں سے میری سواگت کرنے والے ساتھ ساتھ کہہ رہے تھے ''اوے توں ایوب خان دی مخالفت کردا ایں۔ اسیں تیری ساری آکڑ کڈ دیاں گے، وڈا آیا بھٹو، (اوئے تم ایوب خان کی مخالفت کر رہے ہو۔ ہم تیرا سارا غرور اور اکڑ نکال دیں گے، بڑا آیا بھٹو کہیں کا)۔

اب مجھے احساس ہوا کہ وہ مجھے بھٹو سمجھ رہے ہیں۔ لیکن اسی اثنا میں سفید کپڑوں میں ملبوس ایک ''فدوی''، نے مجھے بغور دیکھ کر نہایت رازداری کے ساتھ انگلی کی مدد سے اشارہ کرتے ہوئے انہیں بتایا کہ یہ بھٹو نہیں! ادھر میں نے دیکھا کہ میرے پیچھے آنے والے میرے ساتھی آہستہ آہستہ پیچھے ہٹتے ہٹتے اب اتنی دور ہو گئے ہیں کہ اس مجمع کی گرفت اور پہنچ سے باہر ہیں تو میں نے خود کو سنبھالتے ہوئے پہلی بار زبان کھولی اور کہا ''بھائیو! کیا بات ہے، میں نے کیا قصور کیا ہے؟''۔

ان میں سے کچھ نے کہا ''تم بھٹو ہو؟''

میں نے بڑے تحمل سے کہا ''نہیں، میں تو مسافر ہوں، ملتان سے لاہور جا رہا ہوں۔''

بعض دانت پیستے ہوئے بولے۔ ''بھٹو کہاں ہے۔''

میں نے اپنی چوٹوں کو سہلاتے ہوئے کہا ''مجھے کیا پتہ؟''

وہ تاسف سے ہاتھ ملتے ہوئے ایک طرف ہو گئے اور میرا راستہ چھوڑ دیا۔ میرے ڈرائیور نے ایک لمحہ ضائع کیے بغیر گاڑی آگے بڑھائی اور پھر ہم تیزی سے خانیوال کی طرف چل دیئے۔

دراصل میں نے خود کو مجمع میں اس لیے قربانی کا بکرا بنا لیا تھا کہ بھٹو اور دوسرے ساتھی دور ہو جائیں اگر میں فوراً ہی بتا دیتا کہ بھٹو ان سے چند گز کے فاصلہ پر ہے تو ظاہر ہے کہ مجھے چھوڑ کر میرے محبوب قائد کو پکڑ لیتے۔ اس کے باوجود بعض لوگوں نے بھٹو کی کار سمیت چند کاروں پر پتھر مارے اور ان کو گھیرے میں لینے کی کوشش کرتے ہوئے مخالفانہ نعرہ بازی کی لیکن ان کا داؤ نہیں چل سکا۔

ادھر بھٹو کو بحفاظت لے کر ساتھی قادر پور راں کے نزدیک ہی ایک ریسٹ ہاؤس میں لے گئے۔ جہاں بھٹو صاحب صورت حال سے خاصے پریشان تھے ان کا بار بار یہی کہنا تھا کہ یورپ اور امریکہ میں تو یوں نہیں ہوتا اور ساتھی ان کو حوصلہ دلا رہے تھے۔ شیزان اور اب قادر پور راں میں جو کچھ ہوا اس نے آگے بڑھتے ہوئے بھٹو کو حیران و ششدر کر دیا۔ وہ خاصے تذبذب میں تھے۔

مجھے بعد میں بتایا کہ مصطفےٰ کھر اور دوسرے ساتھیوں نے انہیں خاصہ حوصلہ دیا اور پھر یہ لوگ تازہ دم ہو کر نئے حوصلہ کے ساتھ خانیوال روانہ ہوئے مگر ان کا راستہ پہلے سے مختلف تھا۔ اس موقع پر کھر نے علاقہ شناسی اور ماہرانہ ڈرائیونگ کا بھرپور مظاہرہ کیا اور ایک جگہ اس نے شارٹ کٹ کرنے کے لیے نہایت پھرتی سے بھٹو کی کار کو ریلوے لائن کے اوپر سے عبور کر دیا۔ اس کے نتیجہ میں یہ لوگ خانیوال تقریباً بروقت پہنچے لیکن قادر پور راں کے راستے گزرنے والی بسوں کے مسافروں نے خانیوال یہ خبر پہنچا دی تھی کہ بھٹو پر قاتلانہ حملہ ہو گیا ہے جس سے مقامی لوگوں اور خاص طور پر کارکنوں میں تشویش کی لہر پھیلی ہوئی تھی۔

بھٹو خانیوال پہنچے تو سیدھے ایک کچی کالونی میں گئے جس کے ایک کچے مکان کے احاطہ میں جلسہ کا انتظام تھا۔ کیونکہ جلسہ عام کی اجازت نہیں تھی۔ مکان کے اندر اس قدر رش تھا کہ لاؤڈ سپیکر کی تاریں ٹوٹ گئیں لیکن بھٹو نے بڑے جذباتی انداز میں تقریر کی اور جب انہوں نے قادر پور راں کے واقعہ کا ذکر کیا تو لوگ جوش میں آ کر ایوب خان کے خلاف نعرے لگانے لگے۔ میں یہاں پہنچا تو کوشش کے باوجود کچے مکان کے اندر داخل نہ ہو سکا، مجبوراً دیوار پر کھڑے ہو کر بھٹو کو تقریر کرتے دیکھتا رہا۔ میرے ساتھ ہی ایک اور نوجوان کھڑا تھا جس کے بارے میں بعد میں کسی نے بتایا کہ وہ علاقہ مجسٹریٹ ہے۔ خانیوال بار ایسوسی ایشن سے بھی بھٹو نے خطاب کیا اور اس کے بعد تھانہ گراؤنڈ میں جلسہ عام

سے خطاب کیا۔ بھٹو سے پہلے رسول بخش تالپور نے تقریر کی اور کہا! آج جس غنڈہ گردی کا مظاہرہ ہوا وہ پنجاب کی مہمان نوازی کی روایات کے خلاف تھا۔ ادھر انہوں نے نواب صادق قریشی کو مخاطب کر کے کہا: اگر بدمعاشی کرنا ہے تو کھل کر سامنے آؤ۔ عالم یہ تھا کہ کوئی باقاعدہ سٹیج تک نہ بن سکا تھا۔ ایک کرسی پر بمشکل کھڑے ہو کر بھٹو نے تقریر کی اور عادت کے مطابق جذباتی ہو کر بولتے چلے گئے۔ انہوں نے واضح طور پر کہا۔ مجھ پر حملہ صادق قریشی نے کرایا ہے۔

اب اس کو قسمت کی ستم ظریفی کے سوا اور دوسرا کیا نام دیا جا سکتا ہے کہ جب بھٹو مسندِ اقتدار پر براجمان ہوئے تو یہی صادق قریشی پنجاب کے وزیر اعلیٰ بنے، اور یہی رسول بخش تالپور، مصطفیٰ کھر اور راقم (احمد رضا قصوری)، زیر عتاب آ گئے۔ تاریخ میں بے شمار ایسی مثالیں ہیں کہ درخت لگانے والے اور ہوتے ہیں اور اس کا پھل کھانے والے دوسرے لوگ ہوتے ہیں۔ لیکن میں ساتھ ہی یہ بھی واضح کر دوں کہ جس قوم یا پارٹی میں یہ روایت یا رواج ہو کہ درخت لگانے والے اور ہوں اور اس کا پھل کھانے والے دوسرے ہوں تو وہ قوم یا پارٹی۔ کبھی کامیاب اور سرخرو نہیں ہو سکتی کیونکہ ایسے رویہ اور سلوک سے کام کرنے والوں میں مایوسی اور ناامیدی پھیلتی ہے۔

خانیوال سے ہم واپس ملتان پہنچ گئے۔ جہاں اگلے روز تاریخی قلعہ قاسم باغ پر ایک عظیم الشان جلسہ کا انتظام کیا گیا تھا۔ کھر ہاؤس میں ہمیں برابر خبریں مل رہی تھیں کہ سارے پنجاب سے چیدہ چیدہ اور انتہائی خطرناک غنڈوں کو ملتان میں مبینہ طور پر جمع کر لیا گیا ہے اور ان کے ذمہ کل قاسم باغ میں بھٹو کے جلسہ کو اکھاڑنے کا کام سونپ دیا گیا ہے۔ انتظامیہ نے ایوب خان کی ہدایت کے تحت یہ فیصلہ کر لیا تھا کہ کل بھٹو کو سبق سکھا دیا جائے گا۔

مقتل سج گیا

جہاں کنونشن مسلم لیگی ٹولے اور انتظامیہ کی بھرپور کوشش تھی کہ قلعہ قاسم باغ کے جلسہ کو ناکام بنایا جائے۔ وہیں پر ہماری کوشش تھی کہ اس معرکہ میں کامیابی حاصل کی جائے۔ کھر ہاؤس میں ہم لوگ سر جوڑ کر بیٹھے مختلف منصوبوں کی تیاری اور سوچ بچار میں مصروف تھے۔ ایک فیصلہ کے مطابق غلام مصطفیٰ کھر نے ارد گرد کے دیہات سے تقریباً ایک ہزار لکڑی کے ڈنڈے

تیار کر کے منگوائے تاکہ بوقت ضرورت ان سے کام لیا جا سکے۔ یہ ڈنڈے تین، تین چار، چار فٹ کے تھے کیونکہ جلسہ گاہ میں جب ہنگامہ آرائی یا ہلڑ بازی ہوتی ہے تو پھر لمبی لاٹھیاں کام نہیں آتیں ہجوم کے باعث یہ غیر موثر رہتی ہیں اور یہ چھوٹے چھوٹے ڈنڈے ہی مددگار ہوتے ہیں۔ یہ ڈنڈے ہم نے ہر کار کی ڈگی میں ڈال کر جلسہ گاہ پہنچائے جہاں انہیں سٹیج کے نیچے بڑی رازداری پورا احتیاط سے محفوظ کر کے رکھ دیا۔

مقامی کارکنوں کی مدد سے کچھ اینٹیں اور پتھر بھی لا کر جمع کر دیئے گئے تھے اور یہاں چند انتہائی قابل اعتماد اور جانثار کارکنوں کو بٹھا دیا گیا تاکہ ہنگامی صورت میں وہ کسی بھی یورش کا جواب دے سکیں۔ یہ کام ہم نے جلسہ سے ایک رات پہلے ہی بڑی خاموشی سے کرایا تھا اور جلسہ کے دن صبح سویرے سے ہی عوام قلعہ کی طرف آنے لگے۔ مقررہ وقت سے بہت پہلے ہی جلسہ گاہ عوام سے بھر گیا اور ہزاروں کی تعداد میں لوگ ارد گرد کھڑے ہو گئے۔

ہم نے یہ حکمت عملی اختیار کی کہ بھٹو صاحب کی تقریر سے پہلے بعض دوسرے لیڈروں کا خطاب رکھ دیا۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ ایک تو یہ معلوم ہو جائے گا کہ جلسہ گاہ میں کس کس حصہ میں مخالفین بیٹھے ہیں اور دوسرا یہ اندازہ ہو جائے گا کہ بھٹو صاحب کی آمد اور تقریر کے وقت ہنگامہ کی نوعیت اور شدت کتنی ہو گی۔ اس پروگرام کے تحت جلسہ گاہ میں پہلے ملک حامد سرفراز اور میر رسول بخش تالپور پہنچے اور انہوں نے تقریریں شروع کر دیں۔

ہمیں یہ بھی احساس تھا کہ کھر ہاؤس پر چاروں طرف موجود باوردی اور سفید کپڑوں میں ملبوس پولیس والوں کی بڑی کڑی نگرانی ہے اور وہاں ہونے والی ہر بات کا سختی سے نوٹس لیا جا رہا ہے، ظاہر تھا کہ بھٹو صاحب جب یہاں سے جلسہ کے لیے روانہ ہوتے تو وائرلیس پیان کو اطلاع قلعہ پر موجود پولیس والوں کو دے دی جاتی جو اپنے مخصوص اہل کاروں کے توسط سے ان غنڈوں کو خبردار اور ہوشیار کر دیتے جنہیں پورے ڈویژن سے بھٹو کو سبق سکھانے کے لیے جمع کیا گیا تھا۔

ہم نے ان پولیس والوں کی آنکھوں میں دھول جھونکنے کے لیے بیس پچیس کاروں کا ایک قافلہ تیار کر کے کھڑا کر دیا۔ اس میں وہ کار بھی تھی جو بھٹو صاحب کے لیے مخصوص تھی اور پولیس والوں

کی نظریں اس کو بطور خاص خوب اچھی طرح پہچانتی تھیں۔ یہ پولیس والے منٹ منٹ کی اطلاع "اوپر" دے رہے تھے اور ادھر ہم (میں، بھٹو صاحب، مصطفےٰ کھر اور دو تین اور مقامی لوگ) چپکے چپکے کھسک کر ایک طرف سے جہاں پولیس والوں کی نگاہ نہیں پہنچتی تھی، کھر ہاؤس کی دیوار پھلانگ گئے اور چند قدم یوں چلے گئے جیسے ہمارا اس سارے ماحول سے کوئی تعلق نہیں۔ پھر ادھر ادھر صورت حال کو ٹھیک دیکھ کر ہم اپنی کاروں میں سوار ہو گئے جو سامنے سے ہمارے لیے ہی آرہی تھیں۔ ایک کار میں اگلی نشست پر ایک مقامی کارکن بیٹھ گیا اور پچھلی سیٹ پر درمیان میں بھٹو کو بٹھالیا ان کے ایک طرف میں اور دوسری طرف کھر بیٹھا تھا۔

گاڑی چلی تو بھٹو صاحب جو سوٹ میں ملبوس تھے اپنا ہیٹ ماتھے سے ذرا کھینچ کر آنکھوں کے اوپر کر لیا اور سیٹ پر ذرا دھنس کر بیٹھ گئے تاکہ ان کو پہچانا نہ جا سکے البتہ انہوں نے کہا: مشن کیسا رہے گا۔

کھر نے اپنی پسلی پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا: آج فیصلہ ہو جائے گا۔

بھٹو نے میری طرف دیکھا۔ میں نے ان کی آنکھوں میں ابھرا ہوا سوال پڑھ لیا تھا اور میں نے پوری سنجیدگی سے کھر کی طرح ہی پسلی پر ہاتھ مار دیا اور کہا: جناب

WE ARE READY

اس کے بعد سارا راستہ بھٹو صاحب چپ اور میں اور کھر پوری طرح چوکنے رہے۔ دراصل ہماری پسلی پر بڑی احتیاط سے بندھے ہوئے پستول ہمیں چوکنا رہنے پر اکسا رہے تھے۔

ادھر کھر ہاؤس پر پہرہ دینے والی پولیس یہی سمجھتی رہی کہ ہم اندر ہیں جبکہ ہم قلعہ کے نزدیک واقع گھاٹیوں کے بالکل نزدیک جہاں اس وقت ایک سینما ہوا کرتا تھا۔ جا کر گاڑیوں سے اتر گئے۔ عوام کا ایک اژدہام تھا اور لوگ آ جا رہے تھے۔ ہمیں اندازہ تھا کہ سٹیج کا رخ کدھر ہے اور پروگرام یہی تھا کہ ہم اچانک بھٹو کو سٹیج کے پچھلے سے خفیہ راستے سے اندر لے جائیں گے اور سٹیج کے نیچے جہاں ہمارا "اسلحہ" اور "گوریلے" موجود تھے۔ وہیں سے ایک خفیہ راستہ بھی بھٹو صاحب کے لیے رکھا گیا تھا۔

عین اس وقت جب ہم بھٹو صاحب کو چاروں طرف سے گھیرے مٹی اور ریت میں اٹے ہوئے

ناہموار راستے سے اوپر قلعہ کی سمت بڑھ رہے تھے۔ اوپر سے چند لوگ اترتے ہوئے کہہ رہے تھے "بھٹو تے بن تک نیئں آیا۔ ہو سکدا اے ڈر گیا ہووے"۔ یہ سن کر ہم ایک دوسرے کو مسکرا کر دیکھتے ہوئے آگے بڑھتے گئے اور بالآخر اس جگہ جا پہنچے جہاں سے ایک راستہ قناتوں کے نیچے سے ہوتا ہوا بالکل سٹیج تک پہنچتا تھا۔ وہاں ہمارے ورکر کھڑے تھے۔ جب وہاں نزدیک پہنچے تو چند ورکرز نے جوش اور محبت سے نعرے مارنے کی کوشش کی مگر ہم نے انہیں انگلی کے اشارہ سے ایسا کرنے سے منع کر دیا۔ بلکہ کھر نے تو ایک نوجوان کے منہ پر زور سے ہاتھ بھی رکھ دیا۔ ہم نے بھٹو کو آگے بڑھنے کا اشارہ کیا اور وہ تیزی سے آگے بڑھے۔ اس وقت حامد سرفراز تقریر کر رہے تھے۔ بھٹو سٹیج پر آئے تو انہوں نے ایکدم بھٹو کو دیکھتے ہی اپنی تقریر ادھوری چھوڑ کر بڑے جذباتی انداز میں کہا

حضرات! کس شیر کی آمد ہے کہ رن کانپ رہا ہے۔

آپ کے محبوب قائد ذوالفقار علی بھٹو تشریف لے آئے ہیں یہ ہیں وہ آپ کے سامنے! اور بھٹو نے آگے بڑھ کر مائیک سنبھال لیے۔

بھٹو کا سٹیج پر آنا تھا کہ سٹیڈیم میں جیسے زلزلہ آ گیا۔ نعروں اور تالیوں کے شور سے کان کے پردے پھٹ رہے تھے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی غنڈوں نے سٹیج پر حملہ کر دیا، میدان میں مختلف جگہوں پر بانسوں پر جو لاؤڈ اسپیکر لگے تھے۔ انہیں گرایا جانے لگا اور ہنگامہ اس قدر بڑھ گیا کہ بھٹو کے لیے تقریر کرنا اگر ناممکن نہیں تو ممکن بھی نہیں رہا تھا لہٰذا ہم ساتھیوں نے بھٹو سے کہا کہ آپ عوام سے تعاون اور پُرسکون رہنے کے ساتھ ساتھ غنڈوں کا مقابلہ کرنے کی اپیل کریں۔ انہوں نے ایسا ہی کیا۔ بھٹو کے لہجہ میں ایسی دردمندی تھی کہ عوام ایک حوصلہ کے ساتھ ڈٹ کر کھڑے ہو گئے۔ جان بچا کر بھاگتے ہوئے لوگ بھی رک گئے اور وہ جب غنڈوں کے مقابل آئے تو تقریباً اڑھائی سو آدمیوں میں ایک غنڈہ پھنس گیا۔ جس کے لیے باہر نکلنا ہی مشکل ہو گیا۔ اب ایسے میں اگر ایک ایک جوتا یا تھپڑ ہی مارا جائے تو کسی بھی شخص کا ستیاناس ہونا لازمی بات ہے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا، اور ایک مصدقہ اطلاع کے مطابق اسی شام مختلف ہسپتالوں میں تقریباً چار درجن غنڈوں کو شدید زخمی حالت میں تو داخل کر لیا گیا جو دم دبا کر گھروں کو بھاگ نکلے وہ اس کے سوا

تھے۔

ابھی یہ ہلڑ بازی قابو میں نہیں آئی تھی کہ اچانک ایک طرف سے پولیس نے بلا وجہ لاٹھی چارج شروع کر دیا۔ وہ بظاہر امن قائم کرنا چاہتے تھے مگر ان کا اصل مدعا لوگوں کو ہراساں کر کے وہاں سے بھگانا اور بچے کھچے غنڈوں کو راہِ فرار فراہم کرنا تھا۔ بھٹو نے اس مرحلہ پہ ایک بار پھر عوام سے اپیل کی اور پولیس کو للکارا، جس سے لاٹھی چارج کا سلسلہ قدرے کم ہوا، لیکن دیکھتے ہی دیکھتے سٹیج کے دائیں طرف سے جہاں معززین شہر اور پریس رپورٹرز وغیرہ کے لیے انکلوژر بنایا گیا تھا، دو غنڈے ننگی تلواریں لہراتے اور باقاعدہ للکارتے ہوئے سٹیج کی طرف بڑھے۔ ان کا نشانہ ظاہر ہے کہ بھٹو ہی تھا۔ وہ تلواریں لہراتے تیزی سے سٹیج کی طرف لپکے، اور نہتے لوگ سراسیمگی اور دہشت کے مارے سکتہ میں آ گئے۔ اس مرحلہ پر ملک حامد سرفراز، مصطفےٰ کھر اور میں نے اپنے پستول نکال کر ان غنڈوں پر تان لیے اور ان کو للکارا۔

کھڑے ہو جاؤ۔ ورنہ گولی مار دی جائے گی۔

اس کے ساتھ ہی ہم نے تین چار ہوائی فائر کر دیئے۔ اس صورت حال کا مقابلہ کرنے کے لیے شاید وہ تیار نہ تھے۔ لہٰذا وہ اس غیر متوقع جوابی کارروائی سے گھبرا گئے اور بھاگنے کا راستہ دیکھنے لگے لیکن اسی اثناء میں جذباتی اور پرجوش کارکنوں نے سٹیج سے کرسیاں اٹھا کر ان کو مارنا شروع کر دیں۔ میرے خیال میں ان پر تیس چالیس کرسیاں پھینکی گئی ہوں گی۔ اس سارے دنگے فساد میں ملتان کے ایک وکیل خضر حیات زخمی ہو گئے جن کا جماعت اسلامی سے تعلق تھا۔

یوں بالآخر ہم جلسہ پر قابو پانے میں کامیاب ہو گئے۔ اس کے بعد بھٹو صاحب نے ایک انتہائی شاندار تقریر کی۔ جس کا ایک ایک لفظ بڑا جذباتی اور پرجوش تھا اور ایسا ہونا ایک قدرتی امر تھا کہ وہ ایک سخت آزمائش سے گزر کر اور غنڈہ گردی کا مقابلہ کر کے کامیاب و کامران ہو کر عوام سے مخاطب تھے۔ انہوں نے کئی بار کھلے اور سخت لفظوں میں ایوب خان کو للکارا۔ بہرحال اس جلسہ کی کامیابی نے علاقہ میں پیپلز پارٹی کی سیاسی دھاک جما دی اور اس کے رعب کا سکہ بیٹھ گیا۔ بے شمار ایسے لوگ جو ہوا کا رخ دیکھ رہے تھے اور جنہیں اب بھٹو اور پیپلز پارٹی کی سیاسی مقبولیت اور اہمیت کا اندازہ ہو چکا تھا چنانچہ صاحبزادہ فاروق علی خان، مختار اعوان،

عباس گردیزی، تاج محمد لنگاہ، محمود بابر، تاج محمد نون، ناصر رضوی، محمد اشفاق، بابو فیروز دین، الطاف کھوکھر اور بے شمار لوگ اپنے ہزاروں ساتھیوں سمیت پیپلز پارٹی میں آن شامل ہوئے۔ جس سے ملتان کی سطح پر پارٹی کا ایک مضبوط اور فعال ڈھانچہ تشکیل پا گیا کہنے کو تو ہم نے قاسم باغ کا معرکہ سر کر لیا تھا مگر بھٹو کے ذہن پر قادر پور راں اور قاسم باغ کے واقعات کا بڑا گہرا اثر ہوا، یہ سب کچھ ان کی توقعات کے بالکل برعکس تھا۔ لہٰذا ملتان کے جلسہ سے فارغ ہو کر واپس کھر ہاؤس پہنچ کر ہم لوگ فریش ہو کر اکٹھے ہوئے تو بھٹو نے کہا: یہ بات میرے بس کی نہیں، میں تو واپس برکلے چلا جاتا ہوں میں یہ بدتمیزی برداشت نہیں کر سکتا، میں نے یہ بات جا کر رسول بخش تالپور سے کہی وہ فوراً آئے، پھر میں، حامد سرفراز، کھر اور میر صاحب مسٹر بھٹو کو سمجھانے بجھانے لگے کہ اقتدار میں آنے کیلئے بڑی آزمائش سے گزرنا پڑتا ہے۔ ہم آپ کے جاں نثار ہیں مگر آگے تو بہر حال آپ کو ہی ہونا ہوگا۔ آپ حوصلہ رکھیں۔ تالپور بولے: اگر حکومت اتنی آسانی سے مل جاتی تو دولتانہ، کھوڑو، چٹھہ اور نواب زادوں کو ہی مل جاتی۔ اس مرحلہ پر میں نے کہا۔ جناب آپ تک پہنچنے والا ہماری لاش سے گزرے گا۔ غرض یوں ہم نے مستقبل کے عوامی وزیر اعظم کو بڑی مشکل سے برکلے جانے سے روکا۔ ورنہ وہ تو پیک اپ کرنے والا تھا۔

اس کے اگلے روز ہم مظفر گڑھ گئے۔ جہاں جلسہ عام کا پروگرام نہیں تھا بلکہ بھٹو صاحب کو بار سے خطاب کرنا تھا۔ وہاں ملتان کے معرکہ کی تفصیلات پہنچ چکی تھی۔ لہٰذا لوگوں میں خاصا جوش و خروش تھا، جس کے نتیجے میں بار سے بھٹو صاحب کے خطاب کو لاؤڈ اسپیکروں کی مدد سے باہر موجود ہزاروں افراد کو سنایا گیا۔ بھٹو صاحب کی تقریر کو یہاں پر توجہ سے سنا گیا۔

اس کے بعد ہم ساہیوال گئے جہاں ہمارا قیام راؤ عبدالستار کے گھر تھا۔ یہاں بھی دفعہ ۱۴۴ کا نفاذ کر دیا گیا تھا۔ لہٰذا ایک خاصی وسیع و عریض کوٹھی (جو غالباً سردار عبدالعیم کی تھی)، میں بھٹو صاحب کے خطاب کا بندوبست کیا گیا۔ بار سے خطاب اس سے الگ تھا۔ رانا عبدالحمید خان نے بڑے ڈرتے ڈرتے ہمیں ناشتہ پر مدعو کیا۔ اسی دورہ کے دوران راؤ خورشید، رانا حنیف (جو بعد میں وزیر خزانہ بھی ہوئے)، راؤ ہاشم، ارشد لودھی اور بہت سے لوگ پارٹی میں شامل ہوئے۔

یہاں سے راوی پار کر کے ہم جھنگ روانہ ہو گئے جہاں کی مرکزی جلسہ گاہ میں ہم نے ایک

عظیم الشان جلسے کا انعقاد کیا۔ اس سلسلہ میں نواب زادہ افتخار احمد انصاری نے ہم سے خاصا تعاون کیا حالانکہ وہ لوگ ہماری پارٹی میں نہیں تھے البتہ وہ ایوب خان کے مخالف تھے یعنی وہ دشمن کے دشمن کو دوست سمجھتے ہوئے بھٹو کی حوصلہ افزائی کر رہے تھے اور انہوں نے یہ فیصلہ حب علی سے نہیں بلکہ بغضِ معاویہ کے تحت کیا تھا۔ یہ جلسہ نہایت کامیاب رہا جس کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ اس جلسہ کے بعد ہی عمر حیات خان سیال اور ظفر عباس قریشی سمیت بیشمار لوگ ہمارے ساتھ آن ملے۔ جھنگ میں ہی نواب زادہ انصاری نے ہمارا ایک نہایت ہی پر تکلف کھانا بھی کیا۔ جہاں سے ہماری اگلی منزل سرگودھا تھی۔

سرگودھا میں ہمارا قیام چوہدری ظفر اللہ کے یہاں تھا جو تب کونسل مسلم لیگ میں تھے یہاں پر بھی ہمیں تعاون بغضِ معاویہ کے تحت ہی مل رہا تھا لیکن ہم اس سے بے نیاز اپنے مشن کی کامیابی کے بارے میں متفکر اور سنجیدہ تھے۔ یہاں جلسہ عام ہوا جو بڑا کامیاب رہا۔ اس جلسہ کے بڑے خوشگوار اثرات ہوئے جس کے نتیجے میں یہاں سے ممتاز کاہلوں، میاں جمیل اختر، مسعود زاہدی، حفیظ اللہ چیمہ اور بیشمار جیالے ہمارے ساتھ آن ملے۔

یہاں سے ہم فیصل آباد (تب لائل پور) روانہ ہوئے جہاں دھوبی گھاٹ گراؤنڈ میں ایک عظیم الشان جلسہ ہوا۔ اس موقع پر ہی بعض ممتاز شخصیات نے جن میں طاہر رشاد، احمد سعید اعوان، مختار رانا اور ڈاکٹر حلیم رضا، نرگس نعیم وغیرہ قابلِ ذکر ہیں، پیپلز پارٹی میں شمولیت اختیار کر لی، شمیم احمد خان نے جلسہ کو کامیاب بنانے کے لیے بڑی تگ و دو کی۔ اس موقع پر بھٹو نے مختار رانا کی اکیڈمی کا معائنہ کیا اور یعقوب اعوان ایڈووکیٹ کی طرف سے دیئے گئے استقبالیہ میں شرکت کی۔ اس کے بعد ہم لاہور واپس آ گئے۔

داتا کی نگری سے نگر نگر تک

۲۸ جنوری ۱۹۶۸ء کو لاہور کے تاریخی موچی گیٹ میں ایک عظیم الشان جلسہ کا اہتمام کیا گیا اور اس جلسہ میں لوگ جوق در جوق شریک ہوئے بلکہ بیرون لاہور سے بھی عوام کی ایک بڑی تعداد نے شرکت کی۔ یہ وہی تاریخی جلسہ ہے جس میں مسٹر بھٹو نے کم از کم پنجاب کی حد تک اپنی سیاسی

قیادت کا لوہا منوا لیا تھا۔ اس جلسہ کی کامیابی میں بھی ہمارا بہت بڑا ہاتھ تھا کیونکہ سارے پنجاب میں جواں سال قیادت اور خاص طور پر طلباء کی صفوں میں میرے اور میرے دوستوں کے بڑے گہرے تعلقات اور مراسم تھے اور ہم نے بڑے جذبہ اور شوق کے ساتھ اس جلسہ کے لیے دن رات کام کیا تھا۔ اشتہارات سے لے کر سٹیج کی تیاری تک اور استقبالیہ سے لے کر نعرہ بازی تک ۔ ہر مرحلہ کا بڑی محنت سے بندوبست کیا گیا۔ کیونکہ ہمیں اندیشہ تھا کہ کہیں قاسم باغ ملتان کی طرح یہاں بھی انتظامیہ غنڈہ گردی نہ کرے۔ لیکن ہم نے پورے پنجاب کا جس سج دھج سے دورہ کیا تھا اس کے بعد کسی کی جرأت نہ ہو سکی کہ وہ ہمارے جلسہ کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی دیکھ سکے ۔

جلسہ بڑا پر سکون اور موثر رہا۔ بھٹو نے لاہور کے جیالوں کے سامنے پہلی بار پارٹی کا منشور پیش کیا اور اس کے مختلف پہلوؤں کا جائزہ بھی لیا، یوں پیپلز پارٹی کی جڑیں پنجاب میں بڑی دور تک پھیل گئیں۔ ایک اور اسی قسم کا جلسہ ہم نے شیرانوالہ باغ گوجرانوالہ میں کیا اور ایک جلسہ سیالکوٹ میں کیا یہ گوجرانوالہ کے کامیاب جلسہ کا ہی اثر تھا کہ ذوالفقار علی باجوہ، میاں منظور الحسن، میجر غلام حیدر چیمہ، فاضل راشدی، چوہدری علی احمد، رانا اقبال اور بہت سے دوسرے لوگ پارٹی میں شامل ہو گئے۔ اور انہوں نے پارٹی کے لیے خاصا کام کیا۔ اسی طرح سیالکوٹ سے ملک محمد سلیمان، میاں مسعود، چوہدری عبدالواحد، چوہدری سلطان احمد چیمہ قاضی ذکا اور دیگر لوگوں نے پارٹی میں شمولیت اختیار کر لی۔ ایک نمایاں تبدیلی ہم نے یہ محسوس کی کہ اب پنجاب کے سیاسی پنڈت جو مرغ باد نما کی طرح ہوا کے رُخ پر ہو جاتے ہیں، انہوں نے بھی پیپلز پارٹی سے رابطہ شروع کر دیا۔ ان میں معراج خالد، مولانا کوثر نیازی، حنیف رامے وغیرہ قابلِ ذکر ہیں۔ حنیف رامے تو ان دنوں لاہور میں کنونشن مسلم لیگ کے باقاعدہ تنخواہ دار آفس سیکرٹری تھے۔ معراج خالد بے چارے کبڈی کے میچ کرایا کرتے تھے۔ ان کی ایک تنظیم افرایشین سالیڈیریٹی ہوا کرتی تھی۔ مولانا کوثر نیازی ایک غیر معروف پرچے کے ایڈیٹر ہوتے تھے۔ بلکہ ان سے میری پہلی ملاقات اس وقت ہوئی جب ۱۹۶۷ء میں میں ایک بہت بڑا جلوس لے کر مال روڈ پر آ رہا تھا اور لوگ بڑے جوش سے امریکی سامراج کے خلاف نعرے لگا رہے تھے۔ ایک جگہ ایک شخص نے جس نے لکھنوی پاجامہ قمیض پہن رکھا تھا اور اس کے چہرے پر خراشیں تھیں، بال منتشر تھے۔ جلوس کو خطاب کرنا تھا۔ اس شخص نے تقریر کے آغاز پر تمہید کے طور پر کہا: میں یہاں آ رہا تھا کہ گوتھیں

مارکیٹ میں مجھ پر اسلام پسندوں کے لیڈر آغا شورش کاشمیری نے حملہ کر دیا، مجھ پر ڈالڈا گھی کے ڈبے مارے۔ جس سے مجھے چوٹیں آئیں، یہ سن کر چند زندہ دل بولے۔ ڈالڈا کے ڈبے نہیں ٹاٹی فون کے ڈبے ہوں گے۔ یہ مظلوم اور پریشان حال شخص مولانا کوثر نیازی تھا، اور پھر جس دن یہ خبر آئی کہ چوہدری فضل الٰہی بھی پیپلز پارٹی میں آ گئے ہیں تو میں نے اور میرے جیسے بہت سارے دوستوں نے سوچا اب پارٹی اقتدار کے قریب اور اپنے مقاصد سے دور ہو گئی ہے۔

پنجاب کے اس دورہ کے دوران عام طور پر ایسا ہوتا کہ غلام مصطفےٰ کھر ڈرائیونگ کرتے اور بھٹو صاحب میرے اور حامد سرفراز کے درمیان میں بیٹھ جاتے۔ دوران سفر وہ کبھی کبھار جب بہت زیادہ اچھے موڈ میں ہوتے تو کہتے ۔ یار وہ غزل سناؤ ۔

گلوں میں رنگ بھرے، باد نو بہار چلے

اس کے علاوہ مشہور دھمال لال موری پت رکھیو بھلا مجھ سے گانے کی فرمائش بھی کیا کرتے تھے۔ اکتوبر ۱۹۶۷ء کے آخر میں ہم نے صوبہ سرحد کے دورے کا پروگرام بنایا جو اس اعتبار سے بڑا ضروری تھا کہ وہاں سے ہمیں بڑی خوشگوار اور موافق حالات کی خبریں مسلسل مل رہی تھیں۔ چنانچہ شیر پاؤ گارڈن میں ایک کنونشن کا بندوبست کیا گیا جو ہشت نگر (چارسدہ) کے علاقہ میں واقع ہے یہاں پہنچنے کے لیے ایک راستہ پشاور اور دوسرا رسالپور اکیڈمی کی طرف سے جاتا ہے۔ یہاں ہمارا پروگرام یہ تھا کہ صوبہ سرحد بھر کے علاقہ سے آئے ہوئے کارکنوں کے ساتھ رابطہ کو منظم اور مربوط بنایا جائے۔ اس سلسلہ میں ایک بڑے جلسہ کا انتظام پشاور میں کیا گیا۔

صوبہ سرحد میں پیپلز پارٹی کو مستحکم اور مضبوط بنانے میں جن دو شخصیات نے انتہائی محنت اور جرأت کے ساتھ کام کیا وہ حیات محمد شیر پاؤ اور حق نواز گنڈاپور تھے۔ میں ان دونوں جیالوں کی تعریف کیے بغیر نہیں رہ سکتا۔ ان دونوں نوجوانوں کے ایثار اور جدوجہد کا اثر تھا کہ صوبہ سرحد میں ہماری پارٹی دن بدن آگے بڑھتی جا رہی تھی۔ ان کے علاوہ شوکت لودھی اور عبدالخالق خان کی خدمات بھی نظر انداز نہیں کی جا سکتیں ۔ بلکہ عبدالخالق خان تو پی پی کے واحد امیدوار تھے جو کامیابی سے ہمکنار ہوئے۔ وہ حکومت کے سیکرٹری اطلاعات رائیداد خان کے چھوٹے بھائی تھے۔ وہ سابق سیشن جج بھی رہ چکے تھے۔

اس جلسہ کی کامیابی کے بعد ہی علاقہ کی ممتاز سیاسی شخصیات نے پی پی کی طرف رجوع کرنا شروع کیا۔ چنانچہ عبدالخالق (جو آج کل ولی خان کی عوامی نیشنل پارٹی کے سیکرٹری جنرل ہیں) انہوں نے پارٹی میں شمولیت کا اعلان کر دیا جس سے پارٹی کی سیاسی قوت میں اضافہ ہوا۔

بیوروکریسی سے دو ہاتھ

یہاں میں ایک دلچسپ واقعہ کا ذکر ضرور کروں گا۔ ابھی ہم شیرپاؤ گاؤں میں تھے اور پشاور میں جلسہ عام کے پروگرام کو آخری شکل دی جا رہی تھی کہ بھٹو نے کھر کو بلایا اور اس کو یہ ذمہ داری سونپی کہ وہ پشاور جا کر ڈپٹی کمشنر سے جلسہ کے انعقاد کی اجازت لیکر آئے۔ کھر کے ہمراہ شیرپاؤ بھی تھے۔ یہ لوگ پشاور گئے۔ اپنے طور پر ظاہر ہے کہ انہوں نے سر توڑ کوشش کی ہو گی کہ اجازت مل جائے، مگر بوجوہ ایسا نہ ہو سکا اور وہ بے نیل و مرام واپس آ گئے اور آ کر رپورٹ دی کہ شہر میں دفعہ ۱۴۴ کا نفاذ ہے لہذا جلسہ کے انعقاد کی اجازت نہیں ملی۔ مجھے یاد ہے کہ جب ان لوگوں نے آ کر یہ اطلاع دی اس وقت ہم شیرپاؤ کے گھر بیٹھے ہوئے رات کا کھانا کھا رہے تھے۔ یہ سنتے ہی بھٹو نے انہیں بیٹھ جانے کو کہا اور جب وہ بیٹھ گئے تو بھٹو بولا: تم لوگ گاؤں کے رہنے والے ہو، تمہارے لیے تو ڈپٹی سی بہت بڑا افسر ہوتا ہے۔ تم تو پٹواری، تھانیدار اور تحصیلدار کو بھی تھانے کچہری میں حضور والا اور صاحب بہادر کہہ کر پکارتے ہو۔ یہ معاملہ واقعی تمہارے بس کا نہیں۔ اب کل صبح قصوری (یعنی میں) جائے گا اور دیکھنا کہ یہ جلسہ کی اجازت لے کر واپس آئے گا۔ کیونکہ یہ بیوروکریسی کو قابو کرنا جانتا ہے اور پھر ہنس کر کہا۔ چلو آؤ اب کھانا کھالو۔ مسکراؤ یار۔ کوئی بات نہیں۔

بہر حال اگلی صبح میں بھٹو صاحب کی ہدایت کے مطابق ڈپٹی کمشنر پشاور سلیم جیلانی کے پاس جا پہنچا مجھے معلوم تھا کہ وہ میرے بڑے بھائی کے بڑے قریبی دوستوں میں سے تھے۔ لہذا جب میں ان کے پاس گیا تو وہ اسی حوالے اور نسبت سے میرے ساتھ پیش آئے۔ انہوں نے گفتگو کے آغاز ہی میں ذرا شفقت اور حوصلہ افزائی کے انداز میں بات چیت کی، ان کو قطعاً علم نہیں تھا کہ میں پی پی میں شامل ہو کر اس کے چیئرمین کی طرف سے جلسہ عام کی اجازت لینے کے لیے آیا ہوں۔ وہ یہ سمجھ رہے تھے کہ شاید میں پکنک یا آؤٹنگ کے لیے نکلا ہوں گا تو ان کو بھی ملنے چلا آیا۔

ان کے شفقت بھرے اندازِ تخاطب کے جواب میں میں نے اپنے چہرے پر سنجیدگی، متانت اور کسی حد تک کرختگی لاتے ہوئے کہا۔

Mr. Deputy Commissioner, I have been deputed by the Chairman of P.P.P. to bring it to your notice that party intends holding a public meeting in Peshawar. In case you refuse permission to us we will hold our meeting on 10th November the day Ayub Khan addresses the public meeting in Shahi Bagh. If because of that any ugly situation develops you would be responsible for that. So, choice is yours either you allow us to hold the public meeting now or perforce we stage a public meeting on 10th. Good bye and good luck!

میں نے یہ سخت لہجہ اس لیے استعمال کیا تھا کہ مجھے بخوبی علم تھا کہ بیوروکریسی کے ساتھ یہی سلوک اختیار کیا تو وہ ٹھیک رہے گی۔ وہ جو زبان سمجھتے تھے میں نے اس کو استعمال کیا تھا۔ چنانچہ جب میں نے اٹھ کر ان کو خدا حافظ کہنے کے لیے ہاتھ بڑھایا تو وہ ششش و پنج میں آگئے۔ میرا ہاتھ پکڑ کر مجھے اپنے ریٹائرنگ روم میں لے گئے اور بولے: میں ابھی آیا۔ وہ ساتھ کے کمرے میں گئے جہاں سے انہوں نے کمشنر کو فون کیا اور وہاں سے بات چیت سیکرٹری تک پہنچی کہ پی پی والے تو جلسہ کے بارے میں یہ موقف اختیار کر رہے ہیں کہ ایک جلسہ گاہ میں دو قانون نہیں چل سکتے۔ پندرہ بیس منٹ یونہی گزر گئے۔ میں دوسرے کمرے میں بیٹھا ٹیلی فون کی گھنٹیوں اور جیلانی صاحب کی متفکرانہ باتیں سنتا رہا۔ یہ باتیں وہ کس سے کر رہے تھے، مجھے اس کا علم نہیں۔

غرض وہ بیس منٹ کے بعد واپس آئے تو بولے ۔ ٹھیک ہے ۔ جلسہ کر لو ۔ اجازت ہے ، میں نے
اکھڑ کران کا شکریہ ادا کیا اور جذبات سے عاری چہرہ لیے رخصت ہوگیا ۔ جب میں نے شیر پاؤ
گاؤں پہنچ کر بھٹو کو بتایا کہ اجازت مل گئی ہے اور اس وقت وہاں بے شمار ورکرز بیٹھے تھے ۔
اس موقع پر پھر سمیت دوسرے لوگ بھی تھے ۔ میرے منہ سے اجازت کا لفظ سن کر بھٹو نے خوشی
اور مسرت سے سر ہلاتے ہوئے کہا :

He knows the-art

ہم نے مقررہ تاریخ پر اپنے طے شدہ پروگرام کے تحت جلسہ کیا جو بے حد کامیاب رہا اور اس سے
متاثر ہو کر ہی صوبہ سرحد کی مقتدر ممتاز شخصیات نے ہمارے ساتھ آملنے کا فیصلہ کیا تھا ۔ جلسہ
کے بعد بھی جب لوگوں نے بھٹو صاحب کو جلسہ کی کامیابی کے لیے مبارک باد دی تو انہوں نے اپنے
مخصوص لہجہ اور انداز میں کہا ۔

It is Qasuri s show

اور یہ وہ زمانہ تھا جب بھٹو کی زبان سے ایسے لفظ سن کر ہم جیسے پُرجوش اور بے لوث لوگوں کا
خون گرم ہو جایا کرتا تھا اور ہم دل میں یونہی خواہش کرتے کہ بھٹو صاحب اگر ہمیں آسمان سے
تارے توڑنے کے لیے بھی کہیں تو ہم ایسا کر گزریں ۔ !!

صوبہ سرحد کا دورہ یوں تو مجموعی طور پر انتہائی کامیاب رہا لیکن اس کے دوران ہی صرف
ایک جگہ ہماری مڈبھیڑ کنونشن مسلم لیگ ٹولے کے ساتھ ہوگئی ۔ اور یہ جگہ ڈیرہ اسماعیل خان تھی ۔
وہاں تقریباً دو گھنٹے تک عوام اور پولیس کے درمیان گھمسان کا رن پڑا ، پولیس کے پاس آنسو گیس ،
ڈنڈے اور گولیاں تھیں جبکہ عوام نہتے تھے مگر انہوں نے حسبِ توفیق "پتھراؤ" کا ہتھیار استعمال کیا ۔
اور وہاں مجھے پہلی بار یہ دیکھنے کا موقع ملا کہ حیات محمد شیر پاؤ جیسا خاموش طبع اور کم گو انسان کیسے
بھٹو کے سامنے سیسہ پلائی دیوار بن کر ڈٹ گیا ۔ حق نواز گنڈا پور نے بالکل گوریلا انداز میں پولیس
کے حملوں کا جواب دیا اور خود میرے کمانڈوز ، جو میں نے بھٹو کی جان کی حفاظت کے لیے مامور کر
رکھے تھے ۔ انتہائی بے جگری سے عوام کے ساتھ مل کر آمریت کو سہارا دینے والی پولیس سے لڑے ۔
جس وقت پولیس سے ہماری یہ مڈبھیڑ ہوئی اس وقت بھٹو بازار میں تھے ، ہم نے بھٹو کو پہلے تو بڑی

تیزی اور حفاظت سے ایک دکان کے اوپر واقع چوبارہ پر پہنچایا اور پھر خود بازار میں آکر پولیس سے برسرِ آزما ہو گئے۔

اس زمانے میں وہاں وجیہ الدین کمشنر اور آفتاب احمد ڈی آئی جی تھے۔ یہ دونوں افسران بذاتِ خود موقع پر موجود تھے اور پولیس ایکشن کی نگرانی کر رہے تھے۔ لیکن ہم نے نہ صرف پولیس اور افسران بلکہ غنڈوں کو بھی مار بھگایا۔ ہنگامہ کے بعد ہم نے اپنے پروگرام کے تحت مصروفیات جاری رکھیں۔

شام کو میں نے بھٹو صاحب کو کہا: میں آج رات آپ کے ساتھ قیام نہیں کر سکوں گا کیونکہ میری آج رات نواب ڈیرہ کے گھر بسر ہو گی۔

بھٹو صاحب نے حیرت اور تعجب سے کہا: کیوں! ان سے تمہارا کیا رشتہ؟

میں نے مسکراتے ہوئے کہا نواب ڈیرہ نواب اللہ نواز خان میری والدہ کے پھوپھی زاد بھائی ہیں۔ بھٹو جانتے تھے کہ نواب ڈیرہ علاقہ کی انتہائی معزز اور با اثر شخصیات ہیں اور صوبہ سرحد اسمبلی میں سپیکر بھی رہ چکے ہیں لہٰذا انہوں نے سامنے بیٹھے کھر اور ممتاز بھٹو سے کہا: جہاں جاؤ، اس کا کوئی نہ کوئی معزز شخص رشتہ دار مل جاتا ہے۔

He is very well connected person.

بہر حال میں وہاں سے چلا آیا اور نواب ڈیرہ کے گھر جا پہنچا جو دراصل ایک قلعہ ہے۔ وہاں مجھے اس کمرے میں ٹھہرایا گیا۔ جہاں کسی زمانے میں گاندھی اور نہرو تقسیم ہند سے پہلے آکر ٹھہرا کرتے تھے۔ ان ہی دنوں ہم نے ایبٹ آباد میں ایک عظیم الشان جلسہ کا بندوبست کیا جس کا مجموعی اثر پارٹی پر بڑا خوشگوار رہا۔ اس جلسہ کے بعد بھٹو صاحب اپنے چند قابلِ اعتماد اور قریبی ساتھیوں (جن میں، میں بھی شامل تھا)، کے ساتھ ایبٹ آباد میں ائر مارشل (ریٹائرڈ)، اصغر خان کے گھر گئے۔

دراصل بھٹو نے یہ بات محسوس کر لی تھی کہ جوں جوں تحریک آگے بڑھے گی اور پیپلز پارٹی عوام کے دلوں میں گھر بناتی چلی جائیگی۔ توں توں حکومت تنگ آکر انتہائی اقدام کرنے پر مجبور ہو گی جس میں خود بھٹو کی گرفتاری ایک عام اور بنیادی سی بات تھی لہٰذا مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ وہ ان دنوں گاہے بگاہے اپنی اس تشویش یا دور اندیشی کا ذکر ضرور کیا کرتے تھے کہ اگر وہ جیل چلے گئے تو یہ

تحریک جواب گلیوں، بازاروں میں امڈتی ہوئی صاف طور پر محسوس کی جا سکتی ہے، اس کا کیا بنے گا۔ اور اس کو کون سنبھالے گا۔

چنانچہ چیئرمین نے ایئر مارشل کے گھر چلنے کو کہا تو میرے ذہن میں معاً یہ خیال آیا کہ اس میٹنگ میں کیا ہوگا! اور ساتھ ہی خود بھٹو صاحب کے وہ تفکرات ذہن میں ابھرے جن کا اظہار وہ کیا کرتے تھے۔ میرا خیال تھا کہ وہ ایئر مارشل کو پارٹی میں آنے کی دعوت دیں گے۔ بہر حال ہم ایئر مارشل کے گھر جا پہنچے۔ جہاں ہم کو خندہ پیشانی سے خوش آمدید کہا گیا۔

ہم لوگ اکٹھے ہی بیٹھ گئے اور حسب معمول گفتگو کا آغاز ملکی حالات سے ہوا، بھٹو اور اصغر خان دونوں ہی ایک دوسرے کو بڑی اچھی طرح تاڑ گئے تھے لہٰذا دونوں کی باہمی بات چیت کے آغاز پر ہی اصغر خان یہ جان گئے کہ بھٹو ان کو پارٹی میں لانا چاہتے ہیں اور بھٹو نے یہ محسوس کر لیا کہ اصغر خان ان کے شانہ بشانہ کھل کر نہیں آئیں گے۔ بہر حال نہایت محتاط مگر خوشگوار ماحول میں ہونے والی یہ گفتگو اور ملاقات بے معنی ثابت نہیں ہوئی کیونکہ یہ طے کر لیا گیا تھا کہ اگر بھٹو کو ایوب خان نے گرفتار کر کے جیل میں ڈال دیا یا ان کو نظر بند کیا گیا تو ایئر مارشل صاحب میدان سیاست میں اتریں گے اور ایسے میں ان کو پیپلز پارٹی کے تمام ارکان اور ورکرز کا بھرپور تعاون میسر ہوگا۔ قارئین کو یاد ہوگا کہ بالکل ایسے ہی ماحول میں ایئر مارشل نے کچھ عرصہ کے بعد انٹر کانٹینینٹل ہوٹل لاہور میں اپنی پہلی سیاسی پریس کانفرنس کی اور سیاست میں حصہ لینے کا اعلان کر دیا اور جب وہ ملکی دورے پر نکلے تو ہر جگہ ان کا والہانہ اور پرتپاک استقبال کیا گیا۔

جو کوئے یار سے نکلے

میرا ایک خفیہ مشن

ہم صوبہ سرحد کا دورہ مکمل کر کے واپس شیر باؤ گاؤں پہنچے تو معلوم ہوا کہ راولپنڈی میں پولیس نے ۵ ؍نومبر ۱۹۶۷ء کو احتجاجی طلباء پر فائرنگ کر دی ہے۔ جس کے نتیجے میں ایک طالبِ علم عبدالحمید ہلاک ہو گیا ہے۔ واقعہ یہ تھا کہ پولی ٹیکنیک کالج راولپنڈی کے طلباء ایک وفد مطالعاتی اور سیر و تفریح کے دورہ پر پشاور گیا۔ جس کے دوران انہوں نے باڑہ میں شاپنگ کی۔ واپسی پر اٹک کے پل پر کسٹمز اور پولیس کے عملہ نے جب تلاشی لی تو اُن سے کچھ سامان برآمد کر لیا۔ جو روزمرہ کے استعمال کی چند اشیاء یعنی جرابوں، نقر، رومال وغیرہ پر مشتمل تھا۔ طلباء نے واپس پنڈی آ کر اس پر زبردست احتجاج کیا۔ اور ہڑتال کر دی۔ طلباء نے پشاور روڈ پر واقع اپنے کالج سے باہر نکل کر سڑک کو بلاک کر دیا اور یوں ٹریفک جام کر دی۔ جس پر پولیس موقع پر پہنچ گئی۔ اس زمانے میں راولپنڈی کا ایس پی عبدالوکیل تھا۔ جو اپنے سخت اور اکھڑ رویہ کی وجہ سے عام شہریوں میں اچھی شہرت نہیں رکھتا تھا۔ اس نے طلباء پر پولیس کے

روایتی انداز میں تشدد کیا اور جب طلباء کے جوش و خروش میں کوئی کمی نہ آئی تو اس نے فائرنگ کا حکم دے دیا۔ جس کے نتیجہ میں عبدالحمید مارا گیا۔ یہ خبر آگ کی طرح علاقہ میں پھیل گئی اور عوام میں اضطراب بڑھ گیا۔

بھٹو صاحب نے مجھے فوراً راولپنڈی پہنچنے کا حکم دیا اور ہدایت کی کہ وہاں طلباء کے حلقوں میں رابطہ کیا جائے۔ وہ خود راولپنڈی پہنچنا چاہتے تھے لیکن ان کی خواہش تھی کہ اس سے پہلے وہاں کا ماحول سازگار بنایا جائے۔ اس اہم مشن کے لئے انہوں نے مجھے مقرر کیا اور میں بھٹو کی آمد کا سیکرٹ مشن لے کر راولپنڈی پہنچا۔

راولپنڈی میں میرا قیام دو دن رہا۔ اس میں سے ایک دن میں نے اپنے کزن کے پاس اور دوسرا ایک دوست کے گھر گذرا، لیکن ان کو میں نے اپنی آمد کے بارے میں بس اتنا بتایا کہ ایک ضروری کام ہے۔ میں صبح سویرے گھر سے نکل جاتا اور شام کو آجاتا۔ میں نے راولپنڈی کے ایک گمنام اور غیر معروف پریس سے اشتہار چھپوایا جس میں بھٹو صاحب کی راولپنڈی میں آمد کا پروگرام تھا۔ یہ اشتہار میں نے ایک بیگ میں رکھے اور ٹیکسی کرائے پر حاصل کی۔ میں نے راولپنڈی کے سارے کالجوں اور سکولوں میں یہ اشتہار انتہائی تیزی اور خاموشی سے تقسیم کر دیئے حتیٰ کہ مڈل سکولوں میں بھی یہ اشتہار پہنچا دیئے۔ میں نے احتیاط کے طور پر یہ طریقہ اپنایا تھا کہ ایک ٹیکسی کو صرف ایک گھنٹے کے لئے رکھتا تھا۔ اس کے بعد میں ٹیکسی تبدیل کر لیتا تھا۔ تاکہ اگر کوئی ٹیکسی والا پکڑا جائے یا اس سے میرے بارے میں پوچھا جائے تو وہ پولیس کی مدد نہ کر سکے۔

پروگرام کے تحت غالباً ۸ ، نومبر کو بھٹو راولپنڈی میں ہوٹل انٹر کانٹیننٹل پہنچے۔ یہ وہ وقت تھا جب سارا شہر عبدالحمید کے قتل پر سراپا احتجاج بنا ہوا تھا۔ عوام کا غم و غصہ عروج پر تھا۔ ایسے میں انہیں بھٹو کی آمد کی خبر ہوئی تو وہ جذباتی ہو کر بھٹو کے استقبال کے لئے اُن کے ہوٹل انٹر کانٹی نینٹل پر جہاں بھٹو کا قیام تھا پہنچے عوام کا ہجوم بڑھتا گیا یہ لوگ حکومت کے خلاف نفرت کا اظہار کرنے کے لئے زبردست نعرے لگا رہے تھے۔

ہجوم کو منتشر کرنے کے لئے پولیس نے لاٹھی چارج کیا لیکن پھر بھی صورت حال کو سنبھالنے

کے لئے آنسو گیس کے شیل پھینکے۔ نہتے اور پُرامن شہریوں کو پولیس نے بڑی بیدردی سے زدوکوب کیا حتیٰ کہ ایک اخباری رپورٹر خالد پولیس تشدد سے لہولہان ہو گیا۔ ادھر بھٹو صاحب کے جذباتی رویہ اور سلوک نے عوام کے لہو کو اور گرمایا اور دیکھتے ہی دیکھتے راولپنڈی شہر ایوب آمریت کے قلعہ کو نیلام کرنے کے لئے ہمہ وقت تیار اور چوکنا ہو گیا۔ دوسری طرف ہماری گرفتاری کے آرڈر جاری ہو گئے۔

مجھے اس کا علم ہوا تو میں نے روپ بدل کر راولپنڈی سے لاہور جانے کا فیصلہ کر لیا۔ میں نے سیاہ چشمہ لگایا اور سر پر ہیٹ رکھا۔ امان اللہ خان میرے ہمراہ تھے اور ہم دونوں ٹیکسی پر سوار ہو کر مورگاہ پہنچے۔ پروگرام میں تھا کہ یہاں سے بس پر سوار ہو کر لاہور چلے جائیں گے۔ مجھے معلوم تھا کہ امان اللہ خان کو عام طور پر سیاست پر بحث اور باتیں کرنے کا شوق ہے وہ ہر جگہ اور ہر کسی سے سیاست پر بے دھڑک تبادلہ خیال شروع کر دیتا تھا اور ہم جس مرحلے سے گذر رہے تھے، اس میں خطرہ تھا کہ کہیں ہمارا بھانڈا نہ پھوٹ جائے۔ چنانچہ میں نے بس پر سوار ہونے سے پہلے امان اللہ خان سے کہا: یار دیکھو ابھی فیصلہ کر لیتے ہیں کہ ہم کہاں کہاں بیٹھیں گے؟

وہ حیرت سے بولا: کیا مطلب ہے تمہارا۔

میں نے جواب دیا۔ تم سیاست پر بات کرنے سے باز نہیں آؤ گے اور یوں ہم دونوں پکڑے جائیں گے۔ مناسب یہی ہے کہ تم اور میں الگ الگ بیٹھیں۔ اب یہ فیصلہ تم کر لو کہ کہاں بیٹھو گے۔ آگے ڈرائیور کے نزدیک یا پیچھے۔

بہرحال ہماری ترکیب کارگر رہی اور ہم بخیریت لاہور پہنچ گئے۔ ہمارے علاوہ غلام مصطفےٰ کھر کے بھی وارنٹ جاری ہو گئے تھے۔ لہذا وہ بھی نکلا جس روز ہم لاہور پہنچے، اسی شام بھٹو صاحب بذریعہ ہوائی جہاز لاہور پہنچے۔ ان کا معمول تھا کہ وہ لاہور میں آ کر عام طور پر فلیٹیز ہوٹل یا انٹر کانٹی نینٹل میں ٹھہرتے تھے مگر اب کی بار انہوں نے اس میں ترمیم کر دی اور وہ ڈاکٹر مبشر حسن کی رہائش گاہ پر چلے گئے۔ یہ پہلا موقع تھا کہ بھٹو صاحب نے ڈاکٹر صاحب کے گھر قیام کیا۔ اسی دوران میں خبر ملی کہ پشاور کے شاہی باغ میں ایک پختون نوجوان نے صدر ایوب خان

پر قاتلانہ حملہ کر دیا لیکن یہ حملہ ناکام رہا۔ وہاں ہم دوستوں کی میٹنگ ہوئی اور ہر ایک کا خیال تھا کہ راولپنڈی کے واقعہ اور عوام کے جوش و خروش کو مدنظر رکھتے ہوئے اب حتمی فیصلہ کرنے کی گھڑی آگئی ہے اور یہ حتمی فیصلہ یہی تھا کہ ایوب آمریت کے تابوت میں آخری کیل ٹھونک دی جائے۔ اس کے لئے پروگرام طے ہوا کہ ۱۲ نومبر کو صبح سویرے خیبر میل سے ملتان کے لئے روانہ ہوا جائے علاقوں زور پکڑنا چاہیئے تھا۔

اتنی محبت کون کرے گا

روانگی سے دو دن پہلے میں تقریباً آٹھ دس ہزار اشتہار جن پر بھٹو کی روانگی کا پروگرام تھا ایک بکس میں رکھے اور سکوٹر پر اپنے قصور کے ایک ورکر کے ہمراہ ساہیوال پہنچا یا تاکہ ریلوے لائن کے دونوں طرف کے دیہات میں اور خاص طور پر ان اسٹیشنوں پر جہاں خیبر میل کا سرکاری طور پر کوئی سٹاپ نہیں ہوتا، عوام کو بھٹو کی آمد کے بارے میں بتایا جائے تاکہ وہ ریلوے اسٹیشنوں پر پہنچ جائیں اور یوں حکومت پر دباؤ بڑھایا جائے۔ میں نے آرام کی پرواہ کئے بغیر دن رات ایک کرکے یہ اشتہار بلاشبہ ایک سو سے زائد دیہات میں پہنچائے میں سارا سارا دن کچے راستوں اور پگڈنڈیوں پر مسلسل سکوٹر چلاتا اور پکی سڑک پر صرف اس وقت آتا جب مجھے سکوٹر کی ٹینکی میں پٹرول ڈلوانا ہوتا تھا۔ جہاں سورج غروب ہو جاتا، میں کسی دیہی چوپال یا ڈیرے پر پہنچ جاتا اور وہیں رات بسر کر لیتا۔

اپنا یہ مشن پورا کرکے میں ۱۱ نومبر کو تقریباً دس بجے شب ڈاکٹر مبشر حسن کے گھر پہنچا۔ بھٹو صاحب کے کمرے میں بڑی رونق تھی، دوست جمع تھے اور خوش گپیاں ہو رہی تھیں، میں کمرہ میں داخل ہوا، سفر، تھکن اور بے آرامی کے باعث میرا بُرا حال تھا۔ اتنے میں حبیب جالب بھی وہاں آگئے، وہ خاصے خوشگوار "موڈ" میں تھے محفل کا رنگ دیکھ کر اور چمک اٹھے۔ میں نے ماحول کو بھانپ کر جلدی جلدی بھٹو صاحب کو اپنے کام کے بارے میں بتایا۔ وہ یہ سن کر بے حد خوش ہوئے کہ میں ساہیوال تک اشتہار

تقسیم کر آیا ہوں میرے چہرے کو بغور دیکھ کر انہوں نے کہا :

Raza, well done. I am proud of you. Now you go home and take rest.

میں واپس اپنے گھر آگیا۔ وہاں جاکر معلوم ہوا کہ سب گھر والے ماڈل ٹاؤن میں ریاض صاحب کے یہاں کھانے پر گئے ہوئے ہیں۔ میں خاصا تھک گیا تھا۔ اور بھوک بھی لگ رہی تھی۔ لہٰذا میں نے سکوٹر کا رخ ماڈل ٹاؤن کی طرف موڑ دیا۔ وہاں جاکر دیکھا کہ تمام مہمان کھانا کھا چکے ہیں اور اس وقت قوالی سماعت کر رہے تھے وہاں احباب نے مجھے گھیر لیا مجھ پر موجودہ صورت حال کے بارے میں سوالات کرنے شروع کر دیئے۔ میں نے سوالات کو وقتی طور پر موقوف کرتے ہوئے پہلے منہ ہاتھ دھوکر، تازہ دم ہونیکے بعد سیر ہو کر کھانا کھایا اور پھر دوستوں سے تبادلہ خیال کرنے لگا۔ مہمانوں میں آئی جی پولیس صلاح الدین قریشی کی اہلیہ بھی موجود تھی۔ اور ان کی گاڑی بھی باہر کھڑی تھی۔ دوستوں سے باتیں کرتے ہوئے میں نے نہ صرف صوبہ سرحد کے دورے کی تفصیلات بیان کر دیں بلکہ جوشِ خطابت میں اپنا آئندہ کے پروگرام (یعنی دورۂ ملتان) کے بارے میں بھی کچھ باتیں کہہ دیں۔

ان کا چھاپہ اور میرا فرار

ابھی یہ سلسلہ جاری تھا کہ باہر سے ایک گاڑی کوٹھی کے اندر داخل ہوتی محسوس ہوئی لیکن پھر یہ گاڑی واپس چلی گئی اور کوٹھی کے دروازے سے کچھ دور جاکر رک گئی اس میں سے سفید کپڑوں میں پولیس کے ڈی ایس پی اتر کر اندر آگئے۔ دراصل انہوں نے آئی جی کی گاڑی کھڑی دیکھ کر اپنی گاڑی باہر روکنے کا فیصلہ کیا تھا۔

ان پولیس والوں کے ساتھ میرا وہ نوکر بھی تھا جسے میں کچھ دیر پہلے گھر چھوڑ کر آیا تھا۔ اور اب پولیس میرا پیچھا کرتی ہوئی اس کو اپنے ہمراہ لے کر یہاں تک آئی تھی۔ پولیس والوں نے میرے بارے میں دریافت کیا استفسار پر انہوں نے بتایا کہ قصوری صاحب سے وہ ایک قتل کے مقدمہ کے بارے میں بات کرنا چاہتے ہیں اور یہ کہ وہ سرگودھا سے آئے ہیں —— ان لوگوں کی باتوں سے میرے بڑے بھائی شبیر علی کو شک گذرا۔ لہٰذا انہوں

نے چپکے سے آ کر مجھے اشارہ سے اپنے پاس بلایا اور خطرے سے آگاہ کیا۔ میں نے یہ سوچا کہ ضرور پولیس مجھے راولپنڈی میں بھٹو کی آمد اور اشتہار تقسیم کرنے کے حوالے سے گرفتار کرنا چاہتی ہے۔ اور مجھے پروگرام کے مطابق اگلے روز ملتان کے لئے روانہ ہونا تھا۔ لہذا میں نے فوری طور پر وہاں سے روپوش ہونے کا فیصلہ کر لیا۔

میں نے مہمانوں سے معذرت کرتے ہوئے باتھ روم جانے کی اجازت لی اور وہیں سے باہر نکل آیا۔ میں نے دیکھا کہ چاروں طرف پولیس پوری طرح چوکس کھڑی ہے۔ چنانچہ ساتھ والی ایک کوٹھی میں کود گیا۔ وہاں سے دوسری، پھر تیسری اور یوں یکے بعد دیگرے میں متعدد کوٹھیاں کودتا چلا گیا۔ اس دوران میں ایک کا چوکیدار اور کتا بھی مجھ پر جھپٹا اور اس نے اپنے مالک کی وفاداری کا ثبوت دیتے ہوئے بھونکنا شروع کر دیا لیکن میں کسی نہ کسی طرح اس سے جان چھڑا کر باہر سڑک پر آ گیا کیونکہ اب پولیس والے بہت پیچھے رہ گئے تھے۔

اس زمانے میں ابھی آبادی اس قدر زیادہ پھیلی نہیں تھی۔ سارا علاقہ جنگل کھیت اور قبرستان پر مشتمل تھا۔ میں پھونک پھونک کر قدم رکھتا ہوا آگے بڑھتا چلا گیا اور یوں قذافی سٹیڈیم چلا آیا جہاں اس وقت پولیس کے کیمپ ایک معمولی سٹیڈیم کے سوا کچھ نہیں تھا۔ میں اکیلا شخص چپ چاپ آ کر سٹیڈیم میں بیٹھ گیا۔ اور سوچنے لگا کہ شاید دنیا میں کوئی شخص سردیوں کی ایسی رات میں سٹیڈیم میں یوں تنہا نہیں بیٹھا ہو گا۔ اگر بیٹھا بھی ہو گا تو ساری رات نہیں بیٹھا ہو گا۔ یہ نومبر کی ایک سرد رات تھی اور میں اکیلا وہاں بیٹھا کپکپا رہا تھا۔ دور سے مجھے کبھی کبھی پہرے دار اور پولیس کی سیٹیاں سنائی دیتی تھی۔ اور نیند کا ظاہر ہے کہ دور دور تک کوئی نام و نشان نہیں تھا۔

جونہی پو پھٹنے کے آثار ہوئے۔ میں چپکے سے باہر آیا، اتفاق سے سامنے سے ایک رکشا آتا دکھائی دیا، میں نے اسے روکا اور جلدی سے اس پر بیٹھ گیا اور اسے اچھرہ موڑ چلنے کو کہا۔ وہاں جا کر میں نے ایک ہوٹل میں گرم گرم چائے پی، دو تین انڈے کھائے اور ناشتہ کر کے میں عارف اقبال بھٹی ایڈووکیٹ کے پاس جا پہنچا۔

وہ مجھے علی الصبح اپنے پاس دیکھ کر حیران تو ہوئے لیکن میں نے ان کی حیرانی کو دور

کرنے کے لئے سارا واقعہ سنایا۔ میں بھٹی صاحب کو کہہ رہا تھا کہ آپ میری ضمانت کے کاغذات تیار کریں اور مجھے کسی طریقے سے خیبر میل پر سوار کرائیں خواہ اس کے لئے مجھے پتو کی یا رائے ونڈ ہی ہو کر نہ جانے پڑے۔ ابھی ہم چائے پی رہے تھے کہ صبح کے اخبارات آگئے۔ اخبارات کی شہ سرخی دیکھ کر میں اور عارف اقبال بھٹی حیران رہ گئے۔ اخباری رپورٹ کے مطابق بھٹو سمیت ۱۳ افراد ڈی پی آر کے تحت گرفتار کر لئے گئے تھے۔ اور کمال کی بات یہ تھی کہ گرفتار ہونے والوں میں میرا نام بھی شامل تھا۔

میں تو پولیس کے ہاتھوں آنے سے اس لئے بچ رہا تھا کہ بھٹو صاحب کے ساتھ ملتان کے دورہ پر جاؤں گا۔ مگر اب جبکہ وہ گرفتار ہو گئے تھے ظاہر ہے کہ یہ دورہ ختم ہو گیا تھا اور میری ضمانت بھی نہیں ہو سکتی تھی کہ گرفتاری ڈی پی آر کے تحت عمل میں لائی جا رہی تھی۔ لہٰذا میں نے عارف بھٹی سے مشوروں کے بعد طے کیا کہ خود کو گرفتاری کے لئے پیش کر دوں۔

ادھر لاہور میں بھٹو صاحب اور دیگر راہنماؤں کی گرفتاری پر شدید ردعمل ہوا، عوام نے ایک احتجاجی جلوس نکالا جس میں پیش پیش کالجوں اور یونیورسٹی کے طلباء تھے۔ مجھے معلوم تھا کہ یہ جلوس واپسی پر مال روڈ سے گذرے گا چنانچہ میں چپکے سے جاکر شیزان ریستوران میں بیٹھ گیا جونہی جلوس آیا میں باہر نکل آیا۔ لوگوں اور طلباء نے مجھے دیکھا تو ان کا جوش و خروش پھر سے تازہ ہو گیا اور وہ نعرے بلند کرنے لگے۔

میں نے ایک اونچی جگہ کھڑے ہو کر تقریر شروع کر دی اور سامنے کھڑے پولیس انسپکٹر (سول لائنز) اصغر خان عرف ہلاکو خان کو مخاطب کر کے کہا: میں اپنی مرضی سے گرفتاری دے رہا ہوں ورنہ تم مجھے چھ ماہ تک گرفتار نہیں کر سکتے تھے۔ ہلاکو خان آہستہ آہستہ آگے بڑھا لوگوں کے نعرے بلند ہوئے اور پھر پولیس والوں نے مجھے اپنی حراست میں لے لیا۔ جہاں سے وہ مجھے تھانہ سول لائنز لے آئے۔ وہاں حاجی حبیب الرحمان جو ان دنوں لاہور کے ایس ایس پی تھے مجھے دیکھتے ہی بولے: لیڈر صاحب تسی کتھے، ایسی تے تسانماں نوں رات دے نبھ دے پئیں آں۔ (لیڈر صاحب، آپ کہاں ہیں، ہم تو آپ کو گذشتہ رات سے تلاش کر رہے ہیں)۔ میں نے جواباً کہا میں نے خود گرفتاری پیش کی ہے کیونکہ میرا قائد گرفتار ہو چکا

ہے۔ آپ کی پولیس تو مجھے چھ ماہ تک بھی گرفتار نہیں کر سکتی تھی۔

اسیری کے روز و شب

ضابطہ کی کارروائی بلا تاخیر مکمل کر دی گئی اور مجھے پولیس پارٹی گجرات لے گئی۔ وہاں جا کر معلوم ہوا کہ مجھ سے پہلے ڈاکٹر مبشر حسن اور امان اللہ خان پہنچ چکے ہیں۔ ڈاکٹر مبشر حسن سے بھٹو کے بارے میں دریافت کیا تو انہوں نے بتایا کہ بھٹو صاحب کو میانوالی لے گئے ہیں۔ (وہاں سے پھر ان کو ساہیوال منتقل کر دیا گیا تھا)۔ اگلے روز جیل میں خبر آئی کہ دو مہمان اور آ رہے ہیں۔ اور تیاریاں بتا رہی تھیں کہ کوئی وی آئی پی آ رہا ہے۔ واقعی یہ تاثر درست تھا کیونکہ یہ دو مہمان عبدالولی خان اور اجمل خٹک تھے۔ پھر یہ خبر آئی کہ ایک اور آ رہا ہے۔ لیکن یہ دیکھ کر حیرت کی انتہا نہ رہی کہ آنے والے مہمان کی آمد سے پہلے دو بڑے بکس آئے، پھر بستر بند آیا اور پھر ایک اور چھوٹا بکس آیا۔ اس کے بعد اصل مہمان آیا — یہ سامان واقعی یہی شخص لا سکتا تھا اور یہ میر رسول بخش تالپور تھے۔

میر صاحب سے میری بڑی یاد اللہ تھی اور وہ مجھ سے سینئر ہونے کے باوجود بے حد پیار کرتے تھے اور ہمیشہ اپنائیت اور محبت کے ساتھ ملتے تھے۔ چنانچہ جب ہم دونوں نے ایک دوسرے کو دیکھا تو سندھ کے روایتی انداز میں ایک دوسرے کو خوش آمدید کہتے ہوئے کہا: بادشاہی جو خیر سائیں۔

میر صاحب نے بتایا کہ بھئی یہ جیل ہر سیاست دان کا سسرال ہوتی ہے۔ لہٰذا یہاں آتے ہوئے عزت اور شان و شوکت سے آنا چاہیئے۔ میں تین ماہ کا راشن لے کر آیا ہوں، لیکن گھر پر اہلیہ سے کہہ آیا ہوں کہ ایک ماہ کے بعد راشن بھجوا دینا اللہ کے فضل و کرم سے ہر شے ساتھ ہے۔ بسکٹ، سوہن حلوہ، لوڈو، تاش، سب کچھ ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ میر صاحب کی آمد سے ہم سب کو نیا حوصلہ ملا۔

جیل میں ہم ساتھیوں میں سے صرف ولی خان کو اے کلاس دی گئی تھی اور ان کا کمرہ ہم سب کے مقابلے میں بڑا اور کشادہ تھا۔ اور باقی ہم سب کو بی کلاس دی گئی۔

ولی خان کو آٹھ روپے اور ہم سب کو پانچ روپے فی کس روزانہ ملتے تھے۔

اتفاق سے مجھے میس کا انچارج بنا دیا گیا۔ سرکاری طور پر ہمیں جو الاؤنس ملتا تھا اس میں کچھ پیسے مزید ڈال کر کھانے کا بندوبست کیا گیا، جیل حکام کی طرف ہمیں مشقتی فراہم کیے گئے تھے چنانچہ صبح سویرے ناشتہ، اس کے بعد چکن سوپ، دوپہر کا کھانا اور پرتکلف ڈنر ــــ جس کے دوران مختلف وقفوں سے چائے کا دور چلتا رہتا تھا۔ تمام ساتھی میرے روزانہ کے معمول سے مطمئن اور خوش تھے۔ حتیٰ کہ ولی خان مجھے اکثر کہنے لگے: یار تم تو مجھے موٹا کر دو گے۔

ایک دن ولی خان نے مجھے پوری سنجیدگی سے کہا: تم میرے ساتھ اپنا کمرہ بدل لو میں نے کہا: خان صاحب آپ کے پاس تو پہلے ہی بڑا کشادہ اور عمدہ کمرہ ہے۔

وہ بولے: بات چھوٹے اور بڑے کمرے کی نہیں۔ اصل بات یہ ہے کہ تم جس کمرے میں ہو اس میں ۳۱-۱۹۳۰ء میں باچا خان رہ چکے ہیں لہٰذا اس کمرے سے میری ایک جذباتی وابستگی ہے۔

یہ سن کر میں نے کہا: اگر یہ بات ہے تو اس کمرے پر سب سے جونیئر سیاستدان کی حیثیت سے میرا حق ہے تاکہ مجھے اس کمرے کی دیواروں سے حوصلہ ملتا رہے۔

ایک دن ولی خان بڑے خوشگوار موڈ میں تھے۔ لہٰذا میں نے ان سے کہا: خان صاحب آپ تو پٹھان لوگ بڑے خونخوار اور کھڑے کھڑے بکرے کھا جانے والے "جی دار" لوگ ہیں آپ کا ان ہندوؤں سے کیسے تعلق قائم ہو گیا۔ جو پانچ فٹ کے قد کا ہے اور دال پر گزارہ کرتا ہے۔ میرا سوال سن کر ولی خان مسکرا دیئے اور کہنے لگے: مجھے تمہارا سوال پسند آیا ہے۔ اب ذرا توجہ اور حوصلہ سے میرا جواب سنو ــــ اور پھر قدرے توقف کے بعد کہنے لگے:

باچا خان نے خدائی خدمت گار کی تحریک شروع کی جو دیکھتے ہی دیکھتے سرحد میں عوامی سطح پر مقبول ہو گئی۔ غریب عوام نے اس کو بڑا پسند کیا کیونکہ اس کے توسط سے ان کو پہلی بار عزت نفس کا احساس ہوا تھا۔ رفتہ رفتہ یہ تحریک "سامراج دشمنی" کا رنگ اختیار

کر گئی۔ چنانچہ انگریز حکومت نے اس کا سختی سے نوٹس لیا اور اس کے خلاف سخت کارروائی کا فیصلہ کر لیا۔ اعلیٰ سطح پر اصولاً طے پایا کہ اس کی سزا موت قرار دی جائے۔ وہ زمانہ ڈھیلداری کا زمانہ تھا چنانچہ اس زمانے کے سرحد کے وزیر اعلیٰ صاحبزادہ عبدالقیوم (بانی اسلامیہ کالج پشاور) تھے جنہیں اہل سرحد اپنا سرسید بھی تسلیم کرتے ہیں۔ انہوں نے باچا خان کو کسی ذریعے سے مطلع کیا کہ اگر آپ لوگ اس شکنجے اور مصیبت سے نجات چاہتے ہیں تو خود کو فوراً کسی سیاسی جماعت سے وابستہ کر لیں کیونکہ سیاسی جماعتوں پر ایسی پابندی نہیں تھی۔

باچا خان کو اس زمانے میں گجرات جیل ہی میں رکھا گیا تھا کیونکہ گجرات اور کانگڑہ (بھارت) اس زمانے میں دو ایسی جیلیں تھیں جہاں سیاسی راہنماؤں اور کارکنوں کو رکھا جاتا تھا۔ یہ پہلا موقع تھا کہ ہمارے راہنماؤں کو سرحد سے باہر رکھا گیا کیونکہ جب یہ راہنما سرحد میں ہوتے تھے تو ان کا رابطہ باہر اپنے کارکنوں سے مسلسل رہتا تھا۔

باچا خان کو صورت حال سے آگاہ کیا گیا تو انہوں نے اس امر کی اجازت دے دی کہ کسی سیاسی جماعت سے وابستگی اختیار کر لی جائے لہٰذا سب سے پہلے ہم لوگوں نے مسلم لیگ سے رابطہ کیا مگر مسلم لیگ والوں نے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ آپ لوگ تو انگریز کو گالی دیتے ہیں اور آپ کا خیال ہے کہ انگریز کے رخصت ہونے کے بعد بھی ہم ہندو کے ساتھ مل کر رہ سکتے ہیں لہٰذا چونکہ یہ ہمارے نظریات اور مؤقف کا فرق ہے، لہٰذا ہمارا آپ سے کوئی تعلق یا رابطہ یا ناتہ نہیں ہو سکتا۔ مسلم لیگ والوں سے مایوس ہو کر ہم نے مسلم ایجوکیشن کانفرنس والوں سے رابطہ کیا مگر ان سے بھی بات آگے نہ بڑھ سکی۔ مجبور اور مایوس ہو کر بالآخر گاندھی سے رابطہ کیا گیا تو اس نے کہا کہ کانگریس کے دروازے کھلے ہیں۔ ہم اس کے ساتھ شامل ہو گئے کیونکہ آخر ہم لوگوں نے جان تو بچانا ہی تھی۔

بعد میں کانگریس کے ساتھ کئے گئے ایک معاہدہ جسے ۱۹۳۱ء گاندھی اردون معاہدہ کہتے ہیں، اس کے تحت ہی ہمارے راہنماؤں کی رہائی عمل میں آئی۔ چنانچہ ہندوؤں کے ساتھ ہمارے تعلق کا سبب صرف اور صرف یہی تاریخی حقائق ہیں۔

ولی خان نے سلسلہ کلام جاری رکھتے ہوئے بتایا کہ قیام پاکستان کے بعد ہم نے پورے

خلوص دل سے یہ تسلیم کیا کہ ہمارا نظریہ ہار گیا اور مسلم لیگ کا موقف جیت گیا، برصغیر کے مسلمانوں نے مسلم لیگ کے مؤقف پر اپنے اعتماد کی مہر ثبت کر دی ہے۔ چنانچہ ہمیں کہا گیا کہ اگر قائداعظم سرحد میں آئے تو آپ کا کیا ردعمل ہوگا، ہم نے کہا: جناب انہیں ہم سر آنکھوں پر بٹھائیں گے۔

ہم نے سارے صوبہ میں اعلان کرا دیا کہ قائداعظم کا چارسدہ میں عظیم الشان استقبال کیا جائے۔ مقررہ دن سے پہلے ہی اہل سرحد اپنی روایتی مہمان نوازی کے ثبوت کے طور پر چارسدہ آنا شروع ہو گئے۔ مگر قائداعظم نے چارسدہ آنے سے عین موقع پر انکار کر دیا۔ جس سے پٹھانوں میں زبردست بے چینی پھیل گئی۔ خود ہمیں اپنے کارکنوں کے سامنے شرمندہ ہونا پڑا۔ اب آپ سوچیں گے کہ قائداعظم کیوں نہیں آئے؟

اصل بات یہ تھی کہ جب خان عبدالقیوم خان نے دیکھا کہ قائداعظم کو باچا خان اور اس کے کارکنوں نے خوش آمدید کہنے کا فیصلہ کر لیا ہے تو وہ گھبرا گئے۔ انہوں نے سوچا کہ اگر قائداعظم اور غفار خان ایک دوسرے کے نزدیک آ گئے اور یوں ایک دوسرے کے بارے میں ان کی غلط فہمیاں دور ہو گئیں تو ان کا (خان عبدالقیوم خان کا) مستقبل تاریک ہو جائے گا۔ چنانچہ انٹیلی جنس انتظامیہ اور پولیس کے ساتھ ساز باز کر کے انہوں نے قائداعظم تک یہ غلط رپورٹ پہنچائی کہ چارسدہ میں ان پر قاتلانہ حملہ ہوگا۔ گویا ان کی جان کو خطرہ ہے۔ اس رپورٹ کے باعث قائداعظم نے چارسدہ کا دورہ منسوخ کر دیا۔

جیل میں ہم سب بڑے خوش تھے البتہ اپنے دوسرے ساتھیوں کے بارے میں فکر رہتی تھی کہ نہ جانے وہ کس حال میں اور کہاں ہوں گے۔ میں صبح سویرے اٹھ کر اپنے سارے جسم پر مالش کر کے ورزش کرتا اور باقاعدہ ڈنٹر پیلا کرتا تھا۔ ورزش کرنے کی عادت کو میں نے جیل میں آ کر بھی ترک نہیں کیا۔ مجھے ورزش کرتے دیکھ کر ڈاکٹر مبشر حسن نے بھی عمر رفتہ کو آواز دینے کا فیصلہ کر لیا اور ایک دن نیکر پہن کر میرے مقابل آ گئے۔ انہوں نے سارے جسم پر مالش کی اور پھر ڈنٹر پیلنے لگے۔ چند منٹوں کے بعد ان کا دم پھول گیا اور پسینے میں شرابور ہو گئے۔

اسی اثنا میں میر رسول بخش تالپور ادھر آن نکلے اور ڈاکٹر مبشر حسن کو دیکھ کر اونچی آواز میں قہقہہ مارتے ہوئے بولے : " مبشر سائیں ، آپ تو ایسے مرغ محسوس ہوتے ہیں جو پانی میں بھیگ جانے کے بعد کوٹھے کی منڈیر پر بیٹھ جاتا ہے "۔ بس پھر اس دن کے بعد ڈاکٹر صاحب نے ورزش کا سلسلہ ترک کر دیا ۔

جیل میں ہماری ایک تفریح تاش کھیلنا تھی ۔ ہم " سیپ " کھیلتے تھے اور اس میں میرے ساتھی ہمیشہ میر رسول بخش تالپور ہوتے جبکہ دوسری مستقل جوڑی ولی خان اور اجمل خٹک کی ہوا کرتی تھی ۔ ان دونوں کی نظریں کمزور تھیں لہذا ہم ان کی اس کمزوری سے خوب فائدہ اٹھاتے میں اور میر صاحب آپس میں اشارہ بازی بھی کر جاتے تو ان کو معلوم نہ ہوتا ۔ ہر بار بازی ہار جانے پر ولی خان عموماً کہتے : معلوم نہیں کیا بات ہے ، پتے ہمارے پاس زیادہ اچھے ہوتے ہیں مگر بازی تم لوگ جیت جاتے ہو —— اور جواب میں میر صاحب کہتے : اچھے پتے جیت کی ضمانت نہیں ہوتے ۔

وہاں ہمیں صرف نیشنل پریس ٹرسٹ کے اخبارات ، یعنی امروز ، مشرق اور پاکستان ٹائمز وغیرہ ہی فراہم کئے جاتے تھے جبکہ ہمارا دل چاہتا کہ ہم نوائے وقت پڑھیں جس پر ایک طرح سے پوری پابندی تھی ۔ ہمیں اپنے ساتھیوں کی طرف سے خاصی فکر تھی اور ان کا کوئی سراغ نہ ملتا ۔ البتہ میر صاحب روزانہ شام کو ، منہ زبانی ملک بھر میں ہونے والے عوامی مظاہروں ، احتجاجی جلوسوں اور اجتماعات کی خبریں سناتے ۔ ہم سے کوئی اگر ان خبروں کا ذریعہ یا منبع پوچھتا تو میر صاحب بڑی خوبصورتی سے ٹال جاتے ۔ ان کا معمول تھا کہ وہ دوپہر کو کھانے کے بعد اپنے کمرے میں جا کر قیلولہ کرتے تھے اور اس سے پہلے اخبار کا مطالعہ کرتے تھے ۔

ایک دن میں نے اس جستجو کے تحت کہ میر صاحب آخر اس قدر پر اسرار طریقے سے اخبار پڑھ کر کیوں سوتے ہیں ، فیصلہ کیا کہ چھپ کر دیکھنا چاہیئے ۔ میری انتہا نہ رہی جب میں نے دیکھ لیا کہ میر صاحب نے ایک اخبار کھولا اور پھر اپنے سرہانے سے ایک اور اخبار نکال کر اس میں رکھ کر پڑھنا شروع کر دیا ۔ اب صورت حال یہ تھی کہ بظاہر میر صاحب مشرق

اخبار پڑھ رہے تھے مگر درحقیقت اس کے اندر نوائے وقت اخبار تھا۔ میں حیران تھا کہ میر صاحب کو نوائے وقت کیسے مل جاتا ہے؟ ان سے پوچھا تو وہ پھر ٹال گئے لیکن جلد ہی یہ راز کھلا کہ ہر صبح جیل کا جو ڈاکٹر میر صاحب کے دانتوں کی دیکھ بھال وغیرہ اور علاج کے لئے آتا ہے، وہ اپنے نیفے میں نوائے وقت اخبار چھپا کر لے آتا ہے اور شام کو واپس لے جاتا ہے اور میر صاحب نے صرف اس ڈاکٹر کو بلانے کے لئے دانتوں میں تکلیف کا بہانہ کر رکھا ہے — اس انکشاف پر میر صاحب نے حسبِ عادت ہنس کر کہا: بھئی اب انتظام تو کرنا ہی پڑتا ہے۔ آخر تجربہ بھی تو کوئی چیز ہوتی ہے ناں!

گجرات میں چند دن گذرے اور ذہنی طور پر ہم نے جیل کو قبول کر لیا تو مجھے یہاں سے ساہیوال جیل لے جانے کا فیصلہ ہو گیا۔ مجھے پولیس کی نگرانی میں ایک جیپ میں سوار کر کے ساہیوال روانہ کیا گیا تو میرے ساتھیوں نے بوجھل دل کے ساتھ مگر ہنستی خوشی مجھے رخصت کیا۔ راستے میں پولیس والوں سے گپ شپ کرتا رہا کیونکہ اس کے بغیر سفر کی تلخی اور سختی بڑھ جاتی۔ وہ بے چارے بھی اچھے خوش مزاج ثابت ہوئے۔ میری درخواست پر انہوں نے پتوکی کے نزدیک ایک ڈرائیور ہوٹل پر گاڑی روکی تاکہ میں کچھ تازہ دم ہو سکوں کیونکہ سڑک کی بُری حالت تھی اور پرانے ماڈل کی جیپ میں شدید جھٹکوں سے میرا بُرا حال ہو رہا تھا۔ یہاں پر ہم نے چائے کی ایک ایک پیالی پی اور پھر اپنی منزل کی طرف چل دیئے۔

مجھے معلوم ہو چکا تھا کہ ساہیوال جیل میں بھٹو صاحب، ملک اسلم حیات، مصطفےٰ کھر، اور ممتاز بھٹو جیسے ساتھی موجود ہیں اور میرا خیال تھا کہ وہاں ان سے ضرور ملاقات ہو گی۔ مگر میرا یہ خیال ساہیوال جیل کے اندر پہنچتے ہی غلط ثابت ہوا۔ میں نے تھوڑی ہی دیر میں محسوس کیا کہ یہاں کا ماحول بالکل مختلف ہے۔ کوئی شخص حتیٰ کہ مشقتی بھی سیدھے منہ سے بات نہیں کرتا جیل کے عملہ میں سے کسی شخص کے چہرے پر اپنائیت، محبت یا مسکراہٹ نہیں جیسے یہ انسان نہ ہوں بلکہ روبوٹ ہوں جنہیں ریموٹ کنٹرول کی مدد سے استعمال کیا جا رہا ہے۔ وہ اپنے مطلب کی بات کے علاوہ دوسری بات کرنا تو الگ رہی سننا بھی

گوارا نہیں کرتے تھے۔ میں نے مایوس ہو کر خود ہی رات کو اونچی اونچی آوازوں میں اپنے ساتھیوں کو پکارنا شروع کر دیا کہ شاید یونہی وہ میری آواز سن لیں اور رابطہ کی کوئی صورت ہو یا کم از کم وہ یہ جان لیں کہ میں بھی یہاں موجود ہوں۔ مگر یہ کوشش اکارت گئی۔ ہر بار میری آواز سنگدل اور بے سر دیواروں سے ٹکرا کر واپس آجاتی۔

ساہیوال جیل میں مجھے اس کوٹھڑی میں رکھا گیا جس کے ارد گرد تمام کوٹھڑیوں میں موت کی سزا پانے والے قیدی تھے۔ ایسا کیوں ہوا، مجھے اس کی خبر نہیں۔ اس کا بظاہر جواز نہیں تھا۔ بالآخر میں اس نتیجہ پر ہی پہنچ سکا کہ حکومت میرے اعصاب توڑنا اور میرے حوصلہ کو پست کرنا چاہتی تھی۔

یہاں پر میں نے موت کی سزا پانے والے قیدیوں کو بڑے نزدیک سے دیکھا۔ بیشتر وہ لوگ تھے جن کی زندگی کے دن گنے جا چکے تھے۔ وہ سارا سارا دن اپنے کمروں میں بیٹھے قرآن پاک پڑھتے رہتے۔ یہ کمرے دراصل چھوٹے چھوٹے سیل تھے جنہیں کمرے نہیں کہا جا سکتا بلکہ جیل کی زبان میں انہیں "چکی" کہا جاتا ہے۔ جیسا کہ نام سے ہی ظاہر ہے یہ بس اتنی جگہ کی گنجائش رکھتے ہیں کہ اس میں بیٹھ کر کوئی شخص چکی پیس سکے۔ ماضی میں عموماً قیدیوں سے یہی کام لیا جاتا تھا مگر اب یہ معمول قدرے بدل گیا ہے۔ لیکن میرا خیال ہے کہ معمول بدل جانے سے ایسے شخص کی سوچیں اور تفکرات نہیں بدلے جا سکتے جسے اپنا انجام بالکل نزدیک صاف دکھائی دے رہا ہو۔

دن بھر قرآن پڑھنے والے یہ قیدی رات کو اونچی آوازمیں عام طور پر لوک گیت اور خاص طور پر دکھ درد بھرے ماہیئے اور ڈھولے گاتے تھے۔ ان کی آوازمیں اس قدر سوز اور اداسی ہوتی تھی کہ میں کئی بار ملول ہو جاتا۔ یہ گیت سن کر میرے خیال میں بڑے سے بڑا پتھر دل بھی پھوٹ پھوٹ کر رو پڑے۔

لیکن یہ سب ایک خواب تھا۔ اس کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں تھا اور نہ ہی اس سے حقیقت بدل سکتی تھی اور حقیقت یہی تھی کہ ان کوٹھڑیوں کے دروازے صرف پھانسی گھاٹ کی طرف ہی کھلتے تھے۔

بالآخر مجھے ۲ دسمبر ۱۹۶۸ء کو رہائی ملی کیونکہ جسٹس مولوی مشتاق حسین اور جسٹس محمد گل پر مشتمل لاہور ہائی کورٹ کے ڈویژن بنچ نے میرے وکیل مرحوم ایم انور بار ایٹ لاء کی درخواست پر میری نظربندی کو غیر قانونی قرار دیا اور میری رہائی کے احکامات دیئے تھے۔ عدالت نے جونہی فیصلہ دیا، اس کی اطلاع وائرلیس پر ڈپٹی کمشنر ساہیوال کو دی گئی جس نے فوری طور پر مجھے رہا کرنے کے انتظامات کر دیئے، مجھے اس کی خبر ملی تو میں نے سوچا: ابھی ضابطہ کی کارروائی میں کچھ دیر لگے گی مگر مجھے فوراً ہی تیاری کرنے کے لئے کہا گیا، میں جلدی جلدی تیار ہو کر جیلر کے دفتر میں پہنچا تو وہاں ملک غلام مصطفےٰ کھر پہلے ہی سے موجود تھا۔ تب ہم دونوں بڑی گرمجوشی سے ایک دوسرے سے ملے، اور دوسرے ساتھیوں کی خیریت دریافت کی۔

ابھی یہ سلسلہ جاری تھا کہ ہمیں ریلوے اسٹیشن پر لے جانے کا بندوبست کر لیا گیا۔ اسٹیشن پر ہمیں پولیس والوں نے لاہور تک کے ایرکنڈیشنڈ کلاس کے ٹکٹ خرید کر دیئے اور ہم خیبر میل میں سوار ہو گئے جو ریلوے اسٹیشن پر تیار کھڑی تھی۔ اسی شام ہم لاہور پہنچ گئے اور جب میں گھر پہنچا تو میرے گھر والے مجھے دیکھ کر حیران رہ گئے۔ کیونکہ وہ اگلے روز مجھے ساہیوال جا کر ملنے کا پروگرام بنا رہے تھے۔

دراصل حکومت نے ہمیں اسی لئے اتنی عجلت اور تیزی کے ساتھ رہا کر کے لاہور پہنچایا تھا تاکہ ہمارے ساتھی ہماری رہائی کا جلوس نہ نکال سکیں یا کوئی اور ایسا مظاہرہ نہ کر سکیں جس سے ہماری مقبولیت کا اندازہ لگایا جائے۔

مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ نظربندی کا یہ سارا عرصہ میں نے اپنے کسی رشتہ دار، اور خاص طور پر اپنے گھر والے سے ملاقات نہیں کی۔ حتیٰ کہ جب مجھے ایک بار گجرات جیل میں خبر ملی کہ میرے گھر والے مجھ سے ملاقات کے لئے آ رہے ہیں تو میں نے انہیں فوراً سختی سے منع کر دیا اور پیغام بھجوایا: میں آپ کو انشاء اللہ ایک بار ہی ملوں گا۔ میں نہیں چاہتا کہ حکومت کی مہربانی سے پندرہ بیس منٹ یا آدھ گھنٹہ ملاقات کر کے پھر جدائی کا مرحلہ طے کروں، میں اس آزمائش میں کسی رعایت کا خواہاں نہیں، اور میں حکومت کو بتانا چاہتا ہوں کہ میرے اعصاب کتنے مضبوط ہیں۔

بھٹو کے عشق میں

یہ ۹ر جنوری ۱۹۶۹ء کی بات ہے۔

اڈیٹر جناب آغا شورش کاشمیری محاورتاً نہیں حقیقتاً موت کے دروازے پر دستک دے کر یعنی کراچی سنٹرل جیل میں اپنی بھوک ہڑتال کے بعد رہا ہو کر واپس لاہور آرہے تھے انہوں نے ایوب حکومت کے ناروا سلوک اور غیر مناسب رویے کے خلاف بھوک ہڑتال کر دی تھی اور عین اس وقت جبکہ ان کی نبض ڈوب رہی تھی سانس اکھڑ رہا تھا حکومت نے ان کو رہا کرنے کا اعلان کر دیا۔ ہم دوستوں کو آغا صاحب کے بارے میں بڑی تشویش تھی کیونکہ وہ نہ صرف ایک تجربہ کار اور منجھے ہوئے قلمکار سیاست دان تھے بلکہ ہر لحاظ سے لاہور کے سیاسی اور علمی حلقوں کی رونق تھے۔ اور پھر وہ دوستوں کے دوست اور بڑے کھلے ڈھلے مزاج کی باغ و بہار شخصیت تھے۔ میرے ساتھ وہ ہمیشہ ہی شفقت سے پیش آتے تھے۔ لہٰذا جب ان کی لاہور آمد کی خبر ہوئی تو ظاہر ہے کہ مجھے بے حد خوشی ہوئی۔ مجھے بخوبی احساس تھا کہ اس موقع پر آغا صاحب کا نہایت پرتپاک اور شایان شان استقبال ہوگا۔ چنانچہ میں نے بھی ان کے استقبال میں شریک ہونے کا فیصلہ کیا۔ لاہور اسٹیشن پر اس دن ایک عجیب رونق تھی۔ بالکل جیسے میلہ لگا ہو، دائیں بازو کی تمام پارٹیاں بطور خاص آغا صاحب کے استقبال کے لئے جمع تھیں ایسے میں میں بھی اپنے دوستوں کے ساتھ وہاں پہنچ گیا۔ اب ہوا یوں کہ جونہی آغا صاحب کی گاڑی پلیٹ فارم میں داخل ہوئی اور فضا آغا شورش زندہ باد مجاہد قوم زندہ باد اور فخر صحافت زندہ باد کے نعروں سے گونجی میں نے ایک دم اپنے دوستوں کی ٹولی کے درمیان آکر بھنگڑہ ڈالنا شروع کر دیا اور ساتھ ہی نعرہ لگانا شروع کر دیا: بھٹو ہمارا صدر ہے۔ بس پھر کیا تھا۔ تالیاں بجنے لگیں، دیکھتے ہی دیکھتے اور نوجوان بھی اس ٹولی میں شامل ہو گئے اور سب نے ایک زبان ہو کر نعرے لگانے شروع کر دیا۔ یہ تو نہیں کہا جاسکتا کہ ہم نے آغا صاحب کے استقبال کو خراب کر دیا کیونکہ یہ ہمارا مقصد اور مدعا بھی نہیں تھا لیکن یہ ضرور ہوا کہ ہم نے بھٹو کی پروجیکشن کر دی اور عوام کو ایک نیا نعرہ دے دیا جس

سے ان کے جذبات کی عکاسی ہوتی تھی۔ آج بھی اس واقعہ کو سوچتا ہوں تو دل ہی دل میں مسکراتا ہوں کہ اس زمانے میں بھٹو کے عشق میں ہم نوجوان کس درجہ گرفتار ہو گئے تھے کہ آغا شورش کے استقبال پر بھی بھٹو کے نام کا بھنگڑا ڈالتے تھے۔

جنوری ۱۹۶۹ء میں بھٹو پر مقدمہ چلا، جس کی سماعت کے لئے ہائی کورٹ کا ڈویژن بنچ تشکیل دیا گیا جو جسٹس مولوی مشتاق اور جسٹس محمد گل پر مشتمل تھا۔ حکومت کا خیال تھا کہ بھٹو کو جیل سے باہر لایا گیا تو اس سے عوام جذباتی ہو جائیں گے اور یوں امن و امان کا مسئلہ پیدا ہو گا۔ لہٰذا طے پا گیا کہ تمام کارروائی کیمپ جیل (لاہور) ہی میں ہو گی۔ ادھر میں نے ۲ جنوری کی رات کو لاہور میں ایک عظیم الشان مشعل بردار جلوس کا اہتمام کیا جو مغربی پاکستان میں نکالا جانے والا پہلا مشعل بردار جلوس تھا۔ یہ جلوس لاہور ریلوے اسٹیشن سے شروع ہو کر مال روڈ سے ہوتا ہوا داتا دربار جا کر ختم ہوا اور اس کا مقصد یہی تھا کہ تحریک میں زور پیدا کیا جائے اور بھٹو کی رہائی کے لئے دباؤ بڑھایا جائے۔

ہم حکومت سے قدم قدم پر لڑ رہے تھے اس سلسلہ میں کوئی موقع اور جگہ ہاتھ سے نہیں جانے دیتے تھے۔ ۳ جنوری کو اس وقت کے وزیر قانون ایس ایم ظفر لاہور ہائی کورٹ بار میں تقریر کرنے آئے تو میں نے اٹھ کر ان کو تقریر کرنے سے منع کر دیا میرا موقف تھا کہ اگر آپ ایس ایم ظفر بیرسٹر کی حیثیت سے بات کرنا چاہیں تو جائے کی میز پر بیٹھ کر بات کریں۔ ہم آپ کی باتیں سن سکتے ہیں مگر آپ اگر وزیر قانون اور حکومت کے ترجمان کی حیثیت سے تقریر کریں گے تو ہم اس کی اجازت نہیں دیں گے۔ دوسرے وکلاء نے بھی میرا ساتھ دیا اور یوں ہم نے ایس ایم ظفر کو بولنے نہیں دیا۔ وہ تقریر کئے بغیر ہی چلے گئے دوسرے روز اخباروں میں یہ خبر چھپی تو اس سے بھی حکومت کی سبکی ہوئی۔

جس روز سماعت کا باقاعدہ آغاز ہوا جیل میں انتہائی غیر معمولی حفاظتی انتظامات کئے گئے تھے۔ چاروں طرف مسلح پولیس کا سخت پہرہ تھا بلکہ جیل سے باہر بھی سخت نگرانی کی جا رہی تھی بلکہ ایک طرح سے علاقہ کی ناکہ بندی کر دی گئی تھی۔ لیکن اس کے باوجود میں اپنے اس پروگرام پر عمل کرنا چاہتا کہ بھٹو کو کارکنوں کی محبت اور اعتماد کا یقین جیل کے اندر

دلایا جائے تاکہ اس کا حوصلہ بلند ہو اور وہ سماعت کے دوران اپنے اعصاب پر پورا قابو رکھے۔

نہایت محنت اور بھاگ دوڑ کے بعد میں نے اس بات کا بندوبست کر لیا تھا کہ عین اس وقت جب بھٹو کو اس کے سیل (کوٹھڑی) سے نکال کر کیمپ جیل کی ڈیوڑھی سے متصل کمرے میں (جہاں فاضل جج مقدمہ کی سماعت کر رہے تھے لہٰذا اس کو عدالت کا درجہ دے دیا گیا تھا) لایا جائے گا۔ مجھے جیل کے اندر سے ایک شخص جس کی ڈیوٹی چھت کے اوپر تھی ایک خفیہ اشارہ کر دے گا۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا، جونہی یہ اشارہ مجھے ملا۔ میں نے واشگاف آواز میں نعرہ لگایا۔ "بھٹو ساڈا شیر اے"۔ اور جواب میں ادھر ادھر بکھرے ہزاروں کارکنوں نے بیک زبان ہو کر جواب دیا: "باقی ہیر پھیر اے"۔ اور اس کے ساتھ ہی طے شدہ منصوبہ کے مطابق یکے بعد دیگرے ۲۱ گولے چلائے گئے جو ایک طرح سے بھٹو کو سلامی تھی۔ اس کے ساتھ ہی پرجوش نعروں کا ایک سلسلہ چل نکلا۔

اندر کمرہ عدالت میں بیٹھے لوگ حیران تھے کہ یہ سب کچھ اچانک کیسے ہو گیا۔ اور بھٹو اپنی مخصوص مسکراہٹ سے ان کو دیکھ رہے تھے۔ ظاہر ہے کہ عوام کی طرف سے اتنی محبت اور اعتماد پر وہ بجا طور پر مسرت اور فخر کا اظہار کر سکتے تھے۔ اور پولیس نے پہلے تو پرجوش کارکنوں کو ڈرانے دھمکانے کی کوشش کی مگر جب یہ جیل کی طرف بڑھنے لگے تو حکام کو تشویش لاحق ہو گئی ان کو یہ خطرہ لاحق ہو گیا کہ مبادا بپھرے ہوئے زندہ دلان لاہور جیل توڑ کر بھٹو کو رہا نہ کر لیں چنانچہ پہلے زبردست لاٹھی چارج ہوا اور اس کے بعد بے انتہا آنسو گیس کے شیل پھینکے گئے۔ کچھ شیل جیل کے احاطہ میں بھی جا کر گرے۔ پولیس سے اس آنکھ مچولی میں اگرچہ کچھ ورکر زخمی ہوئے لیکن جیل کے اندر بھٹو تک غیر متزلزل اعتماد اور بھرپور محبت کا پیغام پہنچ گیا۔

بھٹو کے وکلاء میں سربراہ تو میاں محمود علی قصوری (مرحوم) تھے البتہ ان کی معاونت کے لئے عبدالحفیظ پیرزادہ، خورشید حسن میر، شیخ رفیق بیدار، شیر علی خان اور راقم بھی شامل تھے ہمیں عدالت عالیہ کی طرف سے باقاعدہ پاس جاری کئے گئے لہٰذا ہم بلا روک ٹوک اندر

چلے جایا کرتے تھے۔ حکومت کی طرف سے مسعود نبی نور (تب ہوم سیکرٹری حکومت مغربی پاکستان) ایم ایم عثمانی (ڈپٹی ہوم سیکرٹری) شریف الدین پیرزادہ، راجہ سید اکبر خان اور اسلم ریاض حسین (اسسٹنٹ ایڈووکیٹ جنرل) پیش ہوتے تھے۔

بھٹو کی سماعت ہوئی اور یہ اپنی نوعیت کا ملکی تاریخ میں ایک یادگار کیس تھا۔

میں بیگم بھٹو کو سیاست میں لایا

مجھے بھٹو کے وکیل کی حیثیت سے نہ صرف عدالت کے اندر بلکہ عدالت کے وقت کے بعد بھی بھٹو سے ملاقات کرنے کی اجازت اور سہولت حاصل تھی۔ میرے ذہن میں کئی دنوں سے ایک آئیڈیا سمایا ہوا تھا لہٰذا عدالت کی طرف سے میسر سہولت سے استفادہ کرتے ہوئے میں ایک شام جیل میں بھٹو کے پاس چلا گیا۔ پہلے تو اِدھر اُدھر کی گفتگو ہوتی رہی اور جب میں نے محسوس کیا کہ اب وہ میری بات پوری توجہ اور سنجیدگی سے سنیں گے تو میں نے کہا: میرے ذہن میں ایک آئیڈیا آیا ہے۔ انہوں نے مسکرا کر کہا: ہاں تم میرے پاس سب سے زیادہ آئیڈیاز لاتے ہو۔

میں نے شکریہ ادا کرتے ہوئے انہیں بتایا کہ یہ آئیڈیا سب سے منفرد اور نیا ہے۔

مجھے سنجیدہ دیکھ کر وہ بھی گوش بر آواز ہوتے ہوئے بولے: اچھا تو پھر بتاؤ۔

میں نے کہا: آپ میری اس بات سے اتفاق کریں گے کہ عوام میں ہم نے جو تحریک چلا دی ہے اور اس کے نتیجہ میں حکومت پر جو دباؤ ڈالا گیا ہے اس کو برقرار رکھنا ضروری ہے یہ تب ہی ممکن ہو سکتا ہے اگر ایک انتہائی مقبول اور ہر دلعزیز شخصیت اس وقت تک تحریک کی راہنمائی کرتی رہے جب تک آپ جیل سے باہر نہیں آجاتے۔ یہاں آکر میں ذرا رک گیا تو بھٹو نے کرسی پر پہلو بدلتے ہوئے کہا: ہاں ہاں کہو

مجھے یقین ہو گیا کہ وہ میری بات کو واقعی سنجیدگی سے لے رہے ہیں لہٰذا میں نے کہا: اس سلسلہ میں کسی ایسے شخص پر یقین نہیں کیا جا سکتا جو کسی دوسری جماعت یا لابی کا ہو کیونکہ اس بات کی کوئی ضمانت نہیں کہ اگر ہم اس کو کندھوں پر اٹھالیں اور جب آپ

جیل سے باہر آئیں تو آپ کے لئے جگہ خالی کر دے خود پیپلز پارٹی کے پاس کوئی ایسا شخص نہیں جو مرکزی قیادت کا حق ادا کر سکے۔ جے اے رحیم فکری آدمی ہیں۔ اسی طرح ڈاکٹر مبشر حسن میں کوئی کشش نہیں۔ باقی کھر، تالپور وغیرہ کے نام علاقائی سطح کے ہیں۔

لہٰذا میری تجویز ہے کہ اگر آپ اتفاق کریں اور مناسب سمجھیں تو ہم بیگم صاحب یعنی بیگم نصرت بھٹو کو میدان عمل میں لے آئیں۔ کیونکہ لوگ تو بھٹو کے نام سے پیار کرتے ہیں وہ بھٹو کا نام سنتے ہی گھروں سے نکل کر جلوسوں اور جلسوں میں آئیں گے۔ اور جب آپ جیل سے باہر آجائیں تو بیگم صاحبہ خود بخود آپ کی جگہ چھوڑ کر پیچھے ہٹ جائیں گی۔ یہ سنتے ہی انہوں نے ایک گہرا سانس لیا اور آنکھیں موند کر اوپر دیکھنے لگے جیسے کچھ سوچ رہے ہوں۔ انہوں نے چند منٹ کوئی بات نہ کی اور گہری چپ ماحول پر چھائی رہی۔ بالآخر انہوں نے آنکھیں کھولیں اور ان کی ساری چمک میرے چہرے پر مرکوز کر کے بولے: رضا ـــــ میں نصرت کو ایسا کرنے کی اجازت دے سکتا ہوں، مگر ایک شرط پر۔

وہ کیا ہے ـــــ میں نے فوراً پوچھا۔

وہ آہستہ آہستہ کہنے لگے: وہ شرط یہ ہے کہ تم اس کے ساتھ ساتھ رہو گے ـــــ ہر جگہ اس کے ساتھ جاؤ گے ـــــ تمہیں اس کی حفاظت کی ذمہ داری قبول کرنا ہو گی۔

میں نے قدرے جوش سے کہا: شکریہ آپ مجھ پر اعتماد کریں۔ بیگم صاحبہ میری بڑی بہن کی طرح ہوں گی۔ میں ان کے چھوٹے بھائی کی حیثیت سے ان کے ساتھ رہوں گا۔ میں ان کی حفاظت کی ذمہ داری قبول کرتا ہوں۔

اور یوں میں نے مسٹر بھٹو کے بعد مسز بھٹو کو بھی سیاسی میدان میں لا کر ایوبی آمریت کے مقابلے میں کھڑا کر دیا۔

اپنے منصوبہ کے تحت جسے میں نے بڑی محنت اور عرق ریزی سے تیار کیا تھا۔ بیگم نصرت بھٹو کو اپنے عوام سے رابطہ کا آغاز بابا بلھے شاہ کی نگری سے قصور سے ہی کرنا تھا۔ قصور میں بیگم صاحبہ کو جو تقریر کرنا تھی وہ میں نے ان کو لکھ کر دی۔ پھر اس کی ریکارڈنگ کر کے ان کو سنائی، اس کے فوراً بعد ان کی آواز میں یہ تقریر ریکارڈ کر کے ان کو سنائی گئی۔

تقریر کی خوب اچھی ریہرسل اور مشق کرائی گئی۔ میں نے محسوس کیا کہ بیگم صاحبہ ایرانی نژاد ہونے کے باعث فارسی کے الفاظ کی ادائیگی بڑی عمدہ کرتی ہیں اس کے مقابلے میں ہندی کے الفاظ ادا کرتے ہوئے ان کو قدرے دقت کا سامنا ہوتا ہے چنانچہ تقریر کے مسودہ میں ایسے الفاظ کم سے کم کر دیئے گئے۔

بالآخر ۶۔ فروری ۱۹۶۹ء کو وہ پہلی بار قصور میں اپنے شوہر کے مشن کو جاری رکھنے کیلئے عوام میں آگئیں۔ میرے کہنے پر انہوں نے اپنا لباس انتہائی سادہ اور معمولی منتخب کیا اور اسی طرح میک اپ کے بارے میں بھی انہوں نے میری تجویز کو قبول کیا کہ چھوٹے شہروں اور قصبوں کے ماحول کی مناسبت سے یہ بالکل لائٹ اور ہلکا ہونا چاہیئے اسی طرح ان سے یہ بھی کہا گیا کہ وہ عوام کے اجتماع میں آئیں گی تو وہ اونچی ہیل والی جوتی نہیں بلکہ ہموار تلوے والی چپل نما جوتی استعمال کریں گی تاکہ ہجوم میں چلنے پھرنے میں کوئی دقت نہ ہو۔ تمام تیاریاں مکمل کرنے اور ان کو ذہنی طور پر تیار کرنے کے بعد میں بیگم صاحبہ کو پہلی بار قصور کے جلسہ عام میں عوام کے درمیان لایا۔ ان کے ہمراہ میری والدہ کے علاوہ بیگم سمعیہ نظام الدین اور بیگم آبا دا حمد خان بھی تھیں جس تانگے پر بیگم صاحبہ سوار تھیں اس کے پائیدان پر میں ان کے محافظ کی حیثیت سے چوکنا اور مستعد کھڑا تھا۔ بیگم صاحبہ نے جلوس کی قیادت کرتے ہوئے تین چار جگہوں پر تقریر کی۔ ہر جگہ جب بیگم صاحبہ تقریر کرتیں تو میں نے بازار اور اردگرد کے ماحول سے ان کی تقریر کا جائزہ لیا میری حالت اس ہدایت کار کی تھی جس کی منتخب کردہ ہیروئن پہلی بار پرفارم کر رہی ہو۔ بیگم صاحبہ کی آواز میں ایک ٹھہراؤ اور اعتماد تھا وہ خوب گونجدار آواز میں بولیں اور حقیقت تو یہ ہے کہ عوام کے ذہنوں پر انہوں نے واقعی ایک تاثر چھوڑا۔ عوام نے ان کی تقریر کے دوران بار بار تالیاں بجائیں اور نعرے لگائے۔ حتیٰ کہ تقریر ختم ہوئی تو لوگوں کی ایک بڑی تعداد نے ان سے تقریر جاری رکھنے کو کہا جس سے نہ صرف ان کی بلکہ خود میری بڑی حوصلہ افزائی ہوئی۔ وہ بابا بلھے شاہ کے مزار پر بھی حاضری کے لئے گئیں اور وہاں موجود لوگوں کی ایک بڑی تعداد سے خطاب کیا۔

اس کے بعد تو بیگم صاحبہ میں خود اعتمادی آچکی تھی لہٰذا انہوں نے گجرات کا دورہ کیا۔ جہاں سمیعہ عثمان نے ایک جلسہ کا اہتمام کیا تھا۔ وہاں ہمارے ساتھ خورشید حسن میر بھی تھے۔

اس کے بعد تو ایک باقاعدہ سلسلہ چل نکلا، بیگم صاحبہ نے یکے بعد دیگرے ساہیوال، چیچہ وطنی گوجرانوالہ، گکھڑمنڈی، جہلم اور فیصل آباد میں بڑے کامیاب جلسے کئے۔ خاص طور پر فیصل آباد کا جلسہ بڑا منظم اور موثر رہا اور اس میں کوئی شک نہیں کہ بیگم نصرت نے اس طرح جہاں اپنے شوہر کے حق میں رائے عامہ ہموار کی وہاں انہوں نے ایوبی آمریت کے خلاف تحریک کو نیا ولولہ بخشا۔ خاص طور پر پارٹی میں شامل ہونے والے نئے ورکرز جو بھٹو کی گرفتاری سے مایوس ہونے والے تھے بیگم صاحبہ کو اپنے درمیان پُرجوش انداز میں مصروف جدوجہد دیکھ کر تازہ دم اور متحرک ہو گئے۔ اور یوں جیل کے اندر مقدمہ لڑنے والے بھٹو کی بیگم نصرت بھٹو نے جیل کے باہر آمریت کے خلاف عوامی مورچہ سنبھال لیا۔ اور وہ ایک مستند سیاسی لیڈر ہو گئیں۔

بیگم نصرت بھٹو کے پنجاب کے اس طوفانی اور کامیاب دورے کی رپورٹ بھٹو کو جیل کے اندر متواتر مل رہی تھی چنانچہ اس دورہ کے اختتام پر میں ان سے ملنے گیا، مجھے معلوم تھا کہ بھٹو کو مٹر قیمہ اور گاجر کا حلوہ بہت مرغوب تھا۔ لہٰذا میں نے یہ کھانا تیار کرا کے ساتھ دیا اور کیمپ جیل میں بھٹو کے پاس چلا آیا، مجھے یاد ہے کہ اس ملاقات میں انہوں نے میرے بیگم نصرت بھٹو کو میدان سیاست میں لانے کے منصوبہ اور اس کی کامیابی پر بہت زیادہ خوشی کا اظہار کیا تھا وہ اس پر اتنے مطمئن اور مسرور تھے کہ کھانا کھاتے کھاتے ایک دم رک گئے اور مسکرا کر کہنے لگے یار رضا تم میری بیگم کو اب اتنا بڑا لیڈر نہ بنا دینا کہ جب میں جیل سے نکل کر عوام میں آؤں تو وہ شور مچا دیں کہ بھٹو نہیں۔ بیگم بھٹو کو لاؤ۔ پھر میرے لئے بڑا مشکل ہو جاتے گا۔ اور وہ تو بنیادی طور پر گھریلو خاتون ہے۔

میں نے ان سے کہا: جناب! آپ ہوں یا وہ ہوں، بات تو ایک ہی ہے۔ اور میرے پیش نظر یہ بات نہیں کہ کسی شخصیت یا فرد کو آگے لایا جائے بلکہ میں تو یہ چاہتا ہوں کہ پارٹی کا پروگرام آگے بڑھے یہ تحریک چلتی رہے۔

آج بھی یہ بات میں پورے اعتماد اور فخر کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ بیگم نصرت بھٹو کو سیاسی میدان میں لانے کا اعزاز مجھے حاصل ہے اگر اس وقت میں آئیڈیا بھٹو کو پیش کر کے اس پر تیزی سے عمل نہ آتا تو ممکن ہے بھٹو کے جیل چلے

جانے کے بعد پارٹی کی تحریک روبہ زوال ہوجاتی اور بیگم صاحبہ بھی سیاست دان کی حیثیت سے اپنی صلاحیتوں کا لوہا کبھی تسلیم نہ کرا سکتیں ۔

گردشِ دوراں

ایوب خان ہل گیا

اس دورے میں سب سے کامیاب اور یادگار جلوس ۱۷ فروری ۱۹۶۹ء کو لاہور میں نکالا گیا۔ یہ اس قدر بڑا، منظم اور ولولہ انگیز جلوس تھا کہ اس نے درحقیقت حکومت کی بنیادیں ہلا کر رکھ دیں۔ جلوس کی قیادت بیگم نصرت بھٹو نے کی تھی جو ایک ٹانگہ پر سوار تھیں۔ اس ٹانگہ پر میرے سوا کوئی دوسرا شخص نہیں تھا۔ اور میں حسب معمول ان کے محافظ کے طور پر پائیدان پر کھڑا ہوا تھا۔ مال روڈ کے دونوں طرف کی عمارتوں پر لوگ کئی گھنٹے تک کھڑے جلوس کا انتظار کرتے رہے اور جب جلوس وہاں سے گذرا تو انہوں نے پھولوں کے ہار اور پتیاں پھینک کر جلوس کا استقبال کیا۔ کئی مقامات پر مکانوں کی چھتوں سے بوڑھی عورتوں نے بیگم صاحبہ پر دوپٹے پھینکے، وہ انہیں سر اٹھا کر محبت سے چوم کر شکریہ ادا کرتیں اور پھر کسی ورکر خاتون کو یادگار کے طور پر دے دیتیں۔ کارکنوں کا ولولہ قابل دید تھا اور وہ دیوانہ وار بیگم صاحبہ کے جلوس

میں میلوں پیدل چلتے گئے۔

اس جلوس کی اہمیت کا اندازہ صرف اس حقیقت سے ہی لگایا جاسکتا ہے کہ اس جلوس کی کامیابی کے بعد بھٹو نے جیل کے اندر کیس کی کارروائی کا بائیکاٹ کر دیا۔ ادھر ملک کے دونوں صوبوں میں حکومت پر سیاسی دباؤ میں بے حد اضافہ ہوگیا۔ تحریک فیصلہ کن مرحلہ میں داخل ہوتی ہوئی محسوس ہوتی تھی۔ چنانچہ حکومت نے بھٹو کو جیل سے لاڑکانہ میں ان کے آبائی مکان المرتضٰی میں منتقل کر کے نظر بندی جاری رکھی۔ اس پر بھی کارکنوں کو مطمئن نہ کیا جاسکا۔ مزید دباؤ بڑھا تو حکومت اس کا مقابلہ نہ کر سکی۔ اور یوں ان کے نظر بندی کے احکامات واپس لینے پڑے۔

ادھر بھٹو ۲۵، فروری کو کراچی سے بذریعہ ہوائی جہاز لاہور آگئے۔ وہ اب تازہ دم ہو کر اور خم ٹھونک کر میدان میں دوبارہ اتر آئے تھے۔ انہیں احساس ہوگیا تھا حکومت اب ریت کی دیوار کی مانند ہے۔ جو عوامی ریلے کا مقابلے کرنے کی قوت نہیں رکھتی۔ لاہور ایئرپورٹ پر بھٹو کا انتہائی پرجوش استقبال ہوا۔ اور یہ اس اعتبار سے ایک انتہائی یادگار اور تاریخی موقع تھا کہ ایئرپورٹ پر ایئر مارشل (ریٹائرڈ) اصغر خان، جنرل (ریٹائرڈ) اعظم خان اور جسٹس مرشد نے بھٹو کو خوش آمدید کہا کیونکہ اسی دن شیخ مجیب الرحمان بھی لاہور آرہے تھے۔

وہ دن قومی سیاست میں ایک "موڑ" کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس دن کے جلوس اور استقبال ہی نے ایوبی آمریت کے قلعہ میں ایک ایسا شگاف کر دیا جسے کبھی بھی پُر نہ کیا جاسکا چنانچہ ایوب خان نے راولپنڈی میں گول میز کانفرنس بلانے کا اعلان کر دیا جس میں شرکت کے لئے پاکستان پیپلز پارٹی کو بھی دعوت نامہ ملا، اس کانفرنس پر پوری قوم کی نظریں لگی ہوئی تھیں بالآخر اعلان کیا گیا کہ پیرٹی ختم کر دی ہے صدر ایوب خان آئندہ الیکشن میں حصہ نہیں لیں گے، اور انتخابات کا بالواسطہ طریقہ کار بھی ختم کر دیا گیا۔ مختصر یوں کہا جاسکتا ہے کہ ایوزیشن کے بڑے اور نمایاں مطالبات تسلیم کر لئے گئے تھے۔ لیکن ادھر "ملٹری لابی" اس صورت حال پر مطمئن نہیں تھی۔ اور وہ نہیں چاہتی تھی کہ اس مرحلہ پر پُرامن انتقال اقتدار ہو جائے اور ملک میں جمہوریت کا عمل جاری رہے۔ اس کے لئے اس ملٹری لابی نے چند سیاستدانوں سے رابطہ قائم کیا۔ جن میں بھٹو اور بھاشانی پیش پیش تھے۔ یہ دونوں لیڈر

گول میز کانفرنس سے باہر نکل آئے۔ بھاشانی تو ڈھاکہ چلے گئے۔ انہوں نے وہاں جاکر ڈنڈا سنبھالا اور "آگو جالن" کا نعرہ لگا دیا۔

ادھر بھٹو نے لاہور میں آکر بہت بڑا جلوس نکالا۔ اور مال روڈ میں ایک عظیم الشان جلوس سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ میں راولپنڈی کی گول میز کانفرنس میں نہیں بیٹھ سکتا۔ کیونکہ وہ چوروں، لیٹروں اور اُچکوں کی کانفرنس ہے۔ میری گول میز کانفرنس تو غریبوں، مزدوروں محنت کشوں، طالب علموں اور عوام کی کانفرنس ہے۔ غرض ایسا ہی جذباتی اور اشتعال انگیز رویہ بھٹو نے بھی اختیار کر لیا۔

اس کے نتیجہ میں ملکی حالات تیزی سے دگرگوں ہوتے چلے گئے۔ ہر آنے والا دن گذشتہ سے زیادہ مایوسی اور بے یقینی اپنے ہمراہ لاتا تھا کہ حکومت کی گرفت بالکل ڈھیلی ہوگئی اور یوں ۲۶، مارچ ۱۹۶۹ء کو ایک بار پھر مارشل لاء کا منحوس سایہ وطن عزیز کے در و بام پر پھیل گیا۔

حقائق کے پس منظر میں میرا ایمان اور تجربہ ہے کہ مارشل لاء دراصل بعض فوجی جرنیلوں اور چند سیاست دانوں کا ملی بھگت کا نتیجہ تھا کیونکہ اگر یہ مارشل لاء نہ آتا تو ظاہر ہے کہ اس سے جمہوری عناصر کو تقویت ملتی۔ مجھے اچھی طرح خبر ہے کہ چند فوجی جرنیلوں (جن میں جنرل پیرزادہ، جنرل اکبر اور یحییٰ خان وغیرہ قابل ذکر ہیں) کا آپس میں گٹھ جوڑ اور گہرا رابطہ تھا۔ اور اس گٹھ جوڑ (جسے اگر سازش کہا جائے تو زیادہ بہتر ہے) کے نتیجہ میں قوم اس تحریک کے ثمر سے محروم ہوگئی جو ایوب آمریت کے خلاف نہایت بھرپور اور مؤثر انداز میں چلائی گئی تھی اور جس کے لئے بڑی قربانیاں دی گئیں تھیں۔

وہ خفیہ ہاتھ

میں یہ بھی کہوں گا کہ مارچ ۱۹۶۹ء کے اوائل ہی میں "خفیہ ہاتھ" ظاہر ہونا شروع ہو گیا تھا۔ اور اس کا مشاہدہ میں نے یوں کیا کہ لاہور میں یہ بات ہر ذی شعور محسوس کر رہا تھا کہ پرسکون تعلیمی اداروں اور پرامن صنعتی اداروں میں یکدم بے چینی اور بے اطمینانی کی لہر پھیل

جاتی جو توڑ پھوڑ کی کارروائی پر ختم ہوتی۔ خاص طور پر طلباء کو بلا جواز مشتعل کیا جا رہا تھا اور میری اطلاعات کے مطابق پولیس کے چند مخصوص افسر تعلیمی اداروں میں گڑبڑ کرواتے تھے تاکہ طلباء جذباتی ہو کر سڑکوں پر نکل آئیں۔ گویا ایک گہری سازش کے تحت لاہور کو گرم کیا جا رہا تھا۔

اس کا سبب یہ تھا کہ جب تک ملک میں حکومت اور حالت پر سکون رہے کسی خفیہ طاقت کو من مانی کارروائی کرنے کا موقع میسر نہیں آتا۔ یہ بات بھی واضح رہے کہ ایک فوج کا سربراہ (غالباً) ملک میں سب سے زیادہ باخبر شخصیت ہوتا ہے کیونکہ ملک کا سب سے بڑے معتبر اور اہم ادارہ انٹر سروسز انٹیلی جنیٹس (ISI) اپنی جو روزانہ رپورٹ حکومت کے سربراہ (صدر اور وزیر اعظم) کو روزانہ کرتا ہے اس کی ایک نقل فوج کے سربراہ کو جاتی ہے لہٰذا اسے ایک طرح سے جی ایچ کیو میں بیٹھے بیٹھے ہی ملک بھر میں ہونے والے تمام اہم قومی واقعات کا مطالعہ میسر آجاتا ہے اور یوں اس کو بجا طور پر ملکی حالات پر گہری نظر رکھنے کا موقع میسر ہوتا ہے۔ اور وہ ایک ذہین اور با اختیار شخص کی حیثیت سے رفتہ رفتہ مناسب اور خوشگوار وقت کا انتظار کرتا ہے۔ اس کی حیثیت اس شخص جیسی ہوتا ہے جو آم کے پکنے کا انتظار کرتا ہے اور جب آم پک جائے تو درخت کے نیچے اپنی جھولی پھیلا کر آنکھیں موندھ کر دعائیں پڑھنے لگتا ہے۔ پکا ہوا آم بالآخر نیچے گرتے ہوئے اس کی جھولی میں آجاتا ہے اور وہ شکرانہ کا ورد کرتا ہوا آم کو جھولی میں دبا لیتا ہے۔

فوج کا سربراہ بخوبی جانتا ہے کہ حکومت کتنی مضبوط ہے اور اس حکومت کا سربراہ کسی حد تک عوام میں مقبول ہے لہٰذا وہ اس کے ساتھ بوقتِ ضرورت جس طرح کا سلوک روا رکھتا۔ اس کا اندازہ اس واقعہ سے بخوبی ہوتا ہے ایوب خان کی حکومت کے ایک ممتاز سرکاری افسر جی ڈبلیو چوہدری نے (جو ان کے ساتھ ایوان صدر میں آخری دنوں تک رہے) اپنی کتاب Last days of undivided Pakistan میں یوں بیان کیا ہے۔

گول میز کانفرنس کے انعقاد کے وقت تک صدر ایوب خان بڑے پُر اعتماد دکھائی

دیتے تھے اور واقعی وہ ایسے ہی تھے کیونکہ جب کانفرنس کے آغاز پر اپنے ساتھیوں کے ساتھ کمرے میں داخل ہوتے تو ان کی چال ڈھال اور نشست و برخاست سے ان کا عزم جھلکتا تھا جبکہ اپوزیشن والے دبے دبے دکھائی دیتے تھے۔ مگر جب بھٹو اور بھاشانی کی کانفرنس سے علیحدگی کے بعد عوامی دباؤ بتدریج بڑھتا گیا تو وہ رفتہ رفتہ کمزور ہوتے گئے۔ یوں دکھائی دینے لگا جیسے حالات پر ان کی گرفت کمزور ہورہی ہے۔

ایک شام انہوں نے تینوں مسلح افواج کے سربراہوں (جنرل یحییٰ خان۔ ایڈمرل اے آر خان ایر مارشل نور خان) کی میٹنگ طلب کی۔ عام تاثر یہی تھا کہ یہ میٹنگ کم از کم تین چار گھنٹے جاری رہے گی اور اس میں ملک میں امن و امان برقرار رکھنے کے مسئلہ پر خاص طور پر غور و خوض ہوگا اور ممکن ہے بعض اہم اقدامات تجویز کئے جائیں۔ لیکن ہماری حیرت کی انتہا نہ رہی کہ صرف بیس پچیس منٹ کے بعد ہی یہ میٹنگ ختم ہوگئی۔ اور ایوب خان شروع میں ہشاش بشاش اور تازہ دم میٹنگ کے لئے کمرے کے اندر گئے تھے۔ باہر نکلے تو ان کے چہرے پر تشویش کے آثار نمایاں تھے اور وہ تھکے ہوتے محسوس ہورہے تھے۔

بعد میں ہمیں معلوم ہوا کہ میٹنگ میں ملکی حالات کا جائزہ لیتے ہوئے ایوب خان نے مارشل لاء کے نفاذ کی تجویز پیش کی تھی جس پر یحییٰ خان نے اپنے ہاتھ میں پکڑا ہوا "Baton" اپنے بوٹوں کے تلوے پر مارتے ہوئے کہا۔

It is a political issue. Since you are the politicia
it is your's responsibility to find out a political
solution. The Army has no concern with this problem
Any how my colleagues are here you can ask for their
opinion.

اور جب ایوب خان نے باقی دونوں (ایڈمرل اے آر خان اور ایئر مارشل نور خان) سے پوچھا تو انہوں نے متفقہ طور پر جنرل یحییٰ خان کی تائید کی۔

Sir, we agree with General (Yahya

ظاہر ہے کہ اس کے بعد تو میٹنگ کی گنجائش اور ضرورت ہی نہ رہی تھی لہٰذا یہ لوگ رخصت ہو گئے۔ اور اپنے پیچھے ایک متفکر اور پریشان صدر (ایوب خان) کو چھوڑ گئے۔
اس واقعہ سے بخوبی پتہ چلتا ہے کہ صدر ایوب خان کی گرتی ہوئی ساکھ کے پیش نظر جنرل یحییٰ خان نے مارشل لاء کی تجویز کو رد کر دیا۔ کیونکہ وہ ملکی حالات اور نشیب و فراز سے بخوبی آگاہ تھا اور جانتا تھا کہ اس ڈوبتی کشتی کو سنبھالا دینے کا کوئی فائدہ اور جواز نہیں۔

شیشہ میں پہلا بال

مارچ ۱۹۶۹ء میں لاہور میں پارٹی کے پنجاب اور بہاولپور ونگ کا اجلاس ہوا جس کی صدارت پارٹی کے چیئرمین ذوالفقار علی بھٹو نے کی۔ اس اجلاس میں خاص طور پر ون یونٹ کا مسئلہ زیر غور آیا اور بالآخر فیصلہ ہوا کہ ون یونٹ توڑنے کی سفارش کی جائے۔ اسی کے نتیجہ میں ۲۳ مارچ کو بھٹو نے عام اعلان کیا کہ سندھ اور بلوچستان کے بعد اب پنجاب کی پیپلز پارٹی بھی ون یونٹ توڑنے کے حق میں ہے لہٰذا ہم (پیپلز پارٹی) ون یونٹ توڑنے کا مطالبہ کرتے ہیں۔
اس پر میں نے ایک اخباری بیان میں (جو ۲۷ جون کے اخبارات میں چھپا) ون یونٹ توڑنے کے مطالبہ کی مخالفت کی اور میں اس وقت پارٹی کے اندر واحد شخص تھا جس کا خیال تھا کہ ون یونٹ توڑنے کا مطالبہ درست نہیں۔ میرا خیال اور تجزیہ یہ تھا کہ ون یونٹ کو زیادہ سے زیادہ ایک "انتظامی ناکامی" کہا جا سکتا ہے جس سے عوام پریشان ہیں مگر عوام کی اس پریشانی سے بعض ایسے عناصر فائدہ اٹھا رہے ہیں جن کے مفادات پر ون یونٹ کی موجودگی میں زد آتی ہے اس کی وضاحت کے طور پر میں نے یہ مثال دی کہ نوشکی (بلوچستان) کا ایک بلوچ خوشحال خان اپنے کسی کام کے سلسلہ میں جب لاہور آتا ہے تو جب ہائی کورٹ میں اس کا مقدمہ نہیں لگتا یا جب وہ سول سیکرٹریٹ میں جاتا ہے تو ڈپٹی سیکرٹری سے اس کی ملاقات نہیں ہوتی کیونکہ ڈپٹی سیکرٹری بقول اس کے چپڑاسی کے ضروری میٹنگ میں ہے۔ اور دراصل وہ دوستوں کے ساتھ بیٹھا کافی پی رہا ہے یا فون پر لمبی لمبی کالیں کر رہا ہے۔ یقیناً اس صورت حال سے خوشحال خان بلوچ،

مایوس اور پریشان ہوتا ہے۔ اور یہ ایک انتظامی ناکامی ہے جس کا تدارک یوں کیا جاسکتا ہے کہ بلوچستان میں کوئٹہ کے مقام پر ہائی کورٹ کا ایک بنچ قائم کر دیا جائے یا دوسرے ضروری انتظامات کئے جائیں یعنی بڑے بڑے محکموں کے ذیلی دفاتر ذیلی مراکز میں لائے جائیں تاکہ لوگوں کے مسائل ان کے گھروں کے نزدیک ترین مقام پر ہی حل ہو جائیں۔

ادھر صورت حال یہ بھی کہ ون یونٹ کے توڑنے کی صورت میں مثلاً اگر ایک صوبہ کو سو سیٹیں ملتی تو ون یونٹ قائم رہنے کی صورت میں یہ سیٹیں ساٹھ یا ستر رہ گئیں اب جن لوگوں کو سیٹوں کے کم ہونے سے اپنی سیٹ سے محروم ہونا پڑا تھا۔ ان لوگوں نے عوام کی پریشانیوں سے فائدہ اٹھانا شروع کر دیا جنہیں "انتظامی ناکامی" کے باعث بہر حال شکایات تھیں۔ میرا اصرار تھا کہ مفاد پرستوں کی بجائے غریب عوام کی حقیقی شکایات کا مستقل حل تلاش کیا جائے جو ون یونٹ کو توڑنے کے بجائے کچھ اور بھی ہو سکتا تھا۔

اس پر مجھے ڈاکٹر مبشر حسن نے ایک خط لکھا جس میں مجھے کہا گیا کہ میں اس اخباری بیان کی تردید کروں کیونکہ یہ پارٹی فیصلہ کے خلاف ہے، میں نے انہیں بتایا کہ میں پارٹی کے اصولوں کی خلاف ورزی نہیں کر رہا۔ میں پارٹی کے فیصلہ کو قبول کرتا ہوں مگر میں نے تو "ون یونٹ" کے بارے میں اپنے ذاتی خیالات کا اظہار کیا ہے۔

جیسا کہ میں نے پہلے کہا ۲۵ مارچ ۱۹۶۹ء کو جنرل یحییٰ خان کو ایک خط کے ذریعے اقتدار سونپ دیا گیا حالانکہ آئینی طور پر صدر (ایوب خان) کو زمام حکومت قومی اسمبلی کے سپیکر عبدالجبار کے سپرد کرنا چاہیے تھی۔ بہر حال مارشل لاء کے دور میں تمام سیاسی سرگرمیاں معطل کر دی گئیں۔ البتہ سیاسی جماعتوں نے اپنے دفاتر کے اندر بحث مباحثہ کا سلسلہ جاری رکھا اور نجی ملاقاتوں میں سیاسی امور پر تبادلہ خیال کے ساتھ ساتھ تجزیہ کئے جاتے رہے۔

اس دوران میں ایک قابل ذکر واقعہ رونما ہوا۔

یحییٰ خان کی پیش کش

۱۲ جون ۱۹۶۹ء کو صدر جنرل یحییٰ خان کے فوجی سیکرٹری (میجر جنرل اسحاق) کا فون

میرے گھر آیا۔ انہیں بتایا گیا کہ میں گھر پر موجود نہیں لہذا انہوں نے میرے دفتر (۴۲ ۵ دی مال روڈ) پر فون کیا اور مجھے بتایا کہ صدر مملکت آپ سے فوراً ملنا چاہتے ہیں۔ میں نے فوری طور پر انکار یا اقرار کرنے کی بجائے ان سے نہایت شائستگی سے کہا: فی الحال مجھے اپنے پروگرام اور مصروفیات دیکھنے کا موقع دیجئے، میں آپ کو خود ہی فون کر کے اپنے فیصلہ سے آگاہ کر دوں گا۔ فون بند ہوا اور میں نے لمحہ بھر تاخیر کے بغیر ۷۰ کلفٹن فون کیا۔ بھٹو صاحب لائن پر آئے اور میں نے انہیں ساری بات بتائی اور ساتھ ہی کہا کہ

Sir It is not a feather in my hat.

کیونکہ میں بہرحال پارٹی ڈسپلن اور اصول پسندی کا قائل ہوں۔ آپ مجھے جو حکم کریں، میں ویسے ہی کروں گا۔ بھٹو نے فوراً جواب دیا۔

Raza go ahead

چنانچہ میں نے ملٹری سیکرٹری کو جوابی فون کر کے اپنی رضامندی کا اظہار کر دیا۔

۱۴۔ جون ۱۹۶۹ء کو راولپنڈی کے ایوانِ صدر میں میری صدر جنرل یحییٰ خان سے ملاقات ہوئی جو ایک گھنٹے سے زیادہ دیر تک جاری رہی۔ اس ملاقات میں یحییٰ خان نے مجھے نہایت مناسب الفاظ میں ان حالات سے آگاہ کیا جن سے مجبور ہو کر فوج نے اقتدار سنبھالا اور پھر اپنے مستقبل کے پروگرام اور منصوبہ کے بارے میں بتایا۔ انہوں نے یہ بھی کہا کہ نوجوان نسل اور خاص طور پر طلباء قوم کی امیدوں کا مرکز ہیں لیکن میں (یحییٰ خان) محسوس کرتا ہوں کہ نوجوان طلباء بے چین اور انتشار کا شکار ہیں اور بالآخر انہوں نے مطلب کی بات کرتے ہوئے کہا:
میں چاہتا ہوں کہ آپ میرے ساتھ تعاون کریں۔ اور امور نوجوانان Ministry of Culture & Youth Affairs کی ایک نئی وزارت بنا کر آپ کو اس کا مرکزی وزیر بنا دیا جائے۔ میں نے فوراً کہا: جناب میں تو پیپلز پارٹی سے وابستہ ہوں۔ اور آپ غیر جانبدار ہیں۔ لہذا اگر آپ ایسا چاہتے ہیں تو قومی حکومت بنائیں اور میرے چیئرمین کو کہہ کر میری خدمات حاصل کر لیں۔ تب مجھے کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔ اور میرے خیال میں یہ صاف معاملہ ہوگا۔ اس پر یحییٰ خان نے بات سمیٹتے ہوئے جواب دیا۔

I only need you. Go and talk to your friends and let me know about your decision.

جس وقت جنرل یحییٰ خان نے مجھے وزارت کی پیش کش کی تھی اس وقت میری عمر تیس سال کی تھی اور میں ملکی سطح پر سیاسی میدان میں کسی تعارف کا محتاج بھی نہیں تھا۔ اور اگر میں اس پیش کش کو قبول کر لیتا تو یقیناً بھٹو کے بعد پہلا سب سے کم عمر وزیر ہوتا جبکہ بھٹو نے جب ۱۹۵۸ء میں ایوب کی مارشل لاء حکومت میں شمولیت اختیار کی تھی تو وہ قومی سیاست میں بالکل اجنبی اور غیر معروف شخص تھے وہ انگلستان سے واپس آئے ہوئے ایک خوش لباس، خوش مزاج نوجوان بیرسٹر تھے۔ ان کی وکالت برائے نام تھی مگر وہ اس سے قطعاً لاپرواہ تھے۔ اگر ان کو ایوب خان وزیر نہ بناتا تو اب وہ زیادہ سے زیادہ کراچی کے ملک سعید حسن ہوتے اور لاہور میں ان کے سب سے قریبی دوست نعیم بخاری یا پرویز صالح ہوتے۔ اس کے مقابلے میں میں نے مارشل لاء حکومت کی طرف سے طشتری میں رکھ کر پیش کی گئی وزارت کو محض اصول پرستی، سیاسی وابستگی اور پارٹی ڈسپلن کے تحت منظور نہ کیا۔

میں جنرل یحییٰ خان سے مل کر آیا تو راولپنڈی کے صحافیوں کو اس ملاقات کی خبر ہو چکی تھی لہٰذا انہوں نے مجھے گھیر لیا۔ ان کا خیال تھا کہ میں یحییٰ خان اور بھٹو کے درمیان کسی رابطہ کا فرض ادا کر رہا ہوں جبکہ حقیقت اس سے مختلف تھی۔ بہرحال Inter Ming کے ایڈیٹر جناب امین الرحمان دوہا جو شمس الضحیٰ (انسپکٹر جنرل پولیس مشرقی پاکستان جو بعد ازاں ایوب خان کے وزیر زراعت رہے) کے بیٹے تھے اور انہیں یہ اعزاز بھی حاصل تھا کہ وہ پی۔ ایم۔ اے کاکول سے (اعزازی شمشیر) سورڈ آف آنر اور نارمل میڈل حاصل کرنے والے واحد بنگالی تھے۔ جو بعد میں بنگلہ دیش کے وزیر خارجہ بھی ہو گئے۔ اپنے اخبار کے لئے میرا انٹرویو کیا جس میں بعض دلچسپ اور فکر انگیز امور پر گفتگو ہوئی

نومبر ۱۹۶۹ء کے آخری دنوں میں لاہور کے روزنامہ کوہستان کے تقریباً ۵۰۰ کارکنوں کو انتظامیہ نے نہ صرف بند کر دیا بلکہ ادارہ کی غیر قانونی طور پر تالہ بندی کر دی اس پر کارکنوں نے زبردست احتجاج کیا اور کیمپ قائم کر لیا پیپلز پارٹی کیونکہ معاشی استحصال کے خاتمہ اور آزادی اظہار کی داعی تھی لہٰذا جب بھٹو صاحب لاہور آئے تو میں نے ان کی توجہ اس مسئلہ کی طرف بھی مبذول کرائی پہلے تو وہ تیار نہ ہوئے اور کہنے لگے: DONT YOU THINK IT WILL BE OVER DUE? لیکن جب میں نے کہا یہ اخبار نویسوں کا معاملہ ہے اور اس سے پارٹی کے وقار میں اضافہ ہو گا تو وہ راضی ہو گئے اور میری حیرت کی انتہا نہ رہی کہ جب ہم لوگ احتجاجی کیمپ میں پہنچے تو بھٹو نے ہر طرف کارکنوں سے گھرے دکھ اور ہمدردی کا اظہار کیا اس موقع پر کوہستان

سٹاف یونین کے صدر عبدالوحید خان نے تقریر کی جس کے جواب میں بھٹو نے مختصر خطاب کیا اور بڑی دردمندی سے بولے: جب مجھے بتایا گیا کہ کیمپ میں جونسٹ بیٹھے ہیں تو میں نے کہا: جلدی کرو مجھے ان کے پاس لے کر چلو۔ وہ تو میرے بھائی ہیں، میرا سہارا ہیں۔ میں ان سے دور کیسے رہ سکتا ہوں۔ اس پر خوب تالیاں بجائی گئیں اور تب میں یہ سمجھ کر بے حد خوش ہوتا رہا کہ میرا لیڈر کتنا بڑا ڈپلومیٹ ہے۔

۲۸ر نومبر ۱۹۶۹ء کو ایک افسوس ناک واقعہ رونما ہوا۔ چیئرمین بھٹو پنجاب اور سندھ کے سنگم پر واقع شہر صادق آباد کے دورہ پر تھے کہ وہاں جماعت اسلامی والوں نے ان پر قاتلانہ حملہ کر دیا۔ اگرچہ اس میں بھٹو تو بال بال بچ گئے مگر ہمارے ایک ساتھی امان اللہ خان شدید زخمی ہوئے۔ ان کا بازو ٹوٹ گیا جس پر بعد ازاں پلستر کرانا پڑا۔ اس پلستر کے بارے میں یار لوگوں نے یہ انکشاف بھی کیا تھا کہ ڈاکٹروں نے یہ پلستر صرف دو یا تین ہفتوں کے لئے لگایا تھا جبکہ امان اللہ خان نے اسے تین ماہ تک نہیں اتارا جبکہ وہ اس کو پراپیگنڈہ ہتھیار کے طور پر استعمال کرتے اور نوجوانوں کی ہمدردیاں حاصل کرتے۔ کئی مقامی کارکنوں کو بھی چوٹیں آئیں۔ اس پر پورے ملک میں بڑا شدید ردعمل ہوا۔ میں اس وقت لاہور میں تھا چنانچہ ایک اخباری بیان کے ذریعے میں نے اس حملہ کی شدید مذمت کی اور ساتھ ہی واشگاف الفاظ میں کہا کہ اگر سیاسی قائدین کے احترام کو ملحوظ خاطر نہ رکھا گیا اور جماعت اسلامی نے فوراً اپنی یہ روش تبدیل نہ کی تو پھر کوئی لیڈر محفوظ نہیں رہے گا۔ مجھے یہ بیان یوں یاد رہے کہ اس واقعہ کے بعد جب بھٹو لاہور آئے تو انہوں نے مجھے دیکھتے ہی کہا: قصوری! میں جانتا ہوں تم کسی سے نہیں ڈرتے لیکن میرا خیال ہے کہ مولویوں سے کبھی کبھی ڈرنا چاہیئے۔!!

بھٹو محنت کشوں میں

کوٹ لکھپت کا علاقہ لاہور کے محنت کشوں، مزدوروں اور ہنرمندوں کا گڑھ ہے۔ لہذا میں نے سوچا کہ ان لوگوں سے بھی بھٹو کا براہ راست خطاب اور ملاقات اشد ضروری ہے اس سلسلہ میں میں نے پہلے تو ایک عام سروے کیا جس کے لئے مجھے زیادہ تردد یوں نہ کرنا پڑا

کہ ماڈل ٹاؤن میں رہائش کے باعث میرا کوٹ لکھپت کی لیبر سے رابطہ تھا۔ اس سلسلہ میں مظہر علی خان، روزی خان، اعجاز سیفی، عبدالرحمٰن اور افتخار وغیرہ نے میرے ساتھ بھرپور تعاون کیا۔ طے پایا کہ جب دسمبر میں بھٹو لاہور آئیں گے تو کوٹ لکھپت میں ایک مزدور ریلی منعقد ہو گی۔ اس کے لئے مزدوروں اور محنت کشوں نے اپنے محدود وسائل کے مطابق بڑی تیاریاں کیں اور ریلوں ۲۸ دسمبر ۱۹۶۹ء کو میں بھٹو کو اس ریلی میں لے گیا۔ یہ اُس زمانے کے ماحول اور حالات کے حوالے سے بلاشبہ ایک عظیم الشان اجتماع تھا۔ بھٹو خوب کھل کر بولے اور انہوں نے لیبر کو آگے بڑھ کر تعاون کرنے کی اپیل کی۔ یہاں بھٹو کا بڑا والہانہ استقبال ہوا۔ سٹیج پر صرف ایک کرسی خاص طور پر بھٹو کے لئے رکھی گئی تھی مگر انہوں نے اس پر بیٹھنے سے انکار کر دیا اور کھڑے ہو کر تقریر کرتے رہے میں بھٹو کے بالکل ساتھ کھڑا تھا اور ہم دونوں کے سروں کے عین اوپر اور نزدیک سے بجلی کے تار گذر رہے تھے۔ ان تاروں کو غور سے دیکھ کر حنیف رامے چپکے سے نیچے فرش پر بیٹھ گئے۔ بھٹو کی ذہین نظروں نے اس بات کو بھی تاڑ لیا۔ چنانچہ واپسی پر انہوں نے راستے میں مجھے کہا۔ اگر ہم حکومت میں آ گئے تو رامے کو میں واپڈا کا چیئرمین کبھی نہیں بناؤں گا۔ جو کچھ بھٹو سوچ رہے تھے وہ میرے وہم و گمان میں بھی نہ تھا۔ لہٰذا میں نے حیرت سے کہا۔ کیوں؟ بھٹو نے شرارت سے آنکھ مار کر کہا: وہ بجلی سے بہت ڈرتا ہے۔

الیکشن ۷۰ء

جوگی والا پھیرا

۱۹۷۰ء کا سال الیکشن کا سال تھا۔ قومی سیاست میں ایک گہما گہمی اور رونق آچکی تھی۔ مختلف سیاسی جماعتیں عوام میں جا کر ان کا اعتماد حاصل کرنے کے لئے کوشاں تھیں اور سیاسی میدان میں ایک عرصہ کے بعد نئے پرانے چہرے ایک دوسرے سے متعارف اور روشناس ہو رہے تھے۔ ایسے میں پاکستان پیپلز پارٹی نے بھی الیکشن کے لئے اپنی سٹریٹیجی کے تحت کام کرنے کا فیصلہ کیا اور جنوری ۱۹۷۰ء میں مسٹر بھٹو کو سب سے پہلے راولپنڈی میں مدعو کیا گیا۔ پروگرام یہ طے پایا کہ یہاں (راولپنڈی) سے ایک عظیم الشان جلوس جہلم تک لے جایا جائے اور وہاں سے منگلا جا کر اپنا ہیڈ کوارٹر قائم کیا جائے۔ جلوس کا مقصد یہ تھا کہ اپنی عوامی مقبولیت کا بھرپور مظاہرہ کر کے مخالفین کے دانت کھٹے کئے جائیں لیکن ہمیں اس وقت اپنے اس پروگرام پر اوس پڑتی ہوئی محسوس ہوئی جب مقررہ دن بڑی تگ ودو اور دوڑ دھوپ کے بعد یہاں

بمشکل ڈیڑھ دو درجن گاڑیاں جمع ہو سکیں جن میں پارٹی کی مقامی قیادت یعنی ہمارے دوست خورشید حسن میر وغیرہ کی ذاتی گاڑیاں بھی شامل تھیں۔ گنتی کی چند بسیں تھیں جن میں پارٹی کے پرجوش اور جیالے کارکن مسرور تھے۔

مجھے بخوبی علم تھا کہ جب مسٹر بھٹو کو اس عظیم الشان جلوس کی خبر ہو گی (اور اس خبر کو چھپانا بھی ناممکن تھا) تو ان کا کیا حال ہو گا؟ لہٰذا میں نے خورشید حسن میر اور دوسرے ساتھیوں سے کہا کہ آپ بلاتاخیر پارٹی پرچم والی چھوٹی چھوٹی ایسی جھنڈیاں زیادہ سے زیادہ تعداد میں تیار کرالیں جنہیں ایک ہاتھ میں باآسانی اور سہولت کے ساتھ پکڑا جا سکے۔ اس موقع پر بڑی منصوبہ بندی اور عقلمندی سے کام کرنے کی ضرورت تھی۔ لہٰذا ہم نے صورت حال کو بھانپتے ہوئے اپنا یہ مختصر سا قافلہ راولپنڈی شہر سے نکال کر مورگاہ پر لے جا کر کھڑا کر دیا۔ اور ظاہر یہ کیا کہ ہم نہ صرف اپنے ساتھیوں کا انتظار کر رہے ہیں بلکہ ہم اپنے جلوس کو ترتیب دینے میں مصروف ہیں۔ گاڑیوں کو آگے پیچھے کرتے ہوئے ہم نے ظاہر ہے کہ سڑک کے بعض حصوں کو بھی روک لیا اور اس سارے عمل میں آدھ پونا گھنٹہ صرف ہوا۔ اس عرصہ میں راولپنڈی کی طرف سے آنے والی ساری ٹریفک رک گئی۔ اور یوں یہ مجبوراً رکی ہوئی ٹریفک ہمارے جلوس کا ہی حصہ بن گئی۔ اسی اثناء میں ہمارے ورکرز اپنے ہاتھوں میں ایک ایک جھنڈی لے کر پیچھے رکی ہوئی بسوں کی چھتوں پر چڑھ گئے تاکہ جب یہ گاڑیاں ہمارے پیچھے آئیں تو ہمارے اصل جلوس کا ایک حصہ ہی محسوس ہوں۔ چنانچہ جب ہم مورگاہ سے روانہ ہوئے تو یہ جلوس ڈیڑھ دو درجن گاڑیوں کی بجائے دو اڑھائی سو بسوں اور گاڑیوں پر مشتمل تھا کیونکہ ہر بس کے اوپر ہمارا ورکر پارٹی کا جھنڈا لے کر بیٹھا ہوا تھا۔

یہ ایک ایسی صورت حال تھی کہ جس میں ہمارے پیچھے آنے والے مسافروں نے پہلے تو سخت جھنجلاہٹ کا اظہار کیا لیکن پھر وہ جلدی ہی خود کو بے بس محسوس کر کے صورتحال سے سمجھوتا کرنے کے لئے تیار ہو گئے۔ جیسا کہ تیسری دنیا کے عوام کا عمومی انداز ہے۔ اس روز اتفاق سے موسم بھی خوشگوار تھا۔ اور ہمارے عوام کی ایک صفت یہ بھی ہے کہ وہ حکومت وقت کے خلاف رویہ کو پسند کرتے ہیں کیونکہ اس طرح سے بھی ان کی ذہنی تسکین ہوتی ہے اور ان کے

انگلستان میں پاکستانی عوام کا شہری آزادی کی حمایت میں ایک یادگار جلوس ۔ احمد رضا قصوری نے بھی شرکت کی ۔ اپریل

ذوالفقار علی بھٹو موچی گیٹ میں پہلے جلسہ عام سے خطاب کر رہے ہیں۔ جنوری ۱۹۶۸ء۔

پولیس کی کارروائی سے قبل طلبا پنجاب یونیورسٹی کے احاطہ میں جمع ہو گئے جہاں طلبا
کے رہنما اشفاق شاہد، امتیاز جاوید اور احمد رضا خطاب کر رہے ہیں۔

خان بہادر سردار محمد شہباز خان خلف زئی رئیس اعظم قصور، سکندر حیات خان، عالم خان، خان محمد، احمد خان آنریری مجسٹریٹ قصور
سلطان علی، عادل خان، سلطان علی، حسین خان، علی رضا خان، خضر حیات خان، سلطان علی حیدر خان، خان غلام احمد خان۔
شیر علی خان ۔ قصور کی آبائی حویلی میں ۔ ۱۹۳۶ء۔

خان بہادر سردار محمد شہباز خان رئیس اعظم قصور

مصنّف کے دادا

نواب سر امیر الدین خان والی لوہارو جارج VI بادشاہ انڈیا و برطانیہ کے ساتھ اسکاٹ لندن ۱۹۲۵ء۔

نواب محمد اسماعیل (پریذیڈنٹ الیکشن کمیٹی آل انڈیا مسلم لیگ و وائس چانسلر علی گڑھ یونیورسٹی) کی شادی کے موقع پر مولانا
الطاف حسین حالی، سرامیر الدین احمد خان نواب آف لوہارو نواب محمد اسحاق خان، سیکرٹری علیگڑھ مسلم یونیورسٹی اور جسٹس محمود (فرزند سر سید احمد خان)

120. B. Model Town, Lahore,
24th Sept 1969.

My Dear Ali, It is late in the night. I feel terribly sad, depressed, morose & downhearted just as I take up my pen to write these lines to you.

نواب محمد احمد خاں کا خط بیٹے کے نام

۱۲۰- ب ماڈل ٹاؤن
۲۴ ستمبر ۱۹۶۹ء
مائی ڈیر علی!

رات خاصی بیت چکی ہے۔ میں بہت اداس، دکھی اور بجھا بجھا سا ہوں۔ میں نے قلم لے کر تمہیں چند سطریں لکھنا شروع کر دی ہیں۔ میں اس کائنات میں انسانی زندگی کے حقیقی مفہوم کے بارے میں غور کرتے ہوئے پریشاں خیالی اور الجھاؤ کا شکار ہو جاتا ہوں۔ باری تعالیٰ نے ہمیں اور دوسری بہت سی چیزوں کو کیوں تخلیق کیا؟ ہم کہاں سے آئے، ہماری منزل کون سی ہے؟ دنیا کی اس زندگی میں ہم سے مطالبہ کیا ہے؟ بزرگوں کا کہنا ہے، جن کے اعمال اچھے ہوں اگلے جہان میں ان کے لیے دودھ اور شہد کی نہریں ہوں گی، مجھے اس پر شبہ کرنے کی جرأت نہیں ہوتی۔ میرا اس سچائی پر ایمان ہے، لیکن اداسی کے لمحوں میں میرا ذہن اس نہج پر سوچتا ہے کہ اچھے کاموں کا صلہ انسان کو اس دنیا میں مل جانا چاہیے۔

بہت سے ارفع اصول اور نیکیاں ہیں جن پر عمل کرنے کی تلقین سبھی پیغمبروں نے کی ہے۔ ان میں سے ایک خوبی بغیر کسی صلے کی امید کے، انسانیت کی بے لوث اور بے ریا خدمت ہے۔ میں اپنی باقی زندگی کے مختصر سے عرصے میں اسی اصول پر عمل پیرا ہونا چاہتا ہوں۔ میں اپنے رب سے ہمیشہ یہی دعا کرتا ہوں کہ وہ مجھے انسانیت کی بھرپور خدمت کی توفیق بخشے۔ میں برس ہا برس آس لگائے بیٹھا ہوں کہ مجھے خدمت کا کوئی موقع میسر آئے، کبھی کبھار میں باری تعالیٰ سے سوال کرتا ہوں۔ اگر بے لوث خدمت کا جذبہ صورت پذیر نہیں ہو پاتا، تو دل میں اس کی خواہش کیوں موجزن ہوتی ہے؟

یہ کوئی الوہی عمل نہیں ہے۔ درحقیقت ہمیں ایسا سچا ادراک درکار ہے، جو ہمیں چیزوں اور ان کی اصل شکل کی پہچان کروا سکے۔ شاید مجھ میں اسی شعور کی کمی ہے۔ خدائے بزرگ و برتر سے دعا ہے کہ وہ مجھے راہِ مستقیم دکھائے۔ اپنی ذات کا عرفان حاصل کرنے کے لیے مجھے اپنے ذہن کی تربیت کرنا ہو گی۔ اللہ تعالیٰ کی رحمت اور راہنمائی ہی اس منزل تک پہنچا سکتی ہے۔ میں ایسے دور میں پیدا ہوا اور اس زمانے میں جی رہا ہوں۔ جب منفی قوتیں اکثریت کے ذہنوں پر غلبہ پا رہی ہیں۔ مجھے بھی نفی کی اس رو میں سے حصہ ملا، لیکن میں نے باری تعالیٰ کے وعدوں سے خود کو سہارا دیا۔ انسانی زندگیاں اس کائنات کی دوسری چیزوں کی طرح فطرت کے اٹل قوانین کے تابع اور پہلے سے متعین راستے پر محوِ سفر ہیں۔ ہم بس انہیں ٹرین کی طرح ہیں۔

ان باتوں سے میں تمہیں کیوں پریشان کر رہا ہوں۔ مجھے اپنے دکھوں کا تذکرہ کسی سے نہیں کرنا چاہیے، یہ غلط روش ہے، غیر مثبت جذبہ ہے۔ بے لوث خدمت اس طرح نہیں ہوتی۔ مجھے تو دوسروں کی مصیبتیں برداشت کرنا اور انہیں ان مصیبتوں سے نجات دلانے کی کوشش کرنا چاہیے۔ میری دعا ہے اللہ تعالیٰ مجھے اپنی کمزوریوں پر قابو پانے کی توفیق بخشے اور ہم سب کو معاف فرمائے۔

تمہارا مشفق باپ
احمد خان

نواب محمد احمد خان کا اپنے بیٹے کے نام تاریخی خط جو ایک سیاسی کارکن کے لیے مینی فسٹو کا درجہ رکھتا ہے۔

افغانستان کے بادشاہ امان اللہ خان کی ہندوستان آمد کے موقع پر ہندوستان کی ریاستوں کے والیان نظام حیدرآباد
والیِ میسور مہاراجہ پٹیالہ اور نواب سر امیر الدین احمد خان نواب آف لوہارو و دیگر والیان آگرہ - ۱۹۲۷ء -

جذبات کا کتھارسیس ہوجاتا ہے جلوس نے چلنا شروع کیا تو سب سے پہلے ہم لوگوں نے ایسے نعرے لگانا شروع کئے جن کے جواب میں مردہ باد کہا جاتا تھا کیونکہ ایسے نعرے عموماً مشترک ہوتے ہیں جبکہ زندہ باد کے نعروں میں ہر شخص کی اپنی اپنی پسند ہوتی ہے۔ آہستہ آہستہ جب لوگوں نے مردہ باد کے نعروں کا جواب تسلسل اور جوش و خروش سے دینا شروع کر دیا تو ہم نے زندہ باد والے نعرے شروع کر دیئے۔ اس وقت تک ایسا ماحول بن چکا تھا کہ یہ عظیم الشان جلوس واقعی پیپلز پارٹی کا جلوس محسوس ہوتا تھا۔

ہم نے گوجر خان جا کر اپنا پہلا پڑاؤ ڈالا۔ اور یہاں تقریباً پونا گھنٹہ قیام کیا، یہاں سے چلے تو ہماری اگلی منزل جہلم تھی اور جب ہم جہلم کے نزدیک کی پہاڑیوں میں سے گذر رہے تھے تو ایک محتاط اندازے کے مطابق ہمارے اس جلوس میں آٹھ نو سو کے لگ بھگ گاڑیاں تھیں جہاں تک نظر جاتی تھی گاڑیاں ہی گاڑیاں تھیں جن کے اوپر پیپلز پارٹی کے جھنڈے بردار ورکرز بیٹھے تھے اور ان کے مجبور مسافر بڑے جوش و خروش سے زندہ باد، مردہ باد کے نعرے لگا رہے تھے۔

پیچھے سے آنے والی گاڑیوں کو آگے نکلنے کا رستہ نہیں ملتا تھا تو وہ مجبوراً جلوس میں شامل ہو جاتی تھی۔ لہٰذا آج کل جب ایسی باتیں کی جاتی ہیں کہ فلاں کا لاہور سے گوجرانوالہ تک یا شیخوپورہ تک جلوس نکالا گیا تو میں اس سے متاثر نہیں ہوتا کیونکہ میں تو خود ایسے جلوس ترتیب دیتا رہا ہوں مجھے بخوبی علم ہوتا ہے کہ اس عظیم الشان جلوس میں اصل اور اپنی گاڑیاں کتنی ہوتی ہیں اور زوک کر ساتھ شامل کئے جانے والی کتنی ہوتی ہیں۔

قصہ مختصر جب ہم جہلم پہنچے تو بھٹو کا اس قدر عدیم المثال اور شاندار جلوس شہر میں داخل ہوا کہ لوگ ششدر رہ گئے۔ معمر اور عمر رسیدہ لوگوں نے گواہی دی کہ انہوں نے گذشتہ پچاس برسوں میں ایسا منظم اور طویل جلوس نہیں دیکھا۔ اس جلوس کا چرچا قومی اخبارات میں ہوا تو قومی سیاست میں ایک "تھرتھلی" سی مچ گئی۔

جہلم میں جا کر جلوس ختم ہو گیا اور ایک استقبالیہ میں شرکت کرنے کے بعد ہم لوگ منگلا چلے گئے۔ وہاں کے ریسٹ ہاؤس میں ہمارے قیام کا پہلے سے ہی بندوبست کر دیا گیا تھا

اسی رات ہم چند دوست بھٹو صاحب کے کمرے میں بیٹھے ہوئے جلوس کے بارے میں باتیں کر رہے تھے۔ بھٹو ظاہر ہے کہ بے حد خوش اور مسرور تھے جب میں نے انہیں جلوس کی تشکیل کے بارے میں اپنے "آپریشن" سے آگاہ کیا تو وہ بے ساختہ ہنس پڑے اور جھک کر بولے : تو کیا عبدالقیوم خان کا پچاس میل لمبا جلوس بھی تم نے ہی ترتیب دیا تھا۔

اگلے روز منگلا سے ہم میرپور گئے۔ وہاں کلیال ریسٹورنٹ میں ایک پُروقار استقبالیہ ترتیب دیا گیا۔ ایک دن کے لئے ہم نے جہلم واپس آکر جلسہ کیا اور پھر واپس جا کر مضافات میں جلسے کرتے رہے۔ بالآخر ہم جہلم کے راستے اسی طرح جلوس کی شکل میں پنڈدادن خان آئے۔ یہاں محترم بھٹی ایڈووکیٹ نے استقبال اور جلسہ کے انتظامات کر رکھے تھے۔ یہاں سے فارغ ہو کر ہم سرگودھا آگئے جہاں پارٹی کا جلسہ بڑا شاندار رہا۔ میاں جمیل، مسعود زاہدی، ممتاز کاہلوں اور حفیظ اللہ چیمہ سمیت پارٹی کے جملہ کارکنوں نے بڑی محنت اور جانفشانی سے کام کیا تھا۔

سرگودھا سے چلے تو ہم لائل پور (اب فیصل آباد) پہنچے جہاں سب روایت ایک عظیم الشان جلسہ کیا اور ایک رات یعقوب اعوان کے گھر قیام کیا وہاں سے نکلے تو شیخوپورہ میں جلسہ کرنے کے بعد واپس لاہور آگئے۔

اس کے بعد ۲۴ جنوری کو سیالکوٹ کے جناح پارک میں ایک شاندار جلسہ ہوا جس سے ہم لوگوں نے خطاب کیا جہاں سے واپسی پر گوجرانوالہ میں اس قدر ہجوم تھا کہ اس کے اصرار پر خطاب کرنا پڑا۔

یہ ماہ جنوری کے دوران پارٹی کی اس عوامی رابطہ مہم کی مختصر روداد ہے جو اس اعتبار سے نہایت ضروری بلکہ لازم ہو گئی تھی کہ سیاسی سرگرمیوں پر پابندیوں کے باعث پارٹی کے ورکرز سے رابطہ ختم ہو گیا تھا۔ عوام اور خاص طور پر جیالے کارکن بڑے سخت پریشان تھے اور گومگوں کے عالم میں ان کو کچھ سجھائی نہیں دیتا تھا۔ اس دورہ اور جلسہ جلوس کے سلسلہ نے ملکی سطح پر پارٹی کے بدن میں زندگی کی نئی لہر دوڑا دی بلکہ مجھے تو یہ کہنے میں کوئی تامل نہیں ہے کہ اس سلسلہ نے ہماری تیزی سے متاثر ہوتی ہوئی سیاسی ساکھ کو از سر نو بحال کر دیا۔ اس کے ساتھ ساتھ رجعت پسند مخالف جماعتوں کے اس بے بنیاد پراپیگنڈہ کی قلعی بھی کھل گئی کہ پیپلز پارٹی

عوام میں اب مقبول نہیں رہی

زندہ دلان لاہور کے روبرو

اسی طرح ۸ ر مارچ کو لاہور کی تاریخی جلسہ گاہ موچی دروازہ میں ایک عظیم الشان جلسہ منعقد کیا گیا جس سے پارٹی کی عوامی مقبولیت میں مزید اضافہ ہوا۔ اس جلسہ کے سلسلہ میں ضیاء الدین بٹ (لیبر لیڈر) حامد حسین، حارث اقبال بھٹی، ایس ایم مسعود، ضیاء محمود مرزا، عبدالستار نجم، میاں اسلم اور خالد چوہدری وغیرہ نے بڑی جانفشانی اور محنت سے کام کیا۔ سٹیج پر پارٹی کے جن چند لیڈروں کو جگہ دی گئی تھی ان میں میں بھی شامل تھا بلکہ میں تو حسب معمول بھٹو کے بالکل نزدیک کھڑا تھا، جنہوں نے یہاں پر بڑی دھواں دھار تقریر کی۔ انہوں نے حکومت پر خوب کھل کر تنقید کی اور سرکاری وزراء کو ہدف تنقید بناتے ہوئے نواب زادہ جنرل شیر علی خان (وزیر اطلاعات و نشریات) کے جماعت اسلامی کے ساتھ رابطہ کا بھی تمسخر اڑایا انہوں نے اس مرحلہ پر اچانک پیچھے مڑ کر میرا ہاتھ پکڑا اور کھینچ کر اپنے برابر کر لیا، ابھی میں کچھ سمجھ نہ پایا تھا کہ بھٹو نے للکارتے ہوئے کہا۔ "سنو یحییٰ خان۔ یاد رکھو، اگر تمہارے پاس نواب زادہ ہے تو ہمارے پاس صاحبزادہ ہے"۔

اور اس کے ساتھ ہی پانچ لاکھ کے مجمع میں میرا ہاتھ پکڑ کر ہوا میں اونچا کر دیا۔ یہ سنتے اور دیکھتے ہی سارا مجمع خوشی اور محبت کے مارے پُرجوش انداز میں نعرے بلند کرنے لگا۔ زندہ دلان لاہور کے دلوں کو بھٹو کا یہ انداز بھا گیا اور وہ اٹھ کر والہانہ انداز میں بھنگڑہ ڈالنے لگے۔ اس قدر نعرہ بازی اور تالیوں کا شور ہوا کہ تقریباً چار پانچ منٹ تک بھٹو تقریر دوبارہ شروع نہ کر سکے۔ حتیٰ کہ میں نے دونوں ہاتھوں کو اٹھا اٹھا کر اشارے سے لوگوں کو خاموش ہونے کا اشارہ کیا تاکہ چیئرمین اپنی تقریر جاری رکھ سکیں۔

جلسہ کے بعد مجھے لوگوں نے اس بات پر مبارکباد دی کہ جلسہ میں اگرچہ مصطفیٰ کھر، حفیظ پیرزادہ۔ حتیٰ کہ خود بھٹو کے (ٹیلنٹڈ) کزن ممتاز بھٹو موجود تھے لیکن انہوں نے کسی کو عوام کے سامنے "اپنی ڈھال" کے طور پر پیش نہیں کیا بلکہ یہ اعزاز میرے حصہ میں ہی آیا۔ ادھر دائیں

بازو کی جماعتیں خاص طور پر جماعت اسلامی یوم شوکت اسلام منانے کی تیاریوں میں مصروف تھی اور ادھر میں نے لاہور کے وکلاء میں اس امر کے حق میں دستخط لینے کی مہم شروع کر دی کہ وہ (وکلاء) یوم شوکت اسلام کے اجلاس میں شرکت نہیں کریں گے۔ انتہائی دوڑ دھوپ اور دن رات کی محنت کے بعد بالآخر میں لاہور کے صف اول کے تقریباً ۱۸۷ وکلاء کے دستخط حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا جو اس زمانے میں ایک انتہائی موثر اور معتبر دستاویز کی حیثیت اختیار کر گئی تھی۔ ان وکلاء میں ملک سعید حسن، سی آر اسلم، شیخ اشفاق احمد، عارف اقبال حسین بھٹی بیرسٹر جمیل، رانا محمد اکرم، صاحبزادہ شیر علی خان، بیرسٹر نذیر احمد شامی، ضیاء محمود مرزا، ایس ایم مسعود، ایس اے چغتائی اور شفیع الزمان قابل ذکر تھے۔ یہ دستاویز ۳۰ رمئی ۱۹۷۰ء کو قومی پریس کو باقاعدہ طور پر جاری کر دی گئی یعنی عین اس وقت جب یوم شوکت کی تیاریاں عروج پر تھیں۔

اس مہم سے نہ صرف رائے عامہ کو ہموار کیا گیا بلکہ مخالفین کو دفاعی انداز میں جدوجہد کرنے پر مجبور کر دیا گیا۔ نظریاتی لحاظ سے یہ ایک مشکل کام تھا جسے کرنے کے لئے مجھ سے پہلے کئی دوستوں نے ڈول ڈالا تھا مگر وہ بوجوہ ناکام رہے تھے۔ میری اس کوشش بلکہ کامیاب کوشش کو پارٹی کے زعماء نے خوب سراہا۔ ۱۰ رجون ۱۹۷۰ء کو ہم نے دائیں بازو کی جماعتوں کی طرف سے یوم شوکت اسلام منائے جانے کے بعد اپنے جذبات کا اظہار کرنے کے لئے کاروان جہاد کے نام سے ایک یادگار اور عظیم الشان جلوس نکالا، جو کسی اعتبار سے بھی یوم شوکت اسلام کے جلوس سے کم نہ تھا بلکہ اس کی امتیازی خصوصیت یہ تھی کہ ہمارے مخالفین نے پورے پنجاب سے لوگ اکٹھے کئے تھے اور ہم نے صرف لاہور کے جیالوں سے جلوس میں شرکت کی اپیل کی تھی۔ اس جلوس کی قیادت کرنے والوں میں میرے علاوہ سید امیر حسین شاہ، ڈاکٹر مبشر حسن مولانا کوثر نیازی اور رؤف طاہر شامل تھے۔ اس جلوس میں ایک موقع پر ڈاکٹر مبشر حسن نے مولانا کوثر نیازی سے کہا: مولانا کوئی ایسی ترکیب بتائیں کہ اس جلوس سے میں باہر نکل جاؤں یہ کام میرے بس کا نہیں، یہ تو آپ ہی کو مبارک ہو"۔ مولانا نے بڑی ہی صفائی اور سادگی سے کہا: آپ کا راستہ تو کسی نے نہیں روک رکھا، آپ بڑے شوق سے چلے جائیں۔

نیسکن یہ شخص (میری طرف اشارہ کرکے) جب بھٹو صاحب کو جلوس کی رپورٹ دے گا تو پھر آپ کو ممکن ہے شکایت ہو۔ بھٹو کا لفظ مولانا نے دراز در دے کر معنی خیز لہجہ میں کہا تھا لہٰذا ڈاکٹر مبشر حسن نہ صرف سارا عرصہ جلوس میں شامل رہے بلکہ اس کے بعد انہوں نے چھ سات بار بند مٹھی کو سر سے اونچا لے جا کر نعرے بھی لگائے۔ بعد میں مولانا نے مجھے کہا: آپ نے میری بات کا برا تو نہیں منایا تھا۔ میں نے بات یونہی ٹال دی کیونکہ مجھے احساس تھا کہ مولانا نے یہ "حربہ" وسیع تر مفادات کے تحت استعمال کیا تھا۔

ہالہ کانفرنس کا تاریخی موڑ

یہ یکم جولائی ۱۹۷۰ء کی بات ہے، سندھ کے مشہور اور تاریخی شہر ہالہ میں پارٹی کی ایک کانفرنس منعقد ہوئی اس کانفرنس کا بنیادی مقصد "الیکشن ۱۹۷۰ء" تھا یعنی اس میں پارٹی کو یہ فیصلہ کرنا تھا کہ الیکشن میں حصہ لیا جائے یا نہیں۔ یہ ضرورت اس لئے پیش آئی تھی کہ پارٹی میں دو مکتب فکر ابھر کر سامنے آچکے تھے۔ ایک کا خیال تھا کہ تحریک کو مزید تیز کیا جائے کیونکہ ہماری انقلاب کی منزل انتخابات کے ذریعے حاصل نہیں ہوگی۔ دوسرے کا خیال تھا کہ الیکشن میں ضرور حصہ لیا جائے کیونکہ معروضی حالات میں اسی ذریعے سے منزل تک رسائی ممکن ہے۔

ہالہ کانفرنس کے میزبان پیر صاحب آف ہالہ تھے جن کی حویلی میں نہ صرف تمام مندوبین ٹھہرے تھے ان کی ملکیت ایک سینما ہال کو کانفرنس ہال میں تبدیل کر دیا گیا تھا۔ اس موقع پر یہ چھوٹا سا شہر جو عظیم سندھی شاعر شاہ عبداللطیف بھٹائی کے مزار کے بالکل نزدیک واقع ہے۔ یکایک قومی سیاسی حلقوں کی نگاہوں کا مرکز بن گیا تھا۔

اس کانفرنس میں ملک بھر سے پارٹی کے سینکڑوں کارکن اور لیڈر جمع تھے۔ جس سے پارٹی کی عوامی مقبولیت اور سیاسی اثر و رسوخ کا بخوبی اندازہ ہوتا تھا۔ کانفرنس میں بڑی دھواں دھار تقریریں ہوئیں۔ اس موقع پر ملک اختر نے الیکشن میں حصہ لینے کے حق میں تقریر کی اور اپنے تلفظ کے باعث مندوبین کی دلچسپی کا باعث بنے رہے۔ وہ بار بار انگلش لفظ سر کو "شر" کہتے تھے۔ ایک مرحلہ پر انہوں نے کہا: "شر" ویسٹ پاکستان اسمبلی میں میرے ہر روز بیس

بیس کٹ موشن Cut motion ہوا کرتے تھے۔ اور "شر"
میں اکیلا آدمی پوری گورنمنٹ کو آگے لگائے رکھتا تھا شر۔ اور اسمبلی ایک بہت بڑا پلیٹ فارم
ہے، ہم تو وہاں ایک نہیں بیس تیس ہوں گے۔
ہماری کٹ موشن Cut Motion سے گورنمنٹ گھبرائے گی شر
مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ اس تقریر پر معراج خان اور ان کے ساتھی بڑے تلملا رہے تھے۔ کیونکہ وہ
الیکشن نہیں انقلاب کے داعی اور حامی تھے۔ اتفاق ایسا ہوا کہ ملک اختر کے بعد ہی معراج خان
کی تقریر کرنے کی باری آگئی لہذا انہوں نے تقریر کے آغاز ہی میں ملک اختر کے چھوٹے قد پر طنز
کرتے ہوئے کہا: ابھی ابھی ہمارے موچی دروازے کے ایک چھوٹے سے شیر نے کہا ہے کہ میں نے
ایوبی دور میں اسمبلی کے اندر ایک دن میں بیس بیس کٹ موشن Cut motion
لگائے تھے۔ مجھے کیا معلوم وہ ایسا کرتے تھے یا نہیں۔ ممکن ہے کرتے ہوں لیکن مجھے اتنا معلوم
ہے کہ ان کو موشن Motion ضرور لگ جاتے تھے۔ اور اتنے سارے
بیس موشن سے تو آدمی کا انتقال بھی ہو سکتا ہے۔ ویسے بھی یہ (ملک اختر) صاحب شر کو شر
کہہ رہے ہیں اور اتنا زیادہ کہ انہوں نے سارے ہال میں شر پھیلا دیا ہے۔ یعنی وہ اپنی غلط
سوچ کے ساتھ ساتھ شر بھی پھیلا رہے ہیں۔

معراج خان اتنا کہہ چکے تو ملک اختر کھڑے ہو گئے اور انہوں نے انتہائی غصہ، نفرت اور
جذبات سے مغلوب ہو کر کہا۔ I will kill this mad man
اور اس کے ساتھ ہی وہ آپے سے باہر ہو گئے۔ وہ تو معراج محمد خان کے ساتھ مرنے مارنے پر تُل گئے
لیکن بعض دوستوں نے بیچ بچاؤ کرا دیا۔

بہر حال کانفرنس میں بڑے بھرپور اور موثر انداز میں ہر شخص نے اپنا اپنا نقطہ نظر پیش
کیا اور بالآخر قرارداد سب کے سامنے پیش ہوئی تاکہ اس پر رائے شماری ہو سکے۔ اکثریت کا
خیال تھا کہ الیکشن میں حصہ لینا چاہیئے۔

پارٹی کے چیئرمین ذوالفقار علی بھٹو نے پارلیمنٹری بورڈ برائے پنجاب و بہاولپور کا ۱۲ ار
جولائی کو اعلان کیا۔ جس کے کنوینر شیخ رشید تھے اور اس میں جن لوگوں کو شامل کیا گیا

تھا وہ میرے علاوہ ڈاکٹر مبشر حسن، محمد حنیف رامے، ملک معراج خالد، ملک اختر، شیخ صفدر علی، خورشید حسن میر، مختار رانا، شمیم احمد خان، یعقوب اعوان، بابو فیروز الدین انصاری چوہدری برکت اللہ، صاحبزادہ فاروق علی خان، راؤ عبدالستار، میاں مسعود احمد، میاں نذیر حسین برلاس، رانا محمد اقبال، فاضل رشیدی، چوہدری ممتاز احمد کاہلوں، عبدالستار خان نیازی، حبیب اللہ خان نیازی، بشیر الدین سالار، غلام سلمان، میاں محمد افضل وٹو، ملک محمد جعفر، میجر (ریٹائرڈ) عبدالنبی کالجفر، چوہدری محمد اسلم، ظفر عباس قریشی، عمر حیات سیال اور میاں اصغر یگانوالہ تھے۔

اسی طرح صوبہ سرحد کا پارلیمنٹری بورڈ مندرجہ ذیل احباب پر مشتمل تھا۔

حیات محمد خان شیرپاؤ (چیئرمین) محمد اسلم خان، عنایت علی، میاں صدرالدین، شوکت علی خان، نثار محمد خان، ارباب نور اکبر خان، سیف الرحمان کیانی، علی حسین قزلباش، مرزا دین خان کمال شاہ، ملک اکبر علی خان، میر اسلم خان، سردار حق نواز گنڈاپور، لیفٹیننٹ کرنل (ریٹائرڈ) عزیز اللہ خان علی زئی، شیر محمد خان، حاجی فضل غیور، مولوی محمد ولی، عبدالکریم خان اور عبدالصمد خان۔

چیئرمین کے اس اعلان کے ساتھ ہی سیاسی سرگرمیوں میں تیزی اور جوش و خروش آگیا۔ پارٹی کے کارکنوں میں الیکشن کے بارے میں جو گومگو کی کیفیت تھی وہ ختم ہو گئی بلکہ ان کی حیثیت اور اہمیت میں کئی اعتبار سے اضافہ ہو گیا اس کا اندازہ یوں بھی لگایا جا سکتا تھا کہ لاہور میں پیپلز پارٹی کے صدر دفتر کے باہر لمبی لمبی گاڑیوں کی طویل قطاریں لگنا شروع ہو گئیں۔ اس گاڑیوں پر صوبہ کے ہر بڑے شہر کی نمبر پلیٹ دیکھی جا سکتی تھی اور ان سے اترنے والے اخبارمیں عموماً یہی اعلان شائع کراتے تھے کہ وہ اپنے ہزاروں ساتھیوں سمیت پیپلز پارٹی میں شامل ہو گئے ہیں، وہ خود کو ٹوانہ، قریشی، نون، دولتانہ اور ٹمن کہہ کر تعارف کراتے تھے اور ہم سے یوں والہانہ انداز میں گلے ملتے تھے جیسے بہت عرصہ سے شناسائی ہو جبکہ ہم انکی شکلوں کو دیکھنے کے کبھی روادار ہی نہ ہوتے تھے۔ لہذا شناسائی کے عنوان سے وہ جو بھی بہتان باندھتے ہم اسے ازراہِ تکلف نظرانداز کر جاتے۔ اس ریل پیل میں ہمارے کارکن غائب یا اوجھل ہو

گئے ۔ وہ کہیں نظر نہ آئے ۔ نئی صورتوں کے اس ریلے میں پرانے چہرے کم کم ہی دکھائی دینے لگے ۔ دراصل ہوا یہ تھا کہ جب ان جاگیرداروں اور سرمایہ داروں نے صاف طور پر محسوس کیا کہ پیپلز پارٹی دن بدن عوام میں مقبولیت حاصل کرکے اپنی جڑیں گہری اور مضبوط کر رہی ہے اور انہوں نے بلاتاخیر اپنی گاڑیوں کی پٹرول کی ٹنکیاں فل کرائیں اور مقامی کارکنوں سے پارٹی کے دفتر کا ایڈریس لے کر لاہور کا رخ کر لیا ۔ ایک اور سبب یہ تھا کہ ان انتخابات میں حکومت وقت کا کوئی کردار یا حصہ نہ تھا کہ یحییٰ خان اپنی غیر جانبداری کا برملا اعلان کر چکا تھا ۔ اگر وہ ایسا نہ کرتا اور ان طرّہ اور شملہ والوں کو رتی بھر بھی یقین ہو جاتا کہ یحییٰ خان کی الیکشن میں کوئی دلچسپی یا مفاد ہے تو وہ یقیناً" لاہور کی بجائے راولپنڈی کا رخ کرتے اور وہ پیپلز پارٹی کے مقامی کارکنوں کو اسی طرح "کمی" اور "لمبی قلموں والے آوارہ" کہتے رہتے جیسا کہ وہ کہتے آ رہے تھے ۔

میرا تجزیہ اور خیال یہ ہے کہ اب اگر ۱۹۹۰ء میں الیکشن ہوں گے تو تب ماحول ۱۹۷۰ء سے مختلف ہوگا لہٰذا اگر پیپلز پارٹی وہی ۱۹۷۰ء والے نتائج یا ثمرات کی توقع رکھتی ہے تو یہ خام خیالی کے سوا کچھ نہیں میں مکرر اصرار کروں گا کہ ۱۹۷۰ء کے الیکشن میں جنرل یحییٰ خان کا کوئی سیاسی کردار نہیں تھا ۔ اور نہ ہی اس کے کسی قسم کے (بظاہر) سیاسی عزائم تھے کیونکہ سرعام وہ اپنی غیر جانبداری کا اعلان کرتا تھا ۔ جبکہ یہ دولتانے ، ٹوانے ، بھٹوئی ، تالپور ، اور نون سب سے پہلے تو حکومت وقت کی خوشنودی اور رضا کو مدنظر رکھتے ہیں یہ تو تھانیدار اور تحصیلدار کے اشاروں پر سیاست کرتے ہیں ۔ جب حکومت وقت الگ اور لاتعلق ہو جائے تو پھر ان کی دوسری ترجیح یا انتخاب "عوامی رجحان" ہوتا ہے یعنی وہ ہوا کا رخ دیکھتے ہیں اور یہ خبر لیتے ہیں کہ عوام کا زور کس جانب ہوگا ۔

منزل انہیں ملی

چنانچہ ۱۹۷۰ء میں جب انہوں نے دیکھا کہ حکومت وقت غیر جانبدار ہے اور عوام کا واضح جھکاؤ پیپلز پارٹی کی طرف ہے تو وہ جوق در جوق باہیں کھولے ہماری

طرف بڑھے وہ پارٹی کے دفتر میں آتے تو اپنے ہمراہ پارٹی کے ان غریب ورکرز کو بطور سفارش کے ہمراہ لاتے جن کو آج تک اس قسم کی کسی گاڑی کا دروازہ کھولنے کی توفیق نہیں ہوئی تھی بلکہ اُن میں کسی کے پاس نئی سائیکل بھی بمشکل ہی دکھائی دیتی تھی۔ یہ غریب ورکرز ان جاگیرداروں اور سرمایہ داروں کی لمبی لمبی گاڑیوں میں بیٹھ کر آتے ہوئے یقیناً یہ بھول گئے تھے کہ وقت آنے پر یہ گاڑیاں ان کو فٹ پاتھ پر اکیلا چھوڑ کر بغیر ہارن بجائے فراٹے بھرتی آگے نکل جائیں گی اور ان گاڑیوں کے مالک انہیں (ورکرز) کچل کر رکھ دیں گے۔ بہر حال جلد ہی یہ صورت حال واضح ہو گئی جب دن رات کام کرنے والے ورکرز ہاتھ ملتے رہ گئے اور ٹکٹ ان کے حصّے میں آ گئے جو ان غریب ورکرز کو "کافر" کہتے تھے۔

اگر کوئی بہت سر پھرا خود دار اور انا پرست ورکر اس سیاسی استحصال پر احتجاج کرتا تو اس کا بندوبست بھی ہو چکا تھا۔ بدقسمتی سے پارٹی کے اندر ان مفرور مردان کے بھرپور تعاون اور سرپرستی سے ایسا دانشور طبقہ پیدا ہو چکا تھا جو ایسے اعتراض اٹھانے اور بحث کرنے والوں کو یہ کہہ کر خاموش کرا دیتا کہ الیکشن تو سرمایہ کا کھیل ہے جس چوہدری یا ملک کو غریب ورکر کے مقابلے میں ٹکٹ دیا گیا ہے وہ پانچ چھ لاکھ روپیہ خرچ کر کے بھول جائے گا اسے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ اس کے پاس تین چار گاڑیاں اپنی ہیں اور وہ بوقت ضرورت کرایہ پر حاصل کرے گا یا اپنے کسی دوست سے مانگ لے گا اور پھر اس کی جیت دراصل پارٹی کی جیت ہی تو ہے۔ پھر اس پر ستم یہ بھی کہ اس (ورکر) سے کہا جاتا: دیکھ، چیئرمین (بھٹو) صاحب کے دل میں تمہاری بڑی عزت ہے خواہ مخواہ الٹی سیدھی باتیں کر کے اس سے کیوں محروم ہوتے ہو۔ آخر بات ان تک پہنچ تو جاتی ہے چپ رہو گے تو صاحب (بھٹو) خوش ہو کر تمہیں کہیں نہ کہیں کسی اور طریقے سے ایڈجسٹ کر دیں گے۔ غرض اس طرح:

منزل انہیں ملی جو شریک سفر نہ تھے

پنجاب پارلیمنٹری بورڈ کے مختلف اجلاس پانچ چھ دن تک میرے ہی گھر واقع ماڈل ٹاؤن میں ہوتے رہے، اس زمانے کے دیکھنے والے آج بھی گواہی دیں گے کہ میرے گھر کے باہر دونوں طرف تقریباً میل ڈیڑھ میل تک ہر طرح کی گاڑیوں کی قطاریں لگی رہتی تھیں اور ان

میں پنجاب کے ہر بڑے شہر کی نمبر پلیٹ دیکھی جا سکتی تھی۔ بورڈ کا باقاعدہ سرکاری اجلاس تو میرے ڈرائینگ روم میں جاری ہوتا البتہ اس کے دوستانہ اور غیر سرکاری اجلاس میری کوٹھی کے مختلف کمروں، برآمدوں، لان، صحن حتیٰ کہ کچن اور راہداریوں میں بھی ضرورت کے مطابق اور حسب سہولت جاری رہتے۔ لطف کی بات یہ ہے کہ مخالف گروپ ایک دوسرے کے سامنے بیٹھ کر آزادانہ لابنگ کرتے اور کمرے میں آنے جانے والوں کے توسط سے حسب موقع سفارش یا اعتراض داخل کرکے خوش ہوتے۔

ماڈل ٹاؤن ایک ایسا علاقہ ہے جہاں کوئی ایسا عوامی تندور بھی نہیں کہ دور دراز سے آنے والے کارکن روٹی ہی کھا سکیں۔ میں نے یہ محسوس کرتے ہوئے کہ یہ سارا میلہ میرے گھر ہے۔ اور میں ان کا میزبان ہوں لہٰذا اخلاقی طور پر میں تے ان لوگوں کے کھانے کا ذمہ بھی رضاکارانہ طور پر قبول کر لیا۔ کھانے کے دونوں وقت آلو گوشت کے سالن کی دیگ پکوائی جاتی اور میرے نوکر جا کر سینکڑوں کی تعداد میں روٹیاں اور نان لاتے۔ ادھر جو لوگ پارٹی کی طرف سے بورڈ کی کارروائی میں باقاعدہ شریک تھے ان کی میزبانی میں بہرحال پنجاب کے روایتی انداز میں (حسب توفیق) بھرپور انداز سے کر رہا تھا۔

غرض ایک عجیب ہنگامہ اور میلہ لگا تھا۔ میں اس سے یوں بھی لطف اندوز ہو رہا تھا کہ (ماسوائے ان چند لوگوں کے جنہیں میں پارٹی کے مخلص اور بے لوث کارکن جانتے ہوئے ٹکٹ دلانے میں دلچسپی رکھتا تھا) میرا کسی گروپ سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ یہ سب میرے مہمان تھے اور میں ذہنی طور پر بھی گروپ کی سیاست کا قائل نہیں ہوں۔ چنانچہ میں بورڈ کی میٹنگ کے دوران باہر آتا جاتا رہتا تھا۔ کبھی کسی کو چائے پوچھتا۔ کبھی کسی کو فون کی کال ملا کر دیتا۔ کبھی کسی کو شہر کا راستہ سمجھاتا۔ اور کبھی کسی کے ساتھ مخالف کے سامنے کوئی گواہی دے کر معاملہ صاف کراتا اور پھر مجھے اس معاملہ میں کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ فون نمبر ا کا مقابلہ فون نمبر ۲ کر رہا تھا۔ بورڈ کے باقی لوگ خود فیصلہ کر لیں گے۔

ٹکٹوں کی تقسیم کے وقت ایک دلچسپ بات یہ بھی دیکھنے میں آئی کہ بعض لوگوں کو جب ان کے آبائی شہروں سے ٹکٹ دیئے گئے تو انہوں نے اس سے گریز کرتے ہوئے درخواست کی کہ ان کو

کسی اور شہر سے ٹکٹ دیا جائے ۔ مثال کے طور پر مولانا کوثر نیازی کو جب ان کے آبائی شہر میانوالی سے ٹکٹ دیا جانے لگا تو انہوں نے انکار کر دیا اور کہا میانوالی کے سوا پاکستان بھر میں کسی اور شہر سے ٹکٹ دے دو ۔ اس کا سبب تو وہ خود ہی جانتے ہوں گے ۔ بہرحال انہیں پسرور سے ٹکٹ دیا گیا اور شنید ہے کہ جب وہ جیت گئے تو شکر گڑھ کی ایک معمر خاتون نے کہا: ہائے میں نے بھٹو نوں ووٹ دتا تے ایہہ ٹٹ پیناں مولوی کینویں جت گیا" (میں نے تو بھٹو کو ووٹ دیا تھا یہ مولوی کم بخت کہاں سے جیت گیا) ۔

اس کے مقابلے میں جب مجھے قصور کی بجائے لاہور سے ٹکٹ دیا جانے لگا تو میں نے مزاحمت کرتے ہوئے کہا: "اگر میں نے الیکشن لڑا تو میں قصور اور صرف قصور سے لڑوں گا کیونکہ ایک تو میں نے وہاں پارٹی کی بنیاد رکھنے سے آج تک بحیثیت ورکر کام کیا ہے اور یہ میرا حق ہے ۔ دوسرا یوں کہ قصور میرا آبائی شہر ہے جہاں میرے آباؤ اجداد کی قبریں موجود ہیں جن سے نسبت پر مجھے کوئی احساس کمتری یا خوف نہیں ۔ میں عوام میں جانے سے کبھی بھی کسی وجہ سے ہچکچاہٹ محسوس نہیں کرتا ۔ اگرچہ اس مسئلہ پر کچھ تعطل بھی پیدا ہوا مگر فیصلہ بہرحال میرے حق میں ہوا اور قصور سے مجھے ہی ٹکٹ ملا ۔

بھٹو بے نقاب ہوئے

۸ر اگست کو بھٹو کو میں نے قصور آنے کی دعوت دی ۔ ظاہر ہے کہ اس موقع پر ایک جلسہ بھی ہوا جو نہایت کامیاب رہا ۔ نہ صرف قصور بلکہ اس کے گرد و نواح سے عوام کی ایک بڑی تعداد نے اس میں شرکت کی ۔ مقامی کارکنوں میں خاص طور پر منیر بلوچ ، عنایت بلوچ ، شیر محمد کھوکھر ، یونس بالوط ایڈووکیٹ ، شیخ باسط جہانگیر ، حافظ نور محمد ، شیخ اعجاز احمد ایڈووکیٹ ، نیامت علی ، عبدالقیوم انصاری ، منظور ریگانوالہ ، سردار قیصر علی خان ، ظہور حسین نمبردار ، محبوب بھچلیرا نے بلاشبہ دن رات کام کیا ۔ جلسہ کی تنظیم میں میرے برادران شیر علی خان ایڈووکیٹ اور خضر حیات نے بے حد تعاون کیا ۔ اس جلسہ میں جس طبقہ کی طرف سے ہمیں بے لوث اور ہمہ وقت تعاون ملا وہ ان مزارعین کی طرف سے تھا جنہیں تابع مرضی کہا جاتا ہے ۔ یہ مغلوں کے عہد سے ہی مزارعین چلے

آ رہے ہیں اور حکومت ان کی اراضی کے معاملہ میں ایک فیصد (ٹائیٹل کی حد تک) مالک ہے باقی تقریباً یہی لوگ مالک ہیں۔ نسل در نسل یہ حقوق مزارعین ہی میں چلے آ رہے ہیں۔

یہ وہ دور تھا جب قصور کا خوبصورت، زرخیز اور شاداب علاقہ فوجیوں کی نظروں میں آ چکا تھا اور وہ یہاں اپنی اپنی بساط کے مطابق زمین الاٹ کرانے میں ایک دوسرے پر بازی لے جا رہے تھے۔ انہوں نے ایک طرح سے قصور کو اپنی شکارگاہ بنا لیا تھا۔ جنرل گل حسن، جنرل یحییٰ خان، جنرل حمید خان، جنرل خداداد سمیت کئی معروف وغیر معروف جرنیلوں اور بریگیڈیئروں نے قصور کی ان زمینوں کو لوٹ کا مال سمجھ کر اس پر یلغار کر رکھی تھی۔ ان جرنیلوں میں سب سے پیش پیش جنرل خداداد تھا۔ اور ان لوگوں کی ہوس یا بھیڑ چال کا یہ حال تھا کہ لیفٹیننٹ جنرل اظہر نے تو ایک دوسہرہ گراؤنڈ سپورٹس گراؤنڈ جو قصور کی واحد سپورٹس گراؤنڈ بھی تھی بطور زرعی اراضی الاٹ کرالی خود وہ ان دنوں صوبہ سرحد کے گورنر بھی تھے۔

یہ تمام زمینیں ان تابع مرضی مزارعین کی ہی تھیں جو اس صورت حال سے ظاہر ہے کہ نہایت بری طرح متاثر ہو رہے تھے۔ ان کو محروم کر کے فوجی افسران کو نوازنے کا سلسلہ جاری تھا۔ یہ لوگ پیپلز پارٹی کے ساتھ بھرپور تعاون کر رہے تھے اور سچی بات تو یہ ہے کہ ان کے تعاون اور حوصلہ افزائی سے پارٹی کو علاقہ میں اپنی جڑیں پکڑنے میں بڑی مدد ملی تھی۔ چنانچہ میں نے ان لوگوں کی اہمیت، اثر و رسوخ اور جذبات کے پیش نظر وعدہ کیا کہ پارٹی کے پلیٹ فارم سے ان کی حمایت میں ضرور آواز بلند کی جائے گی۔

یہ جلسہ قصور کے بس سٹینڈ پر منعقد ہو رہا تھا اور جلسہ گاہ سے کئی فرلانگ پہلے ہی جھنڈیوں سے مزین استقبالیہ دروازے نصب تھے۔ راستے کو بڑی خوبصورتی سے سجایا گیا تھا اور لطف کی بات ہے کہ اس سلسلہ میں بھی ان تابع مرضی مزارعین نے عملی طور پر بڑا تعاون کیا تھا۔ لاہور سے بھٹو کے ہمراہ پارٹی کے بعض چیدہ چیدہ لیڈر آ رہے تھے۔ جن میں چوہدری فضل الٰہی مصطفےٰ کھر معراج خالد، حنیف رامے، ڈاکٹر مبشر حسن اور میاں محمود علی قصوری قابل ذکر ہیں۔ میاں عطاء اللہ بھی یہیں سے شامل ہوئے اور پھر پنجاب کے سارے دورہ میں ہمارے ساتھ رہے۔ کیونکہ ٹکٹ کے حصول کے لئے جس وفاداری کی ضرورت ہوتی ہے یہ اس کے اظہار کا اچھا موقع تھا۔ پروگرام

کے مطابق یہ لوگ صبح ہی آگئے تھے اور طے یہ پایا تھا کہ سب لوگ میرے گھر قیام کریں گے اور آرام کرنے کے بعد دوپہر کا کھانا ہوگا۔ اس کے بعد بھٹو صاحب علاقہ کے عوامی وفود سے مل کر ان کے مسائل معلوم کریں گے اور تبادلہ خیال کریں گے جبکہ بعد ازاں شام کی چائے کے بعد ہم لوگ جلسہ گاہ پہنچیں گے۔

جب یہ لوگ یعنی بھٹو صاحب اور ان کے ساتھی لاہور سے میری آبائی حویلی میں آئے تو دیکھتے ہی دیکھتے ساری حویلی کے کمرے "مہمان خانہ" میں تبدیل ہو گئے۔ تھکے ہارے لوگوں کو جہاں جگہ میسر آئی وہ وہیں لیٹ گئے۔ میں ایک ایک کمرے میں جا کر مہمانوں کی خاطر تواضع کر رہا تھا۔ ان کے آرام کے لئے ہدایات دے رہا تھا لیکن اس کے باوجود میں نے دیکھا کہ مہمانوں کی تعداد اس قدر زیادہ ہے کہ اس کے لئے میری حویلی کے چودہ پندرہ بیڈ روم بالکل ناکافی ہیں جبکہ ہر بیڈ روم میں پہلے ہی گنجائش سے زیادہ مہمان تھے۔ جسے صوفہ پر جگہ ملی اس نے بیڈ کی تلاش چھوڑ دی اور جسے سر کے نیچے رکھنے کو کشن ہاتھ لگ گئے اس نے تکیہ کا مطالبہ نہیں کیا۔ اسی دوپہر میں نے دیکھا کہ میری حویلی کے ایک کمرے میں (اس وقت) مستقبل کے صدر پاکستان فضل الٰہی چودھری ڈرائنگ روم کے قالین پر اپنے سر کے نیچے بازوؤں کا تکیہ بنائے آنکھیں موندھے قیلولہ فرما رہے تھے۔ اس وقت کسی کو گمان ہی نہیں تھا کہ آنے والے دنوں میں یہ "فرش نشین" ملک کی زمام اقتدار سنبھال لیں گے لیکن پھر ان کے دلوں میں محبت اور یگانگت رخصت ہو جائے گی۔

میں نے بھٹو صاحب سے ملاقات کے لئے آنے والے وفود کی فہرست تیار کر لی تھی اور ان تمام کو باری باری بلایا جا رہا تھا۔ بھٹو صاحب کو ہر وفد کے بارے میں پہلے ہی سے میں نے بریفنگ دے دی تھی تاکہ ان کو کسی قسم کی دشواری یا الجھن نہ ہو اور وہ ان کی باتوں کو اچھی طرح سمجھ جائیں۔ سب سے پہلا وفد ان تابع مرضی مزارعین ہی کا تھا۔ جس کی قیادت حبیب اللہ خان اور منظور یگانہ والہ کر رہے تھے۔ میں نے احتیاطاً بر موقع بھی مختصر طور پر سارے معاملہ کو از سر نو بیان کر دیا کہ ان لوگوں کی زمین ناجائز طور پر فوجی افسران کو دی جا رہی ہے لہٰذا آپ ان غریبوں کے حق میں آواز بلند کریں۔

وفد کے تمام لوگ بڑی محبت اور امید کے ساتھ چمکتی آنکھوں اور مسکراتے چہروں کے

ساتھ بھٹو کو دیکھ رہے تھے ان کا خیال تھا کہ انکی مصیبت سنتے ہی بھٹو ایک دم آتش فشاں کی طرح پھٹ پڑے گا۔ اور ان کے لئے واشگاف طور پر حمایت کا نعرہ بلند کرے گا لیکن اس وقت وہ یکدم جیسے آسمان سے زمین پر آن گرے جب بھٹو صاحب نے میری بات سنتے ہی بغیر کچھ سوچے اور سمجھے بڑی ہی کرخت آواز میں مجھے کہا :

"کیا تم یہ چاہتے ہو کہ میں اپنے ہاتھ کٹوا دوں - میں فوج سے ٹکر لوں"۔ میں خود یہ سنکر ششدر رہ گیا اور میں پھر قدرے اصرار کرتے ہوئے کہا : "جناب یہ تو ان غریبوں کے حق کا مسئلہ ہے ۔ اور پھر ان لوگوں نے ہمارے لئے بڑا کام کیا ہے یہ ہمارے قابل اعتماد لوگ ہیں بجائے اس کے کہ میانوالی، چکوال، کہوٹہ اور گوجر خان سے فوجی آکر ان کی زمینوں پر قبضہ کریں کیا یہ بہتر نہیں کہ یہ ہی لوگ جو کئی سو سال سے ان زمینوں کے ایک طرح سے مالک ہیں، ان کے حق کو ہی تسلیم کر لیا جائے ۔ ابھی میں بول ہی رہا تھا کہ بھٹو نے پہلو بدلا اور مجھے ہاتھ کے اشارے سے روکتے ہوئے کہا ۔

Raza please next delegation.

میں نے ان مزارعین کو اُٹھنے کا اشارہ کیا ۔ وہ لوگ اٹھ تو گئے لیکن بڑی مشکل اور مایوسی کے ساتھ ۔ یوں لگتا تھا جیسے وہ کوئی بہت بڑا جوا ہار گئے ہیں ۔ وہ ٹھنڈی آہیں بھرتے اور اپنے چہرے پر پسینے کے قطروں کو صاف کرتے ہوئے کمرے سے باہر نکلے تو میں نے ایک بار پھر کہا :

جناب ! آج کے جلسہ میں ان لوگوں کا بڑا حصہ ہے اور وہ اس جلسہ میں یہی مطالبہ کریں گے، اور پھر عوام کو بھی ان کے مطالبہ کی حمایت سے خوشی ہو گی ۔ مگر بھٹو صاحب نے جیسے اس بات کا کوئی اثر ہی نہ لیا ۔ بس اپنے سگار کا ہلکا سا کش لے کر بولے :

You want me to confront Army on this question and burn my fing ser

شام کو جلسہ شروع ہوا ، سب سے پہلے اسلم گردا سپوری نے اپنی نظم پڑھی "خطرہ میں اسلام نہیں"۔ اس کے بعد حسب معمول تقاریر کا سلسلہ شروع ہو گیا ۔ میری تقریر ظاہر ہے کہ میرا شہر ہونے کے حوالے سے سب سے اہم اور نمایاں تھی ۔ اور مجھے یہ بھی علم تھا کہ لوگ مجھ سے کیا سننے کی توقع رکھتے ہیں ۔ میں نے اپنی تقریر میں تابع مرضی مزارعین کی حمایت میں آواز بلند

کرتے ہوئے کہا: یحییٰ خان، مجھے بتاؤ کہ یہ غریب مزارعے، شہاب دین، مہتاب دین اور سراج دین۔ کیا اس ملک کے شہری نہیں ہیں۔ کیا ان کے آباؤ اجداد نے صدیوں سے اس دھرتی کا سینہ چیر کر لوگوں کو اناج فراہم نہیں کیا۔ اور کیا اب یہ انڈیا کے جاسوس اور ایجنٹ ہو گئے ہیں کہ ان کی زمین چھین کر فوجیوں کو دی جا رہی ہیں۔ اس کے ساتھ ہی جلسہ میں نعروں کا تالیوں کا شور اٹھا۔ سامعین کو بخوبی احساس تھا کہ اب میری تقریر میں تندی اور تلخی بڑھے گی اور میں نے جس طریقے سے یحییٰ خان کو للکارا تھا وہ ان کے دلی جذبات کا آئینہ دار تھا۔ اچانک میں نے محسوس کیا کہ کوئی پیچھے سے میرا بُش شرٹ کھینچ رہا ہے۔ میں نے کوئی پروا نہ کی اور نعرے لگانے والوں کو ہاتھ کے اشارے سے خاموش ہونے کو کہا۔ ابھی کچھ کہنے ہی والا تھا کہ ایک بار پھر کسی نے میرا بش شرٹ کھینچا۔ اب کی بار میں نے پلٹ کر دیکھا تو بھٹو کا ہاتھ بدستور میرے بُش شرٹ پر تھا اور ان کا چہرہ غیر معمولی طور پر سرخ ہو کر تمتما رہا تھا۔ مجھے اپنی طرف متوجہ پا کر وہ جلدی جلدی صرف اتنا کہہ سکے۔ بس کرو۔ بس کرو۔!

ان کے یہ الفاظ سٹیج پر موجود کئی لوگوں نے خود سُنے اور ممکن ہے کہ مائیک کے ذریعے جلسہ گاہ میں دور تک سنے بھی گئے ہوں لیکن اس وقت ایسا شور اور ہنگامہ تھا کہ کسی نے اس پر توجہ نہ دی کیونکہ یہ توقع ہی نہیں تھی کہ یہ الفاظ غریبوں کی مسیحائی کے دعویدار بھٹو کے ہوں گے۔

میں چونکہ اپنا مدعا اور نقطہ نظر بیان کر چکا تھا لہٰذا میں نے بڑی صفائی کے ساتھ موضوع بدلا، اور تقریر مختصر کر کے مائیک سے ہٹ گیا۔

بھٹو نے اپنی تقریر میں حسب عادت گول مول باتیں کیں اور غیر ضروری تفصیلات کے ساتھ ساتھ مخالفین کی نقلیں اتار اتار کر لوگوں سے تالیوں کی داد ضرور حاصل کی لیکن حقیقت یہ ہے کہ وہ لوگوں کو متاثر نہ کر سکے۔ میں نے خود محسوس کیا کہ جلسہ کے بعد بھٹو قصور کے عوام کی آنکھوں میں تو سما گیا مگر وہ ان آنکھوں کے راستے ان کے دلوں تک پہنچنے میں کامیاب نہیں ہو سکا۔

جلسہ گاہ سے سب لوگ ایک بار پھر واپس میرے گھر آئے تا کہ چائے پی کر اور تازہ

دم ہو کر لاہور واپس ہوں، چائے پیتے ہوئے بھٹو صاحب نے مجھے کہا تم نے کیا کیا؟
میں نے تسلی سے جواب دیا: جناب ان لوگوں نے ہمارا بڑا ساتھ دیا ہے یہ استحصال کے مارے ہوئے لوگ ہیں اور ہمارا تو غریب مزارعوں کے ساتھ یہی وعدہ ہے کہ ہم ان کا ساتھ دیں گے۔ یہ لوگ اتنے بااثر ہیں کہ ان کے تعاون اور مدد کے بغیر قصور میں ہم سیاسی طور پر کامیاب نہیں ہو سکتے۔

وہ بولے: اوہو۔ یار، میں یہ سب کچھ ایفورڈ نہیں کر سکتا۔
اس پر میں نے کہا: جناب! جو کچھ بھی کہا، وہ میں نے کہا ہے۔ آپ نے تو کچھ نہیں کہا: اور میں نے جو کہا ہے میں اس سے کبھی انکار نہیں کروں گا۔ کیونکہ میں نے خوب سوچ سمجھ کر یہ سب کچھ کہا ہے۔
تب انہوں نے کہا: یہ تو تم کہہ رہے ہو ناں۔ یحییٰ خان بھلا کب جانے گا۔ جب اس تک رپورٹ پہنچے گی تو وہ یہی کہے گا کہ بھٹو نے یہ بات خود نہیں کی بلکہ قصوری سے کہلوائی ہے۔

Raza, you are in the inner circle of P.P.P. Yahya Khan would presume that I have prompted you to speak on this sensitive subject and deliberately avoided myself to comment on this issue.

غریب کسانوں اور محنت کشوں کے قائد بھٹو صاحب نے جو کچھ کہا تھا وہ میری توقع سے بالکل برعکس اور میرے قیاس کی حد سے باہر تھا لہٰذا میں نے خاموش ہونا ہی مناسب سمجھا دوسرے جتنے ساتھی موجود تھے وہ بھی چُپ رہے اس وقت جو ایک گہری خاموشی چند ساعتوں کے لئے ہم سب کے درمیان چھائی رہی وہ آنے والے دنوں کے ایک طوفان کی خبر ضرور دے رہی تھی لیکن معلوم نہیں میرے سوا اور کسی نے اس کا احساس کیا یا نہیں؟

اس جلسہ کی کامیابی کا اندازہ اس امر سے لگایا جا سکتا ہے کہ اس کے بعد پیپلز پارٹی سیاسی طور پر ایک مستحکم سیاسی قوت کے روپ میں علاقہ میں ابھر کر سامنے آئی حتیٰ کہ ۱۲ اگست ۱۹۷۰ء کو نوائے وقت میں شائع ہونے والے ایک سیاسی مکتوب میں کہا گیا:

"پاکستان پیپلز پارٹی کے ۸ اگست کے جلسہ نے قصور کے سیاسی حلقوں میں تہلکہ مچا دیا پارٹی کی بنیادیں قصور شہر اور نواحی علاقوں میں مضبوط کرتے ہیں صاحبزادہ احمد رضا خان قصوری انتھک جدوجہد کر رہے ہیں یہ باعزم اور باحوصلہ نوجوان جو قصور کے ایک جاگیردار امیر گھرانے کا چشم و چراغ ہے۔ اپنی خاندانی روایات کو لات مار کر مسٹر بھٹو کا دست راست بنا ہوا ہے۔ اس نے معاہدہ تاشقند کے خلاف آواز بلند کی اور ۱۹۶۷ء میں بھٹو سمیت جن ۱۲ افراد کو ڈی پی آر کے تحت گرفتار کیا گیا ان میں احمد رضا قصوری بھی شامل تھا۔ اس کی جدوجہد سے قصور اور نواحی علاقوں میں پیپلز پارٹی کی شاخیں جگہ جگہ قائم ہو چکی ہیں یہ نوجوان صبح لاہور میں وکالت کرتا ہے یا لاہور پیپلز پارٹی کے اعلیٰ عہدیداروں کے ساتھ سیاسی گتھیاں سلجھاتا ہے اور پچھلے پہر شہر قصور کے کسی نہ کسی محلہ میں یا کسی نواحی گاؤں میں عوام کو پیپلز پارٹی کا پیغام دے رہا ہوتا ہے۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ اس (قصوری) میں عام انسانوں کی روح کی بجائے ایک بجلی دوڑ رہی ہے اور یہ صاحب جنوں ہے جو دیوانہ وار اپنی منزل کی طرف بڑھتا جا رہا ہے۔"

برج الٹ گئے

ٹکٹ تقسیم ہو گئے اور پھر انتخابی مہم کا سلسلہ چل نکلا۔ اس دوران میں مجھے حنیف رامے کی معرفت چیئرمین بھٹو کی طرف سے ہدایت کی گئی کہ میں پنجاب، سرحد، سندھ اور بلوچستان میں پارٹی کے مقرر کے طور پر جلسہ کروں۔ یہاں یہ بات دلچسپی سے خالی نہ ہو گی کہ رامے صاحب نے مجھے اس سلسلہ میں جو خط لکھا اس میں یہ بھی کہا گیا تھا کہ چونکہ جناب بھٹو انتخابی مہم کے جلسوں کے لئے ہر جگہ دستیاب اور موجود نہیں ہو سکتے لہٰذا آپ ان کی جگہ عوامی جلسوں سے خطاب کریں کیونکہ آپ ایک مقبول اور پسندیدہ مقرر ہیں اور آپ کی موجودگی

سے پارٹی کے جلسے کامیاب ہوں گے۔ میں نے اس پر لبیک کہا اور پورے جوش و خروش سے اپنے چیئرمین کی ہدایت پر عمل درآمد شروع کر دیا۔

میں اپنی دھن میں ایسا مصروف ہوا کہ اپنا حلقہ انتخاب چھوڑ کر بلکہ بھول کر ملک بھر کے انتخابی جلسوں میں شریک ہوتا رہا۔ ایک ایک دن میں کئی کئی جلسوں سے خطاب کرتا رات کو سفر کرتا اور ذہن میں صرف اور صرف یہی ایک خیال تھا کہ پیپلز پارٹی کی فتح - ہر جگہ فتح - ہر قیمت پر فتح - !!

بالآخر جب الیکشن میں صرف ۲۰، ۲۵، دن باقی رہ گئے تو مجھے میرے کارکنوں نے پیغام بھجوایا: جناب سارے جت جان گے تے اسی ہار جانواں گے (جناب سب جیت جائیں گے البتہ ہم خود ہار جائیں گے) میں ان کا مطلب سمجھ گیا، مجھے خود بھی احساس ہوا کہ میں دوسروں کے لئے اتنا کام کر رہا ہوں اتنی کنویسنگ کر رہا ہوں مگر آج تک خود اپنے حلقہ میں نہیں گیا. ظاہر ہے اگر میں خود اپنا کام نہیں کروں گا تو آسمان سے فرشتے تو اتر کر میری جگہ جلسے نہیں کریں گے۔

میں نے آخر اپنے حلقہ میں واپس جا کر کام کرنے کا فیصلہ کر لیا اور سوچتا ہوں اب اس کو کیا نام دیا جائے. حالات کی ستم ظریفی، یا تقدیر کا کھیل - کہ میں نے اپنے حلقہ میں آخری پچیس دنوں میں کام اور اس دوران میں سندھ اور سرحد تو کجا اور پنجاب کے سرگودھا جہلم سے تو دور کی بات رہی، خود لاہور سے کسی شیخ رشید یا حنیف رامے نے آکر میری اخلاقی مدد کرنے یا دوستانہ تعاون کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کی بلکہ کسی نے پوچھا تک نہیں کہ میں کس حال میں ہوں۔ چنانچہ میں جو ملک بھر میں پارٹی کے لئے دن رات کام کر رہا تھا، قصور میں تن تنہا اپنی سیاسی زندگی و موت کا معرکہ لڑتا رہا۔ بلکہ بعض "مہربانوں" نے تو یہاں تک کیا کہ میرے حلقہ انتخاب کے لوگوں سے کہا: احمد رضا قصوری کو تو صرف اس لئے ٹکٹ دیا گیا ہے کہ پارٹی کے لئے اس کی خدمات کی وجہ سے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا تھا ورنہ دل سے بھٹو صاحب اور پارٹی اس کو پسند نہیں کرتے۔ بھٹو اور پارٹی کا اصل بندہ تو میاں عارف افتخار ہے۔ میاں عارف افتخار لاہور سے ایوب خان کی اسمبلی کے رکن بھی رہ چکے تھے۔ اور اب وہ میرے مقابلے میں امیدوار تھے دوسرے امیدوار میاں جمیل شرقپوری تھے۔

جب مجھے اس بات کا علم ہوا کہ میری پارٹی میں موجود میرے اپنے ساتھی ہی برادران یوسف کا کردار ادا کر رہے ہیں تو میں نے اپنے طریقہ کار پر سنجیدگی اور حقیقت پسندی کے ساتھ غور کیا، میں نے صورت حال کا جائزہ بھرپور انداز میں لیا۔ اور بالکل اس نتیجہ پر پہنچا کہ میرے اصل حریف میاں جمیل شر قپوری ہیں جن کی انتخابی مہم کا مرکزی نقطہ "مذہب" تھا اور ان کا مذہبی لبادہ ہی ان کی سب سے بڑی اور موثر قوت تھی۔ وہ اپنی تقریروں میں ہر بات پر مذہب کو درمیان میں لے آتے تھے اور ان کی امداد کے لئے پنجاب بھر کے ممتاز علماء کرام اور سجادہ نشین آئے دن قصور پہنچ رہے تھے۔ مجھے جلد ہی احساس ہو گیا اور میں نے فیصلہ بھی کر لیا کہ اب یہ جنگ مجھے اکیلے ہی لڑنا ہو گی۔ بابا بلھے شاہ سے ہمارے خاندان بھر کو ایک خاص عقیدت ہے اور بلھے شاہ کو صوفیائے کرام میں اپنی دانشورانہ طرز احساس کے اعتبار سے بڑا منفرد مقام حاصل ہے۔ میں نے ان کے فلسفہ کو خوب پڑھا اور کھنگالا ہے۔ اور مجھے اس سے بڑی روشنی میسر آئی ہے۔ بلکہ سیاسی حلقوں میں تو مجھے "بابا بلھے شاہ کا ملنگ" بھی کہا جاتا ہے۔

میں اس نتیجہ پر پہنچا کہ اب معروضی حالات ایسے ہو رہے ہیں کہ ان میں پیپلز پارٹی کا منشور وغیرہ نہیں چلے گا کیونکہ یہاں تو الیکشن کا موڈ اور رخ ہی تبدیل ہو گیا ہے۔ مجھے ایک مذہبی شخصیت کا سامنا کرنا پڑ رہا تھا چنانچہ میں نے ایک خاص سٹائل اختیار کیا۔ میں صبح سحری کے بعد ہی نواحی دیہات کی طرف نکل جاتا سارے دن میں کم از کم چھ سات جگہ لوگوں سے خطاب کرتا۔ وہاں جا کر بھی میں کسی ایک خاص شخص نمبردار یا جاگیردار کے گھر نہیں جاتا تھا بلکہ عموماً چوپال یا کسی مرکزی جگہ (جو ہر گاؤں میں بہر حال موجود ہوتی ہے) پر چلا جاتا عوام سے ملتا اور پھر آگے بڑھ جاتا۔ میرا دن میں دیہات کا دورہ کرنے کا مقصد یہ بھی ہوتا تھا کہ رات کے وقت دیہات میں روشنی اور لاؤڈ اسپیکر وغیرہ کے انتظامات کرنا بہت زیادہ مشکل ہو جاتا ہے۔ اور پھر سفر میں بھی دشواری رہتی۔ رات کے وقت البتہ میں شہر کے کسی حصہ میں جلسہ سے خطاب کرتا۔

میں جلسہ شروع ہونے کے بعد تقریباً اس وقت آتا تھا جب مقررین خطاب کر رہے ہوتے میں سفید رنگ کے ایک خوبصورت گھوڑے پر سوار ہو کر جلسہ گاہ میں داخل ہوتا۔ میں نے

شلوار قمیص زیب تن کر کے عموماً سبز عمامہ بھی باندھا ہوتا جو کہ مجھے بلھے شاہ کے مزار پر دستار بندی کے موقع پر عطا ہوا تھا اور ایک اچھے خاصے جلوس کی شکل میں میں جلسہ گاہ تک پہنچتا۔ یہ جلسے عموماً نماز عشاء کے بعد ہوا کرتے تھے۔ میرے جلوس میں آگے آگے پندرہ بیس ملنگ فضا میں والہانہ انداز میں اپنے ڈنڈے لہراتے اور حق قلندر، حق قلندر کی روح پرور تال پر دھمال ڈالتے جاتے تھے۔ چند نوجوان بڑی عقیدت اور سنجیدگی سے مجھ پر کیوڑہ اور گلاب کا عطر چھڑکتے جاتے تھے۔ اور جب میں جلسہ گاہ میں نمودار ہوتا تو جو مقرر اظہار خیال کر رہا ہوتا وہ اپنی تقریر فوراً سمیٹ لیتا، نعروں اور تالیوں کا پرجوش شور ہوتا اور اسی میں جلسہ گاہ میں پہلے سے موجود بلھے شاہ کے قوال طبلہ کی تھاپ پر یکدم بابا بلھے شاہ کے کلام کی یہ قوالی شروع کر دیتے

ساڈا پیا گھر آیا۔ سانوں اللہ ملایا

ہُن آپے کردگا نہال نی۔ ساڈا پیا گھر آیا

نی میں شکر ونڈاں۔۔۔۔۔۔۔۔

اور جب تک عوام میں سے گذرتا ہوا اسٹیج پر نہ پہنچ جاتا۔ یہ قوالی جاری رہتی اور میرے ساتھ آتے ہوئے ملنگ بھی اپنی دھمال جاری رکھتے۔ وہ ایک انتہائی جذباتی، عقیدت مندانہ، اور کیف و مستی میں ڈوبا ہوا منظر ہوتا تھا۔ ایسے میں میں سٹیج پر پہنچ کر مائیکروفون پر آتا اور پنجابی زبان میں عوام سے مخاطب ہوتا۔ میں ہر بات پر بابا بلھے شاہ کے اشعار و افکار کا سہارا لیتا تھا اور اس عظیم صوفی کو ہی بطور حوالہ پیش کرتا تھا۔ مثال کے طور پر میں نے ایک بار کہا: یہ روٹی کپڑے مکان کا نعرہ پیپلز پارٹی نے اب کوئی نیا نعرہ نہیں دیا۔ بابا بلھے شاہ نے اڑھائی سو سال پہلے کہا تھا:

منگ اوئے بندیا اللہ کولوں

جُلی، گُلی، کُلی۔۔۔۔۔

اس وقت بھی اس مست ملنگ کا ساتھ پنجاب کے غریب کسانوں اور غریب عوام نے دیا تھا۔ پنجاب کے ستم زدہ لوگوں اور طبقوں نے بلھے شاہ کو اپنا بزرگ تسلیم کر لیا۔ تاریخ گواہ ہے کہ اس زمانے کے جاگیرداروں نے بھی بلھے شاہ کے پیچھے اس زمانے کے مولوی لگا دیئے تھے۔ جنہوں

نے بابا بلھے شاہ پر کافر ہونے کے فتوے لگائے۔ کیونکہ بلھے شاہ تو جاگیرداری نظام کو ختم کرنا چاہتا تھا۔ تب بلھے شاہ نے ایسے مولویوں کو مخاطب کر کے کہا:

بلھیا، تینوں کافر، کافر آکھدے
تو آہو، آہو، آکھ۔!!

میرے مخالف امیدوار میاں جمیل شرقپوری، ممتاز عالم دین محدث اور صوفی، مولانا شیر محمد (شرقپور والے) کے بھتیجے ہوتے ہیں، اور اس رشتہ اور نسبت کو ان کے حامیوں نے انتخابی مہم میں خوب کرانا شروع کر دیا۔ اس لئے جواب میں میں نے اسلام کا خالص نظریہ پیش کرتے ہوئے کہا کہ اسلام میں خونی رشتوں کی بجائے تقویٰ اور پرہیزگاری کا زیادہ احترام ہے۔ یہی وجہ ہے کہ رسول عربی کا چچا ابوجہل ہونا کوئی فضیلت نہیں مگر رسول عربی کا خادم بلال حبشی ہونا وجہ بزرگی ہے اور ایسی بزرگی کہ اگر بلال اذان نہ دیں تو صبح سورج طلوع نہیں ہوتا۔

اسی طرح میاں جمیل شرقپوری کے ایک انتخابی پوسٹر پر لکھا ہوا تھا۔

نہ آن کی خاطر، نہ شان کی خاطر
ہم تو اتر آئے ہیں میدان میں اسلام کی خاطر

میں نے اس کا یوں جواب دیا کہ الیکشن تو سارے ملک میں ہو رہا ہے۔ اگر اسلام کو خطرہ ہے تو ہر جگہ ہے لہذا ان کو چاہیئے کہ پہلے یہ شرقپور جا کر خویشوں کا اسلام بچائیں پھر قصور اگر دو شوں کا اسلام بچائیں۔ مگر یہ صرف قصور میں کیوں اتر آئے ہیں۔ اصل بات تو یوں ہے کہ

نہ آن کی خاطر، نہ شان کی خاطر
ہم تو اتر آئے ہیں حلوہ نان کی خاطر

پھر جو لوگ اسلام اور دین کی خدمت کرنا چاہتے ہیں انہیں الیکشن اور اسمبلیوں کی ضرورت اور محتاجی نہیں ہوتی۔ اس خطہ میں جن صوفیاء نے اسلام کی شمع روشن کی اور جن سے محروم لوگوں نے فیض حاصل کیا وہ بادشاہوں کے مصاحب یا ایم این اے نہیں تھے۔ وہ تو خود شہر چھوڑ کر جنگلوں میں ڈیرہ لگا لیتے تھے اور پھر خود شہر ان کے ارد گرد آباد ہوتے

تھے۔ بابا فرید الدین گنج شکر کو دیکھ لیں۔ آپ جنگل میں آکر بیٹھ گئے اور جس دریا کے کنارے آپ نے پڑاؤ ڈالا اس کو آج پاکپتن کہا جاتا ہے۔ بابا فرید کے بارے میں بہت کم لوگوں کو معلوم ہوگا کہ آپ سلطان بلبن والئی ہند کے داماد تھے چاہتے تو دربار و سرکار میں کیا حاصل نہ کر سکتے تھے لیکن آپ نے اپنا راستہ اختیار کئے رکھا۔ جب سلطان بلبن کی بیٹی بیاہ کر آئی تو اس کے ہمراہ صرف اڑھائی سو تو لونڈیاں تھیں لیکن وہ واپس گئی تو اس نے جا کر اپنے بادشاہ باپ سے کہا: جو لطف اور سرور میں نے فقیر کی کٹیا میں پایا وہ مجھے آپ کے محلوں میں کہیں نظر نہیں آیا: آپ اپنا سب مال و زر اور لونڈیاں رکھیں، میں بوریہ نشینی میں ہی خوش رہوں گی۔ لہذا اسلام کی خاطر اترنے والے بادشاہوں کے درباروں اور اسمبلیوں میں نہیں اترے تھے۔ وہ جاگیرداروں کے ڈیروں میں نہیں اترے تھے جبکہ وہ تو جنگلوں اور ویرانوں میں اپنی دنیا بسانے کے لئے اترے تھے۔ اور لوگوں نے خود ان کی طرف رجوع کیا تھا۔

اس طرح بھرپور تنقید، بے لاگ تجزیے اور حقیقت پسندانہ جائزہ لیتے ہوئے رفتہ رفتہ میں نے اپنے مخالف حریف کے سارے امیج کے بخیئے ادھیڑ کر رکھ دیئے اور لوگوں کو اصلیت کا جلد ہی علم ہوگیا اور پھر جب میں نے یہ کہنا شروع کر دیا کہ یہ (جمیل شر قسوری) جس تعویز کے آج پچاس روپے وصول کرتا ہے۔ ایم این اے بننے کے بعد ریٹ بڑھا کر پانچ سو روپے وصول کرے گا تو لوگ اس سے لطف اندوز ہونے لگے اور میں آج بھی اس کا اعتراف کرتا ہوں کہ میں جو اکیلا ایک با اثر مذہبی شخصیت کے مقابل ڈٹ گیا تو صرف اس لئے مجھے ذہنی اور جذباتی طور پر حضرت بابا بلھے شاہ کی تھپکی حاصل تھی۔ اس میں پیپلز پارٹی کے منشور یا بھٹو کی شخصیت کا کوئی عمل دخل نہیں رہا۔ اس حوالے سے میں ایک ایسے واقعہ کا ذکر کرنا چاہوں گا جو آج بھی میرے لئے باعث حیرت ہے۔

بابا بلھے شاہ کی بشارت

پولنگ میں صرف دو یا تین دن باقی رہ گئے تو رات کے وقت تقریباً گیارہ بجے بابا بلھے شاہ کے مزار پر حاضر ہوا، میں نے دروازہ کھلوایا اور مزار کے اندر داخل ہوگیا۔ وہاں میرے

سوا کوئی دوسرا نہیں تھا۔ ایک گہرا سکوت طاری تھا، چاروں طرف خوشبو اور عجیب سی مہک رچی ہوئی تھی۔ میں نے فاتحہ پڑھنے کے لئے دونوں ہاتھ اٹھائے اور پھر مجھے خبر نہیں کہ کب میرا چہرہ آنسو سے تر ہو گیا اور میں نے رونا شروع کر دیا حتیٰ کہ روتے روتے میری ہچکی بندھ گئی۔ میرا دل چاہتا تھا کہ میں اکیلا یونہی گریہ زاری کرتا چلا جاؤں اور پھر میں نے خود کلامی کے انداز میں بابا بلھے شاہ سے گفتگو شروع کر دی اور کہا بابا — میں نے تو تمہاری باتیں کی ہیں۔ تمہارا فلسفہ پھیلایا ہے۔ لہذا اب اگر میں ہارا تو یہ میری نہیں خود آپ کی ہار ہوگی۔ یہ میرا نہیں آپ کا مقابلہ ہے، میں تو بس سامنے آ کر کھڑا ہو گیا ہوں۔ غرض اسی طرح کی جذباتی باتیں کرتا رہا۔

مجھے آج بھی اچھی طرح احساس ہوتا ہے اور وہ لمحہ شاید زندگی بھر نہ فراموش کر سکوں کہ اچانک مجھے کسی نے کمر پر تھپکی دی اور کہا: "جا بچہ۔ توں کامیاب ہیں"۔ مجھے اس سے بڑی تشفی ہوئی بلکہ میرا حوصلہ اور عزم ہی نئے روپ میں ڈھل گیا۔ مجھے اپنی کامیابی کا یقین ہو گیا تھا۔ میں مزار سے نکلا اور سیدھا گھر آ کر سو گیا، دوسرے دن صبح میں نے لاؤڈ اسپیکر پر خود ہی اپنی تقریروں کے دوران اعلان کرنا شروع کر دیا۔

"قصور کے لوگو سن لو، احمد رضا قصوری۔ بابا بلھے شاہ کا ملنگ الیکشن جیت چکا ہے"۔

جب میں یہ اعلان کرتا تو لوگ مجھے حیرت سے دیکھتے بلکہ چند ایک نے تو پوری سنجیدگی اور دردمندی سے کہا: بے چارہ سودائی ہو گیا ہے۔ لیکن جب الیکشن کا رزلٹ آیا تو لوگوں کو معلوم ہوا کہ بلھے شاہ نے واقعی اپنے ملنگ کا ہاتھ تھام لیا تھا۔ اور سچی بات ہے کہ میں نے بھی دل و جان سے بلھے شاہ کے فلسفہ کو پیش کیا تھا۔ ان کا فلسفہ بڑا سادہ انسان دوست اور کیف و مستی میں ڈوبا ہوا فلسفہ ہے، ان کا فلسفہ اس اسلام سے وابستہ ہے جو انسان کو خاک سے اٹھا کر تخت پر بٹھاتا ہے وہ نہیں جس کی آڑ میں انسان کو مجبور کیا جاتا ہے وہ اپنے جیسے کسی دوسرے انسان کی قدم بوسی کرتے ہوئے جھک جائے اور انسانیت کی توہین کا باعث ہو۔

لوہے کو لوہا کاٹتا ہے

قومی اسمبلی کا الیکشن ۷ دسمبر ۱۹۷۰ء کو منعقد ہونا تھا۔ اور الیکشن سے صرف پانچ چھ دن پہلے عید الفطر آرہی تھی۔ پیر جمیل شرقپوری کے کارکنوں نے قصور اور اس کے گرد و نواح میں متعدد جیپوں پر لاؤڈ اسپیکر نصب کر کے اعلان کرنا شروع کر دیا کہ پیر جمیل شرقپوری عیدگاہ میں عید الفطر کی نماز کی امامت فرمائیں گے۔ اور آپ جوق در جوق اس میں شرکت کر کے ثواب دارین حاصل کریں۔ در اصل وہ اس سے سیاسی مفاد حاصل کرنا چاہتے تھے اور ان کا مدعا اس کے سوا کچھ نہیں تھا کہ عید کے موقع پر بھی کنویسنگ کی جائے اور اس موقع کو سیاسی مقاصد کے لئے استعمال کیا جائے۔ ظاہر ہے کہ عید کی نماز پڑھنے کے لئے ایسے لوگ بھی عیدگاہ پہنچ جاتے جو سیاسی اعتبار سے جمیل شرقپوری کے حامی نہ ہوں یعنی وہ ایک اعتبار سے اس موقع سے نفسیاتی طور پر دباؤ بڑھانا بھی چاہتے تھے۔ ظاہر ہے اگر وہ ساٹھ ستر ہزار کے مجمع کی امامت کر جاتے تو اس سے یہی تاثر ابھرتا کہ کم از کم یہ لوگ تو ضرور ان کے ساتھ ہیں۔ (خواہ حقائق اس کے برعکس ہی کیوں نہ ہوتے)۔

میں ان کی یہ چال بھانپ گیا۔ اور میں نے خود کو حالات کا مقابلہ کرنے کے لئے تیار کر لیا۔ صورت حال کا جائزہ لینے کے بعد میں نے مناسب اقدامات کر لئے اور کارروائی شروع کر دی۔ میرے کارکنوں نے بھی اسی طرح گرد و نواح میں اعلان کرنا شروع کر دیئے کہ احمد رضا قصوری عید سے دو دن پہلے ایک اہم اعلان کریں گے۔ بلکہ خود میں نے اپنے جلسوں میں اس کا اعلان کرنا شروع کر دیا۔ کیونکہ میں اپنے پروگرام کے مطابق روزانہ سات آٹھ جلسے دیہات میں اور پھر رات کو ایک بڑا جلسہ شہر کے کسی حصہ میں کیا کرتا تھا۔ لہٰذا یہ اعلان جلسہ میں جنگل کی آگ کی طرح پھیل گیا اور لوگوں کا تجسس بڑھ گیا۔ بے شمار لوگ جلسہ کے اندر ہی اصرار کرتے کہ اہم اعلان کرو، مگر میں انکار کر دیتا۔

بہر حال وہ دن آگیا جب مجھے اہم اعلان کرنا تھا اس جلسہ میں لوگوں کی حاضری معمول سے کہیں زیادہ تھی۔ دوسری جگہوں سے لوگ آئے ہوئے تھے کہ اہم اعلان سنیں گے

اور میں ان کا شوق ان کی آنکھوں کی چمک میں دیکھ رہا تھا۔ چنانچہ میں نے تقریر کے دوران اعلان کیا کہ آج صبح میں نے اپنی "مجلس شوریٰ" کا اجلاس طلب کیا تھا۔ اس اجلاس میں متفقہ طور پر طے پایا کہ اس بار ہم عیدالفطر کی نماز عیدگاہ سے ملحقہ میدان میں ادا کریں گے اور امامت کے فرائض میں خود انجام دوں گا۔

اس کے ساتھ ہی میں نے مقامی انتظامیہ کو متنبہ کیا کہ میں آپ لوگوں کو بروقت بتا رہا ہوں کہ اگر پیر جمیل شرقپوری امامت کر سکتے ہیں تو کہاں لکھا ہے کہ میں ایسا نہیں کر سکتا چنانچہ میں ایسا ضرور کروں گا۔ اور اگر انہوں نے اس موقع پر خطبہ کے دوران کسی قسم کی کوئی سیاسی تقریر یا اظہار خیال کیا تو ہمارے میدان سے اس کا ترکی بہ ترکی جواب دیا جائے گا اور اس کے نتیجہ میں اگر عوام میں بے چینی بڑھتی یا ہیجان کی کیفیت پیدا ہوئی تو اس کی تمام تر ذمہ داری آپ (انتظامیہ) پر ہو گی۔ لہٰذا آپ اپنا انتظام کر لیں۔ میرے جلسہ کے فوراً بعد شہر بھر میں یہ اعلان کرنا شروع ہو گیا کہ عیدالفطر کی نماز عیدگاہ سے ملحقہ میدان میں صاحبزادہ احمد رضا خان قصوری ادا کریں گے۔

اس کے بعد ایک دم سارے شہر میں کشیدگی کی فضا ہو گئی۔ دوسرے روز اس میں اضافہ ہو گیا اور جگہ جگہ مختلف لوگوں کے گروپ اسی موضوع پر تبادلہ خیال کرتے دکھائی دیتے تھے۔ یہ معاملہ ایک طرح سے شہر کی باتوں کا مضمون اور عنوان ہو گیا۔ حتیٰ کہ چاند رات آ گئی اور میں نے کارکنوں کو اگلی صبح نماز عید کے لئے ضروری انتظامات کے سلسلہ میں آخری ہدایات جاری کر دیں۔ دوسرے روز علی الصبح یعنی عید کی صبح سویرے میں حسب معمول بیدار ہوا تو میں نے دیکھا کہ میرے گھر کے چاروں طرف پولیس کی بھاری نفری جمع ہے۔

ایس پی (قصور) نے اپنی آمد کی اطلاع پہنچائی تو میں نے جواب میں اس کو انتظار کرنے کو کہا اور اسے کہا کہ میں اپنے کارکنوں کے ایک ضروری اجلاس میں مصروف ہوں۔ تاہم جلد آ رہا ہوں حالانکہ میں اپنے کمرے میں لیٹا ہوا آنے والے حالات کا مقابلہ کرنے کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ میں نے نوکر کو یہ ہدایت بھی کر دی کہ ایس پی سمیت دیگر پولیس افسران کو ڈرائینگ روم میں بٹھا کر چائے پلائی جائے۔

میں نے پولیس والوں کو تقریباً ایک گھنٹہ تک انتظار کرایا اور اس کے بعد آگیا میں نے محسوس کیا کہ پولیس والے بات شروع کرنے سے گریزاں ہیں لہذا میں نے جلدی سے کہا: آپ میرے لائق خدمت فرمائیں کیونکہ مجھے اور بھی کام کرنے ہیں۔ یہ سنتے ہی ایک افسر نے دبے دبے لہجہ میں کہا: سر۔ شہر میں بڑی کشیدگی پھیل چکی ہے۔ ہم آپ سے درخواست کرتے ہیں کہ آپ عید کی نماز ادا نہ کریں۔ یہ سنتے ہی میں نے انتہائی درشت لہجہ میں اور ناراضگی کے ساتھ کہا: آپ پولیس والے بھی کیسے انسان ہیں کہ ایک مسلمان کو عید کے دن یہ کہہ رہے ہیں کہ وہ نماز ادا نہ کرے۔ جہاں تک شہر کی کشیدگی کا معاملہ ہے تو وہ میں نے آپ لوگوں کو ۴۸ گھنٹے پہلے نوٹس دے دیا تھا۔ آپ کو اب تک بندوبست کرنا چاہیئے تھا۔ بہرحال یہ آپ کا مسئلہ ہے، میرا نہیں، میں تو ہر قیمت پر نماز ادا کرنے جاؤں گا۔

جب انہوں نے دیکھا کہ میرے رویہ میں کوئی لچک اور لہجہ میں کوئی رعایت نہیں تو وہ اٹھ کر چلے گئے اور ابھی وہ باہر نکل ہی رہے تھے کہ اتفاقاً میرا ایک کارکن دوڑتا ہوا اندر داخل ہوا اور بولا: قصوری صاحب ہم نے سائبان لگا دیئے ہیں اور صفیں بچھائی جا رہی ہیں۔ لاؤڈ اسپیکر بھی پہنچنے والا ہے۔

پولیس افسران میرے پاس سے اٹھ کر کہا جاتا ہے کہ پیر جمیل شرقپوری کے پاس گئے۔ اور ان سے نماز عید کی امامت نہ کرنے کی درخواست کی۔ انہوں نے جواب دیا: یہی تو ہمارا کام ہے اور میں تو سالہا سال سے امامت کرا رہا ہوں۔ اس پر ایک پولیس آفیسر نے کہا: جناب یہ شوق اور کام شرقپور میں جا کر کر لیں۔ قصور میں کیوں بدنظمی پیدا کرنا چاہتے ہیں بہرحال پیر جمیل شرقپوری بھی راضی نہ ہوئے اور پولیس واپس چلی آئی۔

اس ساری صورت حال کا نتیجہ یہ ہوا کہ تھوڑی دیر کے بعد مجسٹریٹ قصور پولیس کے چند اہل کاروں کے ہمراہ میرے گھر آگئے۔ انہوں نے سامنے کاغذات رکھے اور دستخط کرنے کو کہا۔ ان کاغذات میں لکھا تھا کہ چونکہ نماز عید کے یہ ہر دو اجتماعات جن کی امامت آپ (قصوری) اور پیر جمیل شرقپوری کرنے پر تلے ہوئے ہیں، انتظامیہ کی نظر میں امن و امان کا مسئلہ پیدا کر رہے ہیں جس سے شہریوں کی جان و مال کو خطرہ ہے لہذا آپ ایسا کرنے

سے باز رہیں ۔ اس موقع پر مجھے جب یہ بتایا کہ ایسے ہی احکامات کی تعمیل پیر جمیل شر قپوری سے بھی کرائی جا رہی ہے تو میں نے یہ کہتے ہوئے بادلِ نخواستہ اس پر دستخط کر دیئے کہ اگرچہ یہ زیادتی ہے مگر میں مسلمان اور سیاستدان ہوتے کے ساتھ ساتھ ایک قانون دان ہونے کے رشتے سے ان احکامات کا احترام کروں گا ۔

میں اس کے بعد جلدی جلدی تیار ہو کر اپنے دوستوں اور ورکرز کے ساتھ ایک عیدگاہ کی طرف روانہ ہو گیا اور اطلاعات کے مطابق پیر جمیل شر قپوری بھی شر قپور چلے گئے ۔ اس طرح قصور شہر پر عین عید کے دن کی صبح تصادم کے جو بادل اُمڈ آتے تھے اور ان سے کوئی ناخوشگوار واقعہ رونما نہیں ہوا ۔ اور میں نے اپنے مخالف امیدوار کی یہ گہری چال (بلکہ سازش) ناکام بنا دی کہ عیدگاہ میں سادہ لوح نمازیوں کے ہزاروں کے مجمع کو اپنے حامی اور ووٹر ثابت کر کے مجھے نفسیاتی طور پر دبا یا جائے ۔ اور پھر ستم یہ تھا کہ میں ایسی صورت میں اس کا کوئی تدارک نہیں کر سکتا تھا کہ عید کے فوراً بعد تو پولنگ ہو رہا تھا ۔

بہرحال بالآخر پولنگ کا دن آگیا ۔ لوگوں نے بڑے جوش و خروش سے اس میں حصہ لیا غریب ، محنت کش ، مزدور اور نظر انداز کئے گئے لوگوں کا جذبہ قابلِ دید تھا وہ ووٹ ڈال کر یوں خوشی خوشی باہر آتے تھے جیسے اپنی تقدیر خود تبدیل کرنے کا فیصلہ کر کے آ رہے ہوں ۔ میں نے اس موقع پر کئی بوڑھے لوگوں کی آنکھوں میں آنسوؤں کی نمی صاف طور پر دیکھی میں نے دھتکارے ہوئے لوگوں کو اپنا حق رائے استعمال کرنے کی خوشی میں آنسوؤں میں مسکراتے دیکھا ، اس روز مجھے بڑی شدت سے احساس ہوا کہ یہ غریب لوگ جاہ و حشم اور مال و زر کی ہوس نہیں رکھتے مگر وہ تو عزتِ نفس اور پُروقار زندگی بسر کرنے کے خواہاں ہیں جو ایٹم کے دور میں کوئی جرم نہیں ۔ اور میرے اس تاثر کی تصدیق الیکشن کے نتائج نے کر دی جن کے مطابق مجھے ۵۵ ہزار سے زائد ووٹ ، پیر جمیل شر قپوری کو ۴۸ ہزار سے زائد ووٹ اور میاں عارف انتخاب کو ۱۰ ہزار سے زائد ملے ۔ یعنی میں نے خدا کے فضل اور بابا بلھے شاہ کی تھپکی کے ساتھ ساتھ غریبوں اور بے نواؤں کی دوستی کے بل بوتے پر جہاں پنجاب کے ایک بڑے گدی نشین کو شکست فاش دی وہاں ایک سرمایہ دار اور جاگیر دار کا یوں برج

الٹا دیا کہ اس کی ضمانت ضبط ہو گئی۔

فتح کی نوید سنتے ہی میری آنکھوں میں خوشی کے آنسو آ گئے۔ میری آبائی حویلی کے اندر لوگ بے دریغ اور بے دھڑک آ جا رہے تھے، ان میں عمر رسیدہ بھی تھے اور جواں سال بھی، معمر عورتیں تھیں اور نوعمر بچے بھی۔ ان کے انداز اتنے والہانہ اور پرجوش تھے کہ وہ مجھے اپنے بالکل اپنے محسوس ہو رہے تھے اور میں نے ان کے اور اپنے درمیان کی سب دیواریں اور رکاوٹیں گرا دی تھیں۔ جتنا خالص، سچا اور بے لوث، پیار مجھے اپنے عوام کی طرف سے ملا، اتنا شاید ہی کسی امیدوار کو ملا ہو، لوگ جوق در جوق آ رہے تھے اور رش بڑھ رہا تھا۔ ہر آنے والے کا محبت اور عقیدت کا انداز کچھ ایسا پرجوش ہوتا کہ میں حیران رہ جاتا۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ عین اس وقت مجھے اپنے کندھوں پر ذمہ داری اور فرائض کا بوجھ بڑی شدت سے محسوس ہوا۔ مجھے یوں لگا جیسے یہ لوگ اپنے دکھ درد میری جھولی میں ڈال کر خود ہلکے پھلکے ہو گئے ہیں اور اب میری آزمائش کا وقت آ گیا ہے اس احساس نے مجھے یکدم چپ کرا دیا۔

عین اس وقت جب عوام نے مجھے گھیر رکھا تھا اور وہ مجھے میری شاندار کامیابی پر مبارک باد دے رہے تھے اچانک میرے والد (مرحوم) نے میرے نزدیک آ کر کہا: رضا۔ کیا تم دو منٹ کے لئے میری بات سن سکتے ہو؟ میں نے بڑی سعادت مندی اور حیرت کے ساتھ جواب دیا:

یہ آپ نے کیا کہہ دیا، آپ فرمایئے کیا حکم ہے۔

انہوں نے انتہائی سنجیدگی اور وقار کے ساتھ مجھے اپنے ساتھ آنے کو کہا۔ وہ مجھے حویلی کے اندر اپنے بیڈ روم میں لے آئے اور کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد بولے:

دیکھو بیٹے، خدا نے تمہیں بہت کم عمری ہی میں اپنے فضل سے نوازتے ہوئے تمہیں ایک انفرادی اور امتیازی حیثیت اور فضیلت عطا کی ہے، کہا آج کے بعد میری یہ دو باتیں یاد رکھنا۔ آج کے دن یہی تمہیں میری نصیحت ہے۔

نمبر ا: اپنے دروازے ہمیشہ کھلے رکھنا، تاکہ لوگ تم سے بے دریغ حسب ضرورت مل

سکیں اور نمبر ۲ ۔ جہاں تک ممکن ہو سکے ہر سائل اور ضرورت مند کی زیادہ سے زیادہ جائز حد تک امداد کرنا اور اس میں کبھی پس وپیش نہ کرنا۔

میں نے اُس دن کے بعد سے اپنے والد کی ان دو باتوں کو اپنی سیاست کی اساس بنا لیا اور جب وہ اس دنیا سے رخصت ہو گئے تو میں ان کی نصیحت کو وصیت کا درجہ دے کر اس پر تادم تحریر عمل پیرا ہوں۔

حویلی کے اندر ایک کمرے میں جا کر بے اختیار فرش پر سجدہ میں گر گیا۔ آنکھوں سے آنسوؤں کا طوفان امڈ آیا اور میں نے اس وقت بس یہی دعا کی۔

"یا اللہ۔ مجھے اس آزمائش میں سہارا دے، مجھے ہمت دے۔

مجھے ہدایت کی روشنی میسر رکھنا اور صرف اپنا محتاج رکھنا۔ میں سجدہ سے اٹھا تو میرے اندر ہیجان کی جگہ اطمینان اور جذبات کے جوار بھاٹا کی جگہ احساس ذمہ داری کا حلول جیسا سکون پھیل چکا تھا۔ باہر لوگ خوشی سے ناچ رہے تھے، نعرے لگا رہے تھے قہقہے لٹا رہے تھے۔ ہم سب کے لئے وقت کس قدر بدل چکا تھا۔!!

ایک جائزہ

یادداشت بخیر: اس مرحلہ پر قارئین کی دلچسپی کے لئے پولیٹیکل لیگل فریم ورک آرڈر ۱۹۷۰ء کے تحت عام انتخاب کے لئے مختلف صوبوں کے لئے قومی و صوبائی اسمبلیوں کی تقسیم اور قومی اسمبلی کے الیکشن میں کامیاب سیاسی جماعتوں کی نشستوں کی تعداد کے گوشوارے پیش ہیں تاکہ آگے چل کر زیر بحث آنے والے امور کے بارے میں مجھے اپنا نقطہ نظر واضح کرنے میں سہولت رہے۔

قومی اسمبلی کی نشستوں کی صوبہ وار تقسیم

		عام	مخصوص برائے خواتین	کل
مشرقی پاکستان	=	۱۶۲	۷	۱۶۹
پنجاب	=	۸۲	۳	۸۵
سندھ	=	۲۷	۱	۲۸
بلوچستان	=	۴	۱	۵
سرحد	=	۱۸	۱	۱۹
قبائلی علاقہ جات	=	۷	—	۷

کل نشستیں = ۳۰۳

قومی اسمبلی میں کامیاب سیاسی جماعتوں کی پوزیشن

نام جماعت	مشرقی پاکستان	پنجاب	سرحد	سندھ	بلوچستان	کل
عوامی لیگ	۱۶۷	-	-	-	-	۱۶۷
پاکستان پیپلز پارٹی	-	۶۲	۱	۱۸	-	۸۱
قیوم مسلم لیگ	-	۱	۷	۱	-	۹
کونسل مسلم لیگ	-	۷	-	-	-	۷
مرکزی جمعیت علمائے اہل سنت	-	۴	-	۳	-	۷
جمعیت علمائے اسلام	-	-	۶	-	۱	۷
نیپ (ولی گروپ)	-	-	۳	-	۳	۶
جماعت اسلامی	-	۱	۱	۲	-	۴

نام جماعت	مشرقی پاکستان	پنجاب	سرحد	سندھ	بلوچستان	کل
کنونشن مسلم لیگ	-	۲	-	-	-	۲
آزاد امیدوار	۱	۵	-	۳	-	۹
پاکستان جمہوری پارٹی	۱	-	-	-	-	۱

صوبائی اسمبلیوں کی صوبہ وار تقسیم

	عام	مخصوص برائے خواتین	کل
مشرقی پاکستان	۳۰۰	۱۰	۳۱۰
پنجاب	۱۸۰	۶	۱۸۶
سندھ	۶۰	۲	۶۲
بلوچستان	۲۰	۱	۲۱
سرحد	۴۲	۲	۴۲

کل = ۵۲۱

۱۷ دسمبر کو صوبائی اسمبلیوں کے الیکشن ہوئے جن نتائج کے مطابق پیپلز پارٹی کو پنجاب کی کل ۱۸۶ میں سے ۱۱۹ نشستیں ملی۔ سندھ کی ۶۲ میں سے ۳۶ صوبہ سرحد کی ۴۲ میں سے ۳ نشستیں ملیں جبکہ بلوچستان میں صوبائی اسمبلی کی کوئی سیٹ اس کے حصہ میں نہیں آئی۔

پیپلز پارٹی کی غیر متوقع عدیم المثال کامیابی کا سارا کریڈٹ ہمارے سیاسی مبصرین عموماً پارٹی کے چیئرمین ذوالفقار علی بھٹو کی شخصیت کو دیتے ہیں جو عوام میں غیر معمولی طور پر مقبول اور ہر دلعزیز تھی۔ اور یہ بات کوئی ایسی غلط یا خارج از مکان بھی نہیں کہ اس کو یکسر مسترد کر دیا جائے۔ البتہ میں اتنا ضرور کہوں گا کہ یقیناً بے شمار لوگوں کو بھٹو اور "تلوار" کے طفیل کامیابی نصیب ہوئی اور بلاشبہ جغادری قسم کے سیاستدانوں کو چاروں شانے چت گرانے میں پیپلز پارٹی کے پُرکشش عوامی منشور کا بڑا عمل دخل رہا لیکن جہاں تک میرے حلقہ انتخاب

کا تعلق ہے تو یہاں ان میں سے کوئی بھی عنصر کارفرما نہیں تھا۔ اس ضمن میں مجھے زیادہ تفصیل میں جانے کی بجائے صرف دو نکات پیش کرنا ہیں۔

۱۔ میرے حلقۂ انتخاب میں پیپلز پارٹی کی کسی بھی سطح کا کوئی لیڈر کنویسنگ یا میری اخلاقی مدد کے لئے نہیں آیا بلکہ (جیسا کہ میں پہلے کہہ چکا ہوں) میرے خلاف مبینہ طور پر یہ زہر افشانی کی گئی کہ بھٹو مجھے پسند نہیں کرتے اور مجھے مجبوراً ٹکٹ دیا گیا ہے۔ درپردہ پارٹی کے بعض سرکردہ لوگوں نے میرے مخالف امیدوار کے لئے کام کیا اور اس کو میرے داؤ پیچ بتاتے رہے۔

میں نے اس کے باوجود اپنے حلقہ سے ریکارڈ ووٹ حاصل کئے اور ایک انتہائی اہم کامیابی حاصل کی۔ البتہ بس صرف دس روز کے بعد صوبائی اسمبلی کے الیکشن ہوئے تو میرے ہی حلقہ میں واقع کھڈیاں نشست سے پیپلز پارٹی کے ایک امیدوار شیر محمد بھٹی اتنی بری طرح ہارے کہ ان کی ضمانت ضبط ہو گئی۔ ان کے مقابلے میں (اس وقت) نسبتاً کم شہرت کے حامل امیدوار محمد علی کھائی کو کامیابی حاصل ہوئی جو بہرحال اب سینٹ کے ڈپٹی چیئرمین ہیں اور قومی سیاست میں فعال کردار کر رہے ہیں۔ اور اس روز مرادل پیپلز پارٹی کی ستم ظریفی پر رو دینے کو چاہا جب یہی شیر محمد بھٹی لاہور کے حلقہ نمبر ۶ کے انتخاب میں سابق گورنر پنجاب ملک غلام مصطفےٰ کے مقابلے میں نہ صرف پارٹی کے امیدوار ہوئے بلکہ وہ یہ الیکشن جیت بھی گئے۔

اسی علقہ سے صوبائی اسمبلی کی دوسری نشست کے لئے پیپلز پارٹی کے امیدوار یعقوب مان جیت تو گئے مگر صرف ۵۲ ووٹوں کی اکثریت سے۔ !! ان کے مخالف امیدوار میاں شیخ محمد اقبال کی پوزیشن نہایت مضبوط تھی اور اگر پوسٹر بیلٹ (جنہیں گننے نہیں دیا گیا تھا) شمار کر لئے جاتے تو یقیناً صورت حال مختلف ہوتی۔ یعقوب مان کا حلقہ قصور شہر (یعنی میرے گھر) سے نزدیک تھا لہٰذا میرے لئے ان کی کنویسنگ اور مدد کرنا نسبتاً آسان تھا۔ میں نے اس میں کوئی دریغ اور ہچکچاہٹ بھی محسوس نہیں کی چنانچہ میں نے اپنے ذاتی اثر و رسوخ اور بھاگ دوڑ سے ان کے لئے کام کیا۔ جو بالآخر نتیجہ خیز ثابت ہوا۔

اس عرصہ پر مجھے جو بات بیان کردہ پس منظر اور تجزیہ کے حوالے سے قارئین کی خدمت میں بطور تاریخی حقیقت پیش کرنا ہے یہ ہے کہ مجھے جو کامیابی حاصل ہوئی اس کی بنیاد علاقہ میں

میرے آباؤ اجداد اور خاندان کی گرانقدر خدمات اور کاوشیں تھیں۔ خود میں نے اپنے عوام کے ساتھ جو ایک بھرپور، گہرا اور قریبی تعلق (پیپلز پارٹی کے قیام سے بھی پہلے) استوار کر رکھا تھا اس نے بھی اس کامیابی میں بڑا اہم کردار ادا کیا۔ پیپلز پارٹی کا پروگرام اور منشور عوامی و ملکی سطح پر مقبول اور پسندیدہ تھا لہذا اہل قصور بھی اس سے کسی نہ کسی حد تک متاثر ہونے کے باعث میرے حامی قرار دیئے جا سکتے ہیں۔ گویا میری کامیابی میں پارٹی کا صرف اس قدر حصہ اور کردار تھا کہ میں اس کی طرف سے نامزد کیا گیا تھا۔ اگر میں صرف اور صرف پارٹی کے صدقے کامیاب ہوتا تو اس علاقہ میں صرف دس دن کے بعد پارٹی کیوں ہارتی۔ جبکہ میری کامیابی کے بعد تو تلوار کو دو دھاری تلوار ہونا چاہیئے تھا۔ اصل بات یہی تھی کہ اس علاقہ میں ہی نہیں بلکہ سارے ملک میں میں ان چند ایسے امیدواروں میں سے تھا جو اپنے تشخص کردار اور عوامی خدمت کے باعث بھاری اکثریت سے جیتا۔ چنانچہ منتخب ہونے کے بعد میرا رویہ ظاہر ہے کہ ان لوگوں سے مختلف تھا (اور ہونا بھی چاہیئے تھا) جو راتوں رات بھٹو اور تلوار کی برکت سے ایم این اے ایم پی اے ہو گئے تھے۔ میرے اور دوسرے ایسے لوگوں میں وہی فرق تھا جو انگور کی بیل اور امر بیل میں ہوتا ہے۔ میں ایسا شیر تھا جس نے اپنا شکار خود کیا تھا اور دوسرے ایسے گیدڑ تھے جنہیں اتفاقاً شیر کی کھال نصیب ہو گئی تھی اور اب وہ پہلے سے بڑے شکار پر انتہائی خونخوار انداز میں کھڑے تھے۔ میرے اور ان میں بہت فرق تھا اور میرا اور ان کا گذارہ بہت مشکل تھا۔

بھٹو ششدر رہ گئے

قومی اسمبلی کے نتائج اور خاص طور پر پی پی کی کامیابی نے جہاں قومی سیاسی مبصرین اور رائے عامہ پر نگاہ رکھنے والے حلقوں کو یکسر حیران و ششدر کر دیا تھا وہاں خود پیپلز پارٹی کے چیئرمین ذوالفقار علی بھٹو بھی اس سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکے تھے۔ اس کا سبب یہ تھا کہ یہ نتائج ان کی توقعات بلکہ وہم و گمان سے بھی بڑھ کر زیادہ تھے۔

اگرچہ وہ اس قسم کا تاثر دیتے تھے کہ انتخابی نتائج کے بارے میں ان کا تجزیہ

تقریباً وہی تھا مگر حقیقت کچھ اور ہی تھی اس سلسلہ میں میں ایک واقعہ بیان کرتا ہوں۔

یہ الیکشن سے بہت پہلے ۱۹۶۹ء کی بات ہے۔ ابھی انتخابی پروگرام وغیرہ کا بھی باقاعدہ اعلان نہیں ہوا تھا۔ لاہور کے انٹر کانٹینینٹل ہوٹل میں بھٹو مقیم تھے۔ میں ان کے پاس تھا اور میاں محمود علی قصوری جو اس وقت بھاشانی پارٹی کے مغربی پاکستان میں صدر تھے) غیر رسمی ملاقات کے لئے بھٹو کے پاس آتے رہتے تھے۔ بھٹو بلاشبہ بڑے گھاگ سیاستدان تھے چنانچہ جب میاں صاحب رخصت ہونے لگے تو بھٹو صاحب نے اپنی پارٹی کے بارے میں ایک بزرگ سیاستدان کا تجزیہ حاصل کرنے کے لئے ان سے پوری سنجیدگی سے کہا: میاں صاحب — میں آپ کا بے حد احترام کرتا ہوں، کیونکہ آپ نہایت بزرگ اور تجربہ کار سیاستدان ہیں آپ کو بتا دوں کہ آپ کا مستقبل بھاشانی کے ساتھ نہیں بلکہ پیپلز پارٹی کے ساتھ ہے لہذا آپ اسے چھوڑ کر ہمارے ساتھ آجائیں۔ یہ سنتے ہی میاں صاحب سنجیدہ ہوگئے اور انہوں نے بڑی متانت سے کہا: مسٹر بھٹو، میں آپ سے اخلاقاً ملنے چلا آیا تھا، اس کا مطلب یہ نہیں کہ آپ میرے سیاسی کیریر پر یوں تبصرہ کریں۔ میں آپ کا مہمان ہوں، آپ مہمان داری کے آداب کا خیال ہی رکھیں۔ ان کا خیال تھا کہ بھٹو معذرت کرے گا مگر بھٹو نے ان کی باتوں کو نظر انداز کر کے دوبارہ پوری سنجیدگی سے اپنا موقف نہایت اصرار کے ساتھ دہرایا۔ تب میاں صاحب کے اندر کا قانون دان، انسان اور سیاستدان یکدم جاگ اٹھا۔ انہوں نے رخصت ہونے کا ارادہ ملتوی کر دیا اور دروازے سے پلٹ کر واپس آکر بولے: مسٹر بھٹو آپ میرے مستقبل کی فکر نہ کریں، اپنے اور اپنی پارٹی کے مستقبل کی فکر کریں۔

بھٹو نے لوہا گرم دیکھ کر بڑی چالاکی سے چوٹ لگائی: میاں صاحب کیا ہوا ہے میرے اور میری پارٹی کے مستقبل کو؟ — سب کچھ ٹھیک ہے صرف آپ ہی ہمارے ساتھ نہیں!

یہ سنتے ہی میاں صاحب نے بے دھڑک انداز میں کہا: آپ کسی خوش فہمی میں نہ رہیں الیکشن میں آپ کو زیادہ سے زیادہ دس نشستیں ملیں گی۔

اس پر بھٹو نے شرارت سے مسکراتے ہوئے کہا: آپ دس بھی نہ دیں، یہ بھی آپ خود رکھ لیں۔ مگر پلیز ایسا نہ کہیں۔ کیونکہ میری پارٹی ڈرائنگ روم میں نہیں بلکہ سڑکوں پر

متحرک نظر آتی ہے۔

اس پر میاں صاحب نے دوبارہ زور دے کر کہا: مسٹر بھٹو اس کے باوجود دس اور صرف دس۔ یہ بھی آپ کی شخصیت کو مد نظر رکھتے ہوئے کہہ رہا ہوں۔ ورنہ پی پی میں کیا رکھا ہے۔ تب بھٹو صاحب نے کہا: میاں صاحب۔ اگر ہم دس سے زیادہ نشستیں جیت گئے تو۔۔۔۔۔

میاں صاحب نے بات کاٹتے ہوئے کہا: آپ کتنی سیٹیں جیت لیں گے۔

بھٹو بولے: تیس اور پینتیس کے درمیان۔

میاں صاحب نے جھنجلا کر کہا: نہیں، کبھی نہیں،۔ بالکل ناممکن۔

بھٹو نے پوچھا: اگر یہ ناممکن ممکن ہوگیا تو۔۔۔۔۔

میاں صاحب نے کہا: آپ دن میں ستارے دیکھ رہے ہیں — اور پھر رک کر بولے اگر یہی بات ہے تو میں شرط لگانے کو تیار ہوں۔

کیا شرط؟ بھٹو نے پوچھا۔

جو آپ کہیں؟ وہ پورے اعتماد سے بولے۔

بھٹو شاید یہی چاہتے تھے۔ میری طرف معنی خیز نظروں سے دیکھ کر بولے:

ٹھیک ہے۔ رضا قصوری شرط کو تحریری شکل دے گا۔ اگر آپ شرط ہار گئے تو پی پی میں آجائیں گے ورنہ جو سزا کہیں گے۔ میں تسلیم کروں گا۔ میں نے لبیک کہہ کر ایک طرف پڑا ہوٹل کا پیڈ اٹھایا۔ کاغذ پر میاں صاحب اور بھٹو صاحب سے فرداً فرداً پوچھ کر کاغذ پر لکھا:

میاں محمود علی قصوری کے مطابق = پی پی کی سیٹیں ۱۰

ذوالفقار علی بھٹو کے مطابق = پی پی کی سیٹیں ۳۰ - ۳۵

اس کے بعد میں نے ان دونوں سے کہا اس پر دستخط کر دیجئے۔

میاں صاحب اتنے پر اعتماد تھے کہ انہوں نے لبیک کہہ کر مجھ سے قلم لیا اور میری تحریر کے نیچے دستخط کرتے ہوئے کہا مسٹر بھٹو، مجھے افسوس ہے کہ آپ شرط ہار جائیں گے۔

میں نے اس کے بعد کاغذ بھٹو صاحب کے آگے کر دیا۔ انہوں نے مسکرا کر دستخط کرتے

کرتے ہوئے کہا۔ میاں صاحب آپ پی پی جوائن کرنے کی تیاریاں کریں۔ اتنی دیر میں میاں صاحب کی شگفتگی اور زندہ دلی واپس آچکی تھی لہذا وہ ہنستے مسکراتے رخصت ہوئے۔

ان کے جانے کے بعد بھٹو صاحب کو شرط کا کاغذ دکھاتے ہوئے کہا: آپ نے شرط کی تحریر کے نیچے دستخط کیوں نہیں کئے اوپر کونے میں کیوں کر دیئے۔

یہ سن کر بھٹو نے قہقہہ لگایا اور کہا کہ تاکہ کل اگر میں شرط ہار جاؤں تو معاہدہ سے یہ کہہ کر مکر جاؤں کہ یہ تو کسی نے مجھ سے آٹوگراف لئے ہوں گے۔ اب یہ بتانے یا مزید وضاحت کرنے کی قطعاً ضرورت نہیں کہ خود بھٹو کو بھی الیکشن میں زیادہ سے زیادہ ۳۵ نشستوں کی توقع تھی لیکن اب جبکہ ۸۱ نشستیں ملیں اور یوں ملیں کہ مغربی پاکستان میں ان کے آس پاس ان کا کوئی حریف نظر ہی نہیں آیا تھا تو وہ یکسر بدل گئے۔ انہوں نے حالات کے نتائج اور تقدیر کی عطا کو اپنا فائق حق تصور کیا اور جو کچھ ملا، اس پر صبر وشکر کے بجائے انتہائی پرغرور رویہ اختیار کیا۔ حالانکہ اصل صورت حال یوں تھی کہ الیکشن میں پی پی کو مجموعی طور پر ۳۴ فیصد ووٹ ملے تھے، یہ وہ ووٹ تھے جو پیپلز پارٹی کے وفادار ووٹ تھے۔ اس کے مقابلے میں جتنے ووٹ تھے وہ ایک سے زائد امیدواروں میں تقسیم ہوتے گئے نتیجہ یہ نکلا کہ ۶۶ فیصد والے ہار گئے اور ۳۴ فیصد والے جیت گئے۔

نورے کی پٹائی

یہ الیکشن کے ذرا بعد کی بات ہے۔ بھٹو لاہور کے ہوٹل انٹر کانٹینٹل میں ٹھہرے ہوئے تھے۔ میں ان سے ملنے کے لئے گیا۔ جب میں لفٹ سے باہر نکلا تو ایک عجیب منظر دیکھا۔ کئی نئے ایم این اے حضرات اور ان کے مخصوص ساتھی دبے پاؤں آہستہ آہستہ یوں چلے آ رہے تھے جیسے عقیدت مند کسی مزار یا درگاہ سے نکلتے ہیں۔ ذرا آگے گیا تو دیکھا کہ بھٹو کا پسندیدہ اور خاص ملازم نورا، ان سب کو بڑی سختی سے کہہ رہا تھا ——— چلو ——— چلو ——— شور نہ کرو، صاحب آرام کر رہا ہے ——" اور حیرت کی بات ہے کہ یہ تمام حضرات اس کے سامنے دم مارتے ہوئے مجرموں کی طرح واپس جا رہے تھے۔ میں بہرحال بھٹو کے کمرے کی طرف بڑھا تو اس نے مجھے بھی کہا "ٹھہرو قصوری صاحب ——— اندر صاحب سو رہا ہے ——— یہ سننا تھا کہ میں غصہ کے مارے آپے سے باہر ہو گیا۔ کچھ بھٹو سے قربت کا اعتماد اور کچھ جوانی کا جوش ——— میں نے پیچھے ہٹ کر بغیر کچھ کہے سنے نورے کو دو تین زبردست ٹھوکریں رسید کیں اور ساتھ ہی ایک دو تھپڑ رسید کئے اور کہا "مت بھولو اگر تم بھٹو کے ملازم ہو تو میرے بھی ملازم ہو ———" اور یہ کہہ کر اندر چلا گیا۔

کمرے کے اندر عجیب منظر تھا۔

بھٹو اپنے پسندیدہ مشروب سے لطف اندوز ہو رہے تھے شاید وہ اپنی آئندہ مصروفیت کے لئے موڈ سیٹ کر رہے تھے۔ نورے نے دوسرے کمرے میں بھٹو کو میری شکایت کی۔ بھٹو نے مجھ سے پوچھا تو میں نے کہا "جناب ——— یہ ملازم ہے کوئی پارٹی کا سیکرٹری جنرل نہیں کہ آپ میری جواب طلبی کر رہے ہیں ——— وہ ملازم ہے اسے اپنا مقام اور حیثیت نہیں بھولنی چاہیئے اور میں اس کو کبھی اجازت نہیں دوں گا کہ وہ میرا نام لے"۔ بھٹو نے مجھے سنجیدہ اور غصہ میں دیکھ کر بات بدل کر کہا "وہ ٹھیک ہے۔ میری مراد تھی کہ نوکروں کی مرمت ذرا آہستہ کرنا چاہیئے۔

ادھر شام کو پارٹی کی میٹنگ تھی جس سے پہلے اور بعد بے شمار لوگ مجھ سے پوچھ رہے

تھے"۔ تصوری صاحب آپ نے نورے پر ہاتھ کیسے اٹھا لیا"۔ اب میں ان کو کیسے سمجھاتا کہ نورے کے پاس میری کوئی ایسی کمزوری نہیں تھی جس سے مجبور ہو کر میں اس پر ہاتھ اٹھانے کی بجائے الٹا اس کے نخرے اٹھاتا۔

بھٹو — ۲

تیور بدل گئے

مجھے یہ کہنے میں کوئی تامل یا باک نہیں کہ الیکشن کے بعد کا بھٹو اور الیکشن سے پہلے کا بھٹو
دونوں ایک دوسرے سے مختلف بلکہ متضاد تھے۔ اب بھٹو صاحب میں وہ پہلے والی محبت گرمجوشی
روا داری اور وضعداری نہ رہی تھی بلکہ وہ اب روسی سفید ریچھ جیسا رویہ اختیار کرنے لگے
تھے جس میں سرد مہری، لاتعلقی، اغماض اور گریز پائی غالب رہتی ہے۔ وہ سب کچھ بھلا کر
صرف اس ایک مرض میں مصروف ہونے کی تیاری کرنے لگے کہ اقتدار حاصل کیا جائے۔ ہر حال
میں، ہر قیمت پر۔!! ایسے میں اور مجھ جیسے شخص کے لئے بھی جو بھٹو صاحب کو لاہور ریلوے
اسٹیشن سے فلیٹیز تک لایا تھا اور جس نے قدم قدم پر ان کا (بے لوث) بھرپور ساتھ دیا تھا
یہ جاننا مشکل ہوگیا کہ اصل بھٹو کون سا ہے، الیکشن سے پہلے والا مسیحا نما بھٹو یا الیکشن کے

کے بعد والا فرعون نما بھٹو ۔ !!

ادھر پارٹی کی صورت اور شکل بھی یک لخت بدلنے لگی ۔ انتخابات کے غیر متوقع بلکہ حیران کن نتائج نے پارٹی کے تمام دروازے کھول دیئے ، یوں لگا جیسے کسی نے کھل جا سم سم کا منتر پڑھتے ہوئے ایک طلسماتی محل کا دروازہ کھول دیا ہے اور یوں خوشامدی ، غرض مند ، چاپلوس اور موقع پرست افراد ایک دوسرے کو گراتے پچھاڑتے پارٹی کے اندر آنے لگے اور دیکھتے ہی دیکھتے انہوں نے پارٹی کے مخلص ، بنیادی ، بے لوث اور جانثار جیالے کارکنوں کو دھکیل کے پچھلی صفوں میں دبکنے پر مجبور کر دیا ۔ ایک ایسا وقت بھی آیا جب اس "گھیراؤ گروپ" نے پارٹی کی اعلیٰ کمان اور خاص طور پر چیئرمین بھٹو کے گرد اپنا حلقہ اس قدر مضبوط کر لیا کہ انہوں نے جیالے کارکنوں کو نظر انداز کرنا شروع کر دیا ۔ ایسے میں پیپلز پارٹی کے کئی روپ بن گئے ایک تو دن کی پیپلز پارٹی تھی جو محنت کشوں ، کسانوں ، مزدوروں ، طالب علموں ، کلرکوں ، مظلوموں اور دھتکارے ہوئے غیور اور انا پرست لوگوں پر مشتمل تھی ۔ یہ ہر شے سے بے نیاز فقط اپنے کاز (Cause) کے لئے کام کرتے تھے اور بھٹو کے عشق کا دم بھرتے تھے ۔ دوسری پیپلز پارٹی رات کی پیپلز پارٹی تھی ۔ اس میں وہ سب لوگ شامل تھے جو رات کے اندھیروں میں اپنی صلاحیتوں کا مظاہرہ کر سکتے ہیں ۔ ان کے مشاغل کسی سے اوجھل نہیں تھے ، وہ ایک تل کے بدلے بخارا عطا کرنے والی مخلوق تھی اور وہ ایسے جہانگیر تھے جو ایک کبوتر نور جہاں سے اور دوسرا خود آزاد کر دیتے تھے تاکہ عشق کا جذبہ سلامت رہے (کبوتروں کی یوں بھی کوئی کمی نہ تھی) ۔ لائسنسوں ، ڈیپوؤں ، ٹھیکوں ، پرمٹوں ، پلاٹوں ، کمشنوں اور ایسے ہی دوسرے مفادات کے لئے ہونے والی سیاسی وابستگیوں نے پارٹی کی روح کو زخمی کر کے رکھ دیا ۔ اور سب سے بڑھ کر ستم بلکہ ظلم یہ ہوا کہ چیئرمین بھٹو کچھ ایسے بدلے کہ انہوں نے ان تمام باتوں سے خود کو بے نیاز اور لاتعلق کر لیا ۔ وہ بس یحییٰ خان اور شیخ مجیب کے ساتھ مل کر آنے والے منحوس دنوں (المیہ مشرقی پاکستان) مثلث کو ترتیب دینے میں مگن تھے اب انہیں ان لوگوں کی پرواہ نہیں تھی جو گول باغ قلعہ قاسم باغ میں ان کی جان بچاتے تھے بلکہ وہ ان لوگوں سے روابط بڑھا رہے تھے جو انہیں جی ایچ کیو کی سرگرمیوں سے آگاہ رکھتے ۔

وہ اپنے حصولِ اقتدار کے مشن میں پارٹی کے ورکرز۔ سب کچھ بھول گئے اور انہوں نے ملک کی تاریخ میں اپنا نام بطور سربراہ درج کرانے کے شوق میں اس ملک کے جغرافیہ کو بھی داؤ پر لگا دیا۔ اور یہ داؤ ہار کر بھی وہ جیت کا نشہ لیتے رہے۔ یہ وہی حالات تھے جن میں مختار رانا اور میرے جیسے چند دوستوں نے اصلاحِ احوال کی کوششیں کیں اور چیئرمین صاحب کی توجہ ادھر مبذول کرائی لیکن جسے گستاخی قرار دیا گیا۔

کیا قیامت ہے کہ خاطر کشتہ شب بھی تھے ہم

صبح جب آئی تو مجرم ہم ہی گردانے لگے

میں نے یہ تمام باتیں اور وہ تمام پُراسرار راز جو بھٹو کے انتہائی قریبی ساتھی ہونے کی حیثیت سے میرے پاس محفوظ تھے، ایک انتہائی نازک موڑ پر کھڑی سہمی سہمی قوم کو اس کی امانت کے طور پر سونپ دینے کا فریضہ ادا کرنا شروع کر دیا۔ تاکہ آئندہ کسی بھی شخص کو اس قوم کی سادہ دلی اور جذباتی رویہ سے ناجائز فائدہ اٹھانے کی جرأت نہ ہو سکے۔ میری باتوں کو قومی پریس اور رائے عام کی تشکیل دینے والے دیگر اداروں نے غیر معمولی طور پر قابلِ توجہ جانا اور مجھے ہر سطح پر بے حد درجہ پذیرائی حاصل ہونے لگی۔ جس کا بھٹو نے باقاعدہ نوٹس لینا شروع کر دیا۔

بھٹو کی شخصیت ایک بڑ کے درخت کی طرح تھی۔ ان کے سائے تلے کوئی دوسرا پودا پھل پھول نہیں سکتا تھا۔ غالباً وہ خود بھی ایسا پسند نہیں کرتے تھے۔ لہٰذا جب انہوں نے واضح طور پر محسوس کیا کہ مختلف شہروں کے سیاسی دورے، میل ملاپ، تقاریر و رابطے اور عوامی رابطہ مہم کے بعد اب یہ شخص (راقم الحروف) اسمبلی میں بھی بھرپور، مدلل اور اصولی مخالفت پر اتر آیا ہے تو انہوں نے اس کو غیر ضروری طور پر اپنی انا کا مسئلہ بنا لیا۔ میں جب اسمبلی میں تقریر کیا کرتا تھا تو مہمانوں کی گیلریاں بھر جایا کرتی تھیں اور پریس گیلری میں بیٹھے اخبار نویس اپنے قلم سنبھال کر بیٹھ جایا کرتے تھے اور مجھے ایک شعلہ نوا مقرر کے طور پر دیکھ کر بھٹو کے اندر کا جاگیردار، وڈیرا، اس بھٹو پر حاوی ہو جاتا تھا جو بظاہر آکسفورڈ اور برکلے کا تعلیم یافتہ شمار ہوتا تھا۔ اس نے اعلیٰ غیر ملکی شرٹ کے ساتھ فرانس کی نکٹائی اور رومال سجا رکھا ہوتا لیکن اس کے اس غیر ملکی قیمتی کپڑے کے سلے ہوئے نفیس و اعلیٰ سوٹ کے

اندر وہی وڈیرا سانس لینے لگتا جو اپنی جاگیر کی حدود کے اندر بقول شورش کاشمیری "چڑیا کے بچے سے لے کر غریب ہاری کی لڑکی کو شکار کرنے میں کوئی مضائقہ خیال نہیں کرتا"۔ چنانچہ ایسے میں جب بھٹو نکلسن، چرچل، ابراہیم لنکن، روسو، سارتر اور برٹرینڈ رسل کے اقوال کے حوالے دیتے تھے تو مجھے ان پر اس اداکار کا گمان گزرتا جو میکبتھ کے ڈرامہ کے ڈائیلاگ سٹیج پر یوں بولتا ہے کہ دیکھنے والے ششدر رہ جاتے ہیں لیکن دراصل اندر سے وہ محمد دین یا لعل بخش ہوتا ہے۔ اور مجھ سے زیادہ بھٹو کی نفسیات اور نفسیاتی مسائل کو اور بھلا کون جان سکتا تھا جسے بخوبی علم تھا کہ وہ (بھٹو) قومی اسمبلی جیسے اعلیٰ دستور ساز ادارے کو کبھی اپنا فروٹ فارم تصور کرتے تھے، ان کے نزدیک تمام ایم این اے ان کے مزارعین تھے اور ان مزارعین میں سے ایک (راقم الحروف) کو اٹھ کو یوں بر سر عام اور محفل تنقید کرتے دیکھ کر وہ کیا سوچاتے تھے مجھے معلوم تھا کہ یہ ذوالفقار علی بھٹو دراصل سر شاہنواز کا بیٹا اور غلام مرتضیٰ بھٹو کا پوتا ہے،

اور یہ غلام مرتضیٰ بھٹو وہی ہے جو سندھ میں اپنے آبائی گاؤں کے کسی معصوم کو قتل کرنے کے بعد وہاں (سندھ) سے فرار ہو کر قانون کی گرفت سے بچنے کے لئے پنجاب کے کھیتوں اور کھلیانوں میں سردار دیال سنگھ کے فرضی نام سے زندگی بسر کرتا رہا۔ اس عرصہ میں اس مرتضیٰ بھٹو نے نہ صرف کٹر سکھوں کی طرح بال اور داڑھی بڑھائے رکھی بلکہ اس نے کنگھی اور کڑا بھی روایتی سکھوں کی طرح ہی استعمال کیا۔

راستے جدا ٹھہرے

جن مہذب جمہوری ممالک میں انتخابات کے ذریعے اقتدار منتقل ہوتا ہے۔ وہاں الیکشن کے دن خوب دھوم دھام سے الیکشن ہوتے ہیں۔ شام سے رات گئے تک الیکشن کے نتائج آجاتے ہیں اور اگلے روز پُر امن طریقے سے اکثریتی پارٹی کے لیڈر کو بلا کر اقتدار اس کے حوالے کر دیا جاتا ہے۔ برطانیہ میں یہی روایت ہے۔ اکثریتی پارٹی کے لیڈر کو ملکہ برطانیہ رات کے

کھانے پر مدعو کرتی ہے اور وہ پارٹی جن افراد کو اپنے ہمراہ کھانے پر لاتی ہے دراصل وہ اس کی کابینہ کے ارکان ہوتے ہیں۔ لیکن ہمارے یہاں تو سارا آوے کا آوا ہی بگڑ چکا تھا۔

قومی اسمبلی کے الیکشن ۷ دسمبر کو اور صوبائی اسمبلی کے الیکشن ۱۷ دسمبر کو اختتام پذیر ہوئے اور یوں جنوری کا مہینہ بھی تیزی سے تقریباً گذر ہی چکا تھا مگر یہاں ابھی تک اقتدار کے انتقال کا کوئی اشارہ اور کوئی امکان دور دور تک دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ ان حالات میں شیخ مجیب الرحمان نے ڈھاکہ میں اپنی طرف سے دباؤ ڈالنا شروع کیا۔ میرے خیال میں اس کا یہ رویہ درست اور جائز تھا کیونکہ وہ اکثریتی پارٹی کا لیڈر تھا اور اب اقتدار اس کو قانوناً اور اخلاقاً مل جانا چاہیئے تھا۔

ادھر مغربی پاکستان میں کچھ طاقتیں ایسی تھیں جو صورت حال کو جوں کا توں برقرار رکھنا چاہتی تھیں۔ اس کی راہ میں عوامی لیگ کی شاندار کامیابی ایک رکاوٹ بن گئی تھی۔ عوامی لیگ کے جو لوگ منتخب ہو کر سامنے آئے وہ سب لوئر مڈل کلاس سے تعلق رکھتے تھے یعنی انجینئرز، ڈاکٹرز وکلا، چھوٹے کاروباری لوگ، چھوٹے زمیندار، وغیرہ اور یہ لوگ اس نظریہ کے ساتھ بڑی گہری وابستگی رکھتے تھے کہ پاکستان میں سیاسی، معاشی، سماجی اور کسی حد تک عسکری تبدیلیاں ناگزیر ہو چکی ہیں۔ لہذا جو طاقتیں عوامی لیگ کی راہ میں رکاوٹ تھیں انہوں نے اتحاد کر لیا اور عوامی لیگ کے راستے میں ایک دیوار بنالی کیونکہ جو تبدیلیاں عوامی لیگ کو لانا تھی۔ اس سے فوج، بیوروکریسی، جاگیردار اور صنعت کار طبقہ نے سب سے زیادہ اور سب سے پہلے متاثر ہونا تھا۔ لہذا ان تمام طبقوں نے خود کو متحد کر لیا اور اس بات کی کوشش کرنے لگے کہ بیلٹ پیپرز کے فیصلے اور نتائج کو کسی نہ کسی طرح سازش کے ذریعے زائل اور بے اثر کر دیا جائے۔ چنانچہ ان طاقتوں نے بھٹو کو عوامی سطح پر اپنی چال چلنے کے لئے مہرہ بنایا۔ اور یوں یحییٰ خان اور بیوروکریسی کی ملی بھگت اور پشت پناہی سے بھٹو کو آگے کر کے مجیب کے خلاف سازشیں شروع کر دی گئیں۔

طے یہ پایا کہ کیونکہ شیخ مجیب الرحمان مشرقی پاکستان سے اپنا دباؤ ڈال رہا ہے۔ لہذا یہاں بھی کچھ دباؤ ڈالا جائے یہاں جنوری کے اوائل ہی میں پی پی ایل (پروگریسو پیپرز لمیٹڈ)

کے ورکرز کی چھانٹی ہوئی جس میں صفدر رمیر سمیت تقریباً ۱۸ ارکارکنوں کو برطرف کر دیا گیا۔ ہم نے فیصلہ کیا (اور ہمیں بھٹو کی اس سلسلہ میں پوری آشیرباد حاصل تھی) کہ جس طرح مجیب مشرقی پاکستان میں اپنی طاقت کا مظاہرہ کرنے کے موڈ میں ہے ہم بھی یہاں کوئی ایشو لے کر دباؤ بڑھائیں چنانچہ اتفاق سے یہ مسئلہ ہمارے ہاتھ آگیا۔ چونکہ پارٹی کے منشور کی قرارداد نمبر ۲۰ میں واضح طور پر کہا گیا تھا " ہم مقبوضہ پریس کو آزاد کرائیں گے " لہٰذا یہ ایک موقع تھا کہ ہم اپنی کومٹ منٹ کے لئے عملی طور پر کچھ اقدامات کر سکتے تھے۔ بھٹو سے اس سلسلہ میں بات ہوئی تو انہوں نے کہا Go ahead چنانچہ ہم نے ان ۱۸ ورکنگ جرنلسٹس کے لئے بھوک ہڑتال کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ طے شدہ پروگرام کے مطابق ۷ فروری کو کارداروں نے پی پی ایل بلڈنگ کے سامنے خیمہ لگا کر بھوک ہڑتال شروع کر دی۔ ۸ جنوری کو یہاں حامد یاسین جو شیخوپورہ سے قومی اسمبلی کے رکن تھے جلوس کی شکل میں آئے اور بھوک ہڑتال کر کے بیٹھ گئے۔ ۹ تاریخ کو میں قصور سے ایک بہت بڑا جلوس لے کر لاہور آیا اور مال روڈ کے راستے ہوتا ہوا پی پی ایل بلڈنگ پہنچا۔ اور پرجوش نعروں اور تقریروں کے بعد میں بھی بھوک ہڑتال کیمپ میں شامل ہو گیا اسی طرح ۱۰ تاریخ کو مختار رانا اسی طرح پرجوش کارکنوں کے ہمراہ آئے اور ہمارے ساتھ مل گئے وہ لائل پور (اب فیصل آباد) سے ایم این اے منتخب ہوئے تھے اور وہاں کے محنت کش طبقہ میں ان کا بڑا اثر تھا۔ اس بھوک ہڑتال نے ایک ایسی شکل اختیار کر لی کہ پنجاب کے کونے کونے میں بھوک ہڑتالوں کا سلسلہ چل نکلا۔

اس سلسلہ میں سب سے پہلا بھوک ہڑتال کا کیمپ میرے ایماء پر قصور کے کارکنوں نے حضرت بابا بلھے شاہ کے مزار پر لگایا۔ لائل پور میں یہ کیمپ چوک گھنٹہ گھر میں لگایا گیا۔ اسی طرح گوجرانوالہ، شیخوپورہ، جہلم، راولپنڈی اور دوسرے دور دراز کے علاقوں تک بھوک ہڑتال کا سلسلہ جاری ہو گیا چونکہ ہمارا مقصد آزادیٔ صحافت اور صحافیوں کی بحالی کے لئے جدوجہد کرنا تھا لہٰذا تمام اخبارات ہمیں خوب پبلسٹی دے رہے تھے۔ ظاہر ہے کہ ان کو اس سے ذاتی طور پر دلچسپی تھی اور وہ اس کی حوصلہ افزائی کر رہے تھے۔

دراصل یہ سارا مسئلہ اس لئے کھڑا ہو گیا کہ جنرل شیر خان (جو یحییٰ خان کے دور میں

وزیر اطلاعات و نشریات تھے) کے بارے میں یہ بات مشہور ہو چکی تھی کہ وہ نظریاتی اور فکری اعتبار سے دائیں بازو سے تعلق رکھتے ہیں ان کا جھکاؤ بھی واضح طور پر جماعت اسلامی کی طرف تھا۔ جنرل شبیر علی خان کے ماتحت نیشنل پریس ٹرسٹ کے بعض حکام نے جن میں اے کے سومار جسٹس ایس اے رحمان، زیڈ اے سلہری اور شبیر خان نے منصوبہ تیار کیا کہ اُدھر مشرقی پاکستان میں عوامی لیگ کی اکثریت اور ادھر مغربی پاکستان میں پیپلز پارٹی کی اکثریت کے اثرات کو اخبارات میں پراپیگنڈہ کے ذریعے زائل کر دیا جائے اور پھر کسی نہ کسی طرح انہی دقیانوسی طاقتوں کو اقتدار میں رہنے کا موقع فراہم کر دیا جائے۔ چنانچہ ان لوگوں نے ہی بعض اخبارات اور خاص طور پر نیشنل پریس ٹرسٹ کے اخبارات کو اپنے مذموم مقاصد کے لئے استعمال کیا۔ اور اخبارات کو مجبور کیا کہ وہ اس مہم میں ان کا ساتھ دیں جس پر ترقی پسند صحافیوں نے ایسا کرنے سے انکار کر دیا جس پر انہیں علیحدہ کر دیا گیا۔

یہی وجہ تھی کہ جب ان برطرف شدہ صحافیوں کے حق میں مہم شروع ہوئی تو وہ ایک تحریک کا رخ اختیار کر کے پنجاب کی سطح پر چل نکلی اور اخبارات میں ہمارے ہڑتالی کیمپ کی رپورٹ تصویر سمیت روزانہ چھپنے لگی۔ جب یہ تحریک زیادہ ہی سرگرم ہو گئی بلکہ یوں کہنا مناسب ہوگا کہ جب یہ اتنی شدید ہو گئی کہ ہاتھوں سے نکلنے لگی تو جنرل یحییٰ خان نے بھٹو کو راولپنڈی بلا کر اسے سخت سُست کہا۔

بھٹو کی شخصیت کا ایک رُخ یہ بھی تھا کہ موصوف حکمرانوں اور با اثر افراد کے ساتھ کمرے کے اندر کسی اور لہجہ میں بات کرتے تھے اور کمرہ سے باہر آ کر عوام کی حمایت اور خوشنودی حاصل کرنے کے لئے کسی اور لہجہ میں۔ بہرحال پنڈی سے انہوں نے ایک اخباری بیان جاری کیا جس میں کہا گیا تھا کہ یہ بھوک ہڑتال کرنے والے "سیاسی   " ہیں۔ جنہوں نے سارے پنجاب کا سیاسی ماحول مکدر کر دیا ہے۔ اس کے ساتھ ہی انہوں نے ہمیں بھوک ہڑتال ختم کرنے کے لئے کہا۔ ہمارے ہڑتالی کیمپ میں میاں محمود علی قصوری ہڑتال ختم کرنے کا پیغام لے کر آئے ہم نے مشترکہ طور پر کہا کہ جناب ہم نے تو یہ ہڑتال بھٹو صاحب کے کہنے پر ہی شروع کی تھی۔ لہٰذا اب یہ ہڑتال ہم اس وقت تک ختم نہیں کر سکتے جب تک اپنے مطالبات پورے نہ کرا لیں چنانچہ

یہ ہڑتال جاری رہی۔

اسی عرصہ میں جب بھوک ہڑتال کا یہ سلسلہ بے قابو ہونے لگا تو لاہور شہر کو فوج کے حوالے کر دیا گیا۔ کیونکہ سول انتظامیہ بالکل ناکام ہو کر رہ گئی تھی۔ عوام کے جلوس اور احتجاج ہمارے کیمپ پر ہوتے تھے۔ وہ جیالے عوام لاٹھی چارج اور آنسو گیس کی پرواہ کئے بغیر ہمارا ساتھ دینے کے لئے روزانہ آتے اور ہمارے حوصلہ بڑھاتے۔ اس وقت لاہور میں ڈپٹی کمشنر فضل الٰہی ملک اور ایس پی وکیل خان ہوا کرتے تھے۔ یہ لوگ اپنی تمام کوششوں کے باوجود عوام کے ریلے اور ہمارے جذبہ کو دبا نہ سکے لہٰذا مجبور ہو کر لاہور کو فوج کے حوالے کرنا پڑا۔ اور بریگیڈیر شفیع نے انتظام سنبھال لیا۔

بریگیڈیر شفیع نے ہمیں ایک ایکشن کے بعد وہاں سے اٹھا کر گول باغ (اب ناصر باغ) میں منتقل کر دیا۔ اس سے پہلے شدید آنسو گیس سے ہماری بری حالت ہو گئی کیونکہ ہم لوگ بھوک کے مارے سخت نقاہت محسوس کر رہے تھے اور میرا تو سخت دھوئیں کے باعث دم گھٹنے لگا تھا کیونکہ آنسو گیس کے اکثر شیل میرے کیمپ پر آ کر گر رہے تھے۔ گول باغ میں ایک طرف ہمارا کیمپ تھا اور اس کے ارد گرد خاردار تاریں لگا دی گئی تھیں۔

چند دن یونہی گذرے تا کہ ۱۴ جنوری ۱۹۷۱ء کو بھٹو لاہور آئے۔ کیونکہ بھٹو نے لاہور کے حلقہ سے اپنی جو نشست خالی کی تھی اس کا ضمنی انتخاب ہو رہا تھا۔ اور اس میں پیپلز پارٹی کے نامزد امیدوار میاں محمود علی قصوری تھے۔ اس سلسلہ میں ان کا انتخابی جلوس ریگل چوک سے مسجد شہداء اور شیزان ہوٹل کے سامنے سے شروع ہونا تھا۔

اس سے پہلے جب بھٹو لاہور ایئر پورٹ پر آترے تو اخبار نویسوں نے ان سے پوچھا تھا "کیا آپ بھوک ہڑتال ختم کرانے کے لئے جائیں گے تو بھٹو نے کہا تھا" وہ خود بھوکے مریں گے تو ہڑتال ختم کر دیں گے ادھر ہمارا اصرار تھا کہ جب تک بھٹو نہیں آئے گا بھوک ہڑتال ختم کرنے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ چنانچہ جب ریگل چوک میں بھٹو ٹرک پر سوار ہوئے تو یکدم فضا میں سینکڑوں پلے کارڈ بلند ہوئے جس پر جلی حروف میں لکھا تھا۔

First Camp then Compaign

(یعنی پہلے کیمپ میں جا کر اپنے ساتھیوں کی بھوک ختم کراؤ پھر انہیں ہمراہ لے کر انتخابی مہم پر چلیں گے) اس میں بھلا کس کو کلام ہو گا کہ بھٹو انتہائی شاطر اور موقع شناس سیاستدان تھا۔ اس نے جب دیکھا کہ زندہ دلان لاہور کے تیور آج کچھ بدلے بدلے سے ہیں اور یہ جلوس آگے نہیں چل سکتا۔ تو وہ فوراً ٹرک سے واپس اترا اور سیدھا سامنے واقع شیزان ہوٹل میں چلا گیا۔ اور وہاں ایک تھرماس میں چکن کریم سوپ اور کچھ سینڈوچ اور فرنچ پیٹیز لے کر جنرل نیازی (جو اس وقت لاہور کا ڈی ایم ایل اے تھا) کے ہمراہ گول باغ آ گیا اور آتے ہی ہماری منت سماجت شروع کر دی کہ ہڑتال کو ختم کر دو۔

بھٹو بولتے رہے اور میں خاموش رہا۔ مجھے یوں چپ دیکھ کر بھٹو نے میری طرف دیکھا اور سینڈوچ بڑھاتے ہوئے بولا:

Bhutto: Come on young Turk break the fast

اس جملہ پر جنرل نیازی تو مسکرا پڑے اور وردی بھری نظروں سے مجھے دیکھنے لگے مگر میں نے پوری سنجیدگی سے بھٹو کے سینڈوچ پکڑے ہاتھ کو پیچھے کرتے ہوئے کہا: ہم کس منہ سے ہڑتال ختم کر دیں ہمارے مطالبات تو ابھی پورے نہیں ہوئے۔ خود ہماری اساسی دستاویز میں قرارداد نمبر ۲۰ یہی ہے کہ ہم مقبوضہ پریس کو آزاد کرائیں گے۔ پھر اب بغیر کوئی ٹھوس حوالہ کے اس ہڑتال کو ختم کرنے سے ان سینکڑوں لوگوں کی حوصلہ شکنی ہو گی جو ہمارے ساتھ یک جہتی کے اظہار کے لئے مختلف شہروں میں بھوک ہڑتال کر رہے ہیں خود قومی پریس ہمارے ساتھ ہے۔ لہذا یہ بھوک ہڑتال تو ختم نہیں ہو سکتی۔ اس سے بھٹو کے چہرے پر کئی رنگ آئے اور گئے۔ وہ اس طرح کے جواب اور پھر اتنے لوگوں میں۔ سننے کا عادی تو خیر دور کی بات ہے۔ توقع بھی نہیں کر سکتا تھا۔

اس کے باوجود میں نے محسوس کیا کہ بھٹو نے قدرے ضبط اور تحمل سے کام لیا اور میرا ہاتھ پکڑ کر مجھے کھڑا کیا اور میری کمر پر ہاتھ رکھ کر مجھے دوسرے لوگوں سے الگ لے گیا۔ اس وقت صرف جنرل نیازی ہمارے ساتھ کھڑا تھا۔ بھٹو نے قدرے سرگوشی کے عالم میں کہا: دیکھو ہم اقتدار میں آنے ہی والے ہیں لہذا اب اس بھوک ہڑتال کی کوئی ضرورت نہیں۔

یہ سن کر میں نے کہا : جناب یہ کیا اصول ہے کہ اگر ہم اقتدار سے باہر ہیں تو ٹھیک ورنہ پھر اس کی کوئی ضرورت نہیں، یہ تو دوہرا معیار ہوا۔

یہ سن کر بھٹو کا پارہ چڑھ گیا۔ اس نے غصہ سے قدرے چلا کر کہا۔ مجھے کاغذ پنسل دو، میں پارٹی سے استعفیٰ دیتا ہوں تم اپنا کام کرو، بس میں جا رہا ہوں۔"

بھٹو کی آواز اس قدر اونچی ہو گئی کہ دور کھڑے صحافیوں نے بھی اسے سن لیا جس پر دوسرے دن کے اخبارات میں اس کی خبر آ گئی خاص طور پر پاکستان آبزرور (ڈھاکہ) نے بڑی جلی سرخی جمائی :

"Bhutto faces Mini revolt over P.P.L. issue"

Pakistan Observer 16th January, 1971

بھٹو جانے کے لئے چل بھی پڑے مگر ایک دم ڈرامائی انداز میں واپس آئے اور آ کر ہم بھوک ہڑتالیوں کے ہمراہ زمین پر بیٹھ گئے۔ اِدھر اُدھر کی گپ شپ شروع کر دی۔ کاردار کو کہنے لگے۔ یار۔ اچھے سگریٹ پیا کرو۔ اگر تم ایسا کرتے تو میں تم سے آج سگریٹ مانگتا۔ اس پر جنرل نیازی نے آگے بڑھ کر انہیں ولایتی سگریٹ کا پیکٹ پیش کیا مگر بھٹو نے انکار کر دیا۔ اور پیچھے سے اپنی جیب سے سگار نکال لیا۔ اور حسبِ عادت سلگانے سے پہلے اسے دونوں ہاتھوں کی انگلیوں میں لگاتے ہوئے اس سے کھیلنے لگے۔

وہ اپنا رویہ تبدیل کر چکے تھے۔ رعب کی جگہ مزاح، دھمکی کی جگہ منت اور غصہ کی جگہ ہنسی نے لے لی تھی۔ مجھے سگار دکھاتے ہوئے بولے : رضا۔ دیکھو۔ اگر آج میرا لایا ہوا سوپ نہیں پیو گے تو اس سگار جیسے ہو جاؤ گے۔ میں نے برجستہ کہا : سر اگر ایسا ہو گا تو یہ بھی آپ کی خواہش کے مطابق ہو گا۔ بہر حال کافی دیر تک اِدھر اُدھر کی باتیں کرتے ہوئے کہنے لگے : اتنا وقت تو میں نے سورن سنگھ کو بھی نہیں دیا تھا۔ چلو اٹھو۔ چوک رنگیلا پر لوگ ہمارے منتظر ہیں۔

بہر حال ہم لوگوں نے محض بھٹو کی ذاتی مداخلت اور درخواست کو مدنظر رکھتے ہوئے بھوک ہڑتال ختم کر دی۔ یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ بھوک ہڑتال کے باعث ہمارے جسموں پر نقاہت اور کمزوری کا غلبہ تھا لہذا گول باغ سے ہمیں ایمبولینس گاڑیوں میں ڈال کر البرٹ وکٹر

ہسپتال جو دراصل میو ہسپتال ہی کا حصہ ہے لے جایا گیا جہاں ہمارا مکمل چیک اپ ہوا اور ہمیں دو دن ڈاکٹر کی نگرانی میں رکھا گیا۔

اس ہسپتال کے وی آئی پی وارڈ میں ہم لوگوں نے ایک مشترکہ پریس کانفرنس سے خطاب کیا اور مطالبہ کیا کہ صفدر میر اور ان کے ساتھیوں کو فوری طور پر جیل سے رہا کیا جائے اور پی پی ایل کے امور کی پڑتال اور نگرانی کے لئے ایک ایڈمنسٹریٹر مقرر کیا جائے۔ ۱۸ برطرف شدہ ملازمین کو بحال کیا جائے اس امر کی ضمانت بھی دی جائے کہ آئندہ کوئی برطرفی عمل میں نہیں لائی جائے گی۔

ان دنوں اس خبر کا بڑا چرچا تھا کہ لاہور میں ہونے والے ہاکی ورلڈکپ کے لئے بھارتی ٹیم یہاں (لاہور) آرہی تھی۔ اسی پریس کانفرنس میں میں نے انتباہ کیا کہ اگر بھارت کی ہاکی ٹیم حسینی والا بارڈر کے راستے داخل ہوئی تو میں قصور کے عوام کو لے کر سرحد پر ہی ان کا راستہ روکوں گا اور اگر یہ لاہور ایئر پورٹ پر اترے گی تو میں ان کو اس کی اجازت نہیں دوں گا۔ ہم ان پر قبضہ کرلیں گے۔ میرا استدلال یہ تھا کہ اس وقت پاک بھارت تعلقات ایسے نہیں کہ ہم بھارت کی ہاکی ٹیم کا خیر مقدم کریں۔ یہ سیاسی چال ہے اور ہم یہ چال ناکام بنائیں گے۔

اس زمانے میں بعض سٹوڈنٹس لیڈر گرفتار ہوگئے تھے ہم نے ان کی رہائی کا مطالبہ بھی کیا ان میں جہانگیر بدر (پیپلز پارٹی پنجاب کے موجودہ راہنما) اعجاز سیفی اور افتخار وغیرہ شامل تھے۔

اس سارے واقعہ یعنی بھوک ہڑتال اور پریس کانفرنس کو بھٹو نے آنکھوں سے تو قبول کر لیا مگر دل سے نہیں۔ مراد یہ ہے کہ وہ بظاہر بڑا مطمئن رہا مگر حقیقت یہ ہے کہ اس کے دل و دماغ میں ایک طوفان اُبل پڑا تھا۔ وہ یہ برداشت ہی نہیں کرسکتا تھا کہ اس کے مقابلہ میں کوئی دوسرا شخص نمایاں ہو یا اس کی (بھٹو کی) بات کی مخالفت کرے۔ اسے سب سے بڑا قلق اور افسوس یہ تھا کہ اسے ریگل چوک میں ٹرک پر سوار ہونے کے بعد عوامی مطالبہ کے سامنے مجبور ہوکر واپس ٹرک سے اتر کر گول باغ جانا پڑا۔

جب کھر بھٹو بننے لگا

بھٹو صاحب اپنی بے پناہ خوبیوں کے باوجود اس عیب سے عاری نہیں تھے کہ وہ کینہ ور تھے اور جو بات ایک بار ان کے دل میں سما جاتی وہ اس کو فراموش نہیں کرتے تھے (معاف کرنا تو خیر دور کی بات ہے) چنانچہ انہوں نے اس بات کو بھی اپنے دل میں رکھ لیا۔

ہم البرٹ وکٹر سے فارغ ہوئے تو بھٹو نے ہمیں طلب کیا۔ وہ ابھی تک محمود علی قصوری کے الیکشن کے سلسلہ میں لاہور ہی میں تھے۔ مجھے اس بات کی خبر ہو چکی تھی کہ باقی بھوک ہڑتالیوں نے اپنی مصلحت یا مجبوریوں کے باعث بھٹو صاحب سے معافی مانگ لی تھی۔ اور آئندہ ان کی شان میں ایسی گستاخی یا حکم عدولی نہ کرنے کا یقین دلایا تھا۔ لہٰذا جب میں بھٹو سے ملوں گا تو مجھے ماضی سے قدرے مختلف ماحول کا سامنا کرنا ہو گا۔

چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ جب میں بھٹو صاحب سے ملنے کے لئے گیا اور ابھی کمرے میں داخل ہی ہوا تھا کہ ملک غلام مصطفےٰ کھر نے مجھ سے درشت اور قدرے بدتمیزی سے مخاطب ہونے کی کوشش کی۔ ابھی وہ اپنی بات شروع ہی کرنے والا تھا کہ میں نے نتائج کی پرواہ کئے بغیر اس پر سخت الفاظ میں چڑھائی کر دی اور میرے منہ میں جو آیا میں نے کہہ دیا۔ عام تاثر یہی تھا کہ میں دب جاؤں گا مگر جب میں نے اینٹ کا جواب پتھر سے دینے کا انداز اختیار کیا وہ ڈبک گیا۔

بھٹو کی فطرت تھی کہ وہ ہر کسی پر دباؤ ڈالتے اور اپنا رعب جھاڑتے اگر کوئی ان کے اس سلوک کو کسی بھی وجہ سے قبول کر لیتا تو وہ اس کی بے عزتی کرتے رہتے تھے مگر اگر کوئی ان کی پہلی بات کے جواب میں ہی آگے سے جواب دیتا تو وہ خاموش ہو جاتے تھے۔ چنانچہ یہاں بھی ایسا ہی ہوا۔ جب بھٹو نے دیکھا کہ میں نے کھر کے رعب میں آنے سے انکار کر دیا ہے اور میرا رویہ بڑا ہی مشتعل ہے تو وہ چپ ہو گئے۔ دراصل کھر میں اتنی جرأت یا حوصلہ نہ تھا کہ وہ مجھ سے اس زبان میں ہمکلام ہوتا۔ اس کو تو بھٹو صاحب نے کہا تھا کہ رضا کو ذرا ڈانٹ پلا دینا۔ ان کا خیال تھا کہ ایک تو وہ یوں (کھر سے) مجھے ڈانٹ پلا کر میری بے عزتی

کرائیں گے۔ اور کھر کو شہہ دیں گے اور دوسری طرف اگر میں کھر کے رعب میں آگیا تو پھر وہ خود میری باز پرس کریں گے۔ مگر جو ہوا وہ ان کی توقعات اور منصوبہ کے الٹ تھا۔ لہٰذا وہ چپ کر کے ہم دونوں کو دیکھتے رہے۔ بہر حال ان کے ذہن میں یہ بات اب اچھی طرح سما گئی تھی کہ میں (رضا) ان کے سامنے اکڑ بھی سکتا ہوں اور کوئی غلط بات برداشت بھی نہیں کروں گا۔

۳۰ جنوری ۱۹۷۱ء کو ہاشم اور اشرف قریشی نے انڈین ایر لائینز کا ایک فوکر طیارہ گنگا جو اپنے معمول کی پرواز پر سری نگر سے دہلی جا رہا تھا۔ اسے اغواء کیا اور لاہور کے ائر پورٹ پر اتار لیا۔ اس موقع پر بھٹو لاہور خصوصی طور پر آئے۔ انہوں نے ایپرن (جہاں جہاز کھڑا ہوتا ہے) پر جا کر ان دونوں سے ملاقات کی (اس موقع پر جو بات چیت ہوئی وہ آج تک صیغۂ راز میں ہے)۔ اس کارنامہ پر ان کو مبارک باد دی اور حوصلہ افزائی کے لئے ان کا منہ چوما۔

گنگا طیارہ کو تو تباہ کر دیا۔ البتہ اس کے مسافروں کو واپس بھارت روانہ کر دیا گیا اور لاہور کے سادہ لوح جیالوں نے ان دونوں ہائی جیکروں کا زبردست استقبال کیا۔ خاص طور پر پیپلز پارٹی ان کے خیر مقدم اور جلوس میں بڑی سرگرم اور پیش پیش رہی۔

عوام کو اس واقعہ کی سنگینی کا احساس اس وقت ہوا جب چند دنوں کے بعد بھارت نے اپنے علاقے سے گذر کر مشرقی پاکستان جانے والی پی آئی اے کی پروازوں کے لئے راستہ دینے سے انکار کر دیا۔ یوں ڈھاکہ جانے کے لئے پی آئی اے کو براستہ کولمبو جانا ہوتا تھا۔ اس سے نہ صرف پی آئی اے کے اخراجات بہت زیادہ بڑھ گئے بلکہ آگے چل کر یہی رکاوٹ بہت سی قباحتوں کا باعث ہوئی۔

اِدھر ہم، اُدھر تم

۱۴ فروری ۱۹۷۱ء کو بھٹو نے پشاور میں حیات محمد شیرپاؤ کے گھر پر ایک پریس کانفرنس سے خطاب کیا اور کہا۔

Peoples Party would not be attending the forthcoming session of the National Assembly because we would be treated as double hostages and that we would be going to slaughter house.

(یعنی پیپلز پارٹی قومی اسمبلی کا آئندہ ۳ مارچ کے اجلاس میں اس لئے شرکت نہیں کرے گی۔
کہ وہاں ہمیں دوہرے یرغمال کے طور پر رکھا جائے گا اور ہم میدان قتال میں جائیں گے۔) ان دو جملوں
میں جو بظاہر بڑے بے ضرر تھے، بھٹو نے ڈھاکہ نہ جانے کا فیصلہ کیا اس پریس کانفرنس کے بعد
بھٹو لاہور آگئے۔

میں نے بھٹو صاحب سے درخواست کی کہ میں ان سے علیحدگی میں ملنا چاہتا ہوں۔ کیونکہ
میں نے محسوس کر لیا تھا کہ بھٹو کے اس بیان کے بعد لاہور کے سیاسی حلقوں میں ایک عجیب اور
بے نام سی بے چینی پھیل گئی تھی۔ مخالفین کو تنقید کرنے کا موقع ہاتھ آگیا۔ ہم جب بھی کسی ایسی
جگہ جاتے جہاں دانشور اور سیاسی سوجھ بوجھ رکھنے والے لوگ جمع ہوتے ہیں (مثلاً بار روم،
پاک ٹی ہاؤس، چائنیز لنچ ہوم، شیزان وغیرہ) لوگ ہم سے ایک ہی سوال کرتے، آپ اجلاس
میں شرکت کیوں نہیں چاہتے ؟۔ اور اس انکار سے بھٹو صاحب کی کیا مراد ہے، وہ کیا چاہتے
ہیں۔ کیونکہ ہم لوگ (خاص طور پر میں) اس بیان کے پس منظر اور مقاصد سے خود ہی بے خبر
تھے لہذا ہم سخت پریشان تھے۔ اپنے ذہن کو صاف کرنے اور لوگوں کے سوالات کا جواب
دینے کے لئے ہی میں نے بھٹو سے ملاقات کا وقت چاہا تھا۔ جو انہوں نے دیدیا۔

میں نے بھٹو صاحب سے ملتے ہی کہا: آپ نے پشاور میں جو بیان دیا ہے۔ اس سے
لوگوں میں ایک طرح کا ہیجان پیدا ہو گیا ہے۔ لوگ ہم سے سوال کرتے ہیں کیونکہ لوگوں کے
درمیان تو ہم ہی جاتے ہیں۔ آپ مہربانی کر کے اس بیان کا مقصد، پس منظر اگر عام نہیں
تو کسی حد تک مجھے ہی بتا دیں تاکہ میں کارکنوں اور عام لوگوں کو قائل کر سکوں اور مخالفین
کے پراپیگنڈہ کا جواب دے سکوں۔ آپ بہر حال زیرک سیاستدان ہیں بہت دور تک
دیکھ سکتے ہیں۔ آپ اس سلسلہ میں کچھ تو بتائیں۔

میں جتنی دیر بولتا رہا۔ وہ بغور میرے چہرے کی طرف دیکھتے رہے۔ اور جب میں نے
بات ختم کی تو انہوں نے کہا: بولو۔ اور بولو۔!!

میں نے کہا: جناب بس مجھے اتنا ہی کہنا ہے۔
اس پر وہ خاموش ہو گئے۔ میں نے محسوس کیا کہ وہ کچھ کہنا چاہتے ہیں مگر نہیں کہہ رہے پھر اچانک انہوں نے پہلو بدل کر الٹا مجھ سے سوال کر ڈالا: کیا تم میری قیادت پر شک کرتے ہو؟
میرے لئے یہ سوال بالکل غیر متوقع بلکہ حیران کن تھا۔ لہٰذا میں نے کہا: ایسی کوئی بات نہیں۔ ایسا بھلا کیسے ہو سکتا ہے۔ میں تو ان لوگوں میں سے ہوں۔ جنہوں نے آپ پر ہونے والے حملے خود پر سہے ہیں......
انہوں نے میری بات کاٹ کر کہا: ہاں یہ درست ہے۔ مگر.....
پھر خود ہی انہوں نے اپنی ادھوری بات چھوڑ دی اور بولے:

People either accept their leaders or they don't accept their leaders.

میں نے ان سے پھر بڑے ادب سے کہا: جناب اس میں کرنے کا تو سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ میں نے تو آپ سے ایک سادہ سوال کیا ہے، آپ مجھے اس کا جواب دے دیں تاکہ میرا ذہن مطمئن ہو جائے۔
میری اس بات کا انہوں نے کوئی جواب نہیں دیا چنانچہ میں نے ایک بار پھر کہنا شروع کیا۔ میری معلومات اور علم یہی ہے کہ قومی اسمبلی کا پلیٹ فارم ہی سب سے زیادہ موثر اور موزوں ہے۔ لہٰذا میرے خیال کے مطابق تو ہمیں ۳ مارچ کے اجلاس میں ضرور جانا چاہیئے۔ کیونکہ ہمیں قوم نے اسمبلی کا بائیکاٹ کرنے کے لئے منتخب نہیں کیا۔ بلکہ میں نے جذباتی انداز میں یہاں تک کہہ دیا کہ اگر آپ لاڑکانہ سے نہ جیتے اور ایوب کھوڑو جیت جاتا تو وہ ڈھاکہ جاتا۔ اسی طرح اگر میں نہ جیتا تو میری جگہ جمیل شر قصوری چلے جاتے۔ اس دور میں لوگ اپنے نمائندہ اسی لئے منتخب کرتے ہیں کہ وہ ان کی نمائندگی کریں اور کارروائی میں حصہ لیں۔ اب اگر ہم اس نمائندگی اور شرکت سے انکار کرتے ہیں تو دراصل ہم ان کی طرف سے دیئے گئے اعتماد کی نفی کرتے ہیں۔
میں نے ایک لمحہ کو رک کر دیکھا۔ بھٹو پوری توجہ سے میری باتیں سن رہے تھے۔ میں نے پھر کہنا شروع کر دیا۔ "اگر بعض امور طے کرنا بھی ہیں تو اس کے لئے قومی اسمبلی بہترین جگہ ہے۔

وہاں افہام و تفہیم سے بہت سارے امور طے کئے جا سکتے ہیں۔ اور اگر آپ اس پلیٹ فارم کو مسترد کرتے ہیں تو فرمایئے کہ آپ کے ذہن میں متبادل پلیٹ فارم کون سا ہے۔ کیا متبادل پلیٹ فارم گول میز کانفرنس کا ہے۔ اگر یہی بات ہے تو آپ تو اس بات کو تقریباً دو سال پہلے خود ہی مسترد کر چکے ہیں کیونکہ جب ایوب خان نے گول میز کانفرنس طلب کی تو آپ نے اس کو مسترد کر دیا تھا۔ حالانکہ اسی کانفرنس میں ایوب خان نے عوام کی طرف سے کئے گئے تمام مطالبات تسلیم کر لئے تھے۔ آپ نے اس گول میز کانفرنس کو موچی دروازے اور نشتر پارک میں جا کر چوں چوں اچکوں کی کانفرنس قرار دیا تھا۔ اب اگر بالآخر ہمیں گول میز کانفرنس کا راستہ ہی اختیار کرنا ہے تو پھر یہ دو سال کی جدوجہد کس لئے تھی۔ لہٰذا ہماری اخلاقی اور آئینی ذمہ داری ہے کہ ہم ڈھاکہ جا کر قومی اسمبلی کے اجلاس میں شرکت کریں۔

میرے دل و دماغ پر جو بوجھ تھا میں نے اسے اتارنے کا فیصلہ کر لیا تھا اور میرا خیال تھا کہ اس وقت بھٹو صاحب سننے کے موڈ میں ہیں لہٰذا انہیں ہر بات سنا دینا چاہیئے اور واقعی ایسا ہوا۔ میں ذرا سانس لینے کو رکا تو انہوں نے اضطرابی کیفیت میں اپنا ہاتھ تیزی سے اپنے بالوں میں پھیرتے ہوئے کہا: رک کیوں گئے، تم تو بہت اچھے مقرر ہو! یہ سن کر میں مسکرا دیا لیکن آج مجھے اسوقت یاد آتا ہے تو محسوس ہوتا ہے کہ اس وقت بھٹو کا چہرہ ہر طرح کے جذبات سے عاری تھا۔ اور وہ شاید مجھے سننے سے زیادہ کسی اہم فیصلہ تک پہنچنے کے لئے اندر ہی اندر پیچ و تاب کھا رہے تھے۔ بہرحال ان کی بات سن کر میں نے پھر کہنا شروع کر دیا کہ سیاسی معاملات یکطرفہ طور پر یا خود کلامی سے طے نہیں کئے جاتے۔ کیونکہ سیاست میں اس کا مطلب آمریت، ٹکراؤ اور دوسری پارٹی کی اہانت ہوتا ہے سیاسی امور تو ہمیشہ بات چیت، اور مذاکرات کے ذریعے طے پاتے ہیں کیونکہ بات چیت کے ذریعے ہی بے شمار مشکلات پر قابو پایا جاتا ہے۔ اور افہام و تفہیم کی صورت نکلتی ہے۔ یوں مشترکہ سوچ اور فکر کی ایک ایسی فضا پیدا ہو جاتی ہے جس میں قومی مسائل اور امور کو احسن طریقے سے طے کیا جا سکتا ہے۔ لہٰذا میں یہ سمجھتا ہوں کہ ہمیں ڈھاکہ کے اجلاس میں ضرور شرکت کرنا چاہیئے ورنہ تو پاکستان کا شیرازہ بکھر جائے گا۔ اور آپ نے پشاور میں پریس کانفرنس میں جس

فیصلہ کا اعلان کیا ہے۔ میری سوچ کے مطابق یہ غلط فیصلہ ہے اور اس پر آپ کو نظرثانی کرنا چاہیئے بس یہ وہ مرحلہ تھا جہاں بھٹو صاحب کا ضبط جاتا رہا۔ وہ سخت ناراض اور خفا ہونے کے انداز میں ماتھے پر بل ڈال کر بولے: کیا تم کو میری قیادت پر اعتماد نہیں رہا اور تم میری سیاست کو شک کی نظر سے دیکھتے ہو:

میں نے ایک بار پھر اپنی اسی بات کو دہرایا کہ جناب ایسی کوئی بات نہیں۔ یہ تو میں محض آپ سے راہنمائی حاصل کرنے کے لئے دریافت کر رہا ہوں۔ آپ میرے خلوص کو غلط نہ تصور کریں لیکن بھٹو چپ رہے۔ ایک دو بار انہوں نے ہونٹ کاٹے اور صرف ایک بار خود کلامی کے انداز میں آہستہ سے کہا: مشکل یہ ہے کہ تم احمد رضا ہو۔!

میں سمجھ گیا کہ اب بھٹو صاحب کا موڈ بالکل آف ہو چکا ہے۔ لہذا میں اجازت لے کر چلا آیا۔ انہوں نے صوفہ پر بیٹھے بیٹھے ہی مجھ سے ہاتھ ملایا۔ حالانکہ اس سے پہلے وہ ہمیشہ مجھے کھڑے ہو کر شانوں پر تھپکی دے کر اور کوئی خوبصورت سا جملہ کس کر رخصت کیا کرتے تھے۔ میں ابھی دروازہ سے باہر بھی نہیں نکلا تھا کہ انہوں نے انتہائی غصہ کے عالم میں چیخ کر کہا۔ کوئی ہے یا سب چلے گئے۔؟

تب میں نے اس کو محض اتفاق سمجھ کر اہمیت نہیں دی تھی مگر آج جب ماضی کے واقعات کا تجزیہ کرتا ہوں تو احساس ہوتا ہے کہ اُس دن کی اس ملاقات کے بعد بھٹو صاحب کا رویہ مجھ سے بالکل بدل گیا اور میں کہہ سکتا ہوں کہ یہ ملاقات میرے اور بھٹو کے تعلقات میں ایک موڑ کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس کے بعد بھٹو صاحب نے مجھے اپنی ان محفلوں میں بھی بلانا ترک کر دیا جو پارٹی کے چند گنے چنے لوگوں کی غیر سرکاری طور پر ان کی خلوتوں میں ہوتی تھی۔ دراصل اس ملاقات میں بھٹو اس نتیجہ پر پہنچ چکے تھے کہ احمد رضا ان لوگوں میں سے نہیں جو میرے پیچھے آنکھیں بند کر کے چلے آرہے ہیں اور یہ کہ یہ شخص میرے آئندہ منصوبوں کا ادراک بھی رکھتا ہے۔

روپ بہروپ

اصل بات یہ تھی کہ جیسا کہ میں نے پہلے کہا فوج، بیوروکریسی، جاگیردار، سرمایہ دار اور

بڑے صنعت کار ۔ انہوں نے بھٹو کو اپنی طرف سے آگے کر دیا تھا۔ کیونکہ ان کو علم تھا کہ صرف بھٹو ہی میں آتنی صلاحیت اور سیاسی قوت ہے کہ وہ مشرقی پاکستان کی منتخب قیادت سے ٹکرا کر ان طبقوں کے مفادات کا تحفظ کر سکتا ہے ۔ لہذا پشاور کی پریس کانفرنس ایک سوچے سمجھے منصوبہ کے تحت بلائی گئی تھی اور اس میں بھٹو صاحب کا مذکورہ بیان بھی ایک طے شدہ منصوبہ کا پہلا قدم تھا ۔

دراصل ہوا یہ تھا کہ جنرل یحییٰ خان نے الیکشن سے پہلے سیاست میں کوئی حصہ نہیں لیا اور اپنی غیر جانبداری برقرار رکھی ۔ لیکن الیکشن کے بعد اس نے نہایت مکاری سے ایک ایسی صورت پیدا کر دی جس میں بھٹو نے جان بوجھ کر ایک اہم کردار ادا کیا ۔ جنرل یحییٰ خان کی خواہش تھی کہ اس کی اہمیت کو تسلیم کیا جائے لہذا اسی منصوبہ کے تحت لاڑکانہ میں شکار کا پروگرام بنا جس میں بھٹو صاحب یحییٰ خان کے میزبان تھے ۔ بعض مبصرین اس پر یہ فکر انگیز تبصرہ بھی کرتے ہیں کہ وہاں مرغابیاں نہیں پاکستان شکار ہوا ۔ !! اسی موقعہ پر لاڑکانہ پلان تیار ہوا جس میں بھٹو کی پشت پناہی کرنے والی طاقتوں کی حسب منشاء معاملات طے ہوئے اور بھٹو آگے چل کر اس پر عمل پیرا رہے ۔

ایک یادگار سفر

کچھ عرصہ کے بعد پیپلز پارٹی کا ایک پارلیمانی کنونشن کراچی میں ۲۰ ، ۲۱ ، فروری ۱۹۷۱ء کو پی آئی ڈی سی کے آڈیٹوریم (کلفٹن) میں ہوا ۔ جس میں منتخب نمائندوں کے علاوہ پارٹی کے بعض عہدیدار بھی شریک ہوئے ۔ پنجاب کا وفد لاہور سے بذریعہ ٹرین روانہ ہوا ۔ جس کے تمام انتظامات میرے ذمے تھے ۔ میں نے ٹرین میں خصوصی بوگیاں لگانے کا بندوبست کیا اور یوں جب ہم روانہ ہوئے تو بالکل ایک بارات کا سا سماں تھا ۔ رات میں ہر جگہ عوام نے اسٹیشنوں پر ہمارا پرجوش استقبال کیا تھا کہ حتیٰ اسٹیشنوں سے رات کے ۲ بجے گاڑی گذری وہاں بھی لوگ محبت اور عقیدت کے پھول نچھاور کرنے کے لئے موجود تھے ۔ جہاں کھانے کا وقت ہوتا ۔ وہاں دیگوں کا بندوبست تھا ۔ لوگوں کی محبت اور وابستگی دیکھ کر ایک عجیب سی خوشی

محسوس ہوتی تھی۔

میرے ہم سفر رفقاء نے میری یہ ڈیوٹی لگادی کہ جس اسٹیشن پر لوگ جمع ہوں ان کا شکریہ ادا کرنے کے لئے میں تقریر کردوں یوں مجھے لاہور سے کراچی تک کے ہر بڑے اور چھوٹے اسٹیشن پر عوام سے براہ راست خطاب کرنے کا موقع میسر آگیا اور میں ہر جگہ بات دہراتا تھا کہ آپ لوگوں نے جس جوش اور جذبہ سے پارٹی کے منشور کی تائید کرکے ہمیں ووٹ دیئے ہیں ہم اس کو آپ کی توقعات کے خلاف استعمال نہیں کریں گے۔ کوئی فیصلہ عوام کی منشاء کے خلاف نہیں ہوگا۔ ظاہر ہے کہ سال ہا سال سے استحصال اور زیادتیوں کے مارے لوگ جب یہ باتیں سنتے تھے تو ان کے حوصلے بلند ہوتے اور میں نے ایسے ہی موقع پر ان کی آنکھوں میں اعتماد اور یقین کی ناقابل بیان چمک محسوس کی۔

اسی سلسلے میں میں نے یہ بھی محسوس کیا کہ لوگوں نے پیپلز پارٹی کو اس لئے ووٹ نہیں دیئے کہ بھٹو سابق وزیر خارجہ ہے۔ جاگیردار ہے یا ذہین ہیں۔ یوں تو دولتانہ بھی ذہین تھا۔ بلکہ لوگوں نے تو اپنی محرومیوں اور ناآسودگیوں کو ووٹ دیئے تھے کہ اس کے نتیجہ میں ان کے سروں پر تنی ہوئی صدیوں کی استحصال اور جبر کی سیاہ رات ختم ہو گی۔ ان کا خیال تھا کہ یہ ایک پارٹی ایسی ہے جو ان کی غربت، افلاس اور تحقیر کا خاتمہ کرے گی، کیونکہ اس پارٹی نے پہلی بار عوامی سطح پر آکر غریبوں کے حقوق کا نعرہ بلند کیا ہے۔

داستانِ حسرت

بہرحال یوں انتہائی پرجوش انداز میں ولولہ انگیز منزلیں طے کرکے ہم بالآخر کراچی پہنچے۔ اسی شام میں نے بھٹو صاحب سے ایک ملاقات کی۔ جس میں پارٹی کے بعض اہم امور زیر بحث آئے۔ البتہ میں نے خاص طور پر ان سے کہا کہ جناب جب سے الیکشن کے نتائج کا اعلان ہوا ہے یوں محسوس ہوتا ہے جیسے پارٹی کے سب دروازے کھل گئے ہیں اور لوگ وہ لوگ جو کل تک ہمیں کافر قرار دیتے تھے، ہم سے نفرت کرتے تھے اور ہماری راہ میں کانٹے بچھا رہے تھے۔ آج اپنے ہزاروں ساتھیوں سمیت پارٹی میں شامل ہو رہے ہیں۔

اس سلسلہ میں وہ بس یکطرفہ اعلان پر اکتفاء کر رہے ہیں نہ تو وہ پارٹی کے قواعد وضوابط کو مدنظر رکھتے ہیں اور نہ ہی پارٹی کی کمان سے کسی بھی سطح پر وہ کوئی رابطہ کرنے کی زحمت گوارہ کرتے ہیں میرا خیال ہے کہ اس سے پارٹی کے ان جیالے کارکنوں میں جنہوں نے اس تمام عرصہ میں شدید مخالفت کا سامنا کیا۔ مشکلات کا مقابلہ کیا اور طرح طرح سے زیر عتاب رہے۔ ان کارکنوں میں سخت مایوسی پھیلنا شروع ہو گئی ہے۔ میری یہ بات سن کر بھٹو نے کہا: تو پھر تم کیا چاہتے ہو، تمہارا کیا خیال ہے؟

میں نے سنجیدگی سے جواب دیا "میرے خیال میں اوّل تو ان کو پارٹی میں داخل ہونے ہی نہیں دینا چاہیئے تھا مگر اب اگر یہ آ ہی گئے ہیں تو ان سے کہا جائے کہ اگر وہ پارٹی کے منشور سے مخلص اور سنجیدہ ہیں تو اپنے جذبہ کی صداقت کا ثبوت دیتے ہوئے اپنی جائیداد کا نصف پارٹی کے نام کر دیں۔

میرے اس تقاضے اور اصرار کا پس منظر یہ تاریخی حقیقت تھی کہ کوئی بھی شخص اپنے طبقہ کی خصوصیات اور مفادات کے خلاف اقدام نہیں کیا کرتا۔ اور یہ جو اب قریشی، کھگے لڑانے، تالپور، جتوئی، ٹمن، لون اور مخدوم جوق در جوق یوں چلے آ رہے تھے جیسے میلہ مویشیاں دیکھنے آ رہے ہوں تو یہ بات ایسی نہیں جسے نظر انداز کر دیا جائے۔ کیا یہ لوگ راتوں رات جاگیرداروں، سرمایہ داروں اور استحصال کے خلاف ہو گئے ہیں؟ کیا انہوں نے بیک وقت کسانوں، مزدوروں، ہاریوں، کلرکوں، رکشہ والوں اور ایسے ہی دوسرے محنت کشوں کے پسینہ کا احترام کرنا سیکھ لیا ہے۔ یہ درست ہے کہ بعض اوقات تاریخ میں کوئی مارشل چیوٹے (کمانڈرریڈ آدمی) چواین لائی۔ اور خود بھٹو بھی پیدا ہو جاتا ہے جو اپنے طبقہ کے مفادات کو نظر انداز کرتے ہوئے پرولتاری کا کردار ادا کرتا ہے لیکن سوال یہ تھا کہ یہ تمام لوگ فکری، ذہنی اور سیاسی اعتبار سے یک لخت (مارشل چیوٹے، چواین لائی اور بھٹو) کے ہم پلہ ہو گئے تھے اور ان کے ذہنوں میں انقلاب آگیا تھا۔ لیکن اس کے باوجود میں ان کی دیانت اور فیصلہ کو شک کی نظر سے نہیں دیکھتا۔ البتہ میرا اصرار ہے کہ یہ اپنے ایثار کا مظاہرہ کرتے ہوئے اپنی آدھی جائیداد پارٹی کے نام کر دیں۔ اس طرح جو سرمایہ جمع ہو اس سے بینیز

پارٹی ورکرز ٹرسٹ قائم کیا جائے۔ جس سے پارٹی کے کارکنوں کی تربیت، بہبود، وغیرہ کے ٹھوس بنیاد پر انتظامات کئے جائیں۔ تاکہ جب پارٹی اقتدار سے باہر آئے تو اسی ٹرسٹ کی مدد سے پارٹی کا سارا نظام چلتا رہے پارٹی کے جو ورکرز قید و بند کی صعوبتیں برداشت کریں ان کے اہل خانہ کی دیکھ بھال کا کام ہو۔

میں نے بھٹو صاحب سے کہا کہ جناب جس آدمی نے آج آپ کے کہنے پر جائیداد نہیں دینی اس نے کل بھی نہیں دینی لہذا جس نے کل منحرف ہونا ہے بہتر ہے کہ اس کو آج ہی فارغ کر دیا جائے گویا میرا موقف یہ تھا کہ ان نوواردوں کی آزمائش ہو جائے۔

دوسری بات میں نے بھٹو صاحب سے یہ کہی کہ عام طور پر ترقی یافتہ ممالک میں جب کوئی پارٹی برسر اقتدار آجاتی ہے تو پھر پارٹی اور حکومت ایک ہی شے ہو جاتی ہے۔ بعض پارٹی کے عہدیدار اور حکومت کے برسر اقتدار لوگ۔ دونوں ایک ہی ہوتے ہیں۔ اس سے احتساب کا عمل ختم ہو جاتا ہے اور رفتہ رفتہ پارٹی کمزور ہو جاتی ہے۔ عام طور پر لوگ حکومت کے کام کاج میں زیادہ دلچسپی لیتے ہیں جس کے نتیجہ میں بیوروکریسی پر انحصار بڑھ جاتا ہے۔ لہذا میرا خیال ہے کہ پارٹی کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا جائے تو ایک

Parliamentary group of the party

(پارلیمانی پارٹی گروپ) ہو جس میں ارکان اسمبلی و پارلیمنٹ ہوں۔ اور دوسری The party ہو جس میں پارٹی کے عہدیدار ارکان شامل ہوں اس کی قیادت ارکان اسمبلی و پارلیمنٹ کے پاس نہیں ہونا چاہیئے یعنی یہ نہیں ہونا چاہیئے کہ پنجاب کا وزیر اعلیٰ، پنجاب پارٹی کا بھی سربراہ ہو۔ یا کوئی ایم این اے کسی ضلعی تنظیم کا سربراہ ہو۔ ایسا نہیں ہونا چاہیئے۔ اگر آپ احتساب کے عمل کو آگے بڑھنا چاہتے ہیں تو ایسا کرنا ہوگا۔ اور اس سلسلہ میں اصول یہ وضع کر دیا جائے کہ پارلیمانی گروپ۔ اصل پارٹی کے تابع ہوگا۔ اور اصل پارٹی کے فیصلوں کی روشنی میں پارلیمانی پارٹی گروپ اسمبلی کے اندر قوانین تیار اور پاس کرے۔ یہی وہ طریق ہے جس کے ذریعہ پارٹی کو ہر دور میں گلیوں بازاروں، کھلیانوں اور کارخانوں میں بقا اور دوام حاصل رہے گا۔ پارٹی کی جڑیں عوام میں

حقیقی معنوں میں بڑی گہری ہوں گی اور نظریاتی سطح پر نہایت گرانقدر خدمات انجام دینے کا سلسلہ ہمیشہ جاری رہے گا۔

میں اپنی یہ باتیں جو میں نے بڑے جوش اور جذبہ سے بیان کیں۔ختم کیں تو بھٹو نے بڑے معنی خیز انداز میں ایک گہری نظر سے مجھے سر سے پاؤں تک دیکھا۔ اور میری کسی بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔ بلکہ کھڑکی سے باہر دیکھنے لگے اس سے میں نے یہ اندازہ لگایا کہ بھٹو صاحب کے لئے اب پارٹی کا استحکام، مستقبل اور وجود بے معنی ہو گیا ہے۔ انہوں نے اسے (پارٹی کو) سیڑھی کے طور پر استعمال کیا۔ اس کی مدد سے وہ قومی سیاست کی چھت پر چڑھ گئے ہیں اور اب وہ ایک ٹھوکر سے اس سیڑھی (پارٹی) کو نیچے گرانے میں کوئی تامل نہیں کریں گے۔ یوں بھی وہ پارٹی ڈسپلن کو اس قدر منظم یا مربوط نہیں دیکھنا چاہتے تھے کہ اس کا سلسلہ خود ان کی ذات تک پہنچے۔

اسی طرح میں نے یہ بھی کہا کہ پارٹی میں الیکشن کرائے جائیں کیونکہ اب تک ہم نامزدگیوں پر گذارہ کر رہے ہیں۔ اگر کوئی پارٹی خود اپنے اندر جمہوریت رائج نہیں کر سکتی تو وہ لوگوں کو کس طرح جمہوریت کا درس دے گی۔

میری یہ بات سن لینے کے بعد بھٹو نے بدستور خاموشی اختیار کئے رکھی تو میں نے کہا۔ جناب میں نے اپنی معروضات ختم کر لی ہیں اور اب آپ کے جواب کا منتظر ہوں۔

یہ سنتے ہی انہوں نے میری طرف دیکھا اور کہا۔

Now, you want to teach me politics?

میں نے ان کے لہجہ کی درشتی محسوس کرتے ہوئے کہا۔

Not at all Sir It is neither my intention nor my desire. I have laid my submissions before you. It is now for you either to accept or reject it.

اس پر انہوں نے بالکل طیش میں آ کر قدرے اُونچی آواز میں کہا۔

Raza Qasuri, politics is nothing but

Power - Power and POWER.

میں نے محسوس کیا کہ اگر اب میں نے اپنی اصول پسند کی گفتگو جاری رکھی تو بھٹو صاحب اپنے سے باہر ہو جائیں گے لہذا میں نے کہا:

Right Sir. That is all for the time being. I hope you will give your considered opinion on my submissions.

اور یوں میں نے رخصت چاہی اور چلا آیا۔

گفتی و ناگفتی

اگلے روز پارلیمانی گروپ کا کنونشن شروع ہوا۔ اس موقع پر بڑا موضوع یہی زیر بحث آیا کہ ۳، مارچ کو قومی اسمبلی کے اجلاس میں پیپلز پارٹی شرکت کرے یا نہ کرے اس پر بڑی گرما گرم بحث ہوئی۔ مختلف لوگوں نے اپنا موقف پیش کیا۔

میرا موقف یہی تھا کہ ہمیں اس اجلاس میں ضرور جانا چاہیئے اور اس سلسلہ میں میں نے دلیل یہ دی کہ پارٹی کے منشور یعنی روٹی، کپڑا اور مکان۔ اور ایک ترقی پسند معاشرے کے قیام کے سلسلہ میں سب سے زیادہ موزوں اور بہتر جگہ تو خود مشرقی پاکستان ہے۔ لیکن چونکہ وقت کم تھا لہذا مجبوراً ہم مغربی پاکستان تک رہے اور بدقسمتی سے ہم اُدھر کا رخ نہیں کر سکے۔ لہذا اب وقت ہے کہ ہم پیپلز پارٹی کی بنیاد مشرقی پاکستان میں رکھ سکتے ہیں۔ میرا اصرار تھا کہ اگر پنجاب اور سندھ میں جہاں کہ جاگیرداروں اور سرمایہ داروں کا غلبہ ہے، لوگ ہمارے ساتھ ایسی واضح اکثریت سے شامل ہو سکتے ہیں کہ جو ہماری توقعات سے بھی زیادہ ہے اور ہم نے عوامی تائید سے بڑے بڑے برج الٹا دیئے ہیں تو بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ اگر مشرقی پاکستان میں جا کر کام کیا جائے تو اس کے کیا اثرات ہوں گے۔ میں نے اپنی تقریر کے

اختتام پر کہا کہ پارٹی اور بھٹو صاحب کی اخلاقی، قانونی، سیاسی اور آئینی ذمہ داری ہے کہ وہ ڈھاکہ جائیں اور اپوزیشن کی حیثیت سے اپنے فرائض ادا کریں۔ کیونکہ جمہوریت کے پودے کی آبیاری اسی طرح کی جا سکتی ہے۔

میں نے یہ بھی کہا کہ ہم کل ملا جلا کر ۸۷، ۸۸ کے لگ بھگ ممبران ہوں گے اور یہ کوئی معمولی اقلیت نہیں۔ بلکہ ایک مضبوط اور فعال اپوزیشن ثابت ہو گی۔ اس کے علاوہ میرا تجزیہ یہ تھا کہ شیخ مجیب نے جو اس قدر بھاری اکثریت حاصل کی ہے اس کا سبب یہ تھا کہ اس نے اکتوبر ۱۹۷۰ء کے ہلاکت خیز طوفانوں اور سیلاب کے بعد امدادی کارروائیوں میں تاخیر سمیت سب خرابیوں کی جڑ مغربی پاکستان کو قرار دیا اور یوں اس نے وہاں کے عوام کے دلوں میں مغربی پاکستان والوں کے خلاف نفرت پیدا کر کے ووٹ حاصل کر لئے۔ پھر شیخ مجیب بنیادی طور پر مدبر یا اعلیٰ منتظم نہیں لہٰذا جب ہم وہاں جائیں گے اپنا نقطہ نظر بیان کریں گے اور ان کی اکثریت کو تسلیم کر لیں گے تو شیخ مجیب خود پوری طرح بے نقاب ہو جائے گا۔ اور یوں وہ پانچ سال کی بجائے بمشکل دو اڑھائی سال چل سکے گا جس کے نتیجہ میں مڈٹرم الیکشن کروانے ہی پڑیں گے۔

مجیب میں اتنی سکت نہیں کہ وہ اتنے لمبے عرصہ کے لئے حکومت کو جاری رکھ سکے۔ جب وہ برسر اقتدار آئے گا تو لوگ پلٹن گراؤنڈ میں اس کی مغربی پاکستان کے خلاف تنقید سن کر خوش ہو کر گھروں کو نہیں جائیں گے بلکہ وہ تو اس سے ٹھوس بنیادوں پر عملی اقدامات کی توقع کریں گے وہ اس سے اپنے مشکلات و مسائل کا مداوا چاہئیں گے اور کیا جب شیخ مجیب وزیر اعظم ہوں گے تو طوفان آنا بند ہو جائیں گے؟ چنانچہ ایسی صورت حال میں جب مسائل ایسے ہی رہیں گے تو عوام کو احساس ہو گا کہ مغربی پاکستان کے خلاف ان کو بھڑکایا گیا ہے۔ تب لوگوں کو یقین آئے گا کہ گورنمنٹ خواہ مغربی پاکستان سے ہو یا مشرقی پاکستان سے ہو۔ وہ بہر حال گورنمنٹ ہی ہوتی ہے۔ یوں شیخ مجیب کے ہاتھوں سے اس کا ہتھیار جاتا رہے گا اور لوگ یقیناً جان جائیں

گے کہ اصل بات تو نظام کو تبدیل کرنا ہے جس کی نوید پیپلز پارٹی دیتی ہے۔ یوں بالآخر حالات کا فیصلہ اور بہاؤ ہمارے حق میں ہوگا۔

میں نے تجویز کیا کہ ہم تقریباً ۸۸ افراد سرکاری خرچ پر ڈھاکہ میں ہوں گے لہذا کم ازکم بیس آدمیوں کی ڈیوٹی لگادی جائے کہ مشرقی پاکستان کے گرد و نواح میں جلسے کرتے رہیں اور قصبہ کی سطح پر پیپلز پارٹی کے منشور کو متعارف کرائیں تاکہ وہاں کے غریب لاچار اور مجبور عوام سے ہمارا حقیقی رابطہ استوار ہو۔ جب یہ بیس کا گروپ ڈھاکہ سے واپس آجائے تو بیس مزید چلے جائیں۔ مختصراً میرا مقصد یہ تھا کہ سرکاری خرچ پر ہی ہم مشرقِ پاکستان میں اپنی پیپلز پارٹی کو متعارف اور مستحکم کرسکتے ہیں۔ اور یہ سارا کام ایک سال کے اندر ہوسکتا ہے۔

میری ان باتوں کا کوئی اثر نہیں ہوا اور نہ ہی کوئی نتیجہ نکلا کیونکہ جلد ہی مجھے احساس ہوا کہ یہ کنونشن تو "ربڑ سٹمپ" تھا۔ بھٹو نے ۱۴ فروری ۱۹۷۱ء کو پشاور کی پریس کانفرنس میں ڈھاکہ نہ جانے کا جو فیصلہ سنا دیا تھا۔ بات اس سے آگے نہیں بڑھ رہی تھی۔ اور اس کنونشن کا مقصد اس فیصلہ پر ایک طرح سے چھاپ لگانا تھا رائے لی گئی تو بھٹو کے فیصلہ کی تائید کی گئی اور یوں بھٹو کنونشن سے اپنے فیصلہ پر چھاپ لگوانے میں کامیاب ہوگئے۔

حقیقت یہ ہے کہ مجھے جس قدر گہرا دکھ اور صدمہ اس دفعہ ہوا۔ پہلے کبھی نہیں ہوا تھا۔ میں دل برداشتہ ہوکر اور زخمی روح لئے کسی کو اطلاع کئے بغیر تنہا کلفٹن کے ساحل پر چلا آیا۔ شاید قارئین یقین نہیں کریں گے مگر میں حلفاً کہتا ہوں کہ اس شام میری آنکھوں کے سامنے سقوطِ مشرقی پاکستان کا دلخراش انجام گھوم گیا۔ میں چاہتا تھا کہ کاش سمندر میری باتیں سن کر سمجھ جائے اور اپنے شور سے دنیا کو بتائے کہ قائدِ اعظم، علامہ اقبال اور لاکھوں گمنام شہریوں کے پاکستان پر کیا بیتنے والی ہے اور کیسے مملکت خداداد کو اقتدار کے دیوتا کی بھینٹ چڑھایا جا رہا ہے۔

بہرحال یہ کنونشن ختم ہوئی اور اس کے فوراً بعد لاہور میں ۲۸ فروری

سنہ ۱۹۷۱ء کو ایک عظیم الشان جلسہ عام کے انعقاد کا اعلان کیا گیا۔ یہ جلسہ اقبال پارک (جو پہلے منٹو پارک تھا) میں مینار پاکستان کے سائے تلے منعقد ہوا۔ اس پارک کے سامنے بادشاہی مسجد ہے جس کے تاریخی میناروں نے ۲۳ مارچ سنہ ۱۹۴۰ء کو برصغیر کے کروڑوں مسلمانوں کے دلوں کی دھڑکن کو قرارداد لاہور کی شکل میں منظور ہوتے دیکھا تھا اور اب وہ حیران و ششدر یہ منظر بھی دیکھ رہے تھے کہ پاکستان کو دولخت کرنے کے لئے کیسے کیسے جتن کئے جا رہے تھے۔ اور محض اقتدار کی ہوس میں کیونکر ایسی راہ کا انتخاب کیا جا رہا تھا جو صرف اور صرف تباہی کے گڑھے کی طرف جاتی تھی۔ مجیب کی پارٹی کا کوئی آدمی قومی اسمبلی کے لئے مغربی پاکستان سے منتخب نہیں ہوا تھا اور اس نے جب یہ کابینہ کو تشکیل دینا تھا تو اسے مغربی پاکستان سے کچھ اراکین کو بہر حال اس میں شامل کرنا تھا۔ میرا خیال یہی ہے کہ بھٹو شیخ مجیب الرحمان کے ساتھ مل کر اقتدار میں شریک ہونا چاہتے تھے۔ بھٹو کی خواہش تھی کہ مجیب اسے وزارت خارجہ کا قلمدان سونپ دے اور اس کے علاوہ تین چار اہم وزارتیں اس کی پارٹی کو دے دے۔ اگر اس بات پر سمجھوتہ ہو جاتا تو ملک آج بھی مکمل طور پر قائم رہتا۔ لیکن شیخ مجیب الرحمان بھٹو سے ارجک تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ کابینہ میں وزارتوں کا جو کوٹہ مغربی پاکستان کے لئے ہے وہ یہ کوٹہ میں دولتانہ کو دے دوں گا۔ آزاد امیدواروں کو دے دوں گا۔ ولی خان یا کسی بھی اور سیاست دان سے مل کر کابینہ تشکیل دے دوں گا۔ مگر بھٹو کے ساتھ مل کر حکومت نہیں کروں گا اسے اقتدار میں حصہ نہیں دوں گا۔ بالکل اسی طرح وہ خان عبد القیوم سے بھی بہت الرجک تھا۔

چنانچہ یوں کہا جا سکتا ہے کہ لعبض حکومت اور اقتدار کے بٹوارے کی جنگ میں اس ملک کا بٹوارہ ہو گیا۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ بھٹو یہ سوال کرنے والا کون تھا اور اس کو یہ اختیار کس نے دیا تھا کہ وہ اکثریتی جماعت یا اس کے لیڈر سے اپنی پسند کی وزارتیں طلب کرتا۔ یہ تو اکثریتی پارٹی کے لیڈر کی مرضی اور صوابدید پر منحصر ہے کہ وہ جس پارٹی کے ساتھ چاہے سمجھوتہ کرے۔ اگر شیخ مجیب بھٹو کو بوجوہ حکومت میں شریک نہیں

کرتا تھا تو یہ بھٹو کا فرض تھا کہ وہ اپنا آئینی کردار لعینی قائد حزب اختلاف کا منصب ادا کرتے۔

میں پوری ذمہ داری کے ساتھ کہتا ہوں کہ مجیب کے چھ نکات میں سے بھٹو کا پانچ نکات پر مکمل سمجھوتہ ہو چکا تھا صرف ایک پوائنٹ (نکز) رہ گیا تھا جس پر سمجھوتہ نہیں کر سکا تھا۔ اور وہ پوائنٹ تھا اقتدار کی تقسیم۔ اور نتیجتاً بھٹو جیسے اقتدار پسند سیاستدان کو اقتدار سے الگ رکھا گیا تو اس نے اس ملک کا نقشہ ہی تبدیل کر کے رکھ دیا۔

تاریخ بنی، جغرافیہ بگڑ گیا

○ ضمیر کی گواہی

میں پیپلز پارٹی کا واحد ایم این اے تھا جو قومی اسمبلی کے ۳ مارچ کے اجلاس میں شرکت کے لئے ڈھاکہ گیا۔ یہ الگ بات ہے کہ جب میں ڈھاکہ پہنچا تو یہ اجلاس ملتوی ہو چکا تھا۔ جنرل یحییٰ خان نے یکم مارچ ہی کو ایک نشری تقریر کے ذریعے یہ اجلاس ملتوی کرنے کا اعلان کر دیا تھا جس کے بعد سارا مشرقی پاکستان ایک ہیجان خیز انتشار مہلک طوائف الملوکی کا شکار ہو گیا تھا۔ خاص طور پر ڈھاکہ کے گلی کوچوں میں کان پڑی آواز سُنائی نہیں دیتی تھی۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے تمام لوگ گھروں سے نکل کر بازاروں اور گلیوں میں آ گئے ہیں۔

بہرحال میں تاریخ کے سامنے سرفراز ہوا۔ اور میں نے ڈھاکہ اجلاس میں شرکت کے لئے آنے والوں کی فہرست میں اپنی حاضری لگوا دی۔ تاریخ میں جہاں یہ بات محفوظ رہے گی کہ یہ اجلاس منعقد

نہیں ہو سکا تھا وہاں یہ بات بھی اس (تاریخ) کا ہمیشہ کے لئے حصّہ بن گئی کہ احمد رضا قصوری نے اگر اپنا فرض پورا کر دیا۔ ایک ایسے وقت میں جب کہ بھائی نے بھائی کا گلا کاٹا، جب مسجدوں کے شہر ڈھاکہ میں اسلام کے نام پر حاصل کی جانے والی مملکت خداداد کی افواج نے ہتھیار ڈالے اور ۹۴ ہزار فوجی جنگی قیدی ہو گئے ـــــــ میرے خیال میں مَیں جو کچھ کر سکتا تھا میں نے کیا۔

یہاں یہ بات البتہ قابل ذکر ہے کہ مستقبل کا مورخ جب اس پہلو سے صورتحال کا جائزہ لے گا کہ اگر ۳ مارچ کا اجلاس منعقد ہو جاتا تو کیا پھر بھی شیخ مجیب الرحمٰن اپنے چھ نکات پر اصرار کرتا اور اس کے باوجود ملک توڑنے پر بضد رہتا تو یہ مورخ یہ بات ضرور رقم کرے گا کہ مغربی پاکستان سے اپنے ضمیر اور فرض کی آواز پر لبیک کہنے والا واحد شخص احمد رضا قصوری تھا۔

بہر حال میں تو قومی اسمبلی کے اجلاس میں شرکت کے لئے ڈھاکہ گیا تھا۔ جب وہاں اجلاس ہی منعقد نہ ہوا اور سارا شہر مچھلی مارکیٹ کی صورت اختیار کر گیا تو میں وہاں دو یا تین دن رہنے کے بعد واپس کراچی چلا آیا۔ اس دوران میں نے گنتی کے چند لوگوں سے رابطہ رکھا اور زیادہ تر وقت بنگالیوں کے جذبات اور ردعمل کا مشاہدہ کرتا رہا۔

رنج کی جب گفتگو ہونے لگی

کراچی واپس آ کر میں نے ایک دن آرام کیا اور پھر پیپلز پارٹی کے مرکزی سیکرٹریٹ (واقع داداجی نوراجی مرکز عقب مزار قائداعظم) چلا گیا۔ اتفاق سے اس وقت خود بھٹو صاحب بھی دفتر میں موجود تھے۔ مجھے بتایا گیا وہ بے حد مصروف ہیں، مگر جب انہیں پتہ چلا کہ میں اس وقت سیکرٹریٹ میں موجود ہوں تو انہوں نے مجھے فوراً بلایا۔

میں کمرے میں داخل ہوا تو بھٹو صاحب کے ماتھے پر یکدم بل ابھرے اور پھر گہرے ہوتے گئے وہ خاصے غصے میں دکھائی دے رہے تھے۔ انہوں نے حسب عادت اپنا ہونٹ کاٹا اور کھڑے ہو کر بولے: رضا۔ تم سے مجھے یہ توقع نہیں تھی؟

کیسی توقع؟ ـــــ میں نے پوچھا۔

وہ بولے: تم نے مجھ سے غداری کی ہے اور تم مجیب سے جا ملے ہو۔

میں نے ان سے کہا: جناب آپ تشریف رکھیئے، ـــــــ وہ بیٹھ گئے تو میں نے کہا: میں نے کوئی غداری نہیں کی۔ میں نے اپنی سوجھ بوجھ کے مطابق پاکستان کے مفاد میں جو بہتر تصور کیا وہی کیا ہے۔ پھر میں نے اس حوالے سے کہا: میرے ذہن میں وفاداری کے تین درجے ہیں۔

نمبر۱: قوم و ملک

نمبر۲: پارٹی اور پارٹی کا منشور

نمبر۳: پارٹی کی قیادت

اگر کسی مرحلہ پر ان میں باہمی ٹکراؤ ہوا تو میری ترجیحات یہی ہوں گی۔ چنانچہ اس وقت جبکہ قوم و ملک کو خطرات درپیش ہیں میں نے یہی بہتر سمجھا کہ قومی اسمبلی کے اجلاس میں ہمیں شرکت کرنی چاہیئے۔ یہ باتیں میں شروع دن سے کہہ رہا ہوں۔ جب میرا کسی پر اختیار اور زور نہیں چلا تو میں اپنے ضمیر کی آواز پر خود ہی ڈھاکہ چلا گیا۔ اور جب وہاں اجلاس نہیں ہوا تو واپس گھر آ گیا۔

بھٹو نے سپاٹ لہجے میں کہا: میری اطلاع یہ ہے کہ تم مجیب کے ایجنٹ بن گئے ہو۔

میں نے مسکرا کر کہا: جناب آپ کی اطلاع آدھی درست ہے۔

کیا مطلب ـــــ وہ چونک کر بولے۔

میں نے کہا: وہ یوں کہ میں واقعی ایجنٹ ہوں۔ مگر مجیب کا نہیں ـــــ بلکہ پاکستان کا۔ اور صرف پاکستان کا۔ میں مجیب اور کسی دوسرے کا ایجنٹ نہیں بن سکتا۔ صرف اور صرف پاکستان کا ـــــ اور اس پر مجھے فخر ہے۔

یہ سنتے ہی بھٹو آپے سے باہر ہو گئے۔ انہوں نے سامنے میز پر پڑی فائل اٹھا کر یکدم فرش پر پٹخ دی اور سیٹ سے اُٹھ کر تیزی سے جا کر کچھ دور پڑے صوفے پر جا کر بیٹھ گئے۔ ان کا چہرہ سرخ ہو چکا اور آنکھوں سے شعلے برس رہے تھے ـــــ میں نے ان کو اتنے غصہ میں اور اتنے جلال کے عالم میں پہلی بار دیکھا تھا۔ وہ میری طرف منہ کر کے زور سے بولے۔

Raza by going to Dacca, you have turned traitor to the party

میں نے سنجیدگی سے کہا: جناب آپ کیوں مجھے غلط سمجھ رہے ہیں۔ میں کہیں نہیں جا رہا۔ میں اب بھی پارٹی پروگرام پر یقین رکھتا ہوں۔ میرا یقین ہے کہ جماعت پاکستان کے غریب، مجبور

اور مظلوم عوام کی نمائندہ اور ترجمان جماعت ہے۔

انہوں نے یہ بات سن کر طنزاً مجھے دیکھا اور پھر قدرے سکون سے بولے : اچھا۔ اگر تمہارے واقعی یہ خیالات ہیں تو تم مجھے اپنا استعفیٰ لکھ کر دے دو۔

بھٹو کی اس چال نے مجھے کچھ سوچنے پر مجبور کر دیا۔ ابھی میں کسی فیصلہ پر نہیں پہنچا تھا اور سوچ ہی رہا تھا کہ وہ (بھٹو) کہنے لگے۔ میں نے کہا ہے ناں کہ تمہیں میری قیادت پر یقین نہیں۔ تم مجیب سے جا ملے ہو ـــ اب تم بڑے سیاست دان ہو گئے ہو ـــ خود فیصلے کرنے لگے ہو ـــ تمہیں تو مجھ پر اعتماد ہی نہیں ـــ !

ان کی باتیں سن کر میں نے سنجیدگی سے سر اٹھا کر انہیں دیکھا۔ کیونکہ آج ان کا لہجہ اور تیور خاصے بگڑے اور بدلے نظر آتے تھے۔ جونہی میری ان سے آنکھیں دوچار ہوئیں، انہوں نے وہاں موجود چند ایم این اے حضرات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا : دیکھو ان کو میری قیادت پر یقین ہے۔ میں ان سے ابھی استعفیٰ مانگوں گا۔ اور یہ استعفیٰ دے دیں گے ـــ یہ کہتے ہی انہوں نے دائیں ہاتھ سے چٹکی بجاتے ہوئے کہا : چلو اٹھو ـــ سب لوگ استعفیٰ لکھو ـــ !

بھٹو صاحب کی زبان سے یہ جملہ نکلنا تھا کہ وہاں موجود سارے ایم این اے حضرات یکدم اچھل پڑے۔ وہ ادھر اِدھر دوڑنے لگے۔ اور کاغذ قلم تلاش کر کے اپنے استعفیٰ لکھنے لگے۔ کوئی صوفے کے بازو پر کاغذ جما کے بیٹھا تھا۔ کوئی دیوار سے ڈیسک کا کام لے رہا تھا۔ کسی نے اپنے ہاتھوں پر کاغذ جا رکھا تھا۔ اور کوئی اپنی ٹانگ پسار کر اس پر کاغذ دھرے بیٹھا تھا ـــ یہ ایک عجیب منظر تھا۔ یہ تمام لوگ اس وقت عوام کے نمائندے نہیں بلکہ وہ پتلیاں محسوس ہو رہے تھے جن کی ڈور بھٹو کے ہاتھوں میں ہے۔

سب لوگوں نے استعفے لکھ کر ایک دوسرے سے بڑھ بڑھ کر بھٹو کے سامنے رکھ دیئے ـــ بھٹو نے ہنس کر میری طرف دیکھا اور کہا : دیکھا ـــ یہ ہیں میرے وفادار !

بھٹو کی ہنسی سے میں نے شہہ پا کر ہنستے ہوئے کہا : جناب یہ استعفے آپ ذرا میرے حوالے کریں تاکہ میں انہیں سپیکر کو روانہ کر دوں۔ کیونکہ وہی ان کا اصل مقام ہے۔

میری یہ بات سُن کر بھٹو کا موڈ پھر بدل گیا اور انہوں نے کہا : تم میرے ساتھیوں کا مذاق اڑاتے

ہو۔؟

اس پر میں نے بھی پوری سنجیدگی سے کہا: جناب ـــــ میرا یہ قطعاً ارادہ اور مقصد نہیں ، بہرحال چونکہ میں اس معاملہ کو یہیں ختم کرنا چاہتا ہوں۔ لہٰذا میں آپ کو بتانا چاہتا ہوں کہ میں استعفیٰ نہیں دوں گا۔

یہ سنتے ہی وہ آگ بگولہ ہو گئے۔ انگریزی، سندھی، فرانسیسی اور پنجابی میں انہوں نے انتہائی بے ربط باتیں سُنا ڈالیں جن کا خلاصہ یہی تھا کہ تم لوگوں کو میرے طفیل ووٹ ملے ہیں ـــ اور تم کو میرا احسان فراموش نہیں کرنا چاہیئے۔

میں نے ان کی بات ختم ہونے پر کہا: یہ درست ہے کہ بہت سارے لوگوں کو آپ کی شخصیت اور برکت سے ووٹ ملے مگر میرا شمار ان لوگوں میں نہیں کیا جا سکتا۔ میں تو ان لوگوں میں سے ہوں جنہوں نے پیپلز پارٹی کے وقار میں اضافہ کیا ـــــ قصور میں میرے اجداد نے سینکڑوں سال سے اس علاقہ کے عوام کی جو خدمت کی ہے یہ اس کا ثمر ہے ـــــ یا پھر یہ حضرت بابا بلھے شاہ کا صدقہ ہے۔

اس پر بھٹو نے نہایت غصہ میں کہا:

What Buleh Shah you are talking about.

To hell with Buleh Shah.

اور پھر بولے: اگر یہ بات ہے تو میں قصور آ کر لوگوں سے تمہارے بارے میں بات کروں گا۔ اور میں ان سے پوچھوں گا کہ انہوں نے مجھے اور تلوار کو ووٹ دیئے ہیں یا تمہیں اور تمہارے بلھے شاہ کو ـــ میں نے بھٹو کی اس قدر برہمی، درشتی اور ناراضگی کے باوجود ضبط اور تحمل سے کام لیا اور کہا: جناب آپ جب چاہیں قصور آئیں، میرا گھر آپ کا گھر ہے، لہٰذا آپ کو یاد ہو گا کہ اسی گھر اور اسی شہر میں آپ نے پہلی بار پیپلز پارٹی کا نام سرِعام پکارا تھا۔

وہ آئیں گھر میں ہمارے

ڈسٹرکٹ کنونشن قصور ۲ مئی ۱۹۷۱ء کو منعقد ہوا جس میں شرکت کے لئے سارے پنجاب سے

لوگوں کو گاڑیوں پر بھر کر لایا گیا، کیونکہ یہاں کے اصل کارکن تو میرے ساتھ تھے۔ اور ایسے تمام لوگ جن کے بارے میں رتی بھر بھی شک تھا کہ وہ لوگ ڈاکٹر مبشر حسن، ملک غلام مصطفےٰ کھر اور معراج خالد (جو کہ مجھے پارٹی سے نکالنے کے درپے تھے) وغیرہ کا ساتھ نہیں دیں گے ان کے گھروں کے باہر سفید کپڑوں میں بدمعاش کھڑے کر دیئے گئے تھے۔ اس کا مقصد نہ صرف ان کی نگرانی تھا بلکہ عام لوگوں میں خوف وہراس پھیلانا بھی تھا۔ پھر بھی لوگ پیپلز پارٹی سے محبت اور عقیدت کے مارے وہاں آہستہ آہستہ جانا شروع ہو گئے۔ ان لوگوں کو جب اندر جانے سے روکا گیا اور روکنے والے قصور سے باہر کے لوگ تھے تو لامحالہ ان کو اشتعال آگیا اور ان لوگوں نے ایکدم وہاں پر ہلہ بول کر وہ تمام آرائشی دروازے اکھاڑ دیئے اور جھنڈیاں وغیرہ پھاڑ کر پھینک دیں جو بھٹو کے استقبال اور خیر مقدم کے لئے لگائی گئی تھیں۔ اس طرح انہوں نے اتحاد کر کے باہر سے لائے گئے غنڈوں کی خوب پٹائی کی۔

بھٹو کو لوگوں کے اس ردعمل اور اس واقعہ کا علم لاہور میں ہی ہو گیا تھا۔ لہٰذا جب وہ للیانی پہنچے تو ادھر سے قصور سے پیپلز پارٹی والوں کا ایک ہراول دستہ بھی للیانی پہنچا اور انہیں بتایا کہ قصور میں تصادم کی کیفیت پیدا ہو چکی ہے اور شہر میں سخت کشیدگی ہے۔ اہل قصور کھر اور اس کے غنڈوں کے خلاف سراپا احتجاج بنے ہوئے ہیں ـــــــ یہ سب باتیں سننے کے بعد کہا جاتا ہے کہ وہ سخت مضطرب ہوئے اور اپنی پریشانی کا اظہار یوں کیا کہ تمام لوگوں کو کمرے سے باہر نکال دیا، حالانکہ درحقیقت انہوں نے لوگوں کو کمرے سے باہر نکالنے کے بعد پنجاب گورنمنٹ سے رابطہ کیا تھا۔ اس سلسلہ میں اوپر تک بات پہنچی۔ اور جیسا کہ میں نے پہلے کہا کہ بھٹو فوج اور بیوروکریسی اور جاگیردار کے مفادات کا تحفظ لاڑکانہ پلان کے تحت کر رہا تھا۔ لہٰذا یحییٰ خان نے فوراً بھٹو کی مدد کے احکامات جاری کر دیئے اور لاہور سے سپیشل پولیس فورس قصور پہنچ گئی۔

اس پولیس نے قصور پہنچتے ہی شدید قسم کا لاٹھی چارج کیا اور آنسو گیس استعمال کی۔ اس قدر زبردست پولیس ایکشن کی مثال قصور کی تاریخ میں نہیں ملتی۔ پولیس ہی کی آڑ میں پیپلز پارٹی کے ان مقامی کارکنوں پر جو کبھی پارٹی کے جلسوں اور جلوسوں کی روح رواں ہوا کرتے تھے ان پر باہر سے آنے والے غنڈوں نے تشدد کیا۔ اور جب یہ سب کچھ ہو چکا تو بھٹو قصور آگئے۔

انہوں نے ایک بند کمرے میں اجلاس کیا جس کے چاروں طرف پولیس کا سخت پہرہ تھا۔ وہ

ویسے بھی چھ گھنٹے لیٹ پہنچے تھے اور یہ تمام وقت وہ للیانی میں صورت حال کے سازگار ہونے کا انتظار کرتے رہے۔ اس بند کمرے کے اجلاس میں کیا ہوا اور کیا نہیں ہوا اس کی تفصیلات میں جانا مناسب خیال نہیں کرتا۔ البتہ اس اجلاس سے میری سیاسی زندگی اس لحاظ سے غیر معمولی اہمیت اختیار کر گیا کہ اس اجلاس ہی میں پارٹی سے میری رکنیت کو معطل کر دیا گیا۔

بھٹو کے اس فیصلے کا عوامی سطح پر اور صحافتی حلقوں میں کیا اثر ہوا اس کا اندازہ صرف روزنامہ 'آزاد' لاہور کے ان دو کالموں سے بخوبی کیا جا سکتا ہے جو یکے بعد دیگرے شائع ہوئے (او جنہیں قارئین کی دلچسپی و مطالعہ کے لئے اس کتاب کے آخر میں بطور ضمیمہ پیش کیا جا رہا ہے)

کبھی ہم نہیں، کبھی تم نہیں

اس کے بعد میں نے ۳ مئی ۱۹۷۱ء کو لاہور میں ایک پریس کانفرنس بلائی۔ چونکہ نئے حالات میں مجھے پہلی بار صحافیوں کا سامنا کرنا پڑا تھا لہٰذا اس میں صحافیوں کی ایک بڑی تعداد نے شرکت کی۔ اس کانفرنس میں پہلی بار میں نے کھُل کر بھٹو پر سخت اور حسب ذیل الزامات عائد کئے۔

- یہ شخص (بھٹو) محض اقتدار کی ہوس میں ملک کو توڑنے کے منصوبہ پر عمل کر رہا ہے۔ اس نے محض حکومت حاصل کرنے کے لئے ساری قوم کو داؤ پر لگا دیا ہے۔
- پارٹی کے اندر الیکشن نہیں کرائے گئے۔ اور یوں پیپلز پارٹی کے اندر اب دو پارٹیاں بن چکی ہیں ایک کارکنوں کی پارٹی اور دوسری الیکشن کے بعد آنے جانے والے سرمایہ داروں اور جاگیرداروں کی پارٹی۔!

چنانچہ اس کانفرنس میں مَیں نے پیپلز پارٹی کے اندر نئے گروپ تشکیل دینے کا اعلان کر دیا جو ان دنوں آگے چل کر پیپلز پارٹی (احمد رضا پروگریسو گروپ) کے نام سے مشہور ہوا۔ مجھے اس گروپ کا چیئرمین بنایا گیا تھا۔ اس گروپ کو تشکیل دینے کے بعد میں نے پورے ملک کے طول و عرض کے طوفانی دورے کئے۔ قریہ قریہ بستی بستی گیا اور یہ سلسلہ اس وقت تک جاری رہا جب تک میں مشرقی پاکستان نہیں گیا۔

میں نے لوگوں کو واضح طور پر بتایا کہ 'لاڑکانہ پلان' کیا ہے۔ اور اس کے تحت بھٹو کے ملک توڑنے کے کس قدر بھیانک اور گھناؤنے عزائم ہیں۔ میں نے درجنوں کی تعداد میں جلسے کئے اور زندگی کے ہر شعبہ سے تعلق رکھنے والے افراد سے براہ راست رابطہ کر کے ان سے خطاب کیا۔ میں نے ان لوگوں کو اور

عوام کو واضح طور پر بتایا کہ بھٹو صاحب نے اقتدار کی ہوس میں ملک کو داؤ پر لگا دیا ہے۔ اس سلسلہ میں یحییٰ بھٹو صاحب کے وہ بیان دہراتا جس میں انہوں نے ۳ رمارچ کے اجلاس کا بائیکاٹ کرنے۔ ڈھاکہ جانے والوں کی ٹانگیں توڑنے اور "ادھر تم ادھر ہم" کا نعرہ لگانے کا ذکر کیا تھا۔

یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ بھٹو جب اپنا ۱۵ رکنی وفد لے کر ڈھاکہ گئے تھے تو ان کا قیام ہوٹل انٹرکانٹینینٹل میں تھا۔ اس وقت یحییٰ خان بھی وہاں تھے مگر جب ڈھاکہ میں وسیع پیمانے پر آپریشن کا فیصلہ ہوا تو وہ وہاں سے ۲۵ رمارچ کو چلے آتے تھے۔ یحییٰ خان کی روانگی کو انتہائی خفیہ رکھا گیا تھا کہ جب بھٹو نے تین چار بار گورنمنٹ ہاؤس فون کیا تو انہیں بھی صحیح اطلاع نہ مل سکی۔ بالآخر جب یحییٰ خان کا جہاز مشرقی پاکستان کی حدود سے باہر نکل گیا تو اعلان کر دیا گیا کہ یحییٰ خان مغربی پاکستان چلے گئے ہیں ــــ یہ اطلاع بھٹو کو اس وقت ملی جب وہ اپنے ہوٹل کی آخری منزل سے ڈھاکہ پر فوج کے ایکشن کا نظارہ کر رہے تھے۔

اس وقت بھٹو کے پاس جو لوگ بیٹھے تھے ان میں سے ایک نے بعد میں مجھے بتایا کہ بھٹو اس وقت اتنے پریشان تھے کہ وہ شراب کے نشہ میں دھت بار بار کہہ رہے تھے:

While the ship is sinking the rats have run away.

(یعنی جب جہاز ڈوبتا ــــ ہے تو چوہے دوڑ جاتے ہیں)

اصل بات یہ تھی کہ جنرل یحییٰ خان نے قصداً بھٹو کو ڈھاکہ میں رہنے دیا تھا اور اس کو لئے بغیر چلا آیا تھا وہ یہ چاہتا تھا کہ بھٹو خود اپنی آنکھوں سے اس ایکشن کو دیکھ لے تا کہ اس کو احساس ہو جائے کہ جب فوج کسی بات کا حتمی فیصلہ کر لیتی ہے تو اس کا انداز اور طریقہ کار کیا ہوتا ہے۔ گویا یہ سب کچھ کسی مرحلہ پر تمہارے ساتھ بھی ہو سکتا ہے۔

بھٹو صاحب کو یہ ایکشن دکھانے کے بعد ۲۶ رمارچ کو جہاز میں بحفاظت سوار کرایا گیا اور وہ عازم مغربی پاکستان ہوئے۔ چنانچہ جب بھٹو صاحب کراچی پہنچے تو ۲۶ رمارچ ۱۹۷۱ء کو انہوں نے کراچی ایئرپورٹ پر اخبار نویسوں سے کہا:

"خدا کا شکر ہے کہ پاکستان بچ گیا۔"

اس بیان سے جمہوریت پسند اور محب وطن حلقوں میں حیرت کی لہر دوڑ گئی کہ ایک سیاسی جماعت

کا لیڈر ایک اکثریتی پارٹی کا طاقت کے بل بوتے پر قلع قمع کئے جانے پر ایسے جذبات کا اظہار کر رہا ہے ۔ حالانکہ اسے (بھٹو کو) تو یہ کہنا چاہیئے تھا کہ

آج پاکستان کے ٹوٹنے کی بنیاد رکھ دی گئی ۔

بھٹو صاحب کے اس بیان سے یہ بات واضح ہو گئی تھی کہ وہ فوج کے پٹھو ہیں لہٰذا بھٹو کے فوج کے ساتھ قریبی رابطہ کا ایک اور ثبوت یہ ہے کہ وہ جب بھی ملتان جاتے وہاں نواب صادق قریشی کے "وائٹ ہاؤس" میں انتہائی احتیاط کے ساتھ چند منتخب افراد کی محفلیں منعقد ہوتی تھیں ۔ ان دنوں جنرل گل حسن ملتان میں کور کمانڈر تھے، پھر یہ سلسلہ راولپنڈی اسلام آباد تک پھیل گیا جہاں اس کا اہتمام کرنے کا قرعہ نصراللہ خٹک کے نام نکل آیا ۔ ان کے علاوہ ایئر وائس مارشل رحیم خان کے بھائی غفار اور اقبال شعبان وغیرہ نے اس حوالے سے خاصی شہرت کمائی ۔ ان محفلوں کے طفیل ہی گجرات کی اقلیم عرف رانی جو بعد میں جنرل رانی کے نام سے مشہور ہوئی کی رسائی جنرل یحییٰ خان تک ہوئی اور چہروں کی مسکراہٹوں پر بنگال کا سارا جادو نثار کرنے کے حوصلے جوان ہوئے ۔ سیاست کے آوارہ طرحی مصرعوں پر گرہ لگانے کا شوق بھی ان ہی محفلوں میں پورا کیا جاتا تھا ۔ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ بالآخر یہیں سے بھٹو اور فوج کے درمیان فاصلے ختم ہونا شروع ہوئے اور ان راتوں میں شراب اور شباب کے درمیان قوم کے لئے ناگہانی عذاب کے جواز تراشے گئے ۔

عوام کو بھٹو صاحب کے بارے میں یہ بات بھی بتا دوں کہ وہ "علامتی گفتگو" کرنے کے ماہر تھے چنانچہ جب انہوں نے کہا کہ اس ملک میں تین طاقتیں ہیں ۔ فوج، پیپلز پارٹی اور عوامی لیگ ۔ تو اس روز سے ہی اقتدار کے لئے MUSICAL CHAIR RACE شروع ہو گئی ۔ اب ظاہر ہے کہ کرسی تو ایک ہے اور طاقتیں تین ہیں، ان میں سے کسی ایک ہی کو بالآخر کرسی ملے گی ۔ بظاہر بھٹو کی یہ بات بظاہر بڑی مہمل تھی مگر درحقیقت اس کے پیچھے پوری سوچ کارفرما تھی ۔ میں بھٹو کے انتہائی قریب رہنے کی وجہ سے جانتا تھا کہ اس کا انداز گفتگو اور طرز خطاب کیا ہے ۔ وہ بات کہتا کچھ ہے مگر اس کے معنی کچھ اور ہوتے ہیں ـــــ لہٰذا میں نے لوگوں کو بھٹو کے اس بیان کی روشنی میں بتایا کہ بھٹو کا پروگرام یہ ہے کہ پہلے مرحلے میں فوج کے ذریعے عوامی لیگ کے غبارے سے ہوا نکال دی جائے (چنانچہ ایسا ہی ہوا کہ ڈھاکہ میں فوج نے ایکشن کر کے عوامی لیگ کی کمر توڑ دی) اور اس کے بعد پاکستان کی فوج کو میدانِ جنگ

میں بھارت کی فوج کے ہاتھوں شکست سے دوچار کرا دیا جائے کیونکہ شکست خوردہ فوج بددل ہو جاتی ہے۔ اور ایسی فوج کا کمانڈر کبھی بھی اقتدار اپنے پاس نہیں رکھ سکتا۔

یہ بھٹو صاحب کا نظریہ تھا کیونکہ جہاں وہ فوج کے لئے کام کر رہے تھے اور ان کے مفادات کے نگہبان بنے ہوئے تھے وہاں وہ اس فوج کے ساتھ مخلص بھی نہیں تھے۔ کیونکہ انہیں بخوبی اندازہ تھا کہ فوج مشرقی پاکستان کے بعد خود بھٹو کی خبر لے گی۔ دوسری طرف فوج کو بھی بھٹو پر بھروسہ نہ تھا۔ گویا دونوں نہایت مکاری اور عیاری سے ایک دوسرے کو استعمال کر رہے تھے۔ چنانچہ سوچ بچار کے بعد بھٹو اس نتیجہ پر پہنچے کہ فوج کو ذلیل و خوار کرنے کے لئے اسے مشرقی پاکستان میں شکست سے دوچار کیا جائے۔

دمادم مست قلندر

حالات مخدوش ہوتے تو بھٹو کو ان کی ذاتی حیثیت میں ایک فوجی مشن کا سربراہ بنا کر پیکنگ (چین) بھیجا گیا۔ اس مشن میں ایئر مارشل رحیم خان، جنرل گل حسن، اور وزارت خارجہ کی طرف سے آغا شاہی وغیرہ شامل تھے۔ اس مشن کے ذمہ یہ کام تھا کہ دوست ملک چین کو اصل صورت حال سے باخبر کر دیا جائے۔ ادھر چین کی حکومت نے ایک اچھے اور مخلص دوست کی حیثیت سے (پاکستان کو) یہ تجویز پیش کی کہ یہ مسئلہ آپ کا اندرونی اور سیاسی مسئلہ ہے لہٰذا اسے سیاسی انداز ہی میں حل کیا جانا چاہیئے اور اس کا مفہوم واضح طور پر یہی تھا کہ شیخ مجیب کو اقتدار دے دیا جائے۔ یوں بھی چین کی حکومت یہ بات گوارا نہیں کرتی تھی کہ محض مغربی پاکستان کے جاگیرداروں اور سرمایہ داروں کو خوش کرنے کے لئے مشرقی پاکستان کے غریب اور محنت کش عوام کو ناراض کر دیا جائے۔

چینی حکومت نے یہ بھی کہا کہ موجودہ حالات میں بھارت کے ساتھ کشیدگی میں اضافہ نہ کیا جائے کیونکہ موسم سرما کا آغاز ہو چکا ہے ــ ــ ــ ــ ــ سری گلوٹی پاس جو پاک چین سرحد کا نزدیک ترین مقام ہے برف سے ڈھکا ہوا ہے۔ اس صورت میں ہم آپ کی مدد نہیں کر سکتے۔ کم از کم اس مقام کا موسم اور ماحول سازگار ہونے دیں۔ تب ہی ہم مشرقی پاکستان کو کسی حد تک فوجی تحفظ دے سکیں گے ــــ چنانچہ اول تو اس مسئلہ کو پُرامن طریقے سے طے کریں بصورت دیگر موسم گرما تک اس معاملہ کو یونہی التوا میں رکھیئے ــــ یعنی کوئی ایسا حتمی اقدام نہ کیا جائے۔

بھٹو چین سے واپس آئے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب جنرل یحییٰ خان پوری طرح شراب و شباب میں ڈوبے رہتے تھے اور کاروبار حکومت کی ان کو کوئی خبر نہیں تھی۔ سارا نظام اندرون خانہ جنرل پیرزادہ اور جنرل اکبر نے اپنے ہاتھوں میں لے رکھا تھا۔ اور یہ دونوں مبینہ طور پر بھٹو کے اشاروں پر چل رہے تھے۔ ایک سازش کے تحت یحییٰ خان کو ہر وقت نشہ کی حالت میں رکھا جا رہا تھا۔ چنانچہ وہ اس قدر دھت رہتے تھے کہ کوئی فیصلہ نہیں کر پاتے تھے۔ ادھر بھٹو نے واپس آ کر یحییٰ خان کو اپنے دورے کی رپورٹ دی اور بتایا کہ چین نے ساتھ دینے کا وعدہ کیا ہے اور کہا ہے کہ بیشک بھارت سے لڑ پڑو۔

قارئین کو یاد ہوگا کہ ان ہی دنوں Crush India مہم کا آغاز کیا گیا جو انٹیلی جنس والوں کی نگرانی میں چلی۔ دیواروں پر جلی حروف میں یہ نعرہ لکھا گیا۔ گاڑیوں پر سٹکر لگائے گئے اور یوں بھارت کے خلاف ایک فضا بنائی جانے لگی۔ تاکہ بھارت کسی نہ کسی طرح بہانہ ہاتھ لگتے ہی مشرقی پاکستان پر حملہ کر دے۔ اور یوں مشرقی پاکستان میں فوج کو ختم کر دیا جائے (آرمی ایکشن کے بعد عوامی لیگ پہلے ہی ختم ہو چکی تھی)

یحییٰ خان کو سیاست کی بساط پر بھٹو، بیوروکریسی اور فوج گٹھ جوڑ کے باعث شہ مات ہو گئی تھی اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ اس زمانے میں جب قوم اپنی بقا کی جنگ لڑ رہی تھی یحییٰ خان مشرقی پاکستان کے کمانڈر کا فون، وائرلیس پیغام براہ راست وصول نہیں کر سکتے تھے۔ ان تک مخصوص اور برائے نام کا غذات ہی پہنچ دیئے جاتے تھے۔ اس کے گرد مخصوص مزاج اور طبع کے خواتین و حضرات نے اپنا حلقہ تنگ اور مضبوط کر لیا تھا۔

کہا جاتا ہے کہ ان دنوں ہی مشرقی پاکستان سے ایک سینئر فوجی افسر راولپنڈی آیا۔ اور جب وہ بڑی مشکل سے یحییٰ خان سے ملاقات کرنے میں کامیاب ہوا تو اس وقت یحییٰ خان اپنے دفتر میں ننگے پاؤں میز پر رکھے شراب کے جام لنڈھا رہے تھے۔ اپنے مہمان کو دیکھتے ہوئے کہا آؤ پیو، ایک پیگ تم بھی لوگوں کی مشکلات اور مسائل کے نام پر ——! اس سینئر فوجی افسر نے اسی شام میں میں اپنے ایک دوست سے کہا: ان (یحییٰ خان) کو تو قومی ترانہ سے زیادہ اداکارہ ترانہ کی فکر ہے میں جتنی دیر بیٹھا رہا وہ اسی کی باتیں کرتے رہے۔

یحییٰ خان کا زیادہ تر وقت کھلے مزاج کی عورتوں اور اعلیٰ قسم کی شراب کی بوتلوں میں گزر رہا تھا

اس کے لئے بہتر طور پر انتظامات اور حالات ایسے بنا دیئے گئے تھے کہ اگر وہ چاہتے بھی تو اس حلقہ رنگ و بو سے نکلنا ان کے لئے ممکن نہ تھا۔

بھٹو نے واپسی پر لاہور سے کراچی تک دو مرحلوں میں ایک دورہ کیا۔ پہلا مرحلہ لاہور سے ملتان تک تھا اور دوسرا ملتان سے کراچی تک ——— ! وہ لاہور سے روانہ ہوا تو ہزاروں کی تعداد میں لوگوں نے اسے ریلوے سٹیشن پر رخصت کیا۔ اس موقع پر عوام سے خطاب کرتے ہوتے بھٹو نے واضح طور پر کہا کہ اگر اب بھارت نے پاکستان پر حملہ کیا تو پھر "دمادم مست قلندر" ہوگا۔ عوام نے اس کا یہی مفہوم اخذ کیا کہ چین نے بھٹو صاحب کے دورہ کے دوران ہر قسم کی امداد و تعاون کا یقین دلایا ہے۔ حالانکہ حقیقت اس کے برعکس تھی۔

بھٹو نے یہ "دمادم مست قلندر" کا مبہم نعرہ ایک تو اس لئے لگایا کہ ایک تو اس سے عوام خوش ہوں گے (جو بلاشبہ ہوئے بھی) اور اگر کسی مرحلہ پر چینی حکومت یا کم از کم چینی سفیر اس بات کا نوٹس لے بھی تو یہ کہا جائے کہ یہ تو لال شہباز قلندر سے عقیدت کے اظہار کے طور پر سندھی ثقافت کا ایک اظہار ہے۔

دیکھتے ہی دیکھتے حالات خراب ہو گئے حتیٰ کہ بھارت نے پہلے تو مشرقی پاکستان پر حملہ کیا اور اس کے بعد وہ اچانک مغربی پاکستان پر حملہ آور ہوا۔ اس صورت حال سے نبرد آزما ہونے کے لئے بھٹو کو ڈپٹی پرائم منسٹر نامزد کیا گیا (جبکہ نورالامین پرائم منسٹر نامزد ہوئے) اور اس کے ساتھ ہی اسے (بھٹو کو) وزیر خارجہ کا عہدہ بھی دیا گیا۔ اس حیثیت سے بھٹو اقوام متحدہ کے دروازے پر دستک دینے کے لئے روانہ ہوئے۔

قیامت کے دن رات

یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ اس ہنگامی صورت حال میں بھٹو نے نیویارک جانے کے لئے جو راستہ اختیار کیا وہ خاصا طویل تھا۔ اور اسے عام حالات میں بھی محض سیاحت کے دلدادہ فارغ البال لوگ ہی پسند کرتے ہیں۔ قومی مفادات کا تقاضا تھا کہ وہ جلد سے جلد نیویارک پہنچتے۔ بہرحال وہ وہاں پہنچے اور جاتے ہی "فلو" کا بہانہ کرکے ہوٹل میں لیٹ گئے۔

لوگ حیران تھے کہ یہ وہی بھٹو ہے جس کے بارے میں پیپلز پارٹی والے دن رات یہ کہتے تھکتے نہیں تھے کہ بھٹو اتنا سخت جان انسان ہے کہ وہ سندھ اور ملتان کے تپتے علاقوں میں ۱۰۳ اور ۱۰۴ درجے کے بخار میں دن میں پانچ پانچ چھ چھ جلسے کرتا ہے۔ گویا یہ شخص اپنے اقتدار کے لئے تو اتنا سخت جان ثابت ہوا مگر جب پاکستان کو اس کی ضرورت پڑی تو اس شخص نے نیویارک جیسے شہر میں (جہاں دنیا کی ہر طبی سہولت میسر ہے) معمولی "فلو" کے آگے ہتھیار ڈال دیئے اور بستر سے لگ گیا۔ اس موقع پر ایک اہم سوال ابھرتا ہے کہ آخر ایسا کیوں ہوا؟

اس کا جواب یہ ہے کہ دراصل بھٹو اس انتظار میں تھے کہ کب مشرقی پاکستان سے راؤ فرمان علی کا تار اقوام متحدہ کے سیکرٹری جنرل کو موصول ہوتا ہے اور یہ خبر منظر عام پر آجاتی ہے کہ ڈھاکہ پر بھارتی فوجوں نے قبضہ کرلیا ہے۔ اور واقعی ایسا ہی ہوا۔ جب بھٹو کو یہ خبر ملی تو وہ سیدھا سلامتی کونسل گیا۔ اس وقت وہاں پولینڈ کی قرارداد پیش ہو چکی تھی۔ پولینڈ ایک مشرقی یورپ کا ملک ہے اور روس کی بھی آخری دم تک یہی کوشش تھی کہ پاکستان کی سلامتی اور بقا پر کوئی آنچ نہ آئے اور ایک خود مختار مملکت کے ماتھے پر ندامت کا یہ داغ نہ لگے۔

بھٹو نے اس قرارداد سے جو سلوک کیا وہ بالکل غیر متوقع بلکہ غیر شائستہ تھا۔ موصوف نے اس قرارداد کو پرزے پرزے کر کے پھینک دیا اور ایک ایسی تقریر کی جو کسی ڈرامہ کے ڈائیلاگ زیادہ محسوس ہوتے تھے۔ مثلاً ہم کھیتوں، دریاؤں، اور سرحدوں پر جنگ جاری رکھیں گے۔ ہم پہاڑوں، دریاؤں اور سمندروں پر لڑیں گے مگر کبھی ہتھیار نہیں ڈالیں گے۔ ہم ہزاروں سال تک لڑیں گے ——— دراصل یہ تقریر پاکستان کے سیدھے سادے اور عام لوگوں کو یہ تاثر دینے کے لئے کی گئی تھی کہ بھٹو بڑا نڈر، دلیر اور جیالا ہے۔ یہ تو سلامتی کونسل میں بھی ہزاروں سال تک لڑنے کی بات کرتا ہے۔ حالانکہ میرے تجزیہ اور خیال کے مطابق اس وقت بھٹو نے پولینڈ کی قرارداد ہی نہیں پھاڑی تھی بلکہ دراصل پاکستان کا نقشہ پھاڑ دیا تھا۔ کیونکہ اس وقت بھی عالمی برادری پاکستان کی سلامتی اور وحدت کی متمنی تھی ——— لیکن قرارداد جس میں کہا گیا تھا کہ "سیاسی سمجھوتہ کیا جائے جس کا دوسرے لفظوں میں معنی یہی تھا کہ شیخ مجیب الرحمٰن کو اقتدار منتقل کر دیا جائے۔ اور شیخ صاحب بھٹو صاحب کو اقتدار میں شریک کرنے کو تیار نہیں تھے۔

مجھے اصرار ہے کہ بھٹو نے محض اقتدار کی خاطر اس مملکت خداداد کے دو ٹکڑے کر دیئے۔ اس کے سامنے

دو ہی صورتیں تھیں۔ ایک تو مکمل پاکستان ـــــــ جس کا اقتدار شیخ مجیب کے پاس ہو۔ اور جس کی اسمبلی میں بھٹو صاحب اپوزیشن کی بنچوں پر بیٹھے ہوں اور دوسری آدھا پاکستان۔ لیکن جہاں بھٹو بلا شرکت غیرے سفید و سیاہ کے مالک ہوں ـــــــ اور یوں بھٹو نے دوسری صورت کا انتخاب کرلیا۔

اس بات کا اندازہ کرنے کے لئے کہ بھٹو ایک سازش اور سوچے سمجھے منصوبے کے تحت اقوام متحدہ میں ڈرامہ لگا رہے تھے۔ ایک ہی بات کافی ہے کہ جب وہ پاکستان سے گئے تو ٹی وی کی ایک ٹیم ان کے ہمراہ گئی جس نے سلامتی کونسل میں ان کی تقریر، پولینڈ کی قرارداد پھاڑتے اور واک آؤٹ کے سارے مناظر فلمائے۔ اور پھر جب ۲۰ دسمبر کو بھٹو نے اقتدار سنبھالا تو یہ فلم ٹی وی پر دکھائی گئی۔ اس کا مقصد بھٹو کی شخصیت کو ایک ایسے جیالے، نڈر اور بے باک شخص کے طور پر ابھارنا تھا جو اس وقت "مرد بحران" بنا ہوا تھا جب پاکستان ٹوٹ رہا تھا لیکن یہ ایک غیور اور محب وطن لیڈر کی حیثیت سے عالمی برادری میں قومی وقار کا تحفظ کر رہا تھا۔

میرا تجزیہ یہ ہے کہ اگر بھٹو پولینڈ کی قرارداد کو پھاڑنے کی بجائے قبول کر لیتے تو پھر صورتحال پاکستان کے حق میں بہت زیادہ بہتر ہوتی کیونکہ عالمی طاقتوں کے لئے کسی بھی معاملہ کو طے کرنا مشکل نہیں ہوتا۔ وہ اگر ایک آنکھ کے اشارے سے کسی ملک کو دوسرے پر حملہ کرنے کے لئے کہہ سکتے ہیں تو دوسری آنکھ کے اشارے سے حملہ آور فوجیں واپسی کا راستہ بھی اختیار کر لیتی ہیں۔ لیکن افسوس ایسا نہ ہوا اور پاکستان بھٹو کی ہوس اقتدار کا نشانہ بننے سے نہ بچ سکا۔

ادھر ۱۷ دسمبر ۱۹۷۱ء کو ڈھاکہ کے پلٹن گراؤنڈ میں پاکستان کی فوج کے (مشرقی) کمانڈر جنرل امیر عبداللہ نیازی نے بھارتی فوج کے کمانڈر جنرل اروڑا کے سامنے ہتھیار ڈالے اور شکست کے پروانہ پر دستخط کیے" اور اس کے ساتھ ہی مشرقی پاکستان کے بجائے بنگلہ دیش بن گیا۔ یہاں میں اس جانب بھی اشارہ کرتا ہوں کہ گزشتہ کچھ عرصہ سے پیپلز پارٹی کے بعض نئے دانشوروں نے یہ پروپیگنڈہ شروع کر رکھا ہے کہ سلامتی کونسل کے اجلاس میں بھٹو نے پولینڈ کی قرارداد نہیں پھاڑی تھی بلکہ اپنی تقریر کے نوٹس پھاڑے تھے۔ لیکن میرا استفسار اس کے جواب میں یہ ہے کہ اگر بھٹو نے اس قرارداد کو نہیں پھاڑا تو پھر اس کو منظور کیوں نہیں کیا؟ اور دوسرا یہ کہ کیا وہ اپنی تقریر کے نوٹس پھاڑ کر احتجاج کر رہے تھے جبکہ احتجاج تو یوں نہیں ہو سکتا تھا ـــــــ نیز میں بصد اصرار یہ جاننا چاہتا ہوں اور

میرے خیال میں ساری قوم ایک عرصہ تک ان دو سوالوں کے جواب کی تاریخ سے طلبگار رہے گی

- بھٹو کی بیماری کا اصل سبب کیا تھا ؟
- پولینڈ کی قرارداد کیوں پھاڑی گئی تھی ؟

ہم کہ ٹھہرے اجنبی

میں نے ۱۲ اکتوبر ۱۹۷۱ء کو کراچی سے ڈھاکہ جانے کا پروگرام بنایا۔ میرے ہمراہ میرے بڑے بھائی صاحبزادہ شیر علی خان ایڈووکیٹ بھی تھے۔ جب میں گھر سے ایئر پورٹ کے لئے روانہ ہوا تو مجھے میرے بعض دوستوں نے اطلاع دی کہ پیپلز پارٹی کے غنڈوں کا ایک لٹھ بردار گروہ اس سٹار گیٹ کے پاس کھڑا ہوا ہے جہاں سے ایئر پورٹ کے لئے راستہ مڑ جاتا ہے اور اسی طرح کا ایک گروہ اس مقام پر متعین کر دیا گیا ہے جہاں چیک ان رپورٹ کی جاتی ہے۔

میرے لئے یہ بات معمولی تھی اور میں نے اس کا توڑ یوں نکالا کر ایئر پورٹ کارگو کے راستہ ایئر پورٹ کے اندر داخل ہو گیا۔ سیکورٹی گیٹ پر میں نے اپنا تعارف کرایا اور بتایا کہ دوسرے راستہ پر "جیالے کارکن" میرا راستہ روکے ہوئے ہیں اور اگر میں ادھر سے گیا تو میرا وقت ضائع ہو گا اور پریشانی بھی ہو گی ـــــــ وہاں متعین عملہ نے میری تشویش اور دلیل سے اتفاق کیا۔ اور یوں میں گاڑی سمیت اپرن پر جا پہنچا، جہاں جہاز تیار کھڑا تھا۔

اسی جہاز سے پیپلز پارٹی کا ایک وفد بھی مشرقی پاکستان جا رہا تھا جس کے سربراہ میاں محمود علی قصوری تھے اور اس میں مولانا کوثر نیازی سمیت متعدد حضرات شامل تھے۔ کیونکہ اس زمانے میں وہاں ضمنی انتخابات ہو رہے تھے۔ یہ ان نشستوں کے لئے تھے جو بعض ارکان کی رکنیت (یحییٰ خان کی طرف سے) منسوخ کرنے کے بعد خالی ہو گئی تھیں۔ یحییٰ خان کا یہ فیصلہ بھی آئینی اعتبار سے غلط تھا۔ کیونکہ منسوخی کا ایسے فیصلہ نہیں ہوا کرتا۔ یہ نشستیں مغربی پاکستان کی پارٹیوں میں تقسیم کر دی گئیں جیسے کوئی بسکٹ فیکٹری یتیم خانہ کے بچوں کو بسکٹ کے ڈبے تقسیم کر دیتی ہے۔ چنانچہ اس سلسلہ میں اپنا حصہ لینے کے لئے پیپلز پارٹی کا مذکورہ وفد مشرقی پاکستان جا رہا تھا۔ یہ لوگ میرے ہم سفر تھے اور ان کو بخوبی احساس تھا کہ ڈھاکہ ایئر پورٹ پر میرا والہانہ استقبال ہو گا۔

دراصل مشرقی پاکستان کے عوام تک میری شہرت بہت پہلے پہنچ چکی تھی۔ وہ اس امر سے آگاہ تھے کہ پیپلز پارٹی میں صرف میں ہی وہ شخص ہوں جو بنگالیوں کے حقوق اور عزت نفس کا داعی ہوں لہٰذا پیپلز پارٹی کے (میرے ہم سفر) وفد کو خدشہ لاحق ہو گیا کہ کہیں ڈھاکہ ایئرپورٹ پر قصوری کے استقبال کے ساتھ ساتھ ان کی درگت نہ بن جائے۔ تو اس وفد نے عین آخری وقت اپنا ارادہ ملتوی کرنے کا فیصلہ کرلیا۔

میں ڈھاکہ ایئرپورٹ پر اترا اور وی آئی پی روم میں چلا گیا جہاں اس وقت کے گورنر ڈاکٹر مالک اتفاق سے موجود تھے۔ وہ اپنے کسی عزیز کو الوداع کہنے کے لئے وہاں آئے ہوئے تھے۔ وہاں میرے ایک بنگالی دوست نے میرا ان سے تعارف کرایا تو گورنر مالک نے پوچھا: آپ کہاں ٹھہریں گے؟ میں نے انہیں بتایا کہ یہاں ڈھاکہ میں میرے کچھ دوست اور واقف کار لوگ ہیں۔ ان کے پاس ٹھہروں گا یہ سنتے ہی انہوں نے اپنے ملٹری سیکرٹری کو بلایا اور اسے ہدایت کی کہ قصوری صاحب کا ایڈریس نوٹ کرو۔ اور ان کی قیامگاہ پر مسلح گارڈ کا پہرہ لگاؤ۔

میں نے ان سے کہا کہ اس عزت افزائی کے لئے میں آپ کا شکر گزار ہوں مگر میں تو یہاں مشرقی پاکستان کے اپنے بھائیوں سے ملنے کے لئے ہی آیا ہوں اور ان سے رابطہ قائم کرنے کے لئے آیا ہوں۔ اگر میرے گھر پر پہرہ ہوا۔ اور مسلح افراد کے پہرے میں میں نے نقل و حرکت کی تو لوگ کیسے مجھ سے ملیں گے۔ اس طرح تو میرے اور ان کے درمیان خوف و ہراس کی دیوار کھڑی ہو جائے گی۔

تب ڈاکٹر مالک نے کہا کہ قصوری صاحب یہاں پر حالات اب وہ پہلے والے نہیں رہے۔ حالات خراب ہو چکے ہیں۔ اور اگر کسی شخص کی غیر ذمہ دارانہ حرکت سے آپ کو اگر معمولی سا نقصان بھی پہنچا تو یہ ہم لوگوں کے لئے بڑے شرم اور افسوس کی بات ہوگی۔ اس پر میں نے ان سے کہا کہ ڈاکٹر مالک آپ کے جذبات کے لئے میرے دل میں بڑی قدر ہے مگر میرا تو ایمان ہے کہ جو گولی مجھے لگنی ہے وہ ضرور لگے گی ـــــ اور اگر نہیں تو پھر کچھ نہیں ہوگا۔

میں نے ڈھاکہ پہنچنے کے اگلے روز (۱۳ اکتوبر) ڈھاکہ پریس کلب میں ایک پریس کانفرنس بلائی اور اس میں صحافیوں کی کثیر تعداد نے شرکت کی۔ اس پریس کانفرنس کی پیشگی خبر شائع ہوئی تو مقامی انتظامیہ نے مجھ سے رابطہ قائم کیا اور تجویز کیا کہ میں یہ پریس کانفرنس انٹر کانٹی نینٹل ہوٹل میں کروں جو نسبتاً زیادہ محفوظ

جگہ ہے۔ اور وہاں کسی بھی صورت حال سے نمٹنے کے لئے زیادہ بہتر مواقع ہیں۔ میں نے اس پر جواب دیا کہ میرا تعلق اس پیپلز پارٹی سے نہیں جو نعرہ تو غریبوں کا لگاتی ہے مگر اس کا قیام فائیو سٹار ہوٹلوں میں ہوتا ہے میں تو اس پیپلز پارٹی سے تعلق رکھتا ہوں جو عوام کی حقیقی اور صحیح ترجمان ہے لہٰذا میں تو پریس کلب ہی میں پریس کانفرنس کروں گا۔ چنانچہ میں نے پروگرام کے مطابق وہیں یہ پریس کانفرنس کی۔ یہ پریس کانفرنس اس قدر بھرپور اور مؤثر تھی کہ ایک اخبار نے صفحہ اول پر چوکھٹے میں سرخی جمائی۔

"احمد رضا قصوری نے پریس کلب آباد کر دیا۔"

اس کا سبب یہ تھا کہ جنوری ۱۹۷۱ء کے بعد ڈھاکہ پریس کلب میں کسی سیاست دان کی یہ پہلی پریس کانفرنس تھی۔ یعنی مغربی پاکستان تو کجا خود مشرقی پاکستان کے سیاست دان (مخدوش حالات کے پیش نظر) وہاں پریس کانفرنس نہیں کرتے تھے۔ حالات کی خرابی کا اندازہ یوں لگایا جا سکتا ہے کہ اس وقت ڈھاکہ کے گلی کوچوں میں عام لوگ بھی بم اور ہینڈ گرینیڈ یوں اپنی جیبوں میں لئے پھرتے تھے جیسے سگریٹ کے پیکٹ یا لولی پاپ لئے پھر رہے ہوں۔

اس پریس کانفرنس میں مَیں نے مشرقی پاکستان کے عوام کے حقوق کی بھرپور تائید کی اور اس موقع پر کہا کہ یہ دنیا کا اصول ہے کہ اقلیت علیٰحدگی اختیار کرتی ہے کبھی ایسا بھی ہوا ہے کہ اکثریت نے علیٰحدگی اختیار کرنے کا اعلان کیا ہو۔ پھر یہ بھی حقیقت ہے کہ پاکستان تو آپ (اہل مشرقی پاکستان) نے بنایا ہے آپ نے ہی ۱۹۰۵ء میں تقسیم بنگال کے حوالے سے ایک نئی مسلم مملکت کا فلسفہ اور نظریہ تشکیل دیا۔ ۱۹۰۶ء میں اسی شہر ڈھاکہ میں نواب سلیم اللہ کے گھر مسلم لیگ کا قیام عمل میں لایا گیا جس نے پاکستان کا خواب شرمندہ تعبیر کیا۔ پھر ۱۹۱۱ء میں تقسیم بنگال منسوخ کر دی گئی۔ ۱۹۳۷ء میں آپ ہی کے یہاں مسلم لیگ کی حکومت قائم کی گئی اور اس وقت بنگال کا صوبہ کئی یورپی ممالک کے مقابلے میں بڑا تھا جب کہ اس وقت پنجاب میں یونینسٹ پارٹی تھی۔ اسی دھرتی کے سپوت شیر بنگال اے کے فضل حق نے ۲۳ مارچ ۱۹۴۰ء کو لاہور میں قرارداد پاکستان پیش کی۔

اسی طرح پھر حسین شہید سہروردی نے دہلی میں پارلیمنٹ کنونشن آف مسلم لیگ میں ۱۹۴۶ء میں پاکستان کا نام سرکاری طور پر منظور کرایا اور یوں قرارداد لاہور کے سقم کو دور کر دیا۔ لہٰذا پاکستان کا راستہ اور اس ملک کی شمع تو آپ لوگوں نے ہمیں دکھائی ہے۔ اور اس نئی مملکت کی تاریخی، سماجی اور اقتصادی ضرورت

اہمیت اور افادیت سے آگاہ کیا ـــــ اب آپ لوگ ہمیں چھوڑ کر کہاں جارہے ہیں۔ اگر ہم سے زیادتیاں ہوئی ہیں تو ہمیں معاف کیجئے۔

میں پنجاب سے ضرور آیا ہوں مگر میں یہاں دولتانہ نون اور ٹوانوں کی نمائندگی نہیں کر رہا۔ میں اس پنجاب کی نمائندگی کر رہا ہوں جس نے ایک نئی ترقی پسند سوچ اور انداز فکر اختیار کیا ہے۔ میں پنجاب کے غریب عوام کا آپ لوگوں کے لئے سلام لایا ہوں۔

میں نے یہ بھی کہا کہ دراصل مشرقی پاکستان کے حقوق کی بات تو مغربی پاکستان سے ہونی چاہیئے اور اسی طرح سے مشرقی پاکستان سے ایک ناقابل تسخیر اور مضبوط پاکستان کا نعرہ ہونا چاہیئے ـــــ یہی وہ راستہ ہے جو ہمیں ایک عظیم پاکستان کی طرف لے جائے گا۔

اسی طرح میں نے ضمنی انتخابات کی مخالفت کرتے ہوئے مطالبہ کیا کہ تمام لوگوں کو معاف کیا جائے اور ڈھاکہ میں اسمبلی کا اجلاس بلایا جائے تاکہ ہم سب مل جل کر پاکستان کے تابناک مستقبل کے لئے اپنا تاریخی کردار ادا کریں۔

جب میں نے اس لہجہ اور جذبہ سے بات کی تو وہاں کا پریس میرا دیوانہ ہو گیا۔ خاص طور پر عوامی لیگ کے حامی اخبارات نے میری خوب پذیرائی کی۔ مجھے یاد ہے کہ میرے انتہائی عزیز دوست میجر امین الرحمٰن (دوہا (جو بعد میں بنگلہ دیش کے وزیر خارجہ بھی ہوتے) مجھے بتایا کہ میری خبریں اخبارات کے علاوہ ریڈیو سے بھی تواتر اور تفصیل کے ساتھ بنگلہ دیش کے انقلابی ریڈیو اسٹیشن "ہگلی" سے نشر ہو رہی ہیں۔ اور بقول ان کے "اتنی اہمیت تو مرکز کے وزراء کو بھی نہیں دی جاتی۔"

یہاں یہ بات مد نظر رہے کہ میں نے مشرقی پاکستان میں جا کر نہ تو پانی میں گھرے لوگوں کو باہر نکالا ـــــ اور نہ ہی ان کے بھوکے بچوں کو خشک دودھ کے ڈبے دیئے کہ وہ میرے خیر خواہ اور دوست ہو گئے ـــــ اصل بات یہ تھی کہ میں نے ان کے حقوق کی بات کی تھی۔ اور تاریخ کے صفحوں میں ان کی گمشدہ انفرادیت اور تشخص سے ان کو متعارف کرایا تھا۔

اس موقع پر متعدد بنگالی راہنماؤں نے مجھ سے رابطہ قائم کیا جن میں بعض وہ لیڈر بھی تھے جو زیر زمین کام کر رہے تھے۔ مجھ سے عبدالسلام خان اور مولوی فرید احمد سمیت کئی لوگ ملے جن میں وکلاء، دانشور اور اساتذہ شامل تھے۔

ان لوگوں نے مجھے مجموعی طور پر یہ عندیہ دیا کہ اگر میں واپس اسلام آباد جا کر حکومت کو اس بات پر آمادہ کر لوں کہ وہ ضمنی انتخابات منسوخ کر کے تمام لوگوں کو معافی دے دے اور ڈھاکہ میں اسمبلی کا اجلاس طلب کرے تو وہ (اہل بنگال) سرحد پار کر جانے والے عناصر کو واپس بلالیں گے۔

مجبور و بے بس جرنیل

یہ صورتحال خاصی حوصلہ افزا تھی لہٰذا میں نے فوراً جنرل راؤ فرمان علی سے رابطہ کیا جو گورنر کے بظاہر تو مشیر تھے مگر دراصل وہی گورنر تھے (مشیر کا عہدہ لوگوں کو فریب دینے کے لئے بنایا گیا تھا) اور ساری حکومت وہی چلا رہے تھے۔ میں نے ان سے رابطہ کیا۔

ان سے ملاقات ہوئی تو میں نے ان کو اپنی کوششوں سے آگاہ کیا اور بتایا کہ فعال سیاسی عناصر اب بھی کسی پرامن سمجھوتے اور مشترکہ لائحہ عمل مرتب کرنے کے لیے تیار ہیں۔ میں نے انہیں بتایا کہ میری تمام سطح کے لیڈروں سے بالمشافہ بات چیت ہوئی ہے۔ اب آپ (راؤ فرمان) اسلام آباد سے رابطہ کریں۔

میری باتیں سننے کے بعد جنرل راؤ فرمان علی خاموشی سے اٹھے اور مجھے ہمراہ آنے کا اشارہ کیا۔ وہ مجھے اپنے آپریشن روم میں لے گئے۔ سامنے دیوار پر ایک ریشمی اور دیدہ زیب پردہ پڑا ہوا تھا۔ انہوں نے اس کے ایک طرف سے سنہری ڈور آہستہ آہستہ کھینچی تو پردہ ہٹنا شروع ہو گیا اور پلک جھپکتے ہی مشرقی پاکستان کا نقشہ بے نقاب ہو گیا۔ پھر انہوں نے سامنے پڑی ایک خوبصورت چھڑی اٹھائی اور اس کی چمکدار نوک سے ان مقامات کی نشاندہی کرنا شروع کر دی جہاں اس وقت فوج موجود تھی۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ اس بات پر زور دے رہے تھے "یہاں ہماری پوزیشن زیادہ اچھی ہے۔" انہوں نے خالص فوجی بریفنگ کی اصطلاح میں کہا: ۲۵ مارچ کے ایکشن سے پنڈولم ایک طرف چلا گیا تھا —— اب یہ پنڈولم دوسری طرف چلا گیا ہے —— بس جلد ہی یہ پنڈولم درمیان میں آجائے گا۔

میں نے ان کی بات کاٹ کر اور نقشہ کی طرف پیٹھ کرتے ہوئے کہا: جناب میں آپ سے ایک سیاسی مسئلہ سیاسی انداز میں طے کرنے کے بارے میں گفتگو کرنے کے لئے آیا ہوں اور میرے پاس ایک واضح اور قابل عمل فارمولا ہے آپ مجھے فوجی بریفنگ دے رہے ہیں۔

جنرل فرمان نے ایک گہری چپ کے بعد کہا: اور میں کیا کر سکتا ہوں؟

میں نے کہا: آپ اس قدر مایوس نہ ہوں۔ میں نے لوگوں کے حوصلے بڑے مثبت دیکھے ہیں۔ مجھے اپنے دوستوں پر اعتماد ہے۔ آپ اسلام آباد سے رابطہ کر کے جنرل یحییٰ خان سے بات کریں اور بے شک میرا بتا دیں کہ اگر بھارت چلے جانے والے بنگالی ممبران اسمبلی کو معاف کر دینے کا اعلان کر دیا جائے تو حالات نہ صرف بہتر ہونے کا امکان ہے بلکہ یہ معمول پر لائے جا سکتے ہیں ـــــ میری یہ باتیں سن کر جنرل فرمان نے میری طرف یوں دیکھا جیسے انہیں میری باتوں پر یقین نہ ہو ـــــ تب میں نے ان سے کہا: راؤ صاحب وقت کم ہے۔ آپ کی خاموشی سے میں کیا معنی لوں؟

انہوں نے بالکل نیم دلی اور فکرمندی کے ملے جلے جذبات سے کہا: دراصل فوج کا ڈسپلن ہی ایسا ہوتا ہے کہ ـ ـــ ـــ ـ !

میں نے سمجھ لیا کہ اب وہ مجھے فوج کے ڈسپلن پر لیکچر دیں گے۔ لہٰذا میں اُٹھ کر کھڑا ہو گیا اور رخصت ہونے کے لئے ہاتھ بڑھاتے ہوئے بولا: مؤرخ جب تاریخ لکھتا ہے تو وہ فوج کے ڈسپلن کا پابند نہیں ہوتا ـــــ معلوم نہیں وہ میری یہ بات سمجھ سکے یا نہیں اور اگر سمجھ سکے تو انہوں نے اس کا کس طور اثر قبول کیا۔ بہرحال میں وہاں سے بوجھل قدموں سے واپس آ گیا۔ اب مجھے شدت سے احساس ہوا کہ عوامی جذبات اور حب الوطنی کے جذبے ڈسپلن کے بوجھ تلے دبے پڑے ہیں۔

الوداع، الوداع

میں مشرقی پاکستان میں تقریباً دو ہفتہ تک رہا۔ اس عرصہ میں مَیں نے ڈھاکہ کے گرد و نواح کا دورہ بھی کیا اور ہر جگہ بنگالیوں کے حقوق کی حمایت کی۔ میں وہاں جتنے دن رہا خاصا سرگرم رہا۔ ہر روز کسی نہ کسی اخبار میں میری تقریر چھپی ہوتی تھی۔ لہٰذا اگر میں کبھی بیت المکرم کی طرف چلا جاتا تو کئی لوگ مجھے پہچان لیتے اور میری طرف انگلی سے اشارہ کر کے دوسروں کو کہتے: وہ دیکھو قصوری (رضا قصوری) ـــ! ان کے انداز بتاتے تھے کہ وہ مجھ سے محبت کرتے ہیں، حالانکہ میں نے ان کے لئے چاہنے کے باوجود کچھ نہیں کیا تھا۔ محض زبان سے ان کے جائز مطالبات کی حمایت کی تھی۔ ان لوگوں کی محبت آج بھی میرے دل میں ان کی یاد کا جادو جگاتی ہے تو میں ان کی خوشحالی اور بہبود کے لئے دعاگو ہوتا ہوں۔

ابھی ہم واپس آنے کے پروگرام کو حتمی شکل دے رہے تھے کہ ایک رات عجیب واقعہ ہوا، میں اور میرے بھائی (شبیر علی خان) ایک دعوت سے رات گئے واپس آئے اور لباس تبدیل کر کے بستروں میں جا گھسے۔ میری آنکھ نہیں لگ رہی تھی لیکن میرے بھائی سو گئے۔ رات کا سناٹا اور چپ چاروں طرف پھیلا ہوا تھا۔ ایک عجیب سا سحر انگیز ماحول تھا اور مجھے نیند نہیں آ رہی تھی۔ اچانک میرے بھائی اٹھ کر بستر پر بیٹھ گئے اور آنکھیں ملنے لگے ——— میں نے محسوس کیا کہ وہ کچھ پریشان ہیں ——— میں جلدی سے ان کے نزدیک گیا۔ پانی کا گلاس بھر کر ان کو دیا اور کہا: شبیری بھائی ——— کیا بات ہے؟ - وہ پانی کے دو تین گھونٹ پی کر گلاس میز پر رکھتے ہوئے بولے: رضا ——— میں نے بڑا بھیانک خواب دیکھا ہے۔

کیسا خواب ؟ میں نے حیرت اور تعجب سے پوچھا۔

وہ کہنے لگے: میں نے خواب میں دیکھا ہے کہ مشرقی پاکستان ہم سے الگ ہو گیا ہے۔

میں نے قدرے خوشگوار موڈ میں کہا: بھائی جان ایسی بھی کیا بات ہے۔ آپ لوگوں کا جذبہ اور محبت نہیں دیکھ رہے، وہ علیحدگی نہیں چاہتے، وہ تو ناراض ہیں۔ خدا نے چاہا تو حالات ٹھیک ہو جائیں گے۔ لیکن انہوں نے اپنی بات پر اصرار کرتے ہوئے کہا: رضا۔ میں نے تمہیں پہلے نہیں بتایا ——— پرسوں سے میری بائیں آنکھ بھی پھڑک رہی ہے اور جب یہ آنکھ پھڑکتی ہے تو کوئی نہ کوئی حادثہ ہو جاتا ہے۔

اگرچہ ابھی چند دنوں کی مصروفیات باقی تھیں مگر اپنے بھائی کے زبردست اصرار پر میں نے واپسی کا پروگرام بنایا ——— اب مشکل یہ آن پڑی تھی کہ جہاز پر سیٹ نہیں مل رہی تھی۔ اس قدر رش تھا کہ کئی کئی دن پہلے ہی بکنگ مکمل ہو جاتی تھی۔ مجھے تو ایم این اے ہونے کی وجہ سے استحقاق پر سیٹ مل گئی مگر مسئلہ بھائی صاحب کی سیٹ تھا۔ اپنے طور پر کوشش کی مگر کوئی نتیجہ نہ نکلا ——— بالآخر میں نے ذاتی طور جنرل نیازی سے رابطہ کیا۔ انہوں نے فوج کے لئے مخصوص نشستوں میں سے ایک سیٹ دلا دی، کیونکہ اتفاق سے اس روز ایک سیٹ خالی تھی۔ یوں تقریباً ۲۸ اکتوبر کو میں اور میرا بھائی واپس کراچی آ گئے اور میرے بھائی کا اندیشہ درست ثابت ہوا کیونکہ ۵ نومبر کو مغربی اور مشرقی پاکستان کے درمیان فضائی سروس کا سلسلہ منقطع ہو گیا۔ اور اس کے ساتھ ہی دونوں صوبے ایک دوسرے سے مکمل طور پر علیحدہ

ہو کر رہ گئے۔

یہاں آکر میں نے کراچی میں اپنے دوستوں سے رابطہ کیا انہوں نے بتایا کہ میرے مشرقی پاکستان کے دورے کو یہاں (۷۰، کلفٹن میں) بڑی گہری نظر سے دیکھا جاتا رہا ہے۔ میں نے وہاں جا کر جس انداز میں بنگالیوں کے جائز مطالبات کی حمایت کی، ان سے ہونے والی زیادتیوں کی تلافی کا ذکر کیا اور بھارت چلے جانے والوں کے لئے عام معافی کا مطالبہ کیا اور ڈھاکہ میں اسمبلی کا اجلاس بلانے کا اصرار کیا۔ اس کو بھٹو صاحب نے ستائش کی بجائے تشویش کی نگاہ سے دیکھا ہے۔ گویا پیپلز پارٹی کو میں نے اپنی اصول پرستی اور حقیقت پسندانہ رویہ سے مزید ناراض کر لیا تھا۔

بھٹو سے اختلافات کی وجہ

حنیف رامے کا فلسفہ

بھٹو سے میرا اولین نقطۂ اختلاف یہ تھا کہ جنوری ۱۹۷۱ء میں (یعنی انتخاب کے فوراً بعد) روزنامہ مساوات کے ایڈیٹر محمد حنیف رامے نے بھٹو کی ہدایت پر مساوات کے ذریعے یہ عندیہ دینا شروع کر دیا کہ پیپلز پارٹی نے ملک میں انقلاب برپا کر دیا ہے۔ بلکہ انقلاب آچکا ہے۔ ہر دور میں خوشامدیوں کی کمی نہیں رہی بہرحال ہمیں انقلاب کی نوید دی گئی۔ جیسا کہ میں پہلے عرض کر چکا ہوں کہ پیپلز پارٹی دو حصوں میں تقسیم ہو چکی تھی۔ ایک وہ پیپلز پارٹی جو ایسے جیالے کارکنوں پر مشتمل تھی جو دن کے اجالے میں پارٹی کا منشور لے کر چل رہے تھے اور دوسری ان مخصوص مزاج رکھنے والے لوگوں کی جو تاریکیوں میں ہی اپنی صلاحیتوں کا مظاہرہ کر سکتے تھے۔ اس میں وہ لوگ بھی شامل تھے جو خوشامدی اور کاسہ لیس تھے۔ یہ لوگ موقع محل دیکھ کر بات کرتے اور شاہ سے زیادہ شاہ کے وفادار بنتے تھے۔

میرا تعلق اول الذکر گروہ یا حصہ سے تھا۔ لہٰذا کارکنوں سے میں نے براہ راست رابطہ رکھا ہوا تھا۔ چنانچہ میں یہ محسوس کرتا تھا کہ کارکن اس بات کو دل سے تسلیم نہیں کرتے کہ انقلاب آگیا ہے۔ یہ بات درست بھی تھی کیونکہ انقلاب تو دل و دماغ میں آتا ہے۔ یہ ملکی نظام میں دکھائی دیتا ہے اور ابھی تو ایسے کوئی آثار دکھائی نہیں دے رہے تھے۔ لہٰذا ہم نے اس سوچ (کہ انقلاب آگیا ہے) کا مقابلہ کیا۔ اس سلسلہ میں میں نے قصور میں ایک جلسۂ عام کا اہتمام کیا جس میں مختار رانا اور کاردار کو مدعو کیا۔ وہاں اپنی تقریر کے دوران میں نے جھوٹے انقلاب کا جھوٹا مژدہ سنانے والوں پر کڑی تنقید کی۔ اس تقریر کے مزاج اور لہجہ کا اندازہ روزنامہ آزاد (۲۳ جنوری ۱۹۷۱ء) کی اس سرخی سے بخوبی لگایا جا سکتا ہے۔

وزارتیں تم رکھو، ہم عوام کی خدمت کرتے رہیں گے۔

ہم انتخابات کو انقلاب قرار دے کر آرام سے نہیں بیٹھ سکتے۔

اس جلسہ کا رنگ گہرا جذباتی اور عوامی تھا۔ مجھ سمیت تمام مقررین نے برملا کہا کہ ہم ان لوگوں میں سے نہیں جو بھٹو کو خوشامد اور جی حضوری کے دام میں گرفتار کر کے اس سے وزارتیں حاصل کرنے کے طلبگار ہیں۔ ہم نے تو عوام سے اعتماد اور محبت کی بنیاد پر ووٹ حاصل کئے ہیں اور ہم محبت میں دغابازی یا غداری کے روادار نہیں ہوں گے۔ جب تک روٹی، کپڑا اور مکان کا وعدہ پورا نہیں ہوتا اور جب تک بے نوا اور بے آسرا لوگوں کو احساس تحفظ میسر نہیں آجاتا اس وقت تک انقلاب نہیں آسکتا۔ ظاہر ہے کہ لوگوں کے دلوں میں یہ باتیں جگہ کر گئیں۔ چنانچہ انہوں نے اس کا پرجوش خیر مقدم کیا۔

مجھے اچھی طرح معلوم ہے کہ اس جلسہ کی رپورٹ بھٹو تک اس انداز میں پہنچائی گئی کہ قصوری کا دماغ خراب ہو گیا ہے ـــــ وہ خود کو بھٹو سمجھتا ہے ـــــ اس نے وزارت حاصل کرنے کے لئے یہ ڈرامہ رچایا ہے ـــــ وہ پنجاب کا گورنر بننا چاہتا ہے ـــــ وغیرہ وغیرہ ـــــ

تہران میں اجلاس

اسی طرح جولائی ۱۹۷۱ء میں ایک اور واقعہ ایسا ہوا جس سے میرے اور بھٹو کے درمیان

خلیج بڑھ گئی۔ یہ وہ موقع تھا جب بھٹو نے پیپلز پارٹی کی سنٹرل کمیٹی کا اجلاس تہران میں منعقد کیا۔ تہران میں ان دنوں رچرڈ ہیلم امریکی سفیر تھا جو اس سے پہلے سی آئی اے کا سربراہ رہ چکا تھا۔ اس امر سے قطع نظر بھی یہ بات اصولاً غلط تھی کہ پاکستان کی کوئی سیاسی پارٹی اپنی مرکزی کمیٹی کا اجلاس کسی دوسرے ملک میں منعقد کرے۔ میں نے اس بات کی واضح طور پر مخالفت کی۔ میرے یہ بیانات اس وقت کے قومی اخبارات میں شائع ہوئے کہ بھٹو کی تہران میں سرگرمیوں کی تحقیقات کرائی جائے۔

میں نے اس موقع پر واضح طور پر کہا تھا کہ شاہ ایران کا امریکہ اور سی آئی اے سے تعلق کوئی راز نہیں پیپلز پارٹی کی مرکزی کمیٹی کا تہران میں اجلاس اس شک کو یقین میں بدلتا ہے کہ پیپلز پارٹی اپنے روابط غیر ملکی طاقتوں سے بڑھا رہی ہے اور وہ (پارٹی) ان طاقتوں کی مدد سے اقتدار تک پہنچنا چاہتی ہے مجھے اصرار تھا کہ اقتدار تک پہنچنے کا اصول آئینی، دستوری اور جمہوری راستہ تو عوام کی تائید اور حمایت کا راستہ ہے۔ لیکن اس وقت بھٹو اقتدار کی ہوس میں اس حد تک مبتلا ہو چکے تھے کہ وہ ہر قیمت پر اور ہر حال میں اقتدار حاصل کرنا چاہتے تھے۔ اگرچہ میری مخالفت اور احتجاج صدا بصحرا ثابت ہوئے مگر میں سمجھتا ہوں کہ میں نے اپنے ضمیر کا حق ادا کر دیا۔

تہران میں کیا ہوا؟ —— یہ الگ پراسرار کہانی ہے جس کے حقائق کا پتہ چلانا سیاسیات کے محققین اور مؤرخین کا کام ہے۔ مجھے البتہ اتنا معلوم ہے کہ تہران میں ایک رات بھٹو، شاہ ایران اور رچرڈ ہیلم (امریکی سفیر) کی خفیہ ملاقات ہوئی جس میں اصولی طور پر اس امر سے اتفاق کیا گیا کہ بھٹو کو حکومت دلا دی جائے گی، خواہ اس کے لئے جتنی بڑی قیمت کیوں نہ ادا کرنی پڑے۔ گفتگو اور معاملہ کو نتیجہ خیز بنانے میں شاہ ایران کی ہمشیرہ شہزادی اشرف پہلوی نے بڑا نمایاں اور سرگرم کردار ادا کیا تھا جو بھٹو کی شخصیت کی دل وجان سے مداح تھی۔ شہزادی اشرف نے اس ملاقات سے اگلے روز ایک تقریب میں اپنے موڈ میں اس وقت کے پاکستانی سفارتکار سے کہا تھا "آپ اپنے ملک میں خوبصورت لوگوں کو برسر اقتدار دیکھنا کیوں پسند نہیں کرتے؟" —— سفارتکار صاحب سفارتی آداب کے مارے خاموش ہو کر رہ گئے۔ وہ اس وقت یقیناً نہیں سمجھ سکے کہ شہزادی کے اس جملہ کا مقصد کیا تھا۔

قائد عوام کی عوام دشمنی

اس میں کسی شک وشبہ کی گنجائش نہیں کہ میں نے بھٹو کی اسمبلی کے اندر اور باہر پُرزور مخالفت

مخالفت کی مگر تاریخ اور ریکارڈ گواہ ہے کہ میری یہ مخالفت ـــــ محض مخالفت برائے مخالفت نہیں تھی اور نہ ہی اس کا محرک کوئی لالچ یا طمع تھا۔ بلکہ میں نے یہ مخالفت اس وقت شروع کی جب میں نے پورے غور و خوض کے بعد دیانتداری سے محسوس کیا کہ بھٹو نے جو وعدے پاکستان کے غریب عوام، محنت کشوں، کسانوں، مزارعوں اور طلبا کے ساتھ کئے تھے وہ ذہنی اور عملی طور پر اپنے ان وعدوں سے منحرف ہو گئے ہیں اور پارٹی کے پروگرام سے انہوں نے لاتعلقی ظاہر کرنا شروع کر دی ہے۔ میرے سامنے ان حالات میں اور کوئی دوسرا راستہ باقی نہیں رہ گیا تھا کہ میں بھٹو کو بار بار یہ یاد دلاتا رہوں کہ انہوں (بھٹو) نے عوام سے کیا وعدہ اور کیا کومٹ منٹ کیا تھا۔ میں پورے اعتماد اور یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ میں نے بھٹو کی مخالفت اس وقت کی جب وہ منشور سے ہٹ گئے۔ اپنے عوام سے کئے گئے وعدوں سے راہ فرار اختیار کر لی اور قائد عوام نے "عوام دشمن" رویہ کا اظہار کرنا شروع کر دیا محض اپنی ذاتی خواہشات کو پورا کرنے کے لئے انہوں نے قوم کے اساسی ادارے یعنی مقننہ، عدلیہ اور انتظامیہ کو تہس نہس کرنے سے گریز نہ کیا اور وہ اصول جو پاکستان کی سلامتی اور بقا کے ضامن ہیں انہوں نے ان اصولوں کو پامال کرنا شروع کر دیا۔ اس کے علاوہ انہوں نے گلیوں بازاروں میں جمہوریت کا پرچم لے کر نکلنے والے سیاسی کارکنوں، دانشوروں و وکلاء پر بے پناہ تشدد کیا ـــــ ایسے میں میں نے صورت حال کا جائزہ لیا اور محسوس کیا کہ اب بھٹو کی مخالفت کے سوا کوئی دوسرا راستہ باقی نہیں رہ گیا۔

میں اس نتیجہ پر پہنچا کہ اس شخص (بھٹو) کو بے نقاب کرنا میرا اخلاقی، جمہوری اور سیاسی فرض ہے جس نے اپنے آمر چہرہ کے اوپر جمہوریت اور عوامیت کا خوبصورت چہرہ سجا رکھا ہے۔ چنانچہ اسمبلی کے اندر میں نے فیڈرل سیکورٹی فورس، انٹی ٹیررسٹ ایکٹ، اینٹی ٹیررسٹ کورٹ ایکٹ (جنہیں عام عدالتوں کا حق چھین کر خصوصی اختیارات دیئے گئے تھے) جیسے قوانین کی بھرپور مخالفت کی، کیونکہ مجھے واضح طور پر دکھائی دے رہا تھا کہ یہ انداز اور تیور کسی جمہوری لیڈر کے نہیں بلکہ ایک ایسے شخص کے ہیں جو اپنے اقتدار کے تحفظ اور استحکام کے لئے ان کو انتہائی ظالمانہ انداز میں استعمال کرے گا۔

آئین پر اختلاف

پاکستان کی دستور سازی کی تاریخ میں مجھے یہ منفرد مقام اور اعزاز حاصل ہے کہ اس آئین کی

تیاری کے وقت میں نے اپوزیشن (جس میں میاں محمود علی قصوری، پروفیسر غفور، شاہ احمد نورانی، ولی خان نواب خیر بخش مری، غوث بخش بزنجو جیسے ذہین اکابرین شامل تھے) کی جانب سے بحث کا آغاز کیا اور پھر اس بحث کو سمیٹا۔ یہ اعزاز بہت کم لوگوں کو ملتا ہے کیونکہ قوموں کی تاریخ میں آئین روز روز نہیں بنتے (قوانین کی بات اور ہے وہ تو دن میں کئی ایک بنا سکتے ہیں) چنانچہ میں آئین کا FOUNDING FATHER ہی نہیں بلکہ ۱۹۷۳ء کے آئین میں میرا ایک بڑا نمایاں کردار اور حصّہ ہے اس آئین میں میں نے ذاتی طور پر ۲۵۰ ترامیم پیش کیں۔ یہ الگ بات کہ یہ ترامیم منظور نہیں ہوئیں، لیکن اس تعداد سے بخوبی اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ میں نے اس آئین کا کس قدر عمیق اور گہرا تجزیاتی مطالعہ کیا اور تعمیری اور مثبت طرز فکر و عمل اختیار کیا۔ ہر ترمیم کے ساتھ میں تقریر بھی کرتا تھا۔ یوں جن لوگوں نے آئین کو تنقید اور شماریات کی نظر سے دیکھا ہے وہ اس امر کی تصدیق کریں گے کہ آئین ۱۹۷۳ء کا ⅓ حصّہ جو تحریری طور پر اب بھی اسمبلی کے ریکارڈ میں محفوظ ہے ـــــ وہ میرے نام پر ہے۔ لیکن جب آئین پر ووٹنگ کا مرحلہ آیا تو میں نے نہ اس آئین کے حق میں ووٹ ڈالا اور نہ میں نے اس کی سرکاری دستاویز پر دستخط کئے۔ یہ تاریخی دستاویز (MASTER COPY) آج بھی کراچی کے قومی عجائب گھر میں محفوظ ہے جس میں میرے نام کے آگے میرے دستخط موجود نہیں۔

میرے اس رویہ اور سلوک کی بنیاد میری یہ سوچ تھی کہ یہ آئین ایک مکمل دستاویز نہیں کیونکہ پیپلز پارٹی نے عوام سے جو وعدے کئے تھے ان کا کہیں ذکر نہیں اور جب تک اس آئین میں عوام کے حقوق کی بالادستی کا اعتراف نہیں کیا جاتا، اس میں ان اداروں کے قیام کی ضمانت نہیں دی جاتی جو ملک و قوم کی بقاء اور سلامتی کو یقینی بنائیں گے ـــــ اور جب تک یہ آئین اپنے مزاج اور روح کے اعتبار سے اسلامی نہیں ہوگا میں اس پر دستخط نہیں کروں گا۔

میں اپنی سوچ کے اظہار کے لئے ایک مثال دینا چاہتا ہوں۔

اس آئین ۱۹۷۳ء کے تحت وزیر اعظم کو اس قدر با اختیار بنا دیا گیا تھا کہ جو شخص اس اسمبلی میں بطور وزیر اعظم آجاتا ـــــ پھر اس کی ارتھی ہی ایوان سے نکل سکتی تھی ـــــ وہ خود نہیں ـــــ!! اس کے مقابلے میں صدر غیر مؤثر کردار کا حامل تھا۔ آئینی بحران میں وہ کوئی رول ادا نہیں کر سکتا تھا۔ کیونکہ آئین میں یہ شق رکھ دی گئی تھی کہ اگر وزیر اعظم کو برطرف کرنا مقصود ہو تو نئے وزیر اعظم کے

نام کی نشاندہی کے ساتھ تحریک عدم اعتماد پیش کی جائے۔ رائے شماری میں ۲/۳ ووٹوں کی اکثریت سے برسراقتدار وزیراعظم کو برطرف کرنا ہوگا اور نئے وزیراعظم کو (جس کا نام قرارداد میں پیش کیا ہے) بھی ۲/۳ ووٹوں کی اکثریت حاصل ہونا چاہیئے اور ظاہر ہے کہ یہ ایک ناممکن بات ہے۔ ایسی ہی اور کتنی باتیں تھیں جن کے بارے میں میری رائے اور نقطۂ نظر یہی تھا کہ یہ جمہوریت کی اصل روح اور جذبہ کے خلاف ہیں اور ان پر عوام دوستی کی بجائے عوام دشمنی کا گمان گذرتا تھا۔

مسئلہ بنگلہ دیش

پھر بنگلہ دیش کی منظوری کا مرحلہ آیا جس کی میں نے ڈٹ کر مخالفت کی۔ اس سلسلہ میں سب سے پہلے حکومت نے ایک ریفرنس سپریم کورٹ میں بھیجا اور پھر اس کو اسمبلی میں لایا گیا جہاں میرا موقف یہ تھا کہ ہمیں اس مرحلہ پر بنگلہ دیش کو تسلیم نہیں کرنا چاہیئے۔ یہ درست ہے کہ بنگلہ دیش کا وجود ایک حقیقت ہے لیکن دنیا میں ایسی اور بہت سی مثالیں ہیں۔ فارموسا بہت بڑی حقیقت ہے وہ نہ صرف اقوام متحدہ کا ممبر ہے بلکہ ایک عرصہ تک وہ سلامتی کونسل میں عوامی جمہوریہ چین کی نشست پر براجمان رہا لیکن اگر چین سے کہا جائے کہ فارموسا ایک بہت بڑی حقیقت ہے آپ اس کو تسلیم کرلیں۔ کیا چینی اس حقیقت کو تسلیم کرلیں گے؟ وہ ایسا نہیں کریں گے کیونکہ دنیا کی تمام آزاد قومیں اپنے ان حصوں کو جنہیں ظلم و تشدد، طاقت، سازش، مکاری اور فریب کے بل بوتے پر ان سے علیحدہ کردیا جاتا ہے اتنی آسانی کے ساتھ تسلیم نہیں کرتیں بلکہ وہ مناسب اور سازگار حالات کا انتظار کرتی ہیں۔ تاریخ میں بارہا ایسا ہوا ہے کہ دنیا مصلحت کی بنا پر اصولوں سے دور ہٹ جاتی ہے لیکن بالآخر اس دنیا کو اصولوں کی طرف ہی لوٹ کر آنا پڑتا ہے۔ لیکن اگر ہم (پاکستان) نے خود ہی بنگلہ دیش کو تسلیم کرلیا تو پھر کل کو جب دنیا لوٹ کر اصولوں کی طرف آنا چاہے گی تو اس کا رویہ مختلف ہوگا اس علیحدگی کو تو خود پاکستان نے تسلیم کررکھا ہے۔ میرا اصرار تھا کہ مشرقی پاکستان کے بارے میں ہمیں اپنے "فائق حق" سے دستبردار نہیں ہونا چاہیئے۔ اگرچہ اس کی حیثیت دھاگہ کے رشتے جیسی ہوتی ہے مگر اس کی اہمیت بڑی تاریخی اور تاریخ ساز ثابت ہوتی ہے بالکل ایسے جیسے چین نے فارموسا کے ساتھ اپنا تعلق رکھا اور اچھے وقت کا انتظار کیا ——— میرا خیال تھا کہ دنیا ایک دن ضرور اس نتیجہ پر پہنچے گی کہ پاکستان کے

ساتھ زیادتی ہوئی ہے کیونکہ اگر محض الیکشن کے ذریعے ہی ملک ٹوٹنے شروع ہو جائیں تو آزاد دنیا یقیناً الیکشن سے منحرف ہو جائے گی۔ ویسے بھی الیکشن تو کسی قوم کو متحد رکھنے کے لئے کرائے جاتے ہیں۔ ادھر الیکشن میں کسی مرحلہ پر شیخ مجیب الرحمٰن نے بنگلہ دیش کا ذکر نہیں کیا ——— میں نے اپنے مؤقف کے حق میں یہ دلیل بھی دی کہ ۱۹۰۵ء میں تقسیم بنگال ہوئی لیکن صرف چھ سال کے بعد ۱۹۱۱ء میں اس تقسیم کو منسوخ کر دیا گیا۔ ۱۹۳۷ء میں وہاں مسلم لیگ کی حکومت قائم ہوتی جس نے آگے چل کر پاکستان کے خواب کو حقیقت کا روپ دیا ——— ۱۹۴۷ء میں قدرے مختلف انداز اور طریقے سے پھر تقسیم بنگال ہوئی تو مشرقی بنگال مشرقی پاکستان بن گیا۔ ۱۹۷۱ء میں ہمارے مؤقف کے مطابق یہ تقسیم ایک بار پھر ختم ہو گئی۔ اور یوں ہم اس مقام پر پہنچ گئے جہاں پر ۱۹۱۱ء میں تھے۔ لہٰذا اگر ہم صبر و تحمل سے کام لیں تو تاریخ خود کو دہرائے گی اور ۱۹۴۷ء والا مرحلہ اور منزل اس سفر میں ایک بار پھر آئے گا۔

میرا تجزیہ یہ بھی تھا کہ مشرقی پاکستان (بنگلہ دیش) کے عوام میں یقیناً دیر یا بدیر یہ احساس اجاگر ہوگا کہ انہوں نے ہندوؤں کی چال میں پھنس کر ایک فاش غلطی کی ہے۔ اس کے نتیجہ میں وہاں پھر اسلام سے محبت کا جذبہ حاوی ہوگا جو انہیں مجبور کرے گا کہ وہ مغربی پاکستان سے ایک بار پھر اپنے تعلق اور تشخص کی تجدید کریں۔ ممکن ہے اس سلسلہ میں پہلے کنفڈریشن ہو، لہٰذا اس دن کا انتظار کیا جائے جس کو بہرحال ضرور آنا ہے۔

اپنے اس مؤقف، جذبہ اور انداز فکر کے اظہار کے طور پر میں نے بنگلہ دیش کو تسلیم کرنے کی قرارداد کے حق میں ووٹ نہیں دیا اور اہل وطن اس امر کے گواہ ہیں کہ میں ایسا قدم اٹھانے والا واحد ایم۔این۔اے تھا ——— آج بھی میرا دل گواہی دیتا ہے اور میں خطہ کی تاریخ کے گہرے مطالعہ کے بعد یہ پیش گوئی کرنے میں قطعاً کوئی تامل، گریز یا عار محسوس نہیں کرتا کہ ایک دن ایسا ضرور آئے گا جب بنگلہ دیش اور پاکستان ایک بار پھر یک جان و دو قالب ہوں گے۔ اور ایک وحدت کی تشکل میں اپنی عظمت رفتہ کا نشان بن کر اُبھریں گے۔

بنگلہ دیش نامنظور کی تحریک کی قیادت کرنے کے خوف سے مجھے جیل کوٹ لکھپت میں ڈال دیا گیا جہاں میں تقریباً بیس پچیس دن رہا۔ میں ایم۔این۔اے تھا مگر مجھے سی کلاس میں رکھا گیا اور ایسی جگہ جہاں میرے چاروں طرف پاگل تھے۔ میں ٹاٹ پر سوتا تھا مگر اس کے باوجود میرے اعصاب

نے شکست قبول نہیں کی۔

غرض میں نے کوئی ایسا موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیا جب میں نے محسوس کیا کہ حکومت عوام کے حقوق غصب کر رہی ہے اور میں نے اس کے خلاف آواز بلند نہ کی ہو۔ ایسے مواقع پر میرا انداز نہایت تند و تیز اور جارحانہ ہوتا تھا۔ میں نتائج کی پرواہ کئے بغیر اللہ کی مدد کا طلب گار ہوتے ہوئے دن کو دن اور رات کو رات کہنے کا فرض نبھاتے جا رہا تھا۔ اور میں نے یہ رویہ ذاتی سطح پر نہیں اصولوں کی بنا پر اختیار کیا تھا۔ ادھر بھٹو کی حالت عجیب ہو رہی تھی وہ زبان سے عوام کا نام لیتے نہ تھکتے تھے مگر ذہنی طور پر وہ ایک جاگیردار کے حلقۂ اثر سے باہر نہ نکل سکے تھے۔ انہوں نے قومی اسمبلی کو کبھی ایک قومی ادارہ تصور نہیں کیا تھا۔ وہ اس کو اپنا "ڈیرہ" خیال کرتے تھے۔ ان کی نظر میں تمام ارکان اسمبلی ان کے کمی کاری تھے۔ وہ پنجاب کے کسی چوہدری اور سندھ کے کسی وڈیرے کی طرح ہی سوچتے تھے۔ جیسے وہ چوہدری یا وڈیرہ یہ سوچتا ہے کہ ڈیرے میں بیٹھے ہوئے اس کے کمّی نے اگر چھینک ماری ہے تو اس کی گردن دبوچ لو تاکہ کہیں ایسا نہ ہو کہ کل کو وہ چھینک کی بجائے بڑھک مارے اور یہ بڑھک اس کو میرا وڈیرے کا گریبان پکڑنے پر نہ اُکسا دے ——— بالکل یہی انداز بھٹو کا ارکان اسمبلی کے بارے میں تھا چنانچہ وہ ایسے ہتھکنڈے استعمال کرتے کہ کسی کے گھر ڈاکہ ڈالنے کا حکم دے دیا۔ کسی کے بیوی بچوں کا سکون برباد کر دیا۔ کسی کو جھوٹے مقدمات میں اُلجھا دیا۔ کسی کی بے عزتی کا سامان کر دیا ——— انہوں نے خود کو یورپی اقوام کے سامنے ایک مہذب، تعلیم یافتہ اور شائستہ انسان کے طور پر پیش کر رکھا تھا مگر درحقیقت وہ انتہائی سنگدل اور بے رحم شخصیت کے مالک تھے۔ وہ اپنی مخالفت تو کجا اختلاف رائے بھی برداشت نہ کرتے تھے، حالانکہ تحمل اور بردباری تو جمہوریت کی اساس ہیں ——— انہوں نے سیاست میں وڈیرہ ازم کو رواج دیا۔

بھٹو میری جان کے درپے ہو گیا

میں بھی بھٹو کے اس سلوک اور رویہ کا شکار ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ جب انہوں نے دیکھا کہ میں قدم قدم پر عوام کے حقوق، قومی وقار، ملکی مفادات اور قانون کی بالادستی کے راستے پر مستقل مزاجی اور اعتماد سے مسلسل چل رہا ہوں تو انہوں نے مجھے اپنی ہٹ لسٹ پر سرفہرست رکھ لیا۔ ان کا خیال تھا کہ اگر اس شخص (مجھے) مزید مہلت دے دی گئی تو یہ اپنے انداز سیاست سے دوسروں کو ہم نوا بنائے گا اور یوں (REVOLT OF THE SLAVES) (غلاموں کی بغاوت) کی کیفیت پیدا ہو گی جس پر قابو پانا بے حد مشکل بلکہ ناممکن ہو گا۔

میری جان لینے کے لئے مجھ پر یکے بعد دیگرے کل ۱۹ حملے ہوئے۔ آج یہ سطور لکھتے ہوئے میرے ذہن میں بے ساختہ یہ شعر مسلسل آ رہا ہے۔

ع ان کا نام بھی زندہ ہے، میں بھی زندہ ہوں

تو اپنا حال سنا، سب کو بے وفا میرے

میرا ایمان ہے کہ مارنے والے ہاتھ سے بچانے والا ہاتھ زیادہ طاقتور ہے۔
مولا علی کا قول ہے کہ موت زندگی کی محافظ ہے کیونکہ موت کو خود ایک دن مرنا ہے، لہٰذا جب تک وہ نہیں آتی وہ خود زندگی کی حفاظت کرتی ہے ــــــ خدا نے مجھے اس قدر جرأت اور حوصلہ عطا کر رکھا ہے کہ میں سوائے خدا کی ذات کے کسی سے نہیں ڈرتا۔ اور یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ جس دل میں خوف خدا ہو اس دل میں کسی اور خوف کے لئے جگہ نہیں رہتی۔ آزادیٔ فکر و نظر اور رزق حلال نے مجھے ایک جرأت رندانہ سے نوازا ہے اور ہمیشہ میں نے اپنے خدا کے حضور گڑگڑا کر یہی دعا کی ہے کہ میرا سر خدا کے سوا کسی اور کے آگے سرنگوں نہ ہو ــــــ میرے رب نے میری دعا کی ہمیشہ لاج رکھی ہے۔

۱۹ مرتبہ قاتلانہ حملے

میری اسمبلی کی تقاریر سے بھٹو یوں بھی خائف تھا کہ میری تقاریر کے دوران ظاہر ہے کہ اسمبلی کے اندر اعلیٰ سول اور فوجی حکام موجود ہوتے تھے میری تقاریر سے وہ یہ سوچنے پر مجبور ہو جاتے تھے کہ ہم (افسران) جو بھٹو سے یوں خوفزدہ ہیں تو آخر یہ شخص (قصوری) بھی تو اسی ملک کا باشندہ ہے نوجوان ہے مگر وہ بھٹو کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کرتا ہے۔ یوں ان کو ایک حوصلہ اور توانائی میسر آتی تھی۔ ظاہر ہے کہ یہ بات بھٹو کو کسی طور بھی گوارا اور قابل قبول نہیں تھی۔ انہوں نے اپنے طور پر یہ فیصلہ کر لیا کہ اس سے پہلے کہ یہ آواز یعنی میری آواز لوگوں کو متاثر کر کے اپنے لئے کوئی ایسا راستہ متعین کرے جو بھٹو کے لئے سخت مشکلات پیدا کر دے بہتر ہے کہ اس آواز کو خاموش کرا دیا جائے۔ اسمبلی کا ریکارڈ اور حکومت کا جاری کردہ قرطاس ابیض (وائٹ پیپر) میں اس بات کا ثبوت موجود ہے کہ بھٹو نے مجھے نہ صرف اپنا نشانہ بنا لیا بلکہ اس کے نتیجہ میں مجھ پر ۱۸ قاتلانہ حملے کرائے گئے۔
سرکاری طور پر ۱۹۷۹ء میں جاری کئے گئے قرطاس ابیض (وائیٹ پیپر) زیر عنوان

بھٹو حکومت کی کارکردگی ـــــ جلد دوم ـــــ میں صفحہ ۲۰ پر اس امر کی نشاندہی کی گئی ہے کہ بھٹو نے مجھ پر ۱۸ قاتلانہ حملے کرائے ـــــ لیکن درحقیقت یہ تعداد اس سے زیادہ ہی تھی تفصیل ملاحظہ فرمایئے:

(۱)

مجھ پر پہلا حملہ پیپلز پارٹی کی طرف سے ۲ مئی ۱۹۷۱ء کو حبیب محل سینما قصور کے مقام پر کیا گیا یہ وہ موقع تھا جب بھٹو بطور خاص مجھے پارٹی سے نکالنے کے لئے قصور آئے تھے۔ اس موقع پر پیپلز پارٹی کے مقامی کارکنوں (یعنی میرے حامی ساتھیوں) اور پنجاب بھر سے بسوں اور لاریوں پر سوار کر کے لائے گئے کرائے کے نام نہاد کارکنوں میں باقاعدہ تصادم ہوا تھا۔ (اس واقعہ کا ذکر پہلے آچکا ہے) اس تصادم میں بے شمار لوگ زخمی ہوئے۔ اس دوران مجھے بھی چوٹیں آئیں۔ میرے بائیں ہاتھ کی ہڈی ٹوٹ گئی۔ حملہ کرنے والے غنڈے میاں افتخار احمد تاری کی قیادت میں مجھ پر ٹوٹ پڑے اور انہوں نے مجھے جان سے مارنے میں کوئی کسر نہ چھوڑی۔ اس وقت عجیب کیفیت تھی لوگ حیران اور ششدر تھے کہ کیا یہ وہی بھٹو ہے جو چند سال قبل میری حویلی میں ان سے تعاون اور دوستی کی اپیل کانپتے کانپتے لہجہ اور آواز میں کر رہا تھا اور جب ان لوگوں کی بھرپور حمایت سے خدا نے اس کو عزت اور شہرت دی تو آج یہ پورس کے ہاتھی کی شکل میں ان نہتے عوام کو روندنے کے لئے آگیا ہے۔ اس تصادم میں باہر سے آئے ہوئے غنڈوں نے خاص طور پر مجھے نشانہ بنایا جس کے خلاف قصور سٹی کے تھانہ میں زیر دفعہ ۳۰۷، ۱۴۸، ۱۴۹ باقاعدہ پرچہ درج کرایا گیا تھا جو آج بھی اس تھانہ کے ریکارڈ میں موجود ہے۔

۲

دوسرا حملہ ۱۲ جون ۱۹۷۱ء کو کراچی کے کنٹونمنٹ ریلوے سٹیشن پر ہوا۔ یہ اس وقت کی بات ہے جب میں نے پیپلز پارٹی (رضا قصوری) گروپ کے قیام کا باقاعدہ اعلان کر دیا تھا اور وہاں (کراچی) اپنے گروپ کے دوستوں سے رابطہ کے لئے گیا تھا۔ مجھے کراچی کے دوستوں اور ہم خیال کارکنوں

نے مدعو کیا تھا اور وہ میرے استقبال کے لیے ریلوے اسٹیشن پر آئے ہوتے تھے۔ یہ پُرامن ہجوم مجھے خوش آمدید کہنے میں مگن تھا کہ اچانک ایک طرف سے پیپلز پارٹی کے غنڈوں کا ایک گروہ انتہائی لچر اور بے ہودہ الفاظ میں نعرہ بازی کرتا ہوا ریلوے اسٹیشن کے پلیٹ فارم میں گھس آیا۔ اس ہلڑ بازی سے ظاہر ہے کہ وہاں بھگدڑ مچ گئی۔ میرے میزبان گومگو کے عالم میں کھڑے تھے کہ اچانک چند لوگ میری طرف لپکے، لیکن اس سے پہلے کہ وہ لوگ مجھے اپنا نشانہ بناتے میرے دوستوں اور بعض جرأت مند مسافروں نے میرے گرد حلقہ بنالیا اور مجھے باہر لے گئے۔ جب ان جیالے غنڈوں نے دیکھا کہ میں بحفاظت باہر نکل گیا ہوں تو انہوں نے ڈنڈوں، آہنی سلاخوں اور ہنٹروں سے پلیٹ فارم پر طوفان بدتمیزی برپا کردیا۔ انہوں نے کئی ریڑھیوں کو الٹ دیا۔ مسافروں پر میرا غصہ اتارا اور وہاں موجود سٹالوں کو سخت نقصان پہنچایا۔ حتیٰ کہ پولیس نے فوری مداخلت کر کے ان میں سے کئی ایک کو موقع پر رنگے ہاتھوں گرفتار کرلیا۔

اس واقعہ کا بھی پرچہ درج کرایا گیا جس کے نتیجے میں چند غنڈے بعد میں گرفتار ہوئے۔ جبکہ میں نے اگلے روز پریس کانفرنس میں گمراہ نوجوان قرار دیتے ہوئے انہیں معاف کردیا اور دعا کی کہ اللہ ان کو راہ راست پر چلنے کی توفیق دے۔

۳

تیسرا حملہ میرے بھائی خضر حیات پر ۴ راگست ۱۹۷۱ء کو قصور میں رات کے وقت ہوا۔ تب وہ اپنی حویلی کے اندر چارپائی پر لیٹے آرام کر رہے تھے۔ اچانک نقاب پوش گھر میں داخل ہوئے اور انہیں چارپائی سے اٹھایا۔ میرے یہ بھائی درویش صفت انسان ہیں انہوں نے بڑے تحمل سے پوچھا۔ بھئی کیا بات ہے؟ آنے والوں نے بغیر کوئی جواب دیئے ان پر لاٹھیوں اور ڈنڈوں کی بارش کردی انہوں نے فوری طور پر زمین پر بیٹھ کر اپنے سر کو بچانے کی کوشش کی تو حملہ آوروں نے انہیں چاروں طرف سے زدوکوب کرنا شروع کردیا۔ ان میں سے ایک دو نے یہ بھی کہا: اگر تم لوگ ہمارے بھٹو کے خلاف باتیں کروگے تو انجام اس سے بُرا ہوگا ــــــــــــ

___ تھوڑی دیر کے بعد ان میں سے ایک نے کہا: اب بس کرو، قصوری کو سبق سکھانے کے لئے اتنا ہی کافی ہے ___ اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ یہ حملہ مجھے ہراساں اور انتباہ کرنے کے لئے کرایا گیا تھا۔ اس واقعہ کے بارے میں بھی پولیس سٹیشن قصور سٹی میں ایک پرچہ زیر دفعہ ۳۰۷ درج کرایا گیا۔

پولیس نے میرے بھائی کا باقاعدہ ڈاکٹری معائنہ کرایا اور میڈیکل رپورٹ کے مطابق میرے بھائی کے جسم پر لاٹھیوں، ڈنڈوں اور آہنی مکوں کے تقریباً ایک سو نشانات واضح طور پر پائے گئے۔

۴

چوتھا حملہ ۳۰ اگست ۱۹۷۱ء کو میں پشاور میں ایک ہوٹل میں پریس کانفرنس سے خطاب کر رہا تھا۔ عین اسی وقت جب میں پیپلز پارٹی اور اس کے چیئرمین کی پالیسیوں پر سخت تنقید کر رہا تھا۔ اچانک پیپلز پارٹی کے چالیس پچاس غنڈے ہوٹل کے ہال میں داخل ہوئے۔ انہوں نے آتے ہی "بھٹو جیوے" کی بڑھکیں مارنا شروع کر دیں اور اپنے عوامی انداز میں ہلڑ بازی شروع کر دی ہوٹل کا فرنیچر اور دروازوں کھڑکیوں کے شیشے توڑ دیئے۔ ساری کراکری تباہ کر دی اور یوں نقصان کرنے کے بعد واپس چلے گئے۔ اس موقع پر اخبار نویس خود اپنی آنکھوں سے سارا منظر دیکھ رہے تھے لیکن اس کے باوجود چند غنڈوں نے متعدد بار پتھر، شیشے کے ٹکڑے اور گلاس وغیرہ مجھے نقصان پہنچانے کی غرض سے پھینکے مگران کا نشانہ ہر بار خطا گیا۔ یہاں حملہ کرنے والوں کا نگران شوکت لودھی تھا اور یہ سارا منصوبہ میرے دوست حیات محمد شیرپاؤ (مرحوم) کی زیر نگرانی عمل میں لایا گیا۔

جب ہنگامہ بڑھا تو میرے کارکن مجھے وہاں سے ہٹا کر دوسرے کمرے میں لے گئے۔ تمام اخبار نویس بھی میرے پاس آگئے۔ ادھر پیپلز پارٹی کے غنڈے دندناتے ہوئے میرا نام لے لے کر للکارتے پھرتے تھے۔ میری اطلاع کے مطابق ان غنڈوں میں سے چند ایک کے پاس چاقو بھی تھے اور وہ بار بار اپنے ساتھیوں سے ناراض ہو کر کہتے تھے: تمہاری بیوقوفی سے وہ (یعنی میں) بچ گیا

ورنہ آج اس کی خیر نہیں تھی ـــــــ اس موقع پر ایک غنڈے کو یہ کہتے بھی سنا گیا "چلو ـــــــ اگر بچ گیا تو کوئی بات نہیں، ہم نے کارروائی تو ٹھیک ٹھاک ڈال دی ہے۔"

اس واقعہ کے بارے میں بھی پشاور سٹی کے تھانہ میں پرچہ درج کرا دیا گیا تھا جس کے بعد پیپلز پارٹی کے چند غنڈے گرفتار ہوئے اور انہوں نے اعتراف کیا کہ انہیں قصوری کو نشانہ بنانے کے لئے باقاعدہ ہدایات دی گئی تھیں۔

۵

۹ اکتوبر ۱۹۷۱ء کو کراچی میں مجھ پر پانچواں قاتلانہ حملہ ہوا۔ یہ وہ وقت تھا جب مجھ پر پانچواں قاتلانہ حملہ ہوا۔ یہ وہ وقت تھا جب میں ڈھاکہ جانے کے لئے شہر قائد میں آیا ہوا تھا۔ یہاں میں نے ایک پریس کانفرنس سوسائٹی کے علاقہ میں اپنے ایک دوست کے گھر پر بلائی تھی۔ یہاں پر ابھی پریس کانفرنس جاری تھی کہ پیپلز پارٹی کے غنڈوں نے گھر پر ہلہ بول دیا۔ وہ مخالفانہ نعرے لگاتے اور مجھے للکارتے گھر کے اندر داخل ہو گئے۔ انہوں نے وہاں موجود گاڑیوں کو نقصان پہنچایا، گھر کے شیشے توڑ دیئے اور بار بار مجھ تک پہنچنے کی کوشش کی جو میرے ساتھیوں نے ناکام بنا دی۔ مایوس ہو کر انہوں نے پتھراؤ شروع کر دیا جس سے بے گناہ ہمسایوں کا بھی شدید نقصان ہوا۔ کئی بچے اور عورتیں اس پتھراؤ کی زد میں آ گئیں۔ اسی دفعہ کسی ذمہ دار شہری نے پولیس کو فون کیا۔ اس موقع پر میرے ساتھیوں میں سے ایم ایم پیرزادہ، کاوش رضوی اور اللہ مالک وغیرہ نے بڑی جرأت مندی سے غنڈوں کا مقابلہ کیا اور ان کے دانت کھٹے کر دیئے۔

پولیس نے آ کر صورت حال پر قابو پانے کی کوشش کی تو غنڈوں نے پولیس کے لئے مشکلات پیدا کیں جس کے نتیجہ میں پولیس کو آنسو گیس استعمال کرنا پڑی۔

اس واقعہ کے بارے میں بھی پولیس اسٹیشن فیروز آباد (کراچی) میں پرچہ درج کرایا گیا۔ حسب معمول اس بار بھی چند غنڈے پکڑے گئے۔

اسی طرح ایک اور جملہ مجھ پر ۲۰ر دسمبر ۱۹۷۱ء کو لاہور میں مال روڈ پر پنجاب یونیورسٹی اولڈ کیمپس اور عجائب گھر کی عمارت کے بالکل سامنے ہوا۔ اس روز پورا لاہور ایک انتہائی جذباتی اور ہیجانی کیفیت سے دوچار تھا۔ سقوط ڈھاکہ کا المناک واقعہ رونما ہو چکا تھا اور پورے ملک میں یحییٰ خان کے خلاف مظاہرے شروع ہو چکے تھے۔ لاہور کے شہریوں نے اپنے جذبات کے اظہار کے لئے ایک بھرپور جلوس نکالا۔ میں اس جلوس کی قیادت کرنے والوں میں شامل تھا۔ ہم اس جلوس کو لے کر پہلے گورنر ہاؤس گئے جہاں ان دنوں لیفٹننٹ جنرل عتیق الرحمٰن رہا کرتے تھے۔ ـــــ ہم نے مطالبہ کیا کہ گورنر خود باہر آکر مظاہرین سے خطاب کریں مگر جب ان کو معلوم ہوا کہ عوام کا جوش و خروش انتہائی رنگ لئے ہوئے ہے تو انہوں نے باہر نکلنے سے گریز کیا اور اپنے ملٹری سیکرٹری سے کہا: یار ـــــ ان سے جاکر کہہ دو کہ ـــــ اس کے آگے وہ خاموش ہو گئے ـــــ یہی جملہ انہوں نے چار پانچ بار دہرایا اور ہر بار یہیں آکر رک جاتے۔ ملٹری سیکرٹری نے اضطراری کیفیت سے دوچار گورنر کی پریشانی کو کم کرنے کے لئے کہا۔ سر ـــــ کیا کہوں جاکر ـ ؟

اس پر گورنر صاحب نے کہا: ان کو کہہ دو کہ میں معلوم نہیں کہاں گیا ہوں ـــــ لیکن پھر جملہ کی تصحیح خود ہی کر دی ـــــ ان سے کہہ دو! میں کسی سلسلہ میں اسلام آباد گیا ہوں ـــــ گھبراہٹ میں انہوں نے خود ہی گیٹ پر متعین سیکورٹی سٹاف کو ہدایت دینا چاہی مگر ملٹری سیکرٹری نے نہایت ادب سے کہا: سیکورٹی پوسٹ پر عوام کا قبضہ ہے ـــــ اس پر عتیق الرحمٰن نے ایک دم کرسی کی بجائے میز پر بیٹھتے ہوئے کہا:

THEN YOU DO WHAT EVER YOU LIKE

ویسے ایک اطلاع یہ بھی تھی کہ گورنر بہادر صاحب جلوس کی آمد کی خبر سن کر انتہائی خاموشی کے ساتھ گورنر ہاؤس سے اپنے ذاتی بنگلہ میں منتقل ہو گئے تھے۔

بہرحال یہ جلوس وہاں سے واپس آیا اور پنجاب یونیورسٹی کے سامنے اس کے منتشر ہونے

سے پہلے ایک جلسہ منعقد ہوا۔ مختلف لوگ تقاریر کر چکے اور میری باری آئی تو ابھی میں نے تقریر کے لئے تمہید ہی باندھی تھی کہ اچانک ایک طرف سے شور بلند ہوا، اور چند لوگ ہاتھوں میں چاقو پکڑے میری جانب لپکتے دکھائی دیئے۔

ان میں سے ایک نے چیخ کر کہا: اوے اج نس کے دخاوے۔

میرا خیال تھا کہ یقیناً ان کو مجمع میں موجود کچھ لوگ چپ کرانے کی کوشش کریں گے لیکن مسئلہ یہ تھا کہ اس ساری جگہ پر مبینہ طور پر پہلے ہی عوام کے بجائے قائدِ عوام کے جیالوں نے قبضہ کر لیا تھا۔ اس کا احساس مجھے یوں ہوا کہ جب انہوں نے مجھے للکارا تو یہ لوگ اٹھ کر اودھم مچانے لگے۔

میں نے موقع کی نزاکت کو دیکھا اور وہاں سے ہٹ گیا، مگر وہ آگے بڑھتے گئے۔ میں نے محسوس کیا کہ وہ مجھے گھیرے میں لے رہے ہیں اور سادہ لوح عوام ششدر و پریشان اُٹھ کھڑے ہوئے ہیں۔ میں نے فوراً وہاں سے جان بچانے کا فیصلہ کیا اور اولڈ کیمپس سے نکل کر گول باغ کے سامنے ہو کر ٹاؤن ہال کی طرف لپکا۔ مگر وہ غنڈے جو صریحاً چاقو اور چھریاں تانے ہوئے تھے، میرے تعاقب میں رہے۔ میں نے پیچھے مڑ کر دیکھا تو ان کی تعداد درجن بھر کے لگ بھگ تھی۔

ناصر باغ سے گزرتے ہوتے ذہن میں یکدم وہ منظر گھوم گیا جب میں نے بھٹو کو کالا باغ کے غنڈوں سے بچانے کے لئے اسے "روشن" کے رکشا میں سوار کرایا تھا۔ اور آج اسی جگہ اسی بھٹو کے غنڈے میرے خون کے پیاسے مجھ پر لپک رہے تھے۔

بہر حال میں ٹاؤن ہال سے گزر کر سیکرٹریٹ کے سامنے سڑک پر آگیا۔ جلوس اور جلسہ کے باعث ٹرانسپورٹ غائب تھی۔ میری خوش نصیبی کہ اچانک ایک گاڑی سامنے سے آتی دکھائی دی۔ میں نے اسے اشارہ دیا۔ گاڑی رُکی اور میں بغیر اجازت مانگے اس میں بیٹھ کر بولا: غنڈے میرا پیچھا کر رہے ہیں ــــــ پلیز گاڑی یہاں سے نکال لیں۔

گاڑی چلانے والے نے مجھے غور سے دیکھا اور گاڑی کا گیئر بدلتے ہوئے کہا DONT WORRY

تھوڑی دیر کے بعد تعارف ہوا تو یہ لاہور کے مشہور وکیل عابد بٹ نکلے۔ میں نے کچھ دور جا کر کہا بس مجھے یہاں اتار دیں ــــــ تو انہوں نے بڑی محبت سے کہا: قصوری صاحب ایسا نہیں ہو سکتا میں آپ کو یوں نہیں چھوڑ سکتا ــــــ ممکن ہے وہ ہمارا پیچھا کر رہے ہوں ــــــ لہٰذا وہ

مجھے میرے گھر تک چھوڑ کر واپس ہوئے۔

۷

یہ حملہ مجھ پر ۱۷ر جنوری ۱۹۷۲ء کو قصور میں ہوا۔ پیپلز پارٹی کو ۲۰ر دسمبر ۱۹۷۱ء کو اقتدار مل چکا تھا۔ لیکن ابھی اسے حکومت کی باگ ڈور سنبھالے ایک ماہ بھی نہیں گذرا تھا کہ وہ میری جان کے درپے ہو گئے۔ میں کوٹ غلام محمد میں ۱۹۷۱ء کی جنگ کے متاثرین کی آبادکاری اور امدادی کاموں کے سلسلہ میں موجود تھا۔ میں اپنے ہمراہ ادویات، کپڑوں، بستروں اور راشن پر مشتمل چند ٹرک سامان لے کر پہنچا تھا تاکہ بھارت کی جارحیت اور تشدد کا نشانہ بننے والوں کی امداد کی جائے۔

میں یہ سامان تقسیم کر رہا تھا کہ اچانک پیپلز پارٹی کے غنڈے مجھ پر پل پڑے —— غنڈوں کی قیادت قصور کا ایک ایم پی اے یعقوب خان کر رہا تھا جسے سیاست کے میدان میں مَیں نے ہی اس منصب تک پہنچایا تھا۔ وہ میرے لئے اجنبی نہیں تھا۔ میں نے اسے پہچان لیا۔ مجھے بعد میں معلوم ہوا کہ اسے یہ سبز باغ دکھایا گیا تھا کہ اگر تم کسی طرح قصوری کا ٹھکانہ ٹھپ دو تو تمہیں پنجاب کابینہ میں پسندیدہ وزارت دے دی جائے گی۔ وہ شخص لالچ کا شکار ہو گیا اور یوں اس نے مجھ پر حملہ کرا دیا۔

اس بار (شاید) تجربات کی روشنی میں مجھ پر حملہ بندوقوں اور پستولوں سے ہوا۔ اندھا دھند فائرنگ ہوئی۔ مجھے تین گولیاں دونوں ٹانگوں پر لگیں۔ میرے بھائی خضر حیات بھی اس حملہ میں زخمی ہوئے۔ غنڈوں نے جب دیکھا کہ میری ٹانگ میں گولیاں لگی ہیں تو انہوں نے مجھے اٹھا کر کار کی ڈگی میں ڈالنے کی کوشش کی (دراصل وہ مجھے وہاں سے اٹھا کر کسی بے آباد اور گمنام جگہ پر لے جا کر میرا خاتمہ کرنا چاہتے تھے) ظاہر ہے کہ میں نے مزاحمت کی اور یوں میں ان سے دست و گریباں ہو گیا۔ کیونکہ میں ان کے ساتھ گتھم گتھا ہو رہا تھا لہٰذا دوسرے لوگ مجھ پر فائر کرنے سے بھی گریزاں تھے۔ اسی کشمکش میں میرا چھوٹا بھائی احمد مصطفےٰ خان بھی فائرنگ کی آواز سُن کر ادھر آنکلا۔ اس کے پاس اس کا اپنا ریوالور تھا، اس نے جب مجھے یوں غنڈوں کے نرغے میں دیکھا تو اس نے ان کو للکارتے ہوئے ایک اوٹ سے

فائرنگ شروع کر دی ـــــــــ اس اچانک جوابی کاروائی سے غنڈے بھاگنے شروع ہو گئے۔

اس دوران میں نڈھال ہو کر گر گیا تو بھاگتے ہوئے غنڈوں نے مجھ پر گنڈاسہ اور ٹوکہ سے وار کرنے کی کوشش کی، مگر اسی اثناء میں میرا بھائی خضر حیات زخمی ہونے کے باوجود بجلی کی سی تیزی سے لپک کر میرے اوپر آ گرا، اور اس نے میرے اوپر ہونے والے سارے وار خود برداشت کئے۔

اس قاتلانہ حملہ کا پرچہ قصور شہر کے تھانہ میں درج کرا دیا گیا۔

ادھر جب گورنر ہاؤس لاہور میں خبر پہنچی کہ مجھ پر اس بار بھی قاتلانہ حملہ ناکام ہو گیا ہے تو "عوامی لیڈروں" کا غصہ اور جھنجلاہٹ قابل دید تھی۔ میرے ایک دوست (نام بوجوہ ظاہر نہیں کیا جا رہا) نے جو اس وقت وہاں موجود تھا۔ مجھے بعد میں اس واقعہ کے بارے میں بتایا کہ گورنر مصطفےٰ کھر نے یہ سنتے ہی کہ قصوری پھر بچ گیا ـــــــــ غصہ سے میز پر مکّہ مارا اور پھر سامنے پڑا بیگ اٹھا کر فرش پر پٹخ دیا ـــــــــ اس کے بعد سر پہ ہاتھ مار کر بولا: اب سر پوچھیں گے تو میں کیا کہوں گا ـــــــــ اب تو بہانے ختم ہو گئے ہیں ـــــــــ اچانک ہاٹ لائن کی بتی جلی ـــــــــ اور ملٹری سیکرٹری نے لوگوں کو باہر چلے جانے کا اشارہ کیا اور کھر اپنے صاحب سے ہمکلام ہونے لگا ـــــــــ معلوم نہیں اس بار کھر نے کیا بہانہ یا عذر تراشا ہوگا۔ بہر حال مجھے خدا کے فضل سے میری خوش قسمتی نے ایک بار پھر کسی بہانے سے بچا لیا۔

اس حملہ کے بعد میں تقریباً دو ہفتہ تک البرٹ وکٹر (میو ہسپتال) میں ڈاکٹر مسعود کے زیر علاج رہا۔ انہوں نے ہی میری ٹانگ سے گولیاں نکالیں اور میری دیکھ بھال کی۔

۸

یہ حملہ مجھ پر ۸ اپریل ۱۹۷۲ء کو ضلع قصور کے ایک قصبہ "کھڈیاں" میں ہوا۔ وہاں میں اپنے ایک جلسہ کے سلسلہ میں گیا تھا۔ علاقہ کے بے شمار لوگ میرے استقبال کے لئے جمع تھے۔ پُرجوش نعروں کے شور میں میں نے تقریر کا آغاز کیا۔ ابھی بمشکل چند منٹ ہی بول پایا تھا کہ اچانک فائرنگ کی آواز آئی اور لوگ خوفزدہ ہو گئے۔ پیپلز پارٹی کے غنڈوں نے اپنی ذہنیت کا مظاہرہ کرنا شروع کر دیا تھا۔ اس کے ساتھ ہی کچھ غنڈے لاٹھیاں برساتے ہوئے میری طرف بڑھے۔ ظاہر ہے نہتے اور پُرامن عوام تو اس حملہ کے لئے تیار نہ تھے لہٰذا جب ان (عوام) پر لاٹھیاں برسنے لگیں اور فائرنگ کا سلسلہ بھی تیز ہو گیا تو جلسہ میں بھگدڑ مچ گئی۔ چند غنڈے میری طرف

بڑھے۔ میں اسٹیج پر بالکل پرسکون تھا اور اس کا سبب یہ تھا کہ اب کی بار میں بھی تیار تھا۔ میں نے اپنے کارکنوں کو پہلے ہی پرامن مگر ہوشیار رہنے کی تاکید کردی تھی۔ اس صورتحال میں میرے کارکن باربار میری جانب دیکھ رہے تھے۔ جب میری طرف بڑھتے والے غنڈے چیخے:

اج یا توں نئیں، یا اسیں نئیں۔!

اور ان میں سے ایک نے پستول کا رخ میری طرف کیا تو میں نے ایک دم نعرہ حیدری لگایا۔ اور یا علی کہتے ہوئے میرے کارکن ان پر جھپٹ پڑے۔ (نعرہ حیدری ہمارا کوڈ تھا) ان غنڈوں کا خیال تھا کہ وہ افراتفری مچا کر اپنے مذموم منصوبہ میں کامیاب ہو جائیں گے لیکن ہم نے ان کی اینٹ کا جواب پتھر سے دیا تو وہ سخت گھبرا گئے۔ ان کی قیادت پ پ کا ایک مقامی لیڈر اکبر طور کررہا تھا اور یہ وہ شخص تھا جسے پی پی کا نام لینا بھی میں نے سکھایا تھا۔ ان میں سے بیشتر نے تو راہ فرار اختیار کرلی چند کو کارکنوں نے عوام کے مدد سے زیر کرکے انکو پکڑ لیا۔ ان حملہ آوروں کے خلاف تھانہ کھڈیاں میں زیر دفعہ ۳۰۷ پرچہ تو درج کرادیا گیا مگر ان لوگوں کو عوام کے سامنے موقع پر ہی "قرار واقعی" سزائیں دی گئیں۔ اس موقع پر انہوں نے برملا اقرار کیا کہ ان لوگوں کو پیپلز پارٹی کی ایک اعلیٰ شخصیت نے قصوری کو قتل کرنے کے لیے بھیجا تھا اور کامیابی کی صورت میں انہیں بھاری رقم اور مراعات بطور انعام دینے کا وعدہ کیا تھا، حملہ آوروں کو پکڑنے اور قابو کرنے میں میرے بھائی میجر علی رضا خان اور راجہ اختر نے غیرمعمولی پھرتی اور دلیری کا مظاہرہ کیا۔ انہوں نے ان کو یوں گرفت میں لے لیا جیسے بجلی کا ننگا تار کسی بھی جاندار کو پکڑ لیتا ہے اس وقت مجھے معلوم ہوا کہ امریکہ کے تربیت یافتہ کمانڈو پلک جھپکنے میں کیا سے کیا کرسکتا ہے۔

-۹

۲۰ دسمبر ۱۹۷۲ء کو لاہور کی مال روڈ پر ہی ایک بار پھر مجھ پر قاتلانہ حملہ ہوا۔ اس روز ایک طرف تو پیپلز پارٹی اپنے اقتدار میں آنے کی پہلی سالگرہ منا رہی تھی مگر دوسری طرف اپوزیشن نے اس روز یوم سیاہ منانے کا اعلان کر رکھا تھا، اس سلسلہ میں تحریک استقلال نے ایک جلوس کا اہتمام کیا۔ قومی اسمبلی کے اندر میرے بے باک اور جرأت مندانہ رویہ اور کردار سے متاثر ہوکر تحریک استقلال کے سربراہ ائرمارشل (ریٹائرڈ) اصغر خان نے مجھے ذاتی طور پر

اس جلوس میں شرکت کرنے کی دعوت دی تھی ۔ اس جلوس میں خواجہ رفیق بھی ہمارے ساتھ تھے اور یہ گمان تک نہ تھا کہ وہ اب اس دنیا میں چند گھنٹوں کے مہمان ہیں ۔ یہ جلوس نیلا گنبد سے شروع ہوا ۔ اور پھر مال روڈ پہ ہائی کورٹ کے سامنے سے گزرتا ہوا واپڈا ہاؤس کی بلڈنگ اور پنجاب اسمبلی کے سامنے جاکر ختم ہوا ۔ جب یہ جلوس فیروز سنز کی بلڈنگ کے سامنے تھا تو اچانک پیپلز پارٹی کا ایک غنڈہ تیزی سے میری جانب لپکا ۔ مجھ سے ابھی بمشکل ایک فٹ رہ گیا تھا کہ اچانک میرے کارکن شیر محمد کھوکھر کی اس پر نظر پڑی اور انھوں نے اسے وہیں دبوچ لیا ۔ اس کے نیفے سے ایک تیز دھاری کا کمانی دار چاقو برآمد ہوا ۔ اس نے بڑی آئیں بائیں شائیں کرنے کی کوشش کی ۔ مگر کارکنوں کے چند گھونسوں نے اس کا مزاج درست کر دیا ۔ تب اس نے بتایا کہ اسے گورنر ہاؤس سے ہدایت ملی تھی کہ جلوس میں قصوری پر حملہ کرنا ۔

میں نے اس سے پوچھا : کیا تمھیں احساس نہیں تھا کہ میرے ارد گرد اتنے لوگ ہیں ۔

اس نے جواب دیا : مگر میرے ارد گرد بھی کچھ لوگ تھے ۔ اگر میں اپنا کام کر لیتا تو ان کو بھی اپنا کام کرنے میں آسانی ہوتی ۔ !

اس نے وہیں لوگوں کے ہجوم میں کہا ۔ ایک ڈی ایس پی کی ڈیوٹی لگائی گئی تھی کہ جب میں حملہ کروں اور دوسرے لوگ قصوری صاحب پر جھپٹ پڑیں تو وہ (ڈی ایس پی) فوراً مجھے (حملہ آور کو) اپنی گاڑی میں بٹھا کر سیدھا گورنر ہاؤس پہنچا دے ۔ !

بعد میں مجھے اپنے ذرائع سے معلوم ہوا کہ اس حملہ سے پیپلز پارٹی دوہرا فائدہ اٹھانا چاہتی تھی ایک تو مجھے راستے سے ہٹانے کا اور دوسرا اس کی آڑ میں ایئر مارشل کے خلاف کارروائی کرنے کا ۔ !

مصطفےٰ کھر نے پیپلز پارٹی کی سالگرہ کی تقریبات کی انتظامیہ کمیٹی کے ایک رکن سے کہا تھا ۔ !

"میں سالگرہ کی رات بھٹو صاحب کو وہ زبان کاٹ کر بطور تحفہ دوں گا جو ان کے خلاف ٹر ٹر کرتی پھرتی ہے ۔"

اس خبر کے مصدقہ ہونے کا اس سے بڑا ثبوت اور کیا ہو گا کہ مجھ پر حملہ آور ہونے والے لڑکے کو جب ہمارے کارکنوں نے پولیس کے حوالہ کیا تو پولیس نے موقع پر ہی اسے (رسمی ڈانٹ

ڈپٹ کر کے، بھگا دیا۔

مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ ہمارے جلوس کے اندر بعض پر اسرار لوگ مسلح پھر رہے تھے۔ خاص طور پر میرے اور ایئر مارشل صاحب کے قریب آ کر کئی بار ایسے مسلح افراد نے نازیبا کلمات ادا کیے بعض منچلے مجھے اور اصغر خان کو دیکھ کر "آلو میتھی ہائے ہائے" کے نعرے لگا رہے تھے۔ اصغر خان نے مجھ سے پوچھا، اس کا کیا مطلب ہے؟ تو میں نے آہستہ سے کہا: آلو آپ کو کہہ رہے ہیں اور میتھی مجھے! وہ کیوں؟ ۔ ایئر مارشل صاحب نے حیرت اور غصہ کے ملے جلے تاثر سے کہا۔

میں نے جواب دیا، کیونکہ قصور کی میتھی دنیا بھر میں مشہور ہے۔ ساتھ ہی میں نے ان سے کہا، آپ بالکل نارمل رہیں اور ردِ عمل کا اظہار نہ کریں دراصل وہ اس وقت ہمیں مشتعل کر کے صورتحال کو خراب کرنا اور یوں اس سے فائدہ اٹھانا چاہتے ہیں تاکہ پر اسرار اسلحہ برداروں کو کارروائی کا موقع ملے۔ یہاں پر کسی نے کہا: رفیق باجوہ صاحب کہاں ہیں ۔ مجھے معلوم تھا۔ مگر میں نے خاموشی ہی بہتر سمجھی۔ اب میں لوگوں کو کیا بتاتا کہ رفیق باجوہ صاحب تو جلوس کا موڈ اور پی پی کے غنڈے دیکھ کر ہائی کورٹ کے سامنے سے ہی آنکھیں چرا کر، چپ چاپ ایک طرف کو نکل کر غائب ہو گئے تھے۔

ان دنوں لاہور کے ڈپٹی کمشنر کیپٹن نصیر ہوا کرتے تھے۔ جلوس کے اختتام پر میں نے اور ایئر مارشل صاحب نے اسمبلی کی سیڑھیوں پر کھڑے ہو کر عوام سے پر جوش خطاب کیا۔ اپنی تقریر کے دوران میں نے ڈپٹی کمشنر کو مخاطب کرتے ہوئے کہا "تم ڈی سی لاہور ہو۔ لہذا ڈی سی لاہور ہی رہو۔ خواہ مخواہ پیپلز پارٹی کے چیئرمین بننے کی کوشش نہ کرو۔ تم دیکھ رہے ہو کہ صورتحال کس قدر کشیدہ ہے۔ اس وقت حرکت کرو گے جب کسی کا لہو بہہ جائے گا۔ اپوزیشن کے لیے تو تم ایڈ کنڈ لشنڈ ٹھپے ہی دفعہ ۱۴۴ کے آرڈر جاری کر دیتے ہو۔ اور تمہیں کچھ نظر نہیں آ رہا۔ ساون کے اندھے مت بنو۔!!

کیپٹن نصیر خاموشی سے یہ ساری تنقید سنتا رہا۔ ظاہر ہے کہ وہ اس کے سوا کیا کر سکتا تھا لیکن عین اس وقت جب میں حالات کی کشیدگی اور کسی کے خون کے بہہ جانے کی باتیں کر رہا تھا۔ اس جگہ (پنجاب اسمبلی) کے بالکل عقب میں واقع گراؤنڈ کے اس پار خواجہ رفیق کو سرِ عام قتل کر

دیا گیا۔ اگرچہ قاتل فرار ہونے میں کامیاب ہو گئے مگر شہر میں زبان زدِ عام یہی بات تھی کہ خواجہ رفیق کو افتخار تاری نے قتل کروایا ہے ۔ بہر حال اصل صورتحال کا علم تو خدا ہی کو ہے۔

۲۲ر دسمبر ۲، ۱۹۷ء کو میں نے قومی اسمبلی کو باقاعدہ مطلع کیا کہ مجھے ٹیلی فون پر قتل کی دھمکیاں دی جا رہی ہیں اور مجھے بار بار انتباہ کیا جا رہا ہے کہ اگر تم نے اپنا رویہ تبدیل نہ کیا تو تمہارا حشر بھی خواجہ رفیق اور ڈاکٹر نذیر جیسا ہی کر دیا جائیگا۔ میں نے اس ضمن میں ایک تحریک پیش کرتے ہوئے کہا "ایسے حالات میں میرے لیے بطور ایم این اے اپنے فرائض انجام دینا مشکل ہو گیا ہے"۔ لیکن اس کے باوجود میری بات پر کوئی توجہ نہ دی گئی۔

بھٹو اسمبلی میں پھٹ پڑا

قومی اسمبلی میں ۳ جون ۴، ۱۹۷ء کو ذوالفقار علی بھٹو صاحب نے تقریر کرتے ہوئے میری جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا:

I have had enough of this man. He is absolute poison. We will not tolerate him any more.

"میں نے اس شخص کو بہت برداشت کیا ہے۔ یہ میرے لیے زہر قاتل ہے میں اس شخص کو بہت برداشت کر چکا۔ اب میں اس کو قطعی طور پر برداشت نہیں کروں گا"۔

بھٹو صاحب کے میرے بارے میں یہ الفاظ آج بھی قومی اسمبلی کے ریکارڈ پر موجود ہیں اور یہ میرے بارے میں ان کے جذبات کی ترجمانی کرتے ہیں۔ ان سے یہ بات بھی بخوبی محسوس کی جا سکتی ہے کہ ان کے ذہن میں میرے بارے میں یقیناً "کوئی واضح منصوبہ موجود تھا یا وہ اس منصوبہ کے بارے میں بالکل واضح تھے۔ جوشِ خطابت میں انہوں نے یہ جملے کہہ دیئے تو ان کے دل کی بات اور ذہن کی گھات عیاں ہو گئی۔

شاید وہ ایسا کبھی نہ کرتے لیکن دراصل وہ انتہائی غصہ کی کیفیت میں ایسا کہہ گئے۔ ہوا یہ تھا کہ وہ اس روز اسمبلی میں ایک مؤثر تقریر کرتے ہوئے یہ ثابت کرنے کی کوشش کر رہے تھے کہ آئین پر اپوزیشن کا شور اور واویلا بلا جواز ہے کیونکہ تمام اپوزیشن نے آئین پر دستخط کیے ہیں اور یہ

یہ آئین متفقہ آئین تھا۔

اس پر میں نے اٹھ کر کہا: جناب سپیکر - رتوڈیرو سے آنے والے فاضل ممبر غلط بیانی سے کام لے رہے ہیں۔ ساری دنیا جانتی ہے کہ میں نے آئین پر دستخط نہیں کیے، میں نے اس کے حق میں ووٹ نہیں دیا پھر یہ کیسے کہہ سکتے ہیں کہ آئین پر سب نے دستخط کئے اور یہ متفقہ آئین ہے۔"

میں بھٹو کو اسمبلی کے اندر کبھی جناب وزیراعظم یا ایسے کسی القاب سے مخاطب نہیں کرتا تھا بلکہ ہمیشہ اسے رتوڈیرو کے حوالے سے مخاطب کرتا تھا (یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ بھٹو جس حلقہ سے منتخب ہو کر آئے تھے اس کا نام رتوڈیرو تھا)۔

چنانچہ میں نے بھٹو کی تقریر کے دوران اٹھ کر اپنا نقطۂ اعتراض اٹھایا، بار بار "رتوڈیرو کے منتخب رکن اسمبلی" کہہ کر انہیں پکارا تو نہ صرف اسمبلی کے ہال میں کھسر پھسر شروع ہو گئی بلکہ مہمانوں کی گیلریوں میں بھی لوگوں نے آپس میں اس پر رائے زنی شروع کر دی — یہ وہ مرحلہ تھا جب بھٹو اپنے آپ پر اور اپنے جذبات پر قابو نہ پا سکے اور انہوں نے اپنے دل میں موجود اس نفرت انگیز جذبہ کا اظہار برملا کر دیا، جو وہ میرے بارے میں رکھتے تھے۔ ممکن ہے بعد میں بھٹو کو احساس ہوا ہو کہ انہوں نے اسمبلی کے بھرے اجلاس میں کیا کہہ دیا۔ مگر اس کا امکان کم ہی ہے کیونکہ اس کے بعد تو میرے اوپر قاتلانہ حملے زیادہ شدید ہو گئے۔

۱۰

۲۷ جولائی ۱۹۷۳ء کو میرا وہاڑی بار ایسوسی ایشن سے خطاب کرنے کا پروگرام تھا۔ میں طے شدہ پروگرام کے تحت وہاں پہنچا۔ اور مجھے یہ دیکھ کر بے حد مسرت ہوئی کہ وکلاء کی ایک بڑی تعداد میری منتظر تھی کیونکہ اب عوام میں یہ تاثر قوی ہوتا جا رہا تھا کہ میں انتہائی ناسازگار حالات میں عوام کے جذبات کی ترجمانی کا حق ادا کر رہا ہوں۔ مجھے وہاں جا کر یہ بھی معلوم ہوا کہ نہ صرف وہاڑی بلکہ گرد ونواح — حتیٰ کہ ملتان تک سے بعض وکلاء حضرات نے میری تقریر سننے کے لئے وہاں تک (وہاڑی) پہنچنے کی زحمت اٹھائی۔ بار روم کے باہر بھی عوام کی ایک بھاری تعداد موجود تھی۔

میں نے حسب معمول خداوند تعالیٰ کی حمد وثناء سے تقریر کا آغاز کیا۔ ابھی میں ماحول کو تقریر کے لئے سازگار بنا ہی رہا تھا کہ اچانک باہر سے گولیاں چلنے کی آوازیں آئیں، لوگ بھاگے دوڑے، — اندر وکلاء کی صفوں میں بھی بے چینی پھیل گئی۔ یکدم بار روم کے دروازے توڑ کر کچھ غنڈوں اندر آن گھسے۔ اور ان میں سے ایک نے کھڑے ہو کر مجھ سے مخاطب ہو کر کہا: اپنی خیر چاہتے ہو تو تقریر بند کر دو۔

میں نے اسے ترکی بہ ترکی جواب دیا: میں نے تمہیں پہچان لیا ہے۔ افسوس تم مجھے نہیں پہچانتے۔

وہ بولا: جانتا ہوں — تمہارا نام قصوری ہے۔

میں نے کہا: اگر نام جانتے ہو تو یہ نہیں جانتے کہ قصوری کو خاموش نہیں کرایا جا سکتا۔

اس کے ایک ساتھی نے بندوق میری طرف تان کر کہا: ہم کرا دیں گے خاموش۔

ابھی اس نے اتنا ہی کہا تھا کہ ہمارے کارکنوں میں سے ایک نے اُچھل کر اور بلاشبہ بڑی دلیری کے ساتھ اس کو قابو کر لیا۔ اس کے بعد وہاں سخت ہنگامہ آرائی ہوئی۔ غنڈوں

نے بار کا سارا فرنیچر توڑ دیا۔ کھڑکیوں کے شیشے چکنا چور کر ڈالے۔ لیکن پھر بھی جوان وکلاء
اور نہتے مگر سرفروش کارکنوں نے ان کو مار بھگایا۔ وہ فائرنگ کرتے ہوئے فرار ہو گئے۔ اس
موقع پر میرے ساتھ راجہ محمد افضل تھے جو سرائے عالمگیر سے صوبائی اسمبلی کے رکن اور تحریک
استقلال کی سنٹرل کمیٹی کے رکن بھی تھے ـــــ وہ بھی موجود تھے۔ ان کے ساتھیوں نے
بھی جوابی فائرنگ کی ـــــ غنڈوں میں سے ایک نے اونچی آواز میں کہا: "قصوری ـــــ
یاد رکھنا ہم پھر آئیں گے"۔

میں نے اسی لہجہ میں پوری قوت سے چلا کر جواب دیا: اگر اپنے باپ کا نام جانتے ہو تو
ضرور آنا اور اپنے بھٹو کو ساتھ لانا ـــــ!!

۱۱

واپسی پر بورے والا کے مقام پر پھر ہمارا راستہ روکا گیا۔ سڑک پر رکاوٹیں کھڑی
کر دی گئیں تھیں اور میں نے دیکھ کر اپنے ساتھیوں سے کہا: "چوکس ہو جاؤ"۔ غنڈوں نے
سڑک کو بند کرنے کے لئے یہ طریقہ اختیار کیا کہ اس پر جا بجا بے ترتیبی سے بیل گاڑیاں کھڑی
کر دی تھیں۔ اور سڑک کے کنارے کچھ لوگ یہ ظاہر کرنے کے لئے کھڑے تھے کہ جیسے وہ
ہمارے حامی ہیں اور ہمارا راستہ تک رہے ہیں۔

اس وقت میرے ذہن میں کئی سال پہلے کا قادر پور رداں کا واقعہ گھوم گیا ـــــ
ہم نے اپنی گاڑیاں دور ہی روک لیں۔ اتنے میں ایک موٹر سائیکل سوار تیزی سے ہمارے
پاس سے گذر گیا۔ اس کے موٹر سائیکل کے پیچھے دودھ کے بڑے بڑے برتن رکھے تھے ـــــ
میں نے دیکھا کہ وہ آگے جا کر ان لوگوں کے پاس کچھ دیر رکا اور پھر آگے نکل گیا۔ ادھر ابھی
ہم یہ طے کرنے کے لئے مشورہ کر رہے تھے کہ اب کیا لائحہ عمل ہونا چاہیئے کہ ایک موٹر سائیکل
ہمارے پاس آ کر رکا ـــــ اور اس نے کہا: "قصوری صاحب" آگے مت جائیں، وہ
ٹھیک نیت کے لوگ نہیں۔ انہوں نے بیل گاڑیوں کے پیچھے لاٹھیاں اور ڈنڈے چھپا

رکھے ہیں ـــــــ چند ایک کے پاس اسلحہ بھی ہے۔

مجھے محسوس ہوا کہ اس نوجوان کے کپڑے ویسے ہی ہیں جیسے تھوڑی دیر پہلے گذرنے والے دودھ والے کے تھے۔ میں نے اپنی حیرت دور کرنے کے لئے کہا: ابھی تم گذرے تھے؟

اس نے ہاں میں سر ہلایا ـــــــ!

اور وہ تمہارے برتن ـــــــ! میں نے حیرانگی سے کہا۔

وہ سنجیدگی سے بولا: وہ میں کچھ دور ٹیوب ویل پر چھوڑ آیا ہوں تاکہ لوگ مجھے شناخت نہ کر لیں اور آپ کو یہ اطلاع دینا میں نے اپنا فرض محسوس کیا ـــــــ آپ آگے مت جائیں۔" یہ کہہ کر اس نے موٹر سائیکل کو کیک ماری اور دیکھتے ہی دیکھتے ہوا ہو گیا۔

میں اس اجنبی دوست کی محبت پر آج بھی حیران ہوں کبھی کبھی وہ مجھے بڑی شدت سے یاد آتا ہے اس دوست کے مشورے پر عمل کرتے ہوئے ہم نے اپنا راستہ بدلا اور بالآخر براستہ میاں چنوں واپس لاہور پہنچ گئے۔

یہ دونوں حملے ظاہر ہے کہ پیپلز پارٹی کے ایماء پر کرائے گئے۔

۱۲

پھر مجھ پر ایک اور قاتلانہ حملہ گوالمنڈی لاہور میں ۱۹۷۳ء کے ماہِ رمضان میں ہوا۔ ۲۷ ویں روزے ہمارے ایک کارکن عبدالحمید نے افطار پارٹی کا اہتمام کر رکھا تھا۔ افطار کے بعد وہاں ایک پارٹی میٹنگ کا بھی پروگرام تھا۔ اس میٹنگ میں میں کارکنوں سے گفتگو کر رہا تھا کہ اچانک پیپلز پارٹی کے غنڈوں نے "کھر ساڈا شیر اے ـــــــ باقی ہیر پھیرا اے ـــــــ بھٹو جیوے ہزاروں سال" کے نعرے لگاتے ہوئے حملہ کر دیا۔ اس موقع پر اتفاق سے میرے والد مرحوم بھی ہمراہ تھے غنڈوں نے ہمارے نہتے کارکنوں کو بے دردی سے زدوکوب کیا۔ اچانک ایک طرف سے کسی شخص نے تین چار جوابی (ہوائی) فائر کر دیئے تو یہ غنڈے بھاگ کھڑے ہوئے۔ لیکن اس سے پہلے انہوں نے بے چارے عبدالحمید کے گھر کو برباد کر

دیا۔ گھر کی تمام اشیاء توڑ دی گئیں۔ بچوں کے کھلونے تک پھوڑ دیئے ——!

میں عبدالحمید اور دیگر کارکنوں کے ہمراہ گوالمنڈی تھانہ اس واقعہ کی رپورٹ درج کرانے گیا تو مجھے یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ تھانیدار نے نہ صرف رپورٹ درج کرنے سے گریز کیا بلکہ اس نے الٹا مجھے نصیحتیں شروع کر دیں: جناب آپ گورنمنٹ پر زیادہ تنقید نہ کیا کریں۔ آپ اپنا خیال کریں۔ بھٹو صاحب نے تو آپ کو بڑی عزت دی ہے —— وہ تو آپ کے محسن ہیں۔" باقی باتیں تو میں سنتا رہا مگر جب اس نے یہ کہا تو میں نے قدرے غصہ سے کہا: تقریر کرنے کا زیادہ شوق ہے تو وردی اتار کر پیپلز پارٹی میں شامل ہو جاؤ —— باقی مجھے لیڈری دکھانے کی کوشش نہ کرو، تم بس کام کرو، مجھے اپنا کام کرنے دو —— پھر میں نے اس کو خالص پنجابی میں جو کچھ کہا اس کا اردو میں خلاصہ کچھ یوں ہے۔ "جب دو سانڈ آپس میں سینگ پھنسا کر لڑ رہے ہوں تو مینڈکوں کو ان سے دور ہی رہنا چاہیئے" ——!

اس تکرار کا نتیجہ یہ ہوا کہ تھانیدار نے رپورٹ درج نہ کی۔ البتہ میرے اصرار اور تکرار پر اس نے بعض غنڈوں کو تھانہ میں بلایا اور جب یہ لوگ تھانے آئے تو بلا جھجک اور کسی خوف کے بغیر وہ آ کر تھانیدار کے سامنے کرسیوں پر بیٹھ کر ہمیں یوں گھورنے لگے جیسے دراصل ہم مجرم ہیں ——! ان کو بیٹھے ہوئے بمشکل منٹ گذرے ہوں گے کہ اچانک فون کی گھنٹی بجی اور تھانیدار ریسور کان سے لگاتے ہی یکدم اچھل کر یوں کھڑا ہو گیا جیسے اس کی کرسی پر بچھو آن گرا ہو —— ہم کچھ نہ سمجھ سکے، مگر غنڈے سب کچھ سمجھ گئے تھے۔ تھانیدار کی زبان پر "اچھا سر —— اچھا سر —— جی سر —— جی سر" کا ورد جاری تھا۔ اس نے فون بند کیا اور ماتھے سے پسینہ کی بوندیں صاف کرتے ہوئے غنڈوں سے بولا: یار —— کمال کرتے ہو —— ہم کوئی تمہارے دشمن ہیں —— اس فون کرانے کی بھلا کیا ضرورت تھی۔ اچھا —— بس یار —— رب راکھا ——"

میں سخت حیرت سے یہ سارا ماجرا دیکھ رہا تھا، اچانک غنڈوں کی قطار کے آخری منچلے نے مجھے آنکھ مار کر کہا: قصوری صاحب دیکھا ہمارے صاحب کے فون کا کمال ——!

ذرا پھر خالص لاہوری انداز میں بولا : ساڈے نال پھڈے بازی ٹھیک نئیں پہلوان !
میں اپنے کارکنوں سمیت اٹھ کر تھانے سے باہر چلا آیا مگر مجھے یوں محسوس ہوا جیسے اس ملک میں قانون نہیں دھونس کی حکومت ہے۔

۱۳

کچھ عرصہ خاموش ہونے کے بعد مجھ پر ایک اور قاتلانہ حملہ ۳، دسمبر ۱۹۷۳ء کو میرپور (آزاد کشمیر) میں کرایا گیا۔ میں وہاں ایک جلسۂ عام سے خطاب کرنے گیا تھا۔ اس جلسہ میں ائرمارشل اصغر خان بھی میرے ہمراہ تھے۔ ان سے پہلے جب میں تقریر کرنے کے لئے سٹیج پر آیا اور میں نے پیپلز پارٹی پر اپنے مخصوص انداز میں تنقید شروع کی تو عوام نے اس پر پرجوش نعرے لگائے۔ اس سے پیپلز پارٹی والوں کو سخت کوفت ہوئی۔ اور پھر جب میں نے بھٹو کی شخصیت اور سیاست کے بخیے ادھیڑنے شروع کئے تو پی پی والوں نے صبر و تحمل کا دامن چھوڑ دیا۔ عین اس وقت پی پی کے ایک مقامی لیڈر علی جان شاہ کی نگرانی میں غنڈے آئے اور انہوں نے فائرنگ شروع کر دی۔ لوگ بھاگنے لگے، مگر میں اسٹیج پر ڈٹا رہا۔ اور میں نے للکار کر کہا : "ڈرنے اور بھاگنے کی ضرورت نہیں۔ یہ تو بزدل بھارتی ایجنٹ ہیں جنہوں نے آپ کے حقوق اور آزادی کا سودا کر لیا ہے —— کھڑے ہو جاؤ اور ان غنڈوں کو آج بتا دو کہ جب شریف آدمی غنڈہ گردی کا جواب دیتا ہے تو غنڈے کی سات نسلوں کو غنڈہ گردی کا جواب دیتا ہے تو غنڈوں کی سات نسلیں غنڈہ گردی سے توبہ کر لیتی ہیں ——"

میرا اتنا کہنا تھا کہ لوگوں نے واقعی بڑی جرأت مندی سے غنڈوں پر قابو پا لیا۔ ان میں سے چند ایک کا اسلحہ چھین لیا گیا اور ابھی اس صورت حال پر قابو پایا جا رہا تھا کہ پولیس نے لاٹھی چارج شروع کر دیا۔ لیکن لوگوں کا جذبہ اس سطح پر آ چکا تھا کہ انہوں نے پولیس سے بھی مقابلہ کی ٹھان لی۔ جس پر پولیس کو پیچھے ہٹ کر بیٹھ جانا پڑا۔

اس حملہ کے بعد میں نے ایک طویل تقریر کی اور نہایت جذباتی انداز میں بھٹو سے اپنے

تعلقات اور اختلافات کا ذکر کیا۔ میرا بنیادی استدلال یہی تھا کہ عوام آخر کب تک دھوکہ کھائیں گے ـــــ قائد عوام نے ملک کو دولخت کیوں کیا ـــــ عوام نے پرجوش انداز میں میرے جذبات کی تائید کی۔

۱۴

چند دنوں کے بعد ۱۷ دسمبر ۱۹۷۳ء کو مجھ پر قاتلانہ حملہ ہوا۔ میں قومی اسمبلی کے اجلاس میں تقریر کر کے واپس آ رہا تھا۔ یہ رات کا اجلاس تھا جو تقریباً گیارہ بجے ختم ہوا تھا۔ اس اجلاس میں بلوچستان کے موضوع پر بحث چل رہی تھی۔ ظاہر ہے کہ میں نے بلوچستان میں بھٹو کی پالیسی اور کارروائی کی ڈٹ کر مخالفت کی اور اس کے گھناؤنے عزائم کو بے نقاب کیا۔ میں نے انتہائی صاف گوئی سے اسمبلی کو مطلع کیا کہ کیسے بلوچستان میں ملٹری ایکشن کے ذریعے غریبوں کی بستیوں کو ملیا میٹ کر دیا گیا ہے اور سیاسی کارکن گوریلا کا روپ دھار کر شہروں سے پہاڑوں پر چلے گئے ہیں۔ اور اگر یہی حالات رہے تو پھر بلوچستان کی معتدل قیادت (یعنی بزنجو، مینگل، مری وغیرہ) غیر موثر ہو کر رہ جائے گی۔ بلکہ فوج کے زیادہ استعمال سے ملکی سلامتی اور وفاق کا وجود ایک بار پھر خطرے میں پڑ جائے گا۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ سول انتظامیہ مفلوج ہو جائے اور خانہ جنگی شروع ہو جائے اور کسی طالع آزما جرنیل کو مارشل لاء لگانے کا بہانہ اور جواز ہاتھ لگ جائے۔

میری تقریر کے دوران بھٹو اجلاس میں موجود تھا۔ جب میں نے کہا کہ میں آپ پر پاکستان کو توڑنے، عوام کو دھوکہ دینے، جمہوریت کے نام پر آمریت مسلط کرنے، انسانی حقوق پامال کرنے، شہریوں کو عدم تحفظ کا شکار کرنے، اور بلوچستان میں خونی آپریشن کروانے اور بلوچوں کے قتل کا الزام عائد کرتا ہوں تو پورے ہال میں سکوت طاری تھا۔ لوگ حیرت سے مجھے دیکھ رہے تھے۔ اور بھٹو نے اپنی جیب سے رومال نکال کر اپنے ماتھے سے پسینہ صاف کیا۔ اور پھر مجھے غور سے دیکھ کر ہونٹ کاٹنے لگا۔ غصہ کا یہ عالم تھا کہ بھٹو کی نتھنے پھڑک

رہے تھے اور ماتھے کی سلوٹوں کو بمشکل کھولنے کی ناکام کوشش کر رہا تھا۔

عین اس وقت جب میری تقریر ختم ہونے والی تھی۔ بھٹو اٹھ کر اپنے چیمبر زمیں چلا گیا اور اس نے ایک خفیف سے اشارے سے عبدالحفیظ پیرزادہ اور ممتاز بھٹو کو پیچھے آنے کے لئے کہا۔ میری (بعد کی) اطلاعات کے مطابق اسمبلی کے اندر واقع بھٹو نے اپنے چیمبرز کے اندر داخل ہوتے ہی غصہ سے کہا:

It is too much now!

ممتاز بھٹو نے پیچھے سے آکر ہنس کر کہا:

Your own choice.

بھٹو نے اس جملہ کو نظر انداز کرتے ہوئے پیرزادہ سے کہا:

All I want is to silence this man.

اس پر پیرزادہ نے آہستہ سے کہا۔

For time being or ....

اس کا جملہ پورا نہ ہونے پایا تھا کہ بھٹو نے چیخ کر کہا:

Permanently and for ever.

اس کے بعد ان تینوں نے صلاح مشورہ کیا جس کے دوران ایک اور "شخصیت" سے فون پر صلاح ہوئی اور یوں میری تقریر کے ٹھیک چالیس منٹ کے بعد یہ طے پا چکا تھا کہ "آج اسے ختم کر دیا جائے" ـــــ اور یہ کام ایف ایس ایف کی ایک جیپ سے لیا جانا تھا تو ایک ڈرائیور کے ذمہ یہ فریضہ سونپا گیا کہ وہ بلا خوف و خطر مجھ پر جیپ چڑھا دے۔

اسمبلی سے ایم این اے ہاسٹل تک عموماً میں پیدل ہی آیا جایا کرتا تھا۔ اس روز جب میں اپنی تقریر کر کے اسمبلی سے باہر آیا اور ہاسٹل کی طرف چلا تو میرے آگے پی پی کے ارکان اسمبلی کا ایک گروپ خراماں خراماں جا رہا تھا۔ جبکہ میرے ہمراہ میرے بڑے بھائی صاحبزادہ شیر علی خان ایڈووکیٹ اور قصور سے آئے کچھ ورکرز تھے۔ ہم اپنی باتوں میں مگن چلے جا رہے تھے کہ اچانک پیچھے سے ایک تیز رفتار جیپ آئی اور ہمارے انتہائی نزدیک سے گزرتی ہوئی

بمشکل پچاس گز دور جانے والے لوگوں پر چڑھا دی۔ اس کے نتیجہ میں چوہدری اقبال ممبر قومی اسمبلی (شیخوپورہ) بری طرح کچلے گئے اور موقع پر ہی چل بسے۔ مرحوم پ پ پ کے بڑے سرگرم اور فعال راہنما تھے۔ حاجی غلام رسول تارڑ، حفیظ اللہ چیمہ، سردار عبدالعلیم اور چوہدری ممتاز بھی بری طرح زخمی ہوئے۔

دراصل ہوا یہ کہ ڈرائیور کو بس اتنا حکم دیا کہ "قصوری پر گاڑی چڑھا دو، وہ سڑک پر پیدل جا رہا ہوگا" —— اس وقت رات کا وقت تھا اور ابھی اس زمانے میں اس سڑک پر سٹریٹ لائٹ بھی نہیں تھی —— اس اندھیرے میں وہ میری درست طور پر نشاندہی نہ کر سکے۔ میرا خیال ہے کہ ڈرائیور کو حفیظ اللہ چیمہ پر میرا دھوکہ ہوا کیونکہ اس کی قد و قامت میری جیسی ہی تھی۔

بہرحال جونہی یہ حادثہ ہوا۔ ہم سب دوڑے اور جا کر دیکھا کہ چوہدری اقبال جیپ کے نیچے پہیوں کے درمیان پھنسے پڑے ہیں۔ باقی زخمی ہراساں اور سراسیمگی کے عالم میں زخموں سے تلملا رہے ہیں لیکن جیپ کے اندر ایف ایس ایف کا باوردی عملہ انتہائی پرسکون بیٹھا ہے۔ میں نے ان کو غصہ سے کہا:

ادئے باہر نکلو ——

وہ بڑے سکون سے باہر نکلے۔ ان کے چہرے بڑے مطمئن تھے حالانکہ عام طور پر اگر گاڑی کے نیچے کتا یا بلا بھی آ جائے تو انسان وقتی طور پر سہی —— پریشان ضرور ہوتا ہے —— جب انہوں نے باہر آ کر مجھے کھڑے دیکھا تو وہ حیران و پریشان ہو گئے۔ ان کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں اور ان میں سے ایک نے حیرت میں ڈوبی آواز میں کہا: سر آپ؟

میں سارا معاملہ سمجھ چکا تھا لہٰذا میں نے کہا: ہاں —— بچُو —— میں!

اتنے میں اور لوگ بھی اکٹھے ہو گئے تھے اور ہم نے گاڑی کو ہٹا کر نیچے سے چوہدری صاحب کو نکالا جو آخری سانس لے رہے تھے۔ میں سڑک کے کنارے کھڑا ہو گیا۔ دور سے ایک گاڑی آتی دکھائی دی۔ میں نے اسے ہاتھ دیا۔ قریب آ کر گاڑی رکی۔ اس پر قومی پرچم لہرا رہا تھا اور جب میں نے جھک کر اندر دیکھا تو پچھلی نشست پر عبدالحفیظ پیرزادہ براجمان تھا

اس وقت اس کی آنکھوں پر جو غیر معمولی چمک اور ہونٹوں پر جو مکارانہ مسکراہٹ تھی ــــــ اسے دیکھ کر اس پر وفاقی وزیر نہیں بلکہ انگریزی فلموں کے اس ولن کا گمان گذر رہا تھا جو خود ہی واردات کراتا ہے۔ اور پھر خود ہی انجان اور سادہ لوح راہ گیر بن کر صورت حال کا جائزہ لینے وہاں آجاتا ہے۔

میں نے کہا: پیرزادہ ــــــ جلدی کرو، چوہدری اقبال گاڑی کے نیچے آگیا ــــــ مجھے سامنے دیکھ کر وہ سناٹا گیا۔ حیرت سے اس کا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا۔

میں نے پھر کہا: جلدی کرو، وہ مر رہا ہے۔

اس پر پیرزادہ باہر نکلا، ہم نے چوہدری اقبال کو اٹھا کر گاڑی کی پچھلی سیٹ پر ڈالا، میں بھاگ کر ایم این اے ہاسٹل سے اپنی گاڑی لے آیا۔ اس میں دوسرے زخمیوں کو ڈالا اور پولی کلینک کی طرف دوڑے جب ہم وہاں پہنچے تو دیکھا کہ ٹی وی کا عملہ موجود ہے۔ ان کی تیز روشنیاں ماحول کو منور کر رہی ہیں کیمرہ مین اِدھر اُدھر دوڑ رہے ہیں اور لوگوں کا ہجوم ہے میں نے آگے بڑھ کر دیکھا تو یہ بھٹو اور فضل الٰہی تھے جن کو حادثے کی اطلاع مل چکی تھی اور وہ زخمیوں کی تیمارداری کے لئے ہسپتال پہنچ چکے تھے ــــــ ایک طرف بے گناہ افراد موت کے پنجہ سے بچنے کے لئے کوشاں تھے اور دوسری طرف ان لوگوں کو اپنی "پی آر" کرنے کا بہانہ ہاتھ آگیا اور یہ اپنی پبلسٹی کا سنہری (مگر درحقیقت خونی) موقع بھی ضائع کرنا نہیں چاہتے تھے۔

چوہدری اقبال کو فوراً آپریشن تھیٹر میں لے جایا گیا۔ ڈاکٹر لپکے مگر تھوڑی ہی دیر کے بعد انہوں نے چوہدری صاحب کی موت کا باقاعدہ اعلان کر دیا۔ زخمیوں کو فوراً طبی امداد دی جانے لگی۔ میرے ساتھ میرے بھائی شیر علی خان تھے اور میرے دوسرے ورکرز بھی وہاں پہنچ چکے تھے۔ میں سخت افراتفری میں اِدھر اُدھر دوڑ رہا تھا کہ اپنے دوسرے ساتھیوں اور دوستوں کی زندگی کو بچا سکوں ــــــ اچانک ایک اجنبی شخص نے میرے کندھے پر تھپکی دی اور کہا: ذرا میری بات سنیئے۔ میں اس کے ساتھ ایک طرف کو ہوا اور اس سے پوچھا: آپ کی تعریف، جواب میں اس نے مجھے اپنا نام بتایا (جو میں ظاہر نہیں کرنا چاہتا کہ وہ اب بھی کسی

نواب محمد اسماعیل خان کی رہائش گاہ مصطفےٰ کاسل میرٹھ (۱۹۳۶ء) میں
نواب محمد احمد خان اور بیگم نواب محمد احمد خان کی ایک یادگار تصویر۔

25th September, 1937.

Dear Sir,

I have much pleasure in informing you that the 25th Annual Session of the All India Muslim League will be held at Lucknow on the 15th, 16th and 17th October 1937 and that M. A. Jinnah Esqr, M.L.A. has been elected as the President of the said Session.

I need hardly point out that on account of the critical situation in the country and the great Constitutional changes, this session of the League has an importance of its own.

As you know the All India Muslim League has served the political interests of the country and the Muslim community for the last 31 years, it is recognised as the sole accredited political organisation of the Muslims of India. Its doors are open to all. It offers a plateform for the ventilation of all shades of political thought and opinion. It is high time, therefore, that Muslim of all shades of opinion should assemble at Lucknow for calm deleberation and to give expression their united demand.

It is extremely important and imperative that you should in no case miss the opportunity of participating in the session, which is going to be, perhaps, the most momentous Session of the organisation during its life. I must also request you to be good enough to inform Raja Saheb Mahmudabad, the Chairman of the Reception Committee of the 25th Annual Session of the All India Muslim League at Qaiserbagh, Lucknow of the time and date of your arrival as also your special requirements as regards accommodation to enable him to make necessary arrangements.

Any suggession or draft resolution for discussion and submission to the Session will be welcome and laid before the League in accordance with the provisions of its Consitutions.

Yours sincerely.
S. SHAMSUL HASAN,

نواب محمد احمد خان کو آل انڈیا مسلم لیگ کے اسسٹنٹ سیکرٹری
شمس الحق کی طرف سے لکھنؤ اجلاس میں شرکت کی دعوت۔

۱۹۶۹ء میں مسٹر ذوالفقار علی بھٹو اور احمد رضا قصوری
لاہور انٹرکونٹی نینٹل سے باہر آتے ہوئے

ممتاز ادیب وشاعر جمیل الدین عالی کی صاحبزادی سے مصنف کے بھائی
احمد مصطفیٰ قصوری کی شادی کے موقع پر لی گئی ایک یادگار تصویر۔

نواب محمد احمد خان مرحوم کی تعزیت کے لیے خان عبدالغفار خان
۱۳۰/اے جے ماڈل ٹاؤن لاہور میں، چودھری ظہور الٰہی مرحوم بھی موجود ہیں۔

نومبر ۱۹۶۷ء میں مسٹر ذوالفقار علی بھٹو احمد رضا قصوری نواب خاندان کی تاریخی حویلی قصور میں

اپریل ۱۹۷۴ء میں سینٹ جیمس ہال بریڈفورڈ انگلینڈ میں،
احمد رضا قصوری پاکستانیوں اور دیگر ایشیائی عوام سے خطاب کر رہے ہیں

احمد رضا قصوری اور ان کی اہلیہ محترمہ فہمیدہ بخاری۔ جن کی شادی یکم جون
۱۹۷۷ء میں ہوئی۔ محترمہ فہمیدہ بخاری رئیس الاحرار سید عطاء اللہ شاہ بخاری
کی بھتیجی، سید عنایت اللہ شاہ بخاری کی بھانجی اور سید برکت علی شاہ
بخاری کی صاحبزادی ہیں آپ نے ایم اے (سیاسیات) اور ایم ایڈ سندھ
یونیورسٹی سے پاس کیا اور ایم ایس میشی گن یونیورسٹی امریکہ سے کی۔
ان دنوں وفاقی وزارت تعلیم میں ایک اہم عہدے پر فائز ہیں۔

نواب محمد احمد خان کے قتل کی وہ تاریخی ایف آئی آر جو ۱۱، اور ۱۲ نومبر ۱۹۷۴ء

کی درمیانی رات کو وقت کے وزیراعظم ذوالفقار علی بھٹو کے خلاف اچھرہ تھانہ

لاہور میں لکھی گئی، جسے احمد رضا قصوری نے بیرونِ ملک غائب کرادیا

اور جو بعد میں مسٹر بھٹو کی تقدیر ثابت ہوئی۔

سینئر عہدہ پر کام کر رہا ہو گا) ۔ اس کے بارے میں اشارتاً صرف اس قدر کہنا ہی کافی خیال کرتا ہوں کہ حکومت کے محکموں، اداروں اور رجمنوں میں ہر طرح کے لوگ ہوتے ہیں بے ضمیر اور لالچی بھی ـــــ اور انسانیت دوست اصول پسند بھی ـــــ وہ شخص بھی ثانی الذکر قسم کا تھا ۔ اس نے میرے کان میں کہا : آپ کہاں خونخوار درندوں اور اپنے قاتلوں میں کھڑے ہیں ؟ ۔

کیا مطلب ؟ میں نے حیرت سے کہا :

وہ بولا : قصوری آپ یہاں سے چلے جائیے اور جا کر خدا کا شکر ادا کیجئے ـــــ آپ کی زندگی بچ گئی ۔ یہ اٹیک دراصل آپ پر ہوا تھا ـــــ ڈرائیور اندھیرے میں آپ کو پہچان نہیں سکا ۔ اور چوہدری صاحب بے گناہ مارے گئے ـــــ اتنا کہہ کر وہ تیزی سے ہسپتال کے راہداریوں میں گم ہو گیا ۔

میرا دماغ گھوم گیا ۔ اور مجھے اپنا سارا وجود کمہار کے چاک کی طرح گھومتا ہوا محسوس ہوا ۔ کسی خوف یا اندیشے کے مارے نہیں بلکہ اس تکلیف دہ احساس کے باعث کہ کیا پیپلز پارٹی کا قیام، جدوجہد، سفر اور قربانیاں اس قسم کے سانحہ رونما کرنے کے لئے تھا ؟

(۱۵)

۲۳ جنوری ۱۹۷۴ء کو چند لوگوں نے میرے گھر (واقع قصور) پر اندھا دھند فائرنگ کی ۔ خوش قسمتی سے اس فائرنگ کے نتیجہ میں کوئی جانی نقصان تو نہ ہوا مگر اس سے یہ ضرور ثابت ہو گیا کہ "بھٹو صاحب" نے میری اسمبلی کی تقریر کو فراموش نہیں کیا، وہ ایسا کر بھی نہیں سکتے تھے ۔ کیونکہ انہوں نے حافظہ تو بلا کا پایا تھا ۔ اس فائرنگ سے وہ مجھے یہ باور کرانا چاہتے تھے کہ میں ان کی نظروں سے "آؤٹ آف فوکس" نہیں ہوا ۔ گویا وہ مجھے ہراساں کر کے میری اسمبلی میں کارگزاری پر اثر انداز ہونا چاہتے تھے ۔ اسمبلی میں میرے بے باک انداز نے انہیں سخت پریشان کر رکھا تھا ـــــ وہ ہر روز کسی نہ کسی طور پر میرا ذکر کرتے

اور عموماً ایک جملہ کہا کرتے تھے۔

This man is absolute poison for me.

بھٹو نے اس جملہ کو اسمبلی میں بھی دوہرایا تھا جو آج بھی ریکارڈ پر موجود ہے۔ جس دن اس نے اس جملہ کو اسمبلی میں دوہرایا تھا اس روز اسمبلی کے کیفے ٹیریا میں مجھے ایک غیر ملکی خاتون صحافی نے کہا تھا:

Mr. Qasuri, you are very lucky.

Perhaps your life line is very strong.

(۱۶)

۲۴ راگست ۱۹۷۴ء کو اسلام آباد میں دن دھاڑے ایمبسی روڈ پر مجھ پر ایک اور قاتلانہ حملہ ہوا۔ اس بار حملہ آوروں نے مجھے اس جگہ آلیا جہاں ایمبسی روڈ بلیو ایریا سے متصل ہوتی ہے۔ اس زمانے میں ابھی بلیو ایریا میں تعمیراتی کام اتنے زور وشور سے جاری نہیں تھا بلکہ یوں کہنا چاہیئے کہ یہ سارا علاقہ بے آباد اور سنسان تھا۔ میں اپنی گاڑی پر جا رہا تھا۔

ایک جیپ پہلے میرے پیچھے آتی رہی اور پھر کراسنگ کے نزدیک جا کر تیزی سے آگے نکل گئی۔ مجھے سیدھا (ایوب چوک کی طرف) جانا تھا۔ لیکن یہ جیپ آگے جا کر بائیں طرف کو مڑ گئی۔ یہاں پر میری گاڑی کو ذرا ڈھلوان سے ہو کر گذرنا تھا۔ جب میں اس مقام پر آیا تو یک لخت اس جیپ کا پچھلا دروزہ (جو ترپال کا بنا ہوا ہوتا ہے) معمول سا کھُلا اور اس میں سے ایک آٹومیٹک گن نے مجھ پر فائرنگ شروع کر دی۔

میں نے اللہ کا نام لے کر گاڑی کو روکنے یا گھبرانے کی بجائے سیدھا رکھا اور سپیڈ بڑھا دی، اگر اس وقت گھبراہٹ میں میرا سٹیرنگ ذرا بھی ڈگمگا جاتا تو یقیناً گاڑی

قلا بازی کھا جاتی مگر خدا نے نہ صرف محفوظ رکھا بلکہ فائرنگ کے نشانے سے بچ نکلا۔ میں وہاں سے سیدھا اپنے بڑے بھائی سکندر حیات خان کے گھر پہنچا جو ان دنوں سنٹرل بورڈ آف ریونیو میں ڈائریکٹر ٹیکسز تھے۔ میں نے ان کو سارا واقعہ سنایا اور پھر وہیں سے ٹیلی فون پر آبپارہ پولیس سٹیشن سے رابطہ کیا۔

راجہ ناصر نواز اس وقت پولیس انسپکٹر تھا جس نے میرے کہنے پر دفعہ ۳۰۷ کے تحت پرچہ درج کیا اور موقع واردات پر جا کر چینی ساخت کی بندوق میں استعمال ہونے والی گولیوں کے خول برآمد کر لئے۔ یہ بندوق صرف ایف ایس ایف استعمال کیا کرتی تھی۔

ان دنوں اسمبلی کو کمیٹی میں تبدیل کر دیا گیا تھا اور اس کے صبح و شام دو اجلاس ہوا کرتے تھے کیونکہ قادیانی مسئلہ زیر بحث تھا۔ دوپہر کو یہ واقعہ ہوا اور شام کو میں نے اسمبلی کے اجلاس میں تحریک پیش کر دی اور بتایا کہ میرے اوپر پھر قاتلانہ حملہ ہوا ہے اور میں نے برملا اور واشگاف الفاظ میں کہا کہ ان قاتلانہ حملوں کے پیچھے پی پی اور اس کے چیئرمین بھٹو کا ذہن کارفرما ہے وہی ان حملوں کے ذمہ دار اور محرک ہیں۔"

میں اپنی بات کر چکا تو اسمبلی میں کھلبلی مچ گئی۔ ایسے میں پی پی کے بعض ایم این اے حضرات نے محض بھٹو کی خوشنودی اور توجہ حاصل کرنے کے لئے میری مخالفت شروع کر دی۔ ان میں سب سے زیادہ پیش پیش چکوال کا محمد امیر خان تھا۔ جو کسی زمانے میں تھانیدار رہ چکا تھا۔ اب اگرچہ وہ قومی اسمبلی کا معزز رکن تھا مگر اس کے باوجود اس کے مزاج اور دل و دماغ سے تھانیداری نہیں گئی تھی۔ اس نے بھی میری مخالفت اور بھٹو کی خوشامد کی بہتی گنگا میں ہاتھ دھونے کی کوشش کی اور اٹھ کر بولا: جناب —— قصوری صاحب نے تو یہ وطیرہ ہی بنا لیا کہ جب اجلاس کے اندر آتے ہیں۔ اپنے اوپر کسی نہ کسی قاتلانہ حملہ کی خبر ہمراہ لاتے ہیں۔ اور اس کی آڑ میں پی پی اور قائد عوام کو بدنام کرتے ہیں —— اسلام آباد تو بین الاقوامی اور بڑا پر امن شہر ہے مگر قصوری صاحب نے اس شہر پر بھی قاتلانہ حملہ کا الزام لگا دیا ہے —— دن دہاڑے بلکہ —— اسلام آباد میں یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ قصوری صاحب دوپہر کا کھانا کھا کر آرام کرنے کو سوئے ہوں گے تو انہوں نے

خواب میں چاند ماری دیکھی ہو گی ——— وہ گھبرا کر اٹھ کر اسمبلی میں آ گئے ہیں اور اس بڑے خواب کا الزام بھٹو صاحب پر عائد کر رہے ہیں۔"

اس کا لہجہ اور طرز گفتگو صاف بتا رہا تھا کہ وہ یہ باتیں کیوں کر رہا ہے ——— لیکن ظاہر ہے کہ میں اس کا منہ تو بند نہیں کر سکتا۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ اس روز جمعرات کا دن تھا اور اگلے روز جمعہ کی چھٹی تھی۔ عموماً قریبی شہروں اور قصبوں کے ایم این اے اس ہفتہ وار چھٹی پر اپنے گھر چلے جاتے تھے (اب بھی یہی ہوتا ہے) اجلاس ہفتہ تک کے لئے ملتوی ہوا مگر ہفتہ کی صبح جب میں نے اخبار دیکھا تو اچانک ایک خبر کی نمایاں اور جلی سرخی نے میری توجہ اور میرے دھیان کو حیرت انگیز طور پر اپنے اثر میں لے لیا تھا ——— لکھا تھا:

امیدوار ایم این اے کا سفاکانہ قتل

انہیں مخالفین نے آبائی گاؤں میں گولیوں کا نشانہ بنایا

میں نے خدا کے خوف اور شکر کے طور پر اپنا سر جھکا لیا ——— جو شخص میرے اوپر ہونے والے حملہ کا تمسخر اڑا رہا تھا، وہ خود عبرت کی مثال بن گیا۔ میرے قتل کی کوششوں کو خواب کہنے والے کے سر پر اس کی اپنی موت منڈلا رہی تھی۔ مگر اسے خوش مدسے فرصت نہ تھی۔ تب مجھے قرآن پاک کی یہ آیت یاد آئی۔ اِنَّ بَطْشَ رَبِّکَ لَشَدِید (بے شک اللہ کی گرفت بڑی مضبوط ہے) ——— اور اس کے ساتھ ہی میرا سر خدا کے حضور اس کے خوف اور اس کے شکر کے احترام میں جھک گیا۔

میں اپنے اوپر ہونے بلکہ کرائے جانے والے حملوں کے بارے میں تمام قانونی تقاضے پورے کر رہا تھا۔ یعنی اس کے بارے میں فوراً قریبی تھانہ کو اطلاع دیتا اور قومی اسمبلی کے کھلے اجلاس میں برملا اس کا اظہار کرتا مگر نامعلوم وجوہات کی بنا پر میری یہ کوشش رائیگاں اور اعلانات صدا بصحرا ثابت ہو رہے تھے اس کے مقابلہ میں مبینہ قاتلوں اور ملزموں کی طرف سے پیش قدمی بڑھتی جا رہی تھی۔ اور میری بے بسی سے ان کی حوصلہ افزائی ہو رہی تھی۔

(۱۷)

چنانچہ اسی کے نتیجہ میں ۱۰، ۱۱ر نومبر کی درمیانی شب تقریباً ۲/۱ ۱۲ بجے مجھ پر لاہور میں شادمان اور شاہ جمال کے سنگم پر واقع چوک میں ایک بار پھر میری جان لینے کی کوشش کی گئی۔ اس روز میرے ایک انتہائی عزیز دوست سید بشیر شاہ کی دعوت ولیمہ تھی جہاں ہمارا سارا کنبہ مدعو تھا۔ رات کے کھانے کے بعد وہاں "قربان حسین، طفیل حسین قوال" اپنے فن کا مظاہرہ کرنے لگے اور دیکھتے ہی دیکھتے انہوں نے سماں باندھ دیا۔ شروع میں ہی انہوں نے حضرت بابا بلھے شاہ کا عارفانہ کلام سنایا۔

میرا پیا گھر آیا۔ سانوں اللہ ملایا

ہُن وچھڑن ہو یا محال نی .....

اور اس کے بعد یہ سلسلہ چلتا رہا —— جب ہم اٹھ کر آنے لگے تو میرے والد نواب صاحب نے ایک بار پھر اس قوالی کی فرمائش کر دی اور کہا: بھئی ایک بار پھر وہی سناؤ —— ساڈا پیا گھر آیا" —— ان کی فرمائش اور اصرار کے احترام میں یہ قوالی دوبارہ پیش کی گئی اور اس کے اختتام کے ساتھ ہی یہ محفل سماع بھی اختتام پذیر ہوئی۔

میرے والد نے جس انداز میں بڑی محبت اور نرم گوئی سے قوالی کی فرمائش کی۔ اس پر مجھے یونہی ذرا حیرت سی ہوئی۔ وہ بڑے ہی دھیمے اور آہستہ لہجہ میں بول رہے تھے۔ لیکن اب خیال آتا ہے کہ اس وقت یہ فرمائش ان کی روح کر رہی تھی جسے "بھلاوے" کا احساس ہو چلا تھا۔

اس کے بعد ہم گھر کو واپس روانہ ہوئے۔ ان دنوں میرے پاس ٹویوٹا مارک ٹو LEJ 9495 گاڑی ہوا کرتی تھی جو "رائٹ ہینڈ ڈرائیو" گاڑی تھی میں نے سٹیرنگ سنبھالا، میرے بائیں جانب میرے والد مرحوم نواب صاحب آن بیٹھے، بیک سیٹ پر میرے پیچھے میری والدہ اور میرے والد کے پیچھے میری خالہ (بیگم آغا مہدی خان) بیٹھ گئیں۔

شادی والے گھر سے مذکورہ چوراہا زیادہ سے زیادہ سو گز کے فاصلہ پر ہے۔ ہم وہاں سے نکلے اور میں نے بمشکل گاڑی پہلے گیر سے دوسرے گیر میں ڈالی ہو گی کہ ایک دم سے فائرنگ کی آواز آئی۔ میرے لئے یہ آوازیں اب اجنبی اور غیر معمولی نہیں رہی تھیں لہذا میں تو سمجھ گیا کہ یہ پھر حملہ ہوا ہے۔ میں نے فوراً سر کو نیچے جھکایا اور گاڑی کی سپیڈ تیز کر دی اب میرے سامنے وہ چوراہا تھا جسے پورا گھوم کر (یعنی ۱۸۰ درجہ کے زاویہ کو طے کر کے) گذرنا تھا۔

اب صورت حال یہ تھی کہ ایک حملہ آور گروپ درمیان میں تھا۔ اور دوسرا اس جانب شاہ جمال کی طرف سے جدھر گھوم کر جانا تھا۔ جونہی میری گاڑی سامنے آئی تو ان کے پہلے برسٹ کا نشانہ میری گاڑی کا بونٹ بنا جس سے ڈائینمو بیکار ہوا اور میری گاڑی کی بتیاں بجھ گئیں۔

میرے کانوں میں اب بھی میرے والد کی یہ آوازیں آتی ہیں یا اللہ خیر ——— یا اللہ خیر ——— انہوں نے فائرنگ سنتے ہی بے ساختہ یہ کہا تھا۔ اب صورت حال یوں ہو گئی کہ میرے ایک طرف کوٹھیاں ہیں اور دوسری طرف چوراہے کا گول چکر ——— میں گاڑی کو سوائے سڑک پر چلانے کے کسی طرف موڑ نہیں سکتا تھا۔ جونہی گاڑی اس گول چکر کے درمیان آئی تو ایک بار پھر وہاں سے دو تین برسٹ مارے گئے۔

میرا خیال ہے کہ اب کی بار جو گولیاں نکلیں میرے والد مرحوم ان گولیوں کا نشانہ بنے میں آگے نکل گیا تو وہ پیچھے سے فائرنگ کرتے رہے۔ وہ جو کہتے ہیں کہ قدرت کے ہر کام میں کوئی نہ کوئی مصلحت ہوتی ہے تو یہاں بھی کچھ ایسا ہی ہوا میری گاڑی کی پچھلی بتیاں بجھ جانے کے باعث پیچھے سے حملہ آوروں کو میری گاڑی صحیح طور پر نظر نہ آسکی اور سٹریٹ لائٹ تو خود انہوں نے اپنی سہولت کے تحت بند کر رکھی تھی ——— کچھ گاڑی کی رفتار تیز تھی اور کچھ ان کو دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ لہذا میری گاڑی کے پچھلے حصہ پر کوئی گولی نہیں لگی اور نہ کوئی گولی مجھ تک پہنچ سکی ان کی کوشش تھی کہ پیچھے سے فائرنگ کر کے میری گاڑی کے ٹائر ہی پنکچر کر دیا جائے تاکہ میں بچ نہ سکوں یہ حملہ کس قدر خطرناک تھا اس کا اندازہ یوں لگایا جا سکتا ہے کہ کار کے اس رُخ سے جدھر میں بیٹھا ہوا تھا بعد میں گاڑی کی چادر

کے اندر نکل کر سیٹ کی فوم میں پیوست تین چار گولیاں برآمد ہوئیں۔ یہ گولیاں نہایت نزدیک سے چلائی گئیں تھیں اور پہلے برسٹ کے چلنے کے بعد جن حملہ آوروں نے مجھ پر گول چکر سے فائرنگ کی بس مرحلہ پر بھی ان کے اور میرے درمیان کا فاصلہ تین چار فٹ سے زیادہ نہیں ہوا۔

یہ گولیاں چلانے والے انتہائی مشاق اور ماہر نشانہ باز تھے اس پر مستند رد یہ کہ ایک مجرم غلام حسین انسپکٹر کے عدالتی بیان کے مطابق اسے تقریباً پندرہ سو گولیاں سرکاری اسلحہ خانہ سے محض "مشق" کرنے کے لئے فراہم کی گئی تھیں تاکہ مجھے (تصوری) نشانہ بناتے وقت اس کو سہولت رہے۔

دراصل ہوا یوں کہ جب پہلا برسٹ فائر ہوا تو میری والدہ جلدی سے پیچھے ہٹ گئیں اور میں ایک دم آگے کی طرف جھک گیا۔ اس طرح جو فاصلہ اور خلا پیدا ہوا۔ اس سے گذرنے والی گولیاں میرے والد کی زندگی کا چراغ گُل کرنے میں کامیاب ہو گئیں تھیں۔

میں تیزی سے گاڑی چلاتا ہوا اسے شاہ جمال کالونی میں لایا جہاں سے میں نے اسے موڑا۔ جب میری گاڑی نواب مظفر علی قزلباش کی کوٹھی کے نزدیک پہنچی تو میں نے پیچھے مڑ کر دیکھا کہ کہیں کوئی گاڑی تو میرا پیچھا نہیں کر رہی کیونکہ رات کو پیچھے سے آنے والی گاڑی کی لائٹیں دور سے نظر آجاتی ہیں۔ جب مجھے یہ اطمینان ہو گیا کہ کوئی میرے پیچھے نہیں آرہا تو قدرتی طور پر میں نے ایک گہرا سانس لیا۔ اس لمحہ مجھے یہ جان کر بھی سکون سا ہوا کہ میں نے سب کو بچا لیا ہے کیونکہ اس عرصہ میں گاڑی میں سوار کسی بھی فرد کی کوئی مجھے آواز نہیں سنائی دی تھی ابھی میرا یہ احساس برقرار ہی تھا کہ مجھے یکدم یوں محسوس ہوا جیسے میری پتلون گیلی ہو گئی ہے سردیوں کا موسم تھا لہذا پسینہ آنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ لہذا مجھے شدید حیرت ہوئی۔ اب جو میں نے سیٹ جانچنے کے لئے سیٹ پر ہاتھ رکھا تو میرا سارا ہاتھ خون میں ڈوب گیا۔

کیونکہ میرے ذہن میں جیسے قیامت سی ٹوٹ گئی۔ اور میں نے بے ساختہ آواز دی۔

ابا جان ——— ابا جان ——— ! لیکن کوئی جواب نہ آیا۔

دراصل ہوا یہ تھا کہ جونہی گولیاں میرے والد صاحب کے سر میں پیوست ہوئیں، انہوں

نے اپنا سر میرے کندھوں سے لگا لیا تھا اور میں نے اس سے یہ تاثر لیا کہ شاید وہ پریشان ہو کر نفسیاتی طور پر سہارے کی خاطر میرے کندھے سے ٹیک لگائے ہوئے ہیں۔ مجھے بالکل علم نہیں تھا کہ ظالموں کی ظالم گولیاں انہیں نشانہ بنا چکی ہیں۔

اپنے والد کو یوں خاموش پا کر میرے ضبط کے بندھن ٹوٹ گئے اور میں بالکل بچوں کی طرح بلک بلک کر رونے لگا — لیکن عین اس وقت میری والدہ نے پیچھے سے میرے سر پر شفقت سے ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ بیٹا تمہیں تو اب معلوم ہوا ہے کہ تمہارے والد نشانہ بن گئے ہیں تمہارے والد کا خون میرے پاؤں تک چار پانچ منٹ پہلے آ چکا تھا — میں اس لئے چُپ تھی کہ تم پہلے ہی ذہنی طور پر ڈسٹرب اور جلدی میں ہو — !

وہ ایک دو سکینڈ چپ رہنے کے بعد پھر بولیں — حوصلہ رکھو اور گاڑی یو بی ایچ (یونائٹیڈ کرسچین ہسپتال) لے چلو — ! اس وقت مجھے یوں محسوس ہوا جیسے ساری کائنات خالی ہے اور اس میں صرف میری ماں کی آواز گونج رہی ہے میں نے ان کے حکم کی تعمیل کی اور گاڑی چلاتا رہا۔ جب گاڑی الف سی کالج کے نہر والے پل کے قریب آئی تو میں نے بدحواسی اور افراتفری میں غلط موڑ کاٹ لیا اور یوں گاڑی نہر میں گرتے گرتے بچی — تب میری ماں نے پیچھے سے ایک بار پھر مجھے کہا: "رضا — بیٹے — ہوش کرو۔ حوصلہ کرو — اور ساتھ ہی انہوں نے پیچھے سے میری گردن کا بوسہ لیا" — !

میں قدرے سنبھلا اور پھر بولیں: اللہ کے ہر فیصلہ پر شاکر رہو — مجھے تمہاری ضرورت ہے — اللہ پر بھروسہ رکھو اور ہسپتال چلو — !

مجھے یہ کہنے میں کوئی باک اور تامل نہیں اور ویسے بھی ہر شخص خود محسوس کر سکتا ہے کہ اگر اس مرحلہ اور مقام پر میری والدہ مجھے حوصلہ نہ دیتیں تو یقیناً ہمارے گھر سے ایک کی بجائے — چار جنازے اٹھتے۔

میری والدہ نے ان نازک اور خون رنگ لمحوں میں اُف تک نہیں کی۔ بلکہ وہ خود صبر و تحمل کا کوہ ہمالیہ بن کر کھڑی ہو گئیں۔ اور بلاشبہ ان کی شفقت، اعتماد اور عزم کی

مدد سے ہی گاڑی کو یو۔سی۔ایچ تک لے جانے میں کامیاب ہوا۔

ہسپتال آکر اور والد صاحب کو سٹریچر پر ڈال کر ڈاکٹروں کے سپرد کرنے کے بعد میں نے پہلا فون اپنے گھر کیا۔ اور دوسری طرف سے میرے بھائی شیر علی خان نے فون سنا، میں نے انہیں صرف اتنا ہی کہا کہ "حادثہ ہو گیا ہے، ہم یو۔سی۔ایچ میں ہیں" پھر انہوں نے فوراً باقی بھائیوں اور دوسرے عزیزوں کو اطلاع دی۔

دوسرا فون میں نے ایس ایس پی لاہور اصغر خان عرف ہلاکو خان کو کیا۔ فون پر ہلاکو خان کی آواز بڑی تروتازہ اور مطمئن محسوس ہوتی تھی حالانکہ اس وقت رات کا ایک بج رہا تھا۔ اس کو جب میں نے حادثہ کے بارے میں بتایا تو اس نے کہا "آپ گھبرائے مت میں ابھی آتا ہوں"۔

تیسرا فون میں نے نیورو سرجن کو کیا تاکہ وہ آپریشن تھیٹر والوں کو مناسب ہدایت دے سکیں اور اس کے بعد میں وہاں ہسپتال کے ریسپشن (استقبالیہ) میں بیٹھ گیا۔ تھوڑی دیر یعنی بیس پچیس منٹ کے بعد اچانک پولیس کی گاڑیاں آنی شروع ہو گئیں، جن کی تعداد بڑھتی گئی۔ میں نے جائزہ لیا تو ان میں سے بعض گاڑیوں پر وائرلیس کے "ایریل" بھی نظر آئے یوں دیکھتے ہی دیکھتے تقریباً تین سو پولیس کے جوان آ گئے۔ ایس ایس پی بھی آن پہنچے اور پھر ڈی آئی جی عبدالوکیل، ڈپٹی کمشنر لاہور، پرویز مسعود اور دیگر سول حکام بھی آ گئے۔

ادھر ڈاکٹر بھی آپریشن تھیٹر میں پہنچ گئے تھے۔ میرے والد کا آپریشن شروع ہوا۔ میں نے اسی دوران اپنا دو بوتل خون اپنے والد کے لئے دیا کیونکہ ان کے سر کے زخم سے خون بہہ رہا تھا جیسے عام طور پر ٹونٹی سے پانی بہتا ہے۔ میرے باقی بھائی آن پہنچے تو انہوں نے بھی خون دیا تاکہ میرے والد کی زندگی اور موت کے درمیان انسانی کوششوں کی دیوار کھڑی کرنے والے ڈاکٹر اگر خون کی ضرورت محسوس کریں تو انہیں بلا تاخیر یہ خون فراہم کر دیا جائے۔

ایف آئی آر کیسے درج ہوئی

قانون کے مطابق کسی حادثے یا واردات کی ابتدائی رپورٹ یعنی ایف آئی آر متعلقہ علاقہ کے تھانہ کا ایس ایچ او ہی ریکارڈ کرتا ہے خواہ وہاں اس وقت، آئی جی پولیس بھی کیوں نہ

موجود ہو یہ واردات تھانہ اچھرہ کے علاقہ میں ہوئی تھی اور یہاں کے ایس ایچ او کا نام عبدالحئی نیازی تھا۔ وہ اپنے مخصوص انداز میں ایک پنسل اور چند سادہ کاغذوں کو ایک بورڈ پر سنبھالے آگیا۔ اس وقت فوری طور پر ہسپتال کے اس چھوٹے سے کمرے کو ہی "تھانہ" بنالیا گیا تھا۔ اس تھانیدار نے میرے نزدیک آکر نہایت آہستگی سے دھیمے لہجہ میں کہا: جناب کارروائی کرنا ہے ـــــ آپ بتایئے، آپ کو کس پر شک ہے ـــــ اور خود پنسل سنبھال کر بیٹھ گیا اور میرے جواب کا انتظار کرنے لگا۔

میں نے آہستہ آہستہ بولنا شروع کیا اور وہ چپ چاپ بیٹھا لکھتا رہا۔ مگر جب میں "وجہ عناد" بیان کرنے لگا کہ "میں قومی اسمبلی کا رکن ہوں میں اسمبلی کے اندر اور باہر مسٹر بھٹو کی شدید سیاسی مخالفت کرتا ہوں اور ۳، جون ۱۹۷۳ء کو بھٹو نے قومی اسمبلی کے اندر تقریر کرتے ہوئے میرے بارے میں کہا تھا۔ یہ شخص میرے لئے زہرِ قاتل ہے اور میں اس سے تنگ آچکا ہوں ـــــ بھٹو کے یہ الفاظ اسمبلی کے ریکارڈ پر موجود ہیں۔ لہذا آج کا یہ حملہ جو میرے والد پر ہوا ہے۔ یہ اسی سیاسی رقابت کی ایک کڑی ہے۔

مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ جب میں نے بھٹو کا نام لیا تو سر جھکا کر تیزی سے رپورٹ تحریر کرنے والے تھانیدار نے حیرت سے میری طرف آنکھیں اٹھا کر دیکھا۔ اس کے سکڑے، ماتھے پر سلوٹیں ابھریں اور منہ کھلے کا کھلا رہ گیا ـــــ اسے یہ بھی خیال نہ رہا کہ اس کے ہاتھوں سے پنسل نکل کر فرش پر جاگری ہے ـــــ!

میں نے کہا: "لکھو ـــــ میں اس حادثہ کا ذمہ دار بھٹو کو قرار دیتا ہوں۔"

اس نے گہری آواز میں کہا: جناب ـــــ بھٹو ـــــ!

میں نے محسوس کیا اب اس کے چہرے پر حیرت کی بجائے خوف ابھر آیا تھا۔

"ہاں ـــــ بھٹو ـــــ ذوالفقار علی بھٹو وزیر اعظم ـــــ قائد عوام ـــــ"

میں نے ایک ایک لفظ کو غصہ اور افسوس کے ساتھ چبا چبا کر کہا۔ اس پر تھانیدار بولا: جناب اللہ پر شک کر رہے ہیں۔

میں نے کہا: اللہ ہی پر تو شک کر رہا ہوں۔

اس نے سامنے سے ایک گلاس پانی کا بھر کر مجھے دیا اور بولا : سر آپ پانی لیجئے۔
میں نے پانی پی لیا اور وہ کاغذ پنسل سنبھال کر بیٹھ گیا۔

میں نے پھر وہیں سے لکھوانا شروع کر دیا، جہاں سے سلسلہ ٹوٹا تھا —— میں نے کہا کہ بھٹو۔۔۔ جب میں نے دو تین بار بھٹو کا نام لیا تو تھانیدار سمجھ گیا کہ میں (قصوری) محض جذباتی نہیں بلکہ سنجیدہ ہوں۔ وہ اپنی جگہ سے اٹھا۔ پنسل جیب میں ڈالی اور کاغذ سنبھال کر کمرے سے باہر نکل گیا۔ یقیناً اس نے باہر جا کر اس صورت حال سے اپنے افسران کو مطلع کیا۔ چنانچہ تھوڑی دیر کے بعد ایس ایس پی اصغر خان عرف ہلاکو خان اور ڈی آئی جی عبدالوکیل خان میرے پاس آ گئے۔ اور شاطر پولیس افسروں کی طرح چکنی چپڑی باتیں کرنا شروع کر دیں۔ وہ کہنے لگے :

" قصوری صاحب آپ اندازہ نہیں لگا سکتے کہ اس حادثہ سے ہمیں کتنا دکھ ہوا ہے۔
نواب صاحب تو ہمارے والد کا درجہ رکھتے تھے۔

ان کا یہ رویہ مجھے متاثر نہیں کر سکا۔ کیونکہ میں پولیس والوں کی ذہنیت اور مجبوریوں سے خوب واقف ہوں۔ میں عموماً کہا کرتا ہوں کہ پولیس والے اس قدر موقع شناس، مفاد پرست اور طوطا چشم ہوتے ہیں کہ وہ اپنی ترقی کے لئے اپنے باپ کو بھی یہ کہہ کر ہتھکڑی لگا لیں گے کہ ابا جی ذرا ہتھ اگے کرنا —— تہاڈا کی جانا اے —— میری ترقی ہو جاوے گی تہاڈے پتر دی ترقی —— !! —— میں سمجھتا ہوں کہ کوئی نہیں سمجھ سکتا کہ پولیس والوں کا کون سا بیان یا سلوک حقیقی ہوتا ہے۔

ایس ایس پی اصغر خان عرف ہلاکو خان نے بڑے معنی خیز لہجہ میں کہا : آپ قاتل کو اگر اپنے ماحول میں دیکھنے اور پہچاننے کی کوشش کریں تو آپ کے لئے بھی اور ہمارے لئے بھی —— بہتر ہو گا۔

میں نے کہا " آپ قاتل کی تلاش کے سلسلہ میں مجھے گائیڈ نہ کریں۔ آپ کے آنے سے پہلے میں اس کا جائزہ لے چکا ہوں۔ میں نے اپنے ماحول کا بھی جائزہ لے لیا ہے کیونکہ مجھے احساس تھا کہ آپ کا مشورہ یہی ہو گا۔ مجھے اپنے ماحول میں ایسا کوئی شقی القلب اور سنگدل شخص

دکھائی نہیں دیا۔ کیونکہ میرا ماحول وہ ہے جس پر میرے خاندان نے کئی سو سال حکومت کی ہے اور ساڑھے چار سو سال کے عرصہ میں ہمارے خاندان کے کسی شخص نے کسی کو قتل کیا ہو یا کسی سے وہ قتل ہوا ہو۔ لہذا ہماری کسی سے کوئی دشمنی نہیں۔ صرف بھٹو نے مجھے قومی اسمبلی کے اندر دھمکی آمیز لہجہ میں بات کی کیونکہ میں اس کے غیر جمہوری راستوں میں عوامی رائے عامہ اور ضمیر کی دیوار اٹھا رہا ہوں۔

بہرحال وہ مجھے بدستور سمجھاتے بجھاتے رہے۔ لیکن جب میں بالکل نہ مانا تو سردار وکیل نے اچھا قصوری صاحب —— ہم آپ کی بات مان لیتے ہیں۔ آپ بھی اب ہماری مان لیں —— !

میں نے حیرت سے پوچھا: کیا مطلب ؟

وہ بولے: چلیئے ہم یہ لکھ لیتے ہیں کہ یہ حملہ حکومت کے ایما پر ہوا ہے۔

میں نے جواب دیا: پٹواری سے لے کر گورنر تک اور دھوبی سے لے کر دانشور تک سب حکومت کا لفظ استعمال کرتے ہیں۔ پہلے آج آپ مجھے یہ تو بتا دیں کہ حکومت کیا چیز ہے —— کس مخلوق کا نام ہے یہ —— اور پھر میں نے اپنی بات پر زور دیتے ہوئے کہا: آخر آپ میری بات کیوں نہیں سمجھ رہے کہ میں تو نامزد پرچہ درج کرا رہا ہے۔ اس لئے میں بھٹو کے نام کے ساتھ وزیر اعظم کا لفظ استعمال نہیں کر رہا —— کیونکہ عین ممکن ہے کل کو وہ وزیر اعظم نہ رہے۔

جب انہوں نے اپنی ہر کوشش کر دیکھی تو میری باتوں کا جواب دیئے بغیر وہ کمرے سے باہر چلے گئے۔ میں نے کھڑکی سے دیکھا کہ وہ سیدھے اس پولیس وین پر گئے جہاں ایک پاور فل وائرلیس سیٹ نصب تھا۔ کہا جاتا ہے کہ اس وائرلیس سیٹ سے براہ راست وہ بھٹو سے رابطہ قائم رکھے ہوئے تھے اور اسے لمحہ بہ لمحہ کی رپورٹ دی جا رہی تھی۔ ظاہر ہے کہ وہ ضروری ہدایات بھی دے رہا ہوگا اور اس رات بھٹو ملتان میں وائٹ ہاؤس میں نواب صادق حسین قریشی کا مہمان تھا۔ یہ وہی صادق حسین قریشی ہے جس نے قادر پور راں پر قاتلانہ حملہ کر دیا تو میں بھٹو کی جان بچانے کے لئے سینہ تان کر آگے آ گیا تھا۔ اور اب وہی بھٹو اسی صادق قریشی

کے گھر پر "مخصوص محفل" کے مزے لوٹ رہا تھا اور میں اپنے اوپر ہونے والے قاتلانہ حملہ اور اپنے والد کی موت کا پرچہ درج کرانے کے لئے وضاحتیں کر رہا تھا۔

اس عرصہ میں میرے کئی رشتہ دار جن میں سول و فوجی افسران شامل تھے ہسپتال پہنچ گئے سردار وکیل ایک بار پھر آئے اور میرے رشتہ داروں سے فرداً فرداً باتیں کیں۔ خلاصہ یہی تھا کہ آپ قصوری صاحب کو سمجھائیں یہ وزیر اعظم بھٹو کا نام الف آئی آر میں درج کرا رہے ہیں ——— !

میرے چند عزیز رشتہ دار ان کی باتوں سے متاثر ہو کر یا یوں کہہ لیں کہ اخلاق اور مروت کے مارے (رسماً) میرے پاس آئے اور مجھے سمجھانے کی کوشش کی، مگر جب وہ اصرار کرتے رہے تو میں نے پوری سنجیدگی اور قدرے سرد مہری سے کہا: جناب میں آپ کا شکر گذار ہوں کہ آپ اس قیامت کی گھڑی میں میرے پاس آئے۔ اس وقت میں اگر محض رضا قصوری بن کر پرچہ درج کراتا تو یقیناً میں آپ کی بات مان لیتا مگر مجھے اپنے ہوش و حواس پر پورا اعتماد ہے اور میں رضا قصوری کے ساتھ وکیل ہونے کی حیثیت سے بھی پرچہ کے رموز کو سمجھتا ہوں۔ لہٰذا میں جو کچھ کر رہا ہوں خوب سوچ سمجھ کر کر رہا ہوں ——— اگر آپ محسوس کرتے ہیں کہ ان حالات میں آپ کے لئے یہاں ٹھہرنا مشکل ہے تو آپ بڑے شوق سے گھر جا کر آرام کیجئے ——— آپ نے جو زحمت اٹھائی وہی کافی ہے۔ اور میرے دل میں اس کے لئے بڑی قدر ہے ——— لیکن میں جو کچھ کر رہا ہوں۔ مہربانی کر کے اس میں حائل مت ہوں۔

وہ لوگ واپس سردار وکیل کے پاس گئے اور صاف صاف کہہ دیا کہ وہ (قصوری) اس معاملہ میں بڑا سنجیدہ اور سخت رویہ اختیار کر چکا ہے۔ ہم اس کی طبیعت اور مزاج کو سمجھتے ہیں اس نے تو آرام سے بات کی ہے اگر دوبارہ اس کو کچھ کہا گیا تو وہ کچھ بھی کر سکتا ہے ——— لہٰذا ہم معذرت خواہ ہیں۔

تقریباً آدھ گھنٹہ کے بعد پھر سردار وکیل اور ہلاکو خان آئے اور کہا: قصوری صاحب ——— آپ پلیز جلدی کریں، پرچہ درج کرائیں، دیر ہو رہی ہے ———

میں نے کہا: دیر تو آپ کی طرف سے ہو رہی ہے ——— میں نے تو پرچہ لکھا دیا آپ اس کو درج کر لیں۔

سردار وکیل بولا : آپ اس میں ترمیم کر دیں۔
میں نے کہا : ترمیم ——— کیسی ترمیم ؟ چلیں میں کہہ دیتا ہوں کہ قتل ہوا ہی نہیں۔ یہ ترمیم ٹھیک ہے وہ جواب میں کچھ نہیں بولے ——— میں نے دوبارہ کہا : ڈی آئی جی صاحب پرچہ تو وہی ہوگا جو میں درج کراؤں گا ——— ویسے آپ بڑے قابل ہیں ——— اس کو ایکسیڈنٹ بھی ثابت کر سکتے ہیں۔ اس کے بعد چپ کا ایک وقفہ آیا جسے سردار وکیل نے یہ کہہ کر ختم کیا :
چلیں ——— سر ——— آپ یوں کہہ لیں کہ یہ قتل سیاسی وجوہ کی بنیاد پر ہوا !
اور میرا جواب سنے بغیر میری طرف دادِ طلب نظروں سے دیکھتے ہوئے بولا : اب تو آپ خوش ہیں۔
ہلاکو خان نے بھی لقمہ دیا۔ اب تو ہم نے آپ کی ہی بات مان لی ہے۔
میں نے کہا : آپ لوگ مقتول پارٹی سے بات کر رہے ہیں یا انارکلی میں شاپنگ کر رہے ہیں ——— میں حقائق کی بات کرتا ہوں اور آپ سودے بازی کر رہے ہیں ——— سیاسی وجوہ سے آپ کیا مراد لیتے ہیں اس کا تو مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے اور عین ممکن ہے کہ یہی مطلب آگے چل کر یوں لیا جائے کہ میرے والد کو نواب زادہ نصر اللہ یا ولی خان نے یا کسی اور نے قتل کر دیا ہے کیونکہ وہ بھی سیاستدان ہیں ———
میں نامزد پرچہ صرف اور صرف "ذوالفقار علی بھٹو ولد شاہنواز بھٹو سکنہ لاڑکانہ" کے خلاف درج کرا رہا ہوں آپ پرچہ درج کر سکتے ہیں تو کیجیے ، اتنی ہمت نہیں تو نہ کریں ——— میں کل صبح ہائی کورٹ میں جا کر درخواست دے دوں گا۔ اور وہاں اس پرچہ کو درج کرانے کی کوشش کروں گا۔
ابھی ہم یہ باتیں کر رہے تھے کہ سامنے سے ڈاکٹر ——— سر جھکائے آتے دکھائی دیئے۔ ہم ان کی طرف بڑھے۔ انہوں نے مجھے دیکھ کر نہایت افسردہ اور آہستہ لہجہ میں کہا : قصوری صاحب ——— آئی ایم سوری ——— نواب صاحب کی جان نہیں بچائی جا سکی ——— !

ڈاکٹر کی زبان سے یہ لفظ سنتے ہی میرے اوپر جیسے آسمان گر پڑا۔ اپنے جذبات کے آگے اب تک میں نے جو بند باندھ رکھا تھا اس خبر کے ریلے کے آگے تنکے کی طرح بہہ گیا اور میں نے نہایت سخت انداز میں سردار وکیل اور ہلاکو خان کو ڈانٹ دیا۔ میری آواز سن کر ادگرد کھڑے میرے بھائی اور عزیز بھی دوڑے آئے۔ میری آنکھوں میں آنسو امڈ آئے اور میں نے گلا پھاڑ کر کہا: لوگو ——— میرے والد کو بھٹو نے قتل کر دیا ہے ——— میں اس قتل کا انتقام لوں گا ——— بھٹو ——— تم فرعون بن گئے ہو ——— میں تمہارے لئے موسیٰ بن جاؤں گا ———" ظاہر ہے کہ میں اس وقت غصہ اور طیش میں تھا۔ لہٰذا میں نے نتائج کی پرواہ کئے بغیر جذبات کا اظہار کیا ——— میرے بھائی بھی میری کیفیت اور یہ منحوس خبر سن کر اپنے جذبات پہ قابو نہ رکھ سکتے اور عین ممکن تھا کہ ہم بھائی ان دونوں پولیس افسروں کو گریبان سے پکڑ لیتے ——— مگر یہ دونوں (سردار وکیل اور ہلاکو خان) وہاں سے کھسک آئے اور تقریباً بھاگتے ہوئے پولیس کی نفری اور گاڑیوں کے پاس جا کر کھڑے ہو گئے۔

ہم بھائیوں کی آوازوں کے شور نے ہسپتال میں موجود دوسرے لوگوں کی توجہ حاصل کر لی۔ ویسے بھی وہاں پولیس کی نفری کو دیکھ کر لوگوں کو یہ پتہ چل گیا تھا کہ کوئی اہم بات ہے۔ اور بیشتر کو معلوم ہو چکا تھا کہ میرے والد زندگی اور موت کی کشمکش میں ہیں ——— لہٰذا یہ شور سن کر وہ لوگ بھی ادھر بھاگے۔

اس وقت صبح کی پو پھوٹ رہی تھی۔ اس وقت رزق کی تلاش میں نکلنے والے سڑکوں پر آ چکے تھے۔ ہسپتال کے اندر اور سامنے پولیس کی اتنی بڑی جمعیت کو دیکھ کر ویسے ہی لوگ آنا شروع ہو گئے۔ اور یوں مجمع بڑھنے لگا۔ اور میں نے ان لوگوں کے سامنے برملا اور کھلے لفظوں میں کہا: بھٹو میرے والد کا قاتل ہے ——— دیکھ لو ——— لوگو اس نے محبت، اعتماد اور دوستی کا کیا صلہ دیا ——— غریب لوگو ——— گواہ رہنا ——— قائد عوام نے بے گناہ کی جان لی ہے ——— یہ صبح گواہ رہے کہ اس بھٹو سے اپنے باپ کے خون کا بدلہ لوں گا ———

تقریباً آدھ گھنٹہ کے بعد سردار وکیل اور ہلاکو خان ایک بار پھر آئے اور مجھ سے مخاطب

ہو کر بولے : قصوری صاحب ہم آپ کے جذبات کو سمجھتے ہیں آپ کے ساتھ ظلم ہوا ہے۔ ہمیں نواب صاحب کی موت پر دلی صدمہ ہوا ہے ——— آپ کی جگہ اگر ہم ہوتے تو یقیناً ہمارا ردعمل آپ جیسا ہی سخت ہوتا ——— غرض انہوں نے ایک بار پھر ایسی ہی باتیں جن سے ہمدردی اور محبت کا شائبہ ہوتا تھا، شروع کر دیں ——— اور بالآخر انہوں نے مطلب کی بات کی اور کہا : جناب ہم اپنے ہاتھ سے تو ایف آئی آر میں وزیراعظم بھٹو صاحب کا نام نہیں لکھ سکتے۔ البتہ اگر آپ چاہیں تو اپنے ہاتھ سے بیان لکھ کر دے دیں۔

میں نے اس بات سے اتفاق کیا ——— وہاں پر میرا ایک پڑوسی بھی آیا ہوا تھا۔ میں نے اس کو بیان لکھوانا شروع کر دیا، میں بولتا گیا اور وہ لکھتا گیا ——— اسے قانونی اصطلاح میں فرد بیان کہتے ہیں جب یہ تیار ہو گیا تو میں نے اس کی دو نقل تیار کرنے کو کہا۔ جو جلدی ہی تیار ہو گئیں۔ ان دو نقول میں سے ایک میں نے ایس ایس پی (ہلاکو خان) کو دے دی اور دوسری پر اس سے وصول پانے کے دستخط لے لئے۔ اور اسے اپنے پاس محفوظ رکھا۔ اسی دستاویز کی بنیاد پر سیل شدہ ایف آئی آر کو دوبارہ کارروائی کے لئے نکالا گیا تھا۔ ایف آئی آر اور اس فرد بیان کی نقل پر مشتمل یہ دستاویز میں نے اپنے ایک انتہائی قریبی اور قابلِ اعتماد عزیز کے سپرد کر دی جو اسے اپنے ہمراہ بیرون ملک لے گیا۔ اور وہاں اس نے ایک بنک لاکر میں لے محفوظ کر دیا۔ مجھے بخوبی احساس تھا کہ "بھٹو صاحب" اس دستاویز کو ہر قیمت پر حاصل یا ضائع کرنے کی کوشش کریں گے لہذا میں نے اپنے عزیز کو سختی سے تاکید بھی کی اور بڑی دردمندی سے درخواست بھی کی کہ ——— وہ اس دستاویز کو میرے سوا کسی دوسرے شخص حتیٰ کہ میرے کسی بھائی کو بھی دستاویز نہ دے۔ یہ دستاویز اسی صورت میں مجھے پاکستان میں دی جائے جب میں خود ذاتی طور پر اس سلسلہ میں ان سے رابطہ کروں۔

یہاں ایک اہم سوال جو مجھ سے بار بار پریس انٹرویوز اور ذاتی ملاقاتوں میں پوچھا جاتا رہا ——— اور اب بھی پوچھا ہے یہ ہے کہ آخر پولیس والے ایف آئی آر درج کرنے پر کیوں تیار ہوئے ؟ میں نے بھی اس معاملہ کو بڑی گہری نظر سے دیکھا ہے۔

میرا تجزیہ یہ ہے کہ پولیس حکام کا ہسپتال کے احاطہ میں موجود پولیس دین پر نصب وائرلیس کے ذریعے بھٹو سے براہ راست رابطہ تھا اور وہ اس منٹ منٹ کی رپورٹ آنکھوں دیکھا حال کے انداز میں پہنچا رہے تھے۔ لہٰذا جب بھٹو کو بتایا کہ نواب صاحب نے زندگی کی بازی ہار دی ـــــ اور قصوری اور اس کے بھائی شدید ردعمل کر رہے ہیں۔ وہ لوگوں کے سامنے برملا آپ کا نام لے رہے ہیں اور لوگ جمع ہونا شروع ہو گئے ہیں ـــــ تو بھٹو نے فوری طور پر پیدا ہونے والی صورت حال کو ٹالنے اور خود کو اس سے بچانے کے لئے کہہ دیا ہوگا "اچھا ایف آئی آر درج کر لو"۔ بھٹو نے سوچا ہوگا کہ آئندہ مقدمہ کب چلے گا ـــــ اس کا نتیجہ کیا ہوگا ـــــ یہ دیکھا جائے گا۔ لیکن اس وقت قصوری کو عوام کی توجہ اور ہمدردی حاصل نہ کرنے دو ـــــ اس کی مرضی کے مطابق پرچہ درج ہو جائے گا تو وہ آرام سے اپنے والد کی لاش لے کر گھر واپس چلا جائے گا۔ لیکن اس کو کیا معلوم تھا کہ قدرت کا اپنا نظام ہے وہ کفر کی حکومت کو تو برداشت کرتی ہے مگر ظلم کی حکومت کو برداشت نہیں کرتی۔ اس نے مکافات عمل کا مظاہرہ یوں کیا کہ خود قاتل سے ایف آئی آر درج کرانے کی اجازت فراہم کرائی ـــــ!!

بہر حال پرچہ درج ہو گیا تو ہم نے والد صاحب کی لاش ایمبولینس میں رکھی اور اسے اپنے گھر لے آئے۔ تقریباً چھ سات بجے کے قریب میرے بھائی میجر علی رضا خان کے ایک دوست جوان دنوں لاہور میں کرنل کی حیثیت سے اہم خدمات انجام دے رہے تھے ـــــ انہوں نے جائے واردات سے ملنے والی چند گولیوں کے خول لا کر ہمیں دے دیئے اور تاکید کی کہ انہیں سنبھال کر رکھ لیجئے ـــــ اس نے ہی پہلی بار انکشاف کیا کہ یہ گولیاں چینی ساخت کی ہیں ـــــ ظاہر ہے کہ چینی ساخت کا اسلحہ کسی عام شہری کے پاس تو نہیں ہو سکتا تھا۔ یہ صرف سرکاری ایجنسی ہی کے تصرف میں ہوتا تھا۔ اس کے بعد جن لوگوں کو قدرے شک وشبہ تھا کہ یہ قتل بھٹو کے سوا کسی اور نے کرایا ہوگا) ان کو بھی یقین ہو گا کہ یہ صرف فخر ایشیا ہو کی کارنامہ ہے۔"

بھٹو کے خلاف پرچہ کیوں؟

دوسرا سوال یہ ہے کہ میں نے بھٹو کے خلاف "نامزد پرچہ" کیوں کرایا اپنے والد کے قتل کے ضمن میں میرے ذہن میں بھٹو کا نام ہی کیوں آیا؟

اس ضمن میں یہی کہوں گا کہ اس وقت تک مجھ پر جتنے بھی قاتلانہ حملے ہوئے میں نے ان کے بارے میں پولیس کو اطلاع دی۔ تھانہ میں پرچے درج کرائے، اسمبلی کو اس سے مطلع کیا یعنی تمام قانونی تقاضے پورے کرتا رہا۔ میں ہر بات کو اسمبلی کے ریکارڈ پر لانے کی کوشش کرتا رہا۔ اسمبلی میں جب میں اس حوالے سے بات کرتا اور تحریک پیش کرتا تو اسے مسترد کر دیا جاتا تھا (حتیٰ کہ میں نے جب اپنے والد کے قتل سے متعلق تحریک اسمبلی میں پیش کی تو اسے بھی ۲ر دسمبر ۷۴ء کو خلاف ضابطہ قرار دے کر مسترد کر دیا گیا) ادھر میں اسمبلی میں اور تھانہ میں مسلسل اطلاع کر رہا تھا لیکن اس کے باوجود میرے اوپر قاتلانہ حملے ہوتے تھے۔ جس کا منطقی نتیجہ یا سبب اس کے سوا کچھ نہیں تھا کہ یقیناً میرے اوپر ہونے والے لگاتار قاتلانہ حملوں کے پیچھے ایک ایسا شخص تھا جس تک قانون کا ہاتھ نہیں پہنچ رہا تھا۔

اس بات کو ایک دوسرے پہلو سے یوں بھی دیکھا جا سکتا ہے کہ جب میں بار بار شور مچا رہا تھا کہ مجھے جان سے مارنے کی کوشش کی جا رہی ہے اور میرا قصور حکومت سے اختلاف رائے ہے۔" تو بالآخر بھٹو نے اس معاملہ کی تفتیش یا کھوج لگانے کے لئے کوئی نوٹس کیوں نہیں لیا۔ اگر دیرینہ تعلقات، باہمی دوستی اور رسم آشنائی کو بھی یکسر نظر انداز کر دیا جاتے تو پھر بھی اسے ان شکایات کی پڑتال کرنا چاہیئے تھی کیونکہ وہ ان وارداتوں کی وجہ سے ہدفِ تنقید بنتا تھا۔ وہ صحیح ملزمان کو گرفتار کر کے کٹہرے میں لاتا اور خود کو سچا ثابت کرتا اور میرے دعوؤں کو باطل ثابت کرتا یا پھر وہ مجھ سے رابطہ کر کے یہ بھی معلوم کر سکتا تھا کہ آخر میں کیوں بار بار اس کو ہی موردِ الزام ٹھہراتا ہوں۔ وہ میرے سامنے نہ سہی اسمبلی اور عوام کے سامنے صفائی پیش کرتا —— جو ایک سیاسی اور جمہوری طریقہ ہے —— لیکن ایسا نہیں ہوا۔ وہ ایسا کر ہی نہیں سکتا تھا۔

اس کے بجائے البتہ یہ ضرور ہوتا کہ کچھ وقفہ کے بعد پھر میں قاتلانہ حملہ کا ہدف بنا لیا جاتا یہ سارا تجزیہ میں نے اس آدھ پون گھنٹہ میں یو سی ایچ کے برآمدے میں انتہائی سوچ و بچار کے بعد اس وقت کیا جب میرے والد اندر آپریشن تھیٹر میں زندگی اور موت کے رحم و کرم پر تھے اور پولیس ابھی نہیں پہنچی تھی۔ میں باہر اکیلا بیٹھا تھا۔ میرے دماغ میں ماضی کا ایک ایک دن یاد آ رہا تھا۔ اور سارے واقعات فلم کی طرح میری سوچ کی سکرین پر چل رہے تھے بالآخر میں اس نتیجہ پر پہنچ گیا کہ یہ صرف اور صرف بھٹو ہے ——— وہی ایسا سنگدل اور بے رحم شخص ہے جو اپنے مفاد کے لئے کسی بھی انتہا کو چھو سکتا ہے۔

جس وقت والد صاحب اللہ کو پیارے ہوئے اس وقت تک اخبارات چھپ چکے تھے لہذا اس روز کے اخبارات میں اس قتل کی خبر شائع نہیں ہوئی۔ لیکن اس کے باوجود اس قتل کی خبر زبانی کلامی جنگل کی آگ کی طرح پورے شہر لاہور میں پھیل گئی بلکہ شام تک یہ گرد و نواح کے شہروں میں بھی پہنچ گئی۔ اور لوگ جوق در جوق میرے گھر جے/۱۳۰ ماڈل ٹاؤن پہنچنے لگے۔

دوسرے شہروں سے عزیز و اقارب کا انتظار تھا لہذا ہم نے میت کو غسل دے کر اور کفن پہنا کر تدفین کے لئے تیار کر کے رکھ دیا۔ اور طے پایا کہ نماز جنازہ ۱۲ تاریخ کو (یعنی اگلے روز) گول باغ (ناصر باغ) میں ادا کی جائے۔ اس روز کے اخبارات میں یہ خبر آ گئی تھی۔

والد صاحب مرحوم کی پہلی نماز جنازہ گھر پر ہی ادا کی گئی اور پھر ان کی میت کو کاروں کے ایک طویل اور پر شکوہ ماتمی جلوس میں گول باغ لایا گیا جہاں ان کی نماز جنازہ ادا کی گئی۔ وہاں پہنچے تو ایک عجیب عالم تھا سارے علاقہ میں پولیس والوں کی بھاری نفری متعین کر دی گئی تھی۔ گول باغ کے ارد گرد پولیس کے جوانوں کی کم از کم پانچ صفیں آگے پیچھے دیوار کی طرح کھڑی تھیں۔ صبح سے ہی راوی کے پل پر پولیس کا مکمل قبضہ تھا تاکہ راولپنڈی، سرگودھا اور فیصل آباد کی طرف سے لوگ داخل نہ ہو سکیں۔ اسی طرح ملتان روڈ کو بلاک کر دیا گیا تھا۔ جبکہ لاہور قصور روڈ کو امر سدھو کے مقام پر بند کر دیا گیا تھا۔ صرف یہی نہیں بلکہ لاہور شہر کے تمام تاریخی دروازوں (بھاٹی، شاہ عالمی، موچی، شیرانوالہ، لوہاری وغیرہ) سمیت اندرون شہر جگہ جگہ پولیس کا زبردست پہرہ لگا دیا گیا تھا۔ اس سلسلہ میں لاہور کے علاوہ باہر

کے شہروں سے بھی پولیس کی بلایا گیا تھا اور حد تو یہ ہے کہ رینجرز کے دستے بھی طلب کر لئے گئے تھے۔ یہ تمام کے تمام ضروری سازوسامان سے لیس تھے اور ان کو آنسو گیس استعمال کرنے کی سہولت بھی میسر تھی۔ اسی طرح پولیس کے گھڑسوار دستے بھی گشت پر متعین کر دیئے گئے تھے۔

ظاہر ہے کہ اتنے بڑے پیمانے پر "حفاظتی" اقدامات کا مقصد سوائے زندہ دلان لاہور کو میرے والد کے جنازے میں شریک ہونے سے روکنے کے سوا کچھ اور نہیں تھا۔ اور یہ انتظامات جس وسیع پیمانے پر دکھائی دیتے تھے اس سے یہ بھی بخوبی ظاہر ہوتا تھا کہ اس کے پیچھے کون سی "ذہین و فطین" شخصیت سرگرم عمل ہے۔ لیکن اس کے باوجود اس روز بھی لاہور کے جیالے اور بہادر شہریوں نے اپنی روایات کے مطابق خطرات کی پروا کئے بغیر حق اور اصول کا ساتھ دیا۔ وہ گول باغ میں پہنچے اور یوں عوام کی ایک بڑی تعداد نے نماز جنازہ میں شرکت کی۔ نماز جنازہ کی امامت کے فرائض علامہ احسان الٰہی ظہیر نے ادا کئے۔ اور اس میں ممتاز سیاسی اکابرین نے جن میں ایئر مارشل اصغر، شورش کاشمیری نمایاں تھے شرکت کی۔ آغا صاحب جیسے شخص نے جو برصغیر کی سیاسی زندگی کا لازمی جزو تھا اس موقع پر ایک دوست کو کہا "میں نے اپنی سیاسی زندگی میں اتنی بڑی تعداد میں پولیس کو ایک جگہ مجتمع پہلے نہیں دیکھا۔ یہ وہ لوگ تھے جو اکا دکا اور پولیس کو چکمہ دے کر وہاں پہنچنے میں کامیاب ہو گئے تھے۔ ورنہ جن پرجوش اور جذباتی شہریوں نے اکٹھے ہو کر گروہوں کی صورت میں یا ویگنوں اور تانگوں کے راستے آنا چاہا ان کو پولیس نے روک لیا۔ کئی مقامات پر عوام اور پولیس کی سخت تکرار اور جھگڑا بھی ہوا مگر پولیس نے صاف کہہ دیا کہ "اوپر سے آڈر ہے کہ لوگوں کو روکو — ہم تو حکم کے بندے ہیں"۔

مجھے بعد میں یہ بتایا گیا کہ بادامی باغ سے کچھ نوجوان جب شیرانوالہ گیٹ تک پہنچے تو پولیس نے روکا۔ یہاں ایک انسپکٹر بھی اس وقت موجود تھا۔ نوجوانوں نے آگے بڑھنے پر اصرار کیا اور پولیس نے اپنی مجبوری ظاہر کر کے انہیں آگے جانے سے روکا۔ اور یہی کہا "ہم تو حکم کے بندے ہیں"۔ اس پر ایک باشعور شہری نے کہا: کاش تم خدا کے بندے بن جاؤ۔

یہ بات سن کر پاس کھڑے انسپکٹر نے کہا: پہلوان جی —— آپ بادشاہ لوگ ہیں۔ کبھی ہماری بھی مجبوری محسوس کی ہے۔ ہم یہ وردی میں کیسے پھنس گئے —— ! اور پھر اس نے بتایا کہ اس (انسپکٹر) کا تعلق قصور سے ہے۔ وہ بچپن میں یتیم ہو گیا تھا۔ مگر محنت مزدوری کرتا رہا اور پڑھتا رہا حتیٰ کہ میٹرک کا داخلہ بھیجنے کے لئے رقم نہ ملی تو نواب صاحب نے یہ رقم بھی دی اور حوصلہ بھی —— میں نواب صاحب کا زندگی بھر کا احسان مند ہوں مگر افسوس آج نوکری کے ہاتھوں مجبور ہو کر ان کے جنازہ میں شریک نہیں ہو سکتا —— !!

یہ تو ایک واقعہ ہے —— ایسے کئی سرکاری اہل کار اور افسر تھے جو نواب صاحب کی حوصلہ افزائی اور شفقت کے باعث زندگی کے سفر میں کامیابی کی منزلیں طے کر گئے تھے مگر وہ بھٹو کے خوف سے نماز جنازہ میں شرکت نہ کر سکے۔ کئی اعلیٰ افسروں کے مجھے ٹیلی فون اور پیغامات ملے۔ جن میں انہوں نے نماز جنازہ میں شریک نہ ہونے پر معذرت کی۔ میں ان کی مجبوریوں سے بخوبی آگاہ تھا۔ لہٰذا جب نماز جنازہ کے بعد میں نے حاضرین کا شکریہ ادا کیا۔ میں نے اپنی مختصر تقریر میں پولیس کے آج کے کردار اور رویہ پر سخت تنقید کی اور کہا کہ میرے اور میرے گھرانے پر جو ظلم بھٹو نے ڈھایا اس کی رپورٹ پولیس درج کرے یا نہ کرے مجھے اس کی پرواہ نہیں لیکن میں آج لاہور اور داتا کو گواہ بنا کر اعلان کرتا ہوں کہ بلیے شاہ کے اس ملنگ نے یہ رپورٹ اس خدائے بزرگ و برتر کی عدالت میں ضرور درج کرا دی ہے جس کے قبضہ میں میری بھٹو اور آپ سب کی جان ہے۔ میں آج اپنے آنسوؤں کے ایک ایک قطرے کے حساب کے لئے آپ کی دعاؤں کو گواہ بناتا ہوں اور اللہ سے انصاف کا طلب گار ہوں۔ جس طرح آج کے دن کے سورج کی ایک حقیقت ہے اسی طرح خدا کا انصاف بھی ایک دن اسی سورج کی طرح حقیقت بن کر آئے گا۔

میری تقریر جاری تھی اور میرے جذبات امڈ امڈ آ رہے تھے کہ یکدم آغا شورش کاشمیری نے مجھے کمر پر تھپکی دے کر کہا: رضا۔ اللہ پر فیصلہ چھوڑ دیا ہے تو صبر بھی کرو، جذبات کو قابو میں رکھو۔ چنانچہ میں نے تقریر ختم کر دی۔

یہاں سے جنازہ قصور کے لئے روانہ ہوا تو تمام بڑی بڑی سڑکوں پر پولیس کا کڑا پہرہ

تھا۔ میرے والد کی میت بردار گاڑی کے آگے پولیس کی گاڑیاں اور موٹر سائیکل دستے چل رہے تھے اور پیچھے دوسری گاڑیاں تھیں۔ ہم نے مال روڈ سے گورنمنٹ ہاؤس کا رخ کیا اور وہاں نہر کے پل کے کنارے کنارے چلتے چلتے فیروزپور روڈ پر آ گئے —— وہاں سے ماڈل ٹاؤن، کاہنہ کاچھ اور للیانی (موجودہ نام مصطفیٰ آباد) ہوتے ہوئے قصور پہنچے۔

مجھے یاد ہے کہ میت کے ساتھ گاڑی ہی میں بیٹھا تھا اور میرے ساتھ ایر مارشل اصغر خان بھی بیٹھے تھے جب جنازہ کا جلوس قصور کی طرف جا رہا تھا تو راستے میں پاک فوج کا ایک دستہ اپنی معمول کی مشقوں کے سلسلہ میں گذر رہا تھا۔ فوجیوں نے جب دیکھا کہ کوئی ماتمی جلوس ایسا آ رہا ہے۔ جس کے ساتھ بے شمار گاڑیاں اور پولیس ہے تو وہ چلتے چلتے رک گئے اور سڑک کے دونوں کناروں پر احتراماً کھڑے ہو گئے۔ اور انہوں نے اپنی بندوقوں کے دستوں پر ہاتھ مار کر اپنے روایتی انداز میں سلوٹ کیا۔ اس پر ایمبولینس میں موجود ہمارے ایک دیرینہ گھریلو ملازم نے یہ منظر دیکھا تو آنسوؤں بھری آواز میں بولا، واہ نواب صاحب زندہ تھے تو اس وقت بھی سلوٹ لیتے تھے، اب زندہ نہیں رہے تو پھر بھی سلوٹ لے رہے ہیں —— موت تو برحق ہے لیکن میں سمجھتا ہوں کہ نواب صاحب کو اللہ تعالیٰ نے موت کے موقع پر بھی ایک عظمت بخشی۔

بہرحال ہم جنازہ کو لے کر قصور پہنچے جہاں سارا شہر سراپا ماتم بنا ہوا تھا۔ میت کو خاندانی حویلی کے اندر رکھا گیا جہاں ہزاروں افراد نے اشکبار آنکھوں سے ان کا آخری دیدار کیا۔ یہاں سے جنازہ کو اٹھایا گیا اور یہ ماتمی جلوس پیدل بابا بلھے شاہ کے مزار کی طرف چلا جہاں نواب صاحب مرحوم کی لحد تیار ہو چکی تھی۔

سارا شہر ایک گہرے ملال اور سوگ میں ڈوبا ہوا تھا۔ سگریٹ پان کا ایک معمولی کھوکھا تک بھی نہیں کھلا دکھائی دیتا تھا۔ البتہ ریلوے اسٹیشن، بس اسٹینڈ اور دیگر اہم مقامات پر پولیس کا کڑا پہرہ لگا دیا گیا تھا۔ اسی طرح چونیاں، کوٹ رادھا کرشن وغیرہ کے تمام راستوں کی ناکہ بندی کر دی گئی تھی تاکہ لوگ باہر سے جنازہ میں شریک نہ ہو سکیں۔ اس کے باوجود ہزاروں افراد جنازہ میں شریک تھے جن کے اصرار پر بابا بلھے شاہ کے مزار پر ایک بار پھر نماز جنازہ ادا

کی گئی جس کے بعد نواب صاحب کو سپردِ خاک کر دیا گیا۔

والد مرحوم کی آستانہ بلھے شاہ میں تدفین کیوں؟

قصور میں ہمارا آبائی قبرستان موجود ہے۔ لیکن اس کے باوجود نواب صاحب کو بابا بلھے شاہ کے آستانہ میں ہی سپردِ خاک کیا گیا۔ عام طور پر لوگ اس بارے میں استفسار کرتے ہیں کہ یہ فیصلہ کرنے کا ایسا سبب کیا تھے۔

جیسا کہ میں پہلے ہی بتا چکا ہوں کہ جس رات ہم پر قاتلانہ حملہ ہوا تو اس رات ہم قوالی سن رہے تھے اور جب ہم رخصت ہونے لگے تو نواب صاحب مرحوم نے ایک بار پھر اسی قوالی کی فرمائش کی تھی جس کا کلام حضرت بابا بلھے شاہ کا تھا۔ اور جسے طفیل حسین قربان حسین قوال نے نہایت ہی اثر انگیز انداز میں پیش کیا تھا حتیٰ کہ میرے والد صاحب پر رقت طاری ہو گئی تھی اور ہم وہاں قوالی ختم ہوتے ہی اٹھ کر چل پڑے جس کے تین یا چار منٹوں بعد یہ حادثہ پیش آگیا۔

میرا اپنا دماغ کہتا تھا کہ انہوں نے ایک بار قوالی سننے کے بعد جب دوبارہ اس کی فرمائش کی تھی تو یہ دراصل ان کی روح کی پکار اور اصرار تھا کہ "میرا پیا گھر آیا" ——— لہٰذا جب ان کی روح اس ملن کا مطالبہ کر رہی تھی تو انہیں حضرت بابا بلھے شاہ صاحب کے احاطہ میں ہی سپردِ خاک کیا جائے تاکہ ان کی روح کو سکون مل سکے۔

جب میں نے یہ فیصلہ کیا تھا تو اس پر انتظامیہ کچھ لیت و لیل سے کام لے رہی تھی انتظامیہ سے اجازت کی ضرورت یوں پیش آئی تھی کہ سارا آستانہ محکمہ اوقاف کی تحویل میں ہے۔ مجھے لاہور میں ہی اطلاع مل گئی تھی کہ انتظامیہ اس سلسلہ میں رخنہ ڈالنے کی کوشش کرے گی لہٰذا میں نے لاہور ہی میں گول باغ کی نمازِ جنازہ کے بعد یہ اعلان کر دیا تھا کہ قصور ہمارا شہر ہے وہاں نواب صاحب کو سپردِ خاک کرنے کے بارے میں ہمیں حکومت سے کسی قسم کی اجازت کی ضرورت نہیں ہو گی ——— بابا بلھے شاہ ہمارا ہے اور ہم اس کے ہیں۔ یہ رشتہ اور ناتہ کوئی نہیں توڑ سکتا۔

میں نے اعلان کیا کہ اگر آج مجھے گولیوں کی بارش میں بھی اپنے والد صاحب کو وہاں دفن کرنا پڑا تو میں اس کے لئے تیار ہوں ——— !

میری یہ باتیں فوراً اوپر تک پہنچا دی گئیں تھیں اور یہ تو سب جانتے تھے کہ میں اس وقت کس قدر جذباتی عروج پر تھا چنانچہ جب ہم قصور پہنچے تو ڈپٹی کمشنر پہلے ہی اجازت نامہ لئے منتظر تھا۔

جن لوگوں نے میرے والد صاحب کو لحد میں اتارا ان میں علامہ احسان الٰہی ظہیر اور ایر مارشل (ریٹائرڈ) اصغر خان پیش پیش تھے۔

میرے والد کی تقریب کے لئے یوں تو تمام سیاسی زعماء اور راہنما میرے گھر تشریف لائے جن میں نواب زادہ نصر اللہ خان، شیر باز مزاری، مولانا مفتی محمود، پروفیسر غفور، مولانا شاہ احمد نورانی، میر علی احمد تالپور، ولی خان وغیرہ شامل ہیں مگر میں یہاں بطور خاص خدائی خدمت گار تحریک کے راہنما اور ممتاز سرخپوش بزرگ سیاست دان خان عبدالغفار خان (باچا خان) کا ذکر کروں گا جو پندرہ سال کے بعد پہلی بار پنجاب آئے تو انہوں نے یہ سفر میرے والد کی تعزیت کے لئے ہی اختیار کیا تھا۔

(۱۸)

۲۸، دسمبر ۷۴ء کو میری والدہ (صاحبزادی میمونہ بانو بیگم) نے لاہور میں کل پاکستان مختار رانا رہائی کمیٹی کے کنونشن کی صدارت کی۔ جس میں ملک بھر سے طلباء، محنت کش، دانشور، وکلاء اور ترقی پسند حلقوں کے نمائندوں نے شرکت کی اور اس میں بڑے موثر اور بھرپور انداز میں مختار رانا کی رہائی کا مطالبہ کیا گیا۔ اس موقع پر ایک قرارداد بھی منظور کی گئی جس میں بھٹو کی وحشیانہ، غیر جمہوری اور عوام دشمن پالیسیوں کی پرزور الفاظ میں مذمت کی گئی تھی۔

اگلے روز ۲۹، دسمبر کو اسی سلسلہ میں ایک جلسہ عام منعقد کیا گیا اس جلسہ عام کا پروگرام

ابتدائی طور پر تو موچی دروازہ تھا اور یہ طے پایا تھا کہ میرے ساتھ چوہدری ظہور الٰہی اور میاں محمود علی قصوری بھی تقاریر کریں گے۔ لیکن ہوا یوں کہ جب وہاں پہنچے تو وہاں اس وقت کے وزیر داخلہ خان عبدالقیوم خان کے جلسہ کے انتظامات جاری تھے دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ ہمارے جلسہ کو دفعہ ۱۴۴ کے تحت غیر قانونی قرار دیا گیا ہے۔ لیکن خان عبدالقیوم خان کو نہ صرف جلسہ کی اجازت ہے۔ بلکہ پی پی کے غنڈے یہ ہدایات لئے ہمہ تن چوکس بیٹھے ہیں کہ ہمارا جلسہ کسی صورت بھی نہ ہونے پائے۔ یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ مقامی پولیس کی ان غنڈوں کو مکمل پشت پناہی حاصل تھی۔

جب میں وہاں پہنچا تو میں نے دیکھا کہ عوام اور ہمارے کارکن پی پی کے غنڈوں اور پولیس کے اہل کاروں کے نرغے میں ہیں۔ پرامن شہریوں کو نہ صرف ڈرایا دھمکایا جارہا ہے بلکہ بعض بے گناہ افراد کو بلاجواز زدوکوب کرکے خوف وہراس کی فضا پیدا کی جارہی ہے۔ میں نے دیکھا کہ کچھ دور چوہدری ظہور الٰہی اور میاں محمود علی قصوری بے بسی کے عالم میں کھڑے ہیں۔

مجھے دیکھتے ہی عوام اور خاص طور پر نوجوانوں نے پُرجوش انداز میں نعرے لگانے شروع کردیئے کیونکہ میری شہرت یہی تھی کہ میں میدان میں ڈٹ جانے والا ہوں۔ سب لوگ میرے اردگرد جمع ہونا شروع ہوگئے اور یوں چند منٹوں کے بعد ایک اچھا خاصا مجمع ہوگیا۔ میں نے فوراً ایک دکان کے چبوترے پر کھڑے ہوکر تقریر کی اور متنبہ کیا گیا کہ اگر ہمیں جلسہ کرنے نہ دیا گیا تو پھر خان عبدالقیوم خان کا جلسہ بھی نہیں ہوگا۔ میں نے انتہائی پُرجوش انداز میں عوام سے کہا کہ وہ آگے بڑھ کر جلسہ گاہ پر قبضہ کرلیں، میرا یہ کہنا تھا کہ سینکڑوں لوگ دیوانہ وار لپکے اور انہوں نے جلسہ گاہ پر قبضہ کرلیا۔ راستے میں انہوں نے پولیس اور پی پی کے غنڈوں کا کرکے رکھ دیا —— نہتے عوام مسلح پولیس سے ٹکرا گئے۔ اور اس کا دماغ ٹھکانے کردیا۔ خود میں نے ایس ایس پی لاہور کی ٹوپی چھین کر گندے نالے میں پھینک دی۔ اور اس کا گریبان پکڑ کر پوری قوت سے ایک جھٹکا دیا۔ یہ منظر دیکھتے ہی عوام یوں جھپٹے جیسے باز اپنے شکار پر —— کیونکہ یہ عوام کی نفسیات ہے کہ وہ اپنے درمیان پولیس کو دیکھ کر جذباتی طور پر مشتعل ہوجاتے ہیں۔

اس موقع پر جبکہ میں پولیس والوں سے نبرد آزما تھا۔ پی پی کے غنڈوں نے مجھ پر حملہ کیا اور میرے نزدیک آ کر کاری وار کرنے کی تاک میں تھے مگر میرے کارکنوں نے مجھے چاروں طرف سے گھیر لیا خود میں نے ایک غنڈے کو دبوچ کر اس کے ہاتھوں سے چاقو چھینا ——— جب غنڈوں نے دیکھا کہ اب وہ گھیرے میں آنے والے ہیں تو انہوں نے راہ فرار اختیار کر لی۔ تاہم میں نے اسی جگہ جلسہ کیا اور تقریر کرتے ہوئے مختار رانا کی رہائی کا مطالبہ کیا۔

(۱۹)

جنوری ۱۹۷۵ء میں تحریک استقلال نے موچی دروازے میں ایک عظیم الشان جلسہ کا اہتمام کیا جس کے لئے کئی دنوں سے لاؤڈ اسپیکروں کے ذریعے شہر بھر میں اعلانات کئے جا رہے تھے۔ اس جلسہ میں ائیر مارشل (ریٹائرڈ) اصغر خان اور میں ہی نمایاں مقرر تھے لاہور کے شہریوں میں میرے لئے غیر معمولی جذبات پیدا ہو چکے تھے۔ کیونکہ وہ جانتے تھے کہ میرے والد کو محض اس لئے گولیوں کا نشانہ بنایا گیا کہ میں اسمبلی کے اندر عوام کے حقوق اور حق کی بات کرتا ہوں۔ یہ ان ہی دنوں کا قصہ ہے کہ جب ہم نے یہ جلسہ منعقد کیا تو اس سلسلہ میں تحریک استقلال کی ہائی کمان میاں محمود علی قصوری کی قیام گاہ پر موجود تھی اور ادھر ہمارا ایک اہم اور معتبر شخص، جو حکیم بابری کے گھر کی چھت پر بیٹھا اوپی کا کام کر رہا تھا۔ ہمیں فون پر براہ راست لمحہ بہ لمحہ رپورٹ دے رہا تھا کہ کس طرح پیپلز پارٹی کے غنڈے مختلف سمتوں سے آ کر جلسہ گاہ میں اپنی پوزیشن سنبھالتے جا رہے ہیں۔

جلسہ گاہ میں صورت حال تحریک کے کارکنوں کے کنٹرول میں تھی اور خاص طور پر لاؤڈ اسپیکروں کی حفاظت کے لئے خصوصی انتظامات کر لئے گئے تھے۔ لیکن اس کے باوجود جب یہ اطلاع ملی کہ پی پی کے غنڈوں میں ایک بڑی تعداد باقاعدہ تیار ہو کر ٹرکوں پر سوار وہاں پہنچ چکی ہے تو تحریک کی اعلیٰ کمان نے ایک ہنگامی اجلاس طلب کیا اور غور و خوض شروع

ہوا کہ اس صورت حال میں کیا اقدام کیا جائے۔

ایئر مارشل (ریٹائرڈ) اصغر خان نے جلد فیصلہ کرنے کے لئے ایک سمت سے باری باری سب کی رائے لینا شروع کر دی۔ تقریباً تمام دوستوں کی رائے یہی تھی کہ ملنے والی اطلاعات کے پیش نظر یہ جلسہ ملتوی کر دیا جائے کیونکہ پی پی کے مسلح کارکن غنڈہ گردی اور تشدد کا بازار گرم کریں گے ـــــــ لیکن جب میری باری آئی تو میں نے کہا: جناب اگر قیادت اتنی آسان ہو کہ پلیٹ میں پڑی مل جائے تو پھر ہر گھر میں لیڈر ہو جاتے۔ قیادت کے لئے تو بڑے جان جوکھوں سے کام لینا پڑتا ہے۔ اور آزمائش سے گزرنا ہوتا ہے۔ ایسے ہی کڑے مرحلے ہوتے ہیں جن کو عبور کر کے لوگ قائد بنتے ہیں۔ اس سے پہلے تحریک استقلال کے دو جلسے محض اس لئے منسوخ ہو چکے ہیں کہ پی پی کے غنڈے مسلح ہو کر وہاں آ گئے اور ہم لوگ محض شرافت اور امن و امان کے خیال سے پیچھے ہٹ گئے ـــــــ لیکن اب اگر جلسہ نہ ہوا تو عوام کا اعتماد ڈول جائے گا اور ہم اپنی ساکھ کو کبھی بحال نہیں کر سکیں گے۔ لہٰذا میری رائے ہے کہ یہ جلسہ ضرور کیا جائے حالانکہ اسی شہر کے خوبصورت علاقے میں میرے والد کو گولیوں سے چھلنی کر کے شہید کر دیا گیا ہے۔

میں نے یہ اپنا موقف انتہائی جذباتی انداز میں پیش کیا جس پر ائیر مارشل اصغر خان مجھے حیرت سے تکنے لگے۔ وہ مذبذب کا شکار تھے، نہ تو وہ مجھے انکار کر سکتے تھے اور نہ ہی صاف کہہ سکتے تھے کہ چلو اٹھو چلتے ہیں ـــــــ کیونکہ پارٹی کے باقی دوستوں نے مختلف رائے دی تھی۔

میں نے ان لوگوں کا انتظار بھی نہ کیا اور تیزی سے باہر نکلا، میری گاڑی وہاں موجود تھی، لیکن میں نے اسے وہیں چھوڑا اور ٹیکسی پر سوار ہو کر سیدھا موچی دروازہ پہنچا۔ مجھے حیرت ہوئی کہ کسی شخص نے میرے ساتھ چلنا تو الگ مجھے گاڑی کی پیشکش بھی نہ کی، کیونکہ انہیں ڈر تھا کہ جس گاڑی میں یہ (قصوری) سوار ہو گا۔ پی پی والے تو اس کا بھرکس نکال دیں گے۔ میرے ہمراہ میرے بھائی میجر علی رضا خان، شیر علی خان اور میرے بھائی کی پلٹن کا ریٹائرڈ حوالدار شیر باز خان بطور گن مین میرے ساتھ تھا ـــــــ میں نے سر پر

سواتی ٹوپی پہن لی۔ آنکھوں پر کالے شیشوں والی عینک جمائی اور ایک گرم چادر کی بکل مار کر گاڑی سے باہر نکلا۔ کیونکہ مجھے معلوم تھا کہ پی پی کے غنڈے میری تاک میں ہوں گے اور مجھے دور ہی سے پہچان لیں گے۔

موچی دروازے جا کر جب میں ٹیکسی سے نکلا تو وہاں ایک گھمسان کا رن پڑ رہا تھا۔ لوگ آپس میں دست و گریباں ہو رہے تھے۔ پی پی کے غنڈے دندناتے پھر رہے تھے اور تحریک کے کارکن ان کا مقابلہ کر رہے تھے مگر ان کی نظریں بار بار اِدھر اُدھر اپنے قائدین کو تلاش کر رہی تھیں اور ان کی پریشانی صاف بتاتی تھی کہ وہ زیادہ دیر تک ان کا مقابلہ جاری نہیں رکھ سکیں گے۔ پھر ایک زیادتی یہ بھی تھی کہ جہاں ہمارے کارکن پی پی کے غنڈوں کو قابو کرتے یا ان کو زیر کرتے تو پولیس ایکدم لاٹھی چارج شروع کر دیتی۔ غرض ایک ایسا ہنگامہ تھا جس کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ سارا علاقہ پتھراؤ، ہنگامہ اور آنسو گیس کی زد میں تھا۔

میں اس ساری صورت حال کا جائزہ لیتا ہوا آہستہ آہستہ سٹیج کے پاس پہنچ گیا۔ بعض کارکنوں نے مجھے سٹیج پر چڑھنے سے روکا تو میں نے گرم چادر کی بکل سے اپنا چہرہ انہیں دکھایا۔ اس سخت اور کڑے وقت میں وہ مجھے اپنے درمیان پا کر بڑے خوش ہوئے اور ان کے حوصلے بڑھ گئے۔ میں پورے سکون سے سٹیج پر چڑھا۔ اس وقت ایک نوجوان مقرر پورے جوش سے تقریر کر رہا تھا مگر مجھے دیکھ کر اس نے اپنی تقریر ادھوری چھوڑی اور ایک دم اعلان کیا: حضرات! پاکستان کے غریبوں، جوانوں، محنت کشوں اور مزدوروں کے دلوں کی دھڑکن احمد رضا قصوری آ چکے ہیں —— اب وہ آپ سے مخاطب ہوتے ہیں۔ اس کے ساتھ ہی اس نے مائیک میرے حوالے کر دیا۔ میں ٹوپی، عینک اور گرم چادر ایک طرف پھینک کر جب سٹیج پر نمودار ہوا اور عوام نے مجھے دیکھا تو ان کا جوش و خروش قابل دید تھا۔ وہ یکدم جذباتی طور پر نعرے بلند کرنے لگے۔ میں نے اس انتشار، افراتفری اور بھگدڑ کے ماحول کو قابو میں کرنے کے لئے ایک نفسیاتی حربہ استعمال کیا اور کہا:

میرے بھائیو، دوستو، بزرگو اور لاہور کے زندہ دل شہریو —— !

ایک بات اچھی طرح یاد رکھیں کہ موت کبھی غلط جگہ نہیں آتی۔ جس نے موچی دروازے میں مرنا ہے اور جتنا چاہے دوڑے، چھپے —— موت اس کو نہیں چھوڑے گی۔ اور جس کی موت موچی دروازے میں نہیں لکھی، گولیاں تو الگ، توپ کے گولے بھی اس کا کچھ بگاڑ نہیں سکتے —— لہٰذا اپنے خدا پر ایمان رکھ کر پورے سکون سے بیٹھ جائیں پی پی کے غنڈے جو کچھ کر رہے ہیں، وہ تو آپ کے سامنے ہے۔ میں آ گیا ہوں اب آپ گھبرائیں نہ۔ اسی شہر لاہور میں انہوں نے مجھے مارنا چاہا مگر خدا نے مجھے بچا لیا کیونکہ ابھی میرا وقت نہیں آیا مگر میرے والد صاحب شہید ہو گئے کیونکہ ان کا بلاوا آ گیا تھا آپ بے فکر رہیں ہم مل کر پی پی کے غنڈوں کا مقابلہ کریں گے —— میں ان کے ہتھکنڈوں سے خوب واقف ہوں —— بس آپ ذرا اتحاد کا ثبوت دیں ——

میری یہ جذباتی اور حقیقت پسندانہ اپیل لوگوں پر اثر کر گئی۔ وہ متحد ہو کر ان غنڈوں سے ٹکرا گئے۔ اور انہوں نے ان غنڈوں کی ایسی درگت بنائی کہ وہ فرار ہونے لگے عوام اتنے جذباتی ہو گئے کہ چند نوجوان پولیس کے اہل کاروں پر بھی پل پڑے —— لیکن میں نے انہیں قانون کو اپنے ہاتھ میں لینے سے باز رہنے کی تلقین کی اور تقریر جاری رکھی۔ میں تقریباً اڑھائی گھنٹہ تک لگاتار تقریر کرتا رہا۔ مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے میرے اندر سے جذبات اور الفاظ کا آتش فشاں پھٹ کر بہہ نکلا ہے۔ میں آج بھی سوچتا ہوں تو حیران رہ جاتا ہوں کہ اس وقت میں نے کیونکہ تیاری کے بغیر اتنی طویل تقریر کر ڈالی۔ بلاشبہ وہ میری زندگی کی سب سے بہترین تقریر تھی۔

اپنی تقریر میں میں نے بھٹو اور اس کے آمرانہ عزائم کو بالکل بے نقاب کر کے رکھ دیا۔ میں نے لوگوں کو دعوتِ فکر دیتے ہوئے بتایا کہ وہ بھٹو کے معصوم چہرے کے پیچھے چھپے ہوئے ایک سفاک، سنگدل اور عوام دشمن وڈیرے کو پہچاننے کی کوشش کریں —— اس پر موچی دروازہ نعروں اور تالیوں سے گونج اٹھا اور دیر تک کانوں پڑی آواز سنائی نہ دی۔ عین اس وقت جب جلسہ ہوا یوں کہنا چاہیے کہ میری تقریر پورے عروج پر تھی میں نے دیکھا کہ تحریک استقلال کی ہائی کمان آہستہ آہستہ دبے پاؤں سٹیج پر چڑھ رہی

تھی ——— میرے بعد تحریک کے دوسرے راہنماؤں کی تقاریر کیں اور یوں یہ جلسہ جو ابتداء میں کسی طور بھی قابو میں نہیں آ رہا تھا پوری طرح کامیاب رہا۔

اس موقع پر بھی پی پی کے چند غنڈوں نے مجھ پر اس وقت حملہ آور ہونے کی کوشش کی تھی جب میں سٹیج پر آ کر لاہور کے جیالوں کو مخاطب ہو رہا تھا۔ دو تین کرائے کے غنڈے میری جانب لپکے مگر ہمارے کارکنوں نے انہیں سٹیج پر چڑھنے سے پہلے ہی دبوچ لیا ———

میں نے سٹیج سے کہا: اگر ہمت ہے تو آؤ مارو ———!

کارکنوں کے ساتھ دھینگا مشتی میں ان میں سے دو کے ہاتھوں سے چاقو گر گئے اور وہ بھاگ نکلے ——— جب وہ جان بچا کر بھاگ رہے تھے تو میں نے ان کو للکارنے کے انداز میں کہا: اپنے بھٹو سے کہنا ابھی لاہور زندہ ہے۔

میرے اس جملہ پر اہل لاہور نے دل کھول کر بھٹو کے خلاف نعرے لگائے۔ شاید یہ پہلا موقع تھا کہ موچی دروازے کی فضاؤں میں "قائد عوام" کے خلاف نعرے بلند ہو رہے تھے۔

آف دی ریکارڈ حملے

ایک روز ایک عجیب واقعہ ہوا۔

میرے والد کے قتل کے مقدمہ کی تفتیش کے دوران ایف آئی اے کے ایک سینئر افسر نے میرے ہاتھ کو چوما۔ جس پر ظاہر ہے کہ مجھے حیرت اور تعجب ہوا۔ میں نے اس کا سبب پوچھا تو اس نے مسکرا کر مگر بڑی سنجیدگی سے کہا: قصوری صاحب۔ میرا ایمان ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو بے شمار مرتبہ موت کے منہ میں جانے سے بچایا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ایک تو وہ آپ پر بے حد مہربان ہے اور دوسرا یہ کہ وہ آپ سے کوئی خاص کام لینا چاہتا ہے ——— پھر اس نے کہا کہ آپ پر ۱۸ یا ۱۹ حملے تو وہ ہیں جن کا آپ کو علم ہے۔ جو رونما ہوئے اور جو ریکارڈ پر موجود ہیں مگر بعض حملے ایسے بھی ہیں جن کا آپ کو علم نہیں مگر جو آپ کے لئے تیار کئے گئے اور اس کا علم مجھے آپ کے والد صاحب کے قتل کی تفتیش

کے دوران ہوا۔

میں نے مزاحاً کہا: ایک آدھ حملہ مجھے بھی بتائیں۔

میرے سوال کے جواب میں اس نے انکشاف کیا کہ ایک بار جبکہ قومی اسمبلی کا اجلاس جاری تھا اور آپ بذریعہ کار چھٹیوں میں لاہور آرہے تھے تو ایک حملہ کی سکیم بنائی گئی۔ جب آپ ایم این اے ہوسٹل میں اپنے کمرے سے تیار ہو کر باہر نکلے تو آپ کی نگرانی اور تعاقب پر مامور ایف ایس ایف کے دستہ کے ایک اہل کار نے وائرلیس پر آگے اطلاع دی۔ کہ قصوری صاحب تیار ہو کر روانہ ہونے والے ہیں۔ ان کی گاڑی کار آرہی ہے لہذا تیار رہو جاؤ ــــــ!

خوش قسمتی سے آپ ذرا لیٹ ہو گئے مگر عین اس وقت وہاں سے اداکار محمد علی اسی رنگ کی گاڑی میں وہاں سے گذرے، ان کا قدوقامت بھی آپ سے ملتا جلتا ہے ــــــ لہذا حملہ آوروں نے بغیر کسی انتظار اور تکلف کے گاڑی کا نشانہ لے کر گولیاں چلا دیں۔ اس حملہ میں اداکار محمد علی کا پرائیویٹ سیکرٹری چل بسا۔ اس کا ڈرائیور شدید زخمی ہوا۔ محمد علی کو معمولی زخم آئے مگر وہ معجزانہ طور پر بچ نکلا۔

اس حملہ کا بڑا چرچا رہا۔ خود اداکار محمد علی نے اس سلسلہ میں بڑا شور مچایا اور اس نے غالباً کسی فلمی ہدایت کار پر اس حملہ کا شک ظاہر کیا تھا ــــــ اخبارات نے بھی اس حملہ کی تفتیش اور کھوج لگانے کے مطالبے کئے یوں جب محسوس کیا جانے لگا کہ رائے عامہ رفتہ رفتہ اس حوالے سے بیدار ہونے لگی ہے اور یہ معاملہ زیادہ سنجیدہ ہوتا جا رہا ہے تو ایک دن عبدالحفیظ پیرزادہ نے اداکار محمد علی سے خفیہ طور پر ملاقات کی اور اسے ہدایت کی کہ وہ حملہ آوروں کی گرفتاری کا مطالبہ کرنا بند کر دے۔ پیرزادہ نے سہمے ہوئے اداکار محمد علی کو پوری سنجیدگی سے یقین دہانی کرائی کہ یہ حملہ تم پر نہیں ہوا۔ بلکہ تم پر کسی اور کا مغالطہ ہوا تمہیں کسی نے کیوں قتل کرنا ہے ــــــ جو کچھ ہوا وہ اچانک ہوا ــــــ لہذا اب یہ ہر روز کی پریس کانفرنس، بیان بازی اور پبلسٹی کا سلسلہ فوراً ختم کرو۔

یہ واقعہ سنا کر وہ افسر بولا: جناب آپ کہاں رہ گئے جو بے چارہ اداکار محمد علی پھنس

گیا۔ میں نے کہا: اس اٹل ایمان کے باوجود کہ نئی زندگی اور موت خدا کے ہاتھ میں ہے، میں ہمیشہ احتیاطی تدابیر اختیار کیا کرتا تھا۔ عوام کو اب معلوم ہوا ہے کہ میں بھٹو صاحب کا "نشان زدہ" آدمی اور ٹارگٹ تھا۔ لیکن مجھے تو شروع دن سے ہی احساس تھا ——— لہٰذا میں گاڑی پر چلتا تو ہمیشہ یہ خیال رکھتا کہ کوئی گاڑی میرا تعاقب تو نہیں کر رہی۔ کیونکہ تعاقب کرنے والی گاڑی ہمیشہ پیچھے پیچھے رہتی ہے، آگے نہیں ہوا کرتی ——— اس کے علاوہ میں اپنے پروگرام میں تبدیلی کر کے اچانک راستے میں کسی جگہ کچھ دیر رک جایا کرتا تھا تاکہ میرے راستے میں اگر کوئی جال بچھا ہوا ہے تو وقت میں کمی بیشی کر کے اسے غیر مؤثر بنا دوں۔ اس وقت میں ایم این اے ہاسٹل سے نکل کر کسی دوست کے پاس چلا گیا تھا اور وہاں تقریباً گھنٹہ بھر بیٹھا رہا ——— اسی اثناء میں محمد علی صاحب ادھر جا نکلے ہوں گے ———

اس افسر نے ایک اور حملہ کا ذکر کیا۔ اس نے بتایا کہ ایف ایس ایف کے انسپکٹر غلام حسین کو میرے قتل کی ذمہ داری سونپی گئی۔ غلام حسین کو بخوبی معلوم تھا کہ میں عموماً مسائل یا مشکلات لے کر آنے والے لوگوں کی حتی الوسع مدد کیا کرتا تھا (میرے والد کی مجھے نصیحت تھی) غلام حسین نے مجھے فون پر اپنا جعلی نام بتایا اور ملاقات کی خواہش ظاہر کی۔ اس نے کہا کہ وہ ایک سرکاری اہل کار ہے اور سخت مشکلات کا شکار ہے۔ اس سلسلہ میں اسے میری (قصوری) مدد درکار ہے ——— میں نے حسب عادت اس کو اگلے روز (جمعہ) ایم این اے ہاسٹل آنے کا وقت دیا اور وعدہ کیا کہ اس کی ہر ممکن مدد کروں گا۔

بقول غلام حسین کے میں (قصوری) اپنے کمرے سے نکل کر حسب وعدہ وقت مقررہ پر کار پارکنگ پر پہنچا۔ اور ادھر میں (غلام حسین) نے اپنی چادر کے اندر چھپائی ہوئی چینی ساخت کی خودکار شین گن کھینچ کر اپنے کاندھے سے لگائی اور قصوری صاحب کا نشانہ لے لیا۔ دن کی روشنی پوری طرح پھیلی ہوئی تھی۔ اور قصوری صاحب بڑے سکون سے کھڑے ادھر ادھر دیکھ رہے تھے یقیناً وہ اپنے سائل یعنی مجھے تلاش کر رہے ہوں گے۔ اس وقت قصوری صاحب میرے نشانے کی زد میں بالکل اسی طرح تھے جیسے ایک

بیٹھی ہوئی مرغابی۔ جبکہ میں پوری طرح محفوظ جگہ چھپا ہوا تھا اور مجھے سوائے میرے خدا کے کوئی اور نہیں دیکھ رہا تھا۔ میں نے جب شست باندھ کر ایک نظر قصوری صاحب کو بغور دیکھا تو مجھے ان کی جوانی نے متاثر کیا، وہ دراز قد اور ہینڈسم و سمارٹ نوجوان تھے۔ اس وقت میری انگشت شہادت کی ذراسی حرکت ان کی زندگی کو موت سے ہمکنار کرسکتی تھی یا کم از کم زندگی کے امکانات کو معدوم کرسکتی تھی ——— اچانک میرے ضمیر کی آواز آئی۔

غلام حسین ——— تم اس وجیہہ اور خوبصورت نوجوان کو قتل کر رہے ہو جس پر خود جوانی کو رشک آتا ہوگا اور یہ وہ شخص ہے جو تمہارے جھوٹے نام کو سچ جان کر محض تمہاری مدد کرنے آگیا ہے ——— اور تمہارا ہی منتظر ہے ——— پھر ابھی تم نے جمعہ کی نماز پڑھی ہے ——— اس پر گولیاں چلا کر کس منہ سے خدا کے حضور سجدہ ریز ہوگے ———

اس ضمیر کی آواز نے مجھے جھنجوڑ کر رکھ دیا ——— بس پل بھر کو خوف خدا نے میری روح پر اپنا سایہ ڈالا اور میں نے ایک گہرا سانس لے کر مشین گن کو کندھے سے نیچے کرلیا۔ یہ مشین گن جو میرے بچوں کے کھلونے جیسی ہوا کرتی تھی اب مجھے کئی من وزنی محسوس ہو رہی تھی میرا جی چاہا ——— میں دوڑ کر یہ مشین گن قصوری صاحب کے قدموں میں رکھ دوں اور ان سے معافی مانگوں گو عین اس وقت وہ پلٹے اور عمارت کے اندر چلے گئے۔

میں سمجھتا ہوں اور یہ میرا اٹل ایمان ہے کہ خداوند کریم نے مجھے ہمیشہ ہی اپنی امان میں رکھا ہے اور یہ اسی رحمت کا صدقہ اور ثمر ہے کہ میں آج بھی بے خوف و خطر سکون کی نیند سوتا ہوں میرا ضمیر مطمئن ہے اور مجھے کوئی پچھتاوا نہیں، میں ہر رات سونے سے پہلے خدا کا شکر ادا کرتا ہوں کہ اس نے مجھے درندہ صفت انسانوں سے ہمیشہ محفوظ رکھا جس خدا نے مجھے جرأت اظہار دی ہے وہ میری اس جرأت کی حفاظت کرنے والا ہے۔

پی پی میں میری واپسی

میری سیاسی زندگی کا ایک انوکھا اور ڈراماتی فیصلہ پیپلز پارٹی میں میری واپسی تھی جو ۶ر اپریل ۱۹۷۶ء کو ہوئی بظاہر لگتا ہے جیسے میں نے پیپلز پارٹی میں شمولیت سے سیاسی طور پر خودکشی کی۔ مگر دراصل یہ ایک سیاسی چال اور حکمت عملی تھی جو ایک عیار خون کے پیاسے اور جمہوری لبادے میں ملبوس آمر کے خلاف اپنائی گئی۔ ذرا چشم تصور سے اس صورت حال کا مشاہدہ کیجیے جو مجھے درپیش تھی۔ میرے والد صاحب بھٹو فسطائیت کی بھینٹ چڑھ چکے تھے اور میں واحد شخص تھا جو اپنے والد کے قتل کے انتقام کی آگ میں جل رہا تھا اور میرے علاوہ کوئی شخص ایسا نہ تھا کہ بھٹو سے نمٹ سکتا۔ اگر بھٹو کسی طرح مجھے بھی ٹھکانے لگانے میں کامیاب ہوجاتا تو اس کا راستہ بالکل صاف ہوجاتا جس طرح نذیر شہید، خواجہ رفیق شہید اور سیاسی کارکنوں کے قتل سے بھٹو نے اپنا دامن بچا لیا تھا۔ اس طرح وہ میرے قتل کے بعد میرے والد کے قتل کے مقدمے اور اس کی سزا سے پیچھا چھڑا سکتا تھا۔ اور اس نے میرے قتل کی ہر ممکن کوشش بھی کی مگر قدرت کسی نہ کسی طور مجھے بچا رہی تھی۔ مگر موت اور میرے درمیان ایک کھیل جو انیس قاتلانہ حملوں کی صورت کھیلا جا رہا تھا اس نے مجھے ایک خطرناک سیاسی داؤ کھیلنے پر آمادہ کر لیا اور وہ یہ تھا کہ میں بھٹو کی آتش غضب کو کسی نہ کسی طور تب تک سرد رکھوں جب

وقت کی طنابیں اس کی بجائے میرے ہاتھ میں ہوں اور پھر جب مجھے موقع ملے میں تاریخ اور عدالت کے کٹہرے میں لا کھڑا کروں۔

سیاسی آتار چڑھاؤ کے تجزیے اور مطالعے سے میں دو نتیجے اخذ کر سکا۔ ایک یہ کہ اگلے تین سال یعنی ۱۹۷۶ء، ۷۷ ۱۹ء اور ۱۹۷۸ء بھٹو کے لیے ایک نئی صورت حال پیدا کر دیں گے۔ اگر بھٹو نے انتخاب کرایا تو ہو سکتا ہے وہ ہار جائے یا ایسی معمولی اکثریت کے ساتھ اقتدار میں آئے کہ اقتدار کی ریت اس کے ہاتھوں سے آہستہ آہستہ پھسلنے لگے اور پھر اس کے خلاف آگے پانچ سالوں میں کوئی تحریک اُٹھے اور وہ اقتدار کی کرسی کی بجائے زوال کی لپیٹ میں ہو اور وہ، وہ وقت ہو گا جب بھٹو اور رضا ایک ساتھ عدالت کے روبرو انصاف طلب ہوں گے۔ بھٹو کے خلاف ایف آئی آر درج کراتے وقت بھی میرے ذہن میں یہی بات تھی کہ بھٹو کے اقتدار میں تو یہ مقدمہ نہیں چل سکے گا مگر میں ابھی سے ایک ایسی بنیاد رکھ دوں گا جس سے آگے چل کر میں اس سے معاملہ کر سکوں گا۔ اس لیے میں نے ایف آئی آر کو ایک قریبی دوست کی مدد سے فوری طور پر بیرون ملک منتقل کر دیا تھا اور تاریخ کی کروٹ کا انتظار کرنے لگا تھا اب بھٹو کے دل میں بھی میں کانٹے کی طرح چبھ رہا تھا۔ بھٹو کا خیال تھا کہ یہ ایف آئی آر انتخابات میں اس کے خلاف استعمال ہو گی جس طرح بھٹو نے ایوب کے خلاف معاہدہ تاشقند استعمال کیا تھا۔ اب بھٹو کے سامنے بھی دو راستے تھے ایک تو یہ کہ وہ میرے ساتھ جنگ جاری رکھتا اور اس جنگ کے نتیجے میں مَیں مارا جاتا یا وہ مجھ سے صلح کر لیتا اور ایف آئی آر اور مجھے اپوزیشن کے ہاتھ میں اپنے خلاف استعمال نہ ہونے دیتا۔ میری موت کی صورت میں ایک خطرہ یہ تھا کہ میرے والد کے قتل کے بعد میرا قتل اس کے لیے زیادہ خطرناک بھی ثابت ہو سکتا تھا لہٰذا اس نے میرے ساتھ صلح کی حکمت عملی اپنائی اب یہ میرے سیاسی تدبر کی آزمائش تھی کہ میں بھٹو سے جنگ

جاری رکھتا یا بھٹو کی اس حکمت عملی کے جواب میں اپنی حکمت عملی وضع کرتا چنانچہ میں نے خود تو بھٹو کی طرف کبھی دوستی یا چاہت کا ہاتھ نہیں بڑھایا مگر جب میں نے دیکھا کہ یہ موقع خود مجھے بھٹو دے رہا ہے تو میں نے اسے ضائع نہ کرنے کا فیصلہ کر لیا اور ہر دم چوکنا اور ہوشیار رہ کر اپنے اور بھٹو کے درمیان سیز فائر کی صورت حال پیدا کر لی۔

دوسرا نتیجہ میں نے یہ اخذ کیا تھا کہ پاکستان کی سیاسی جماعتیں بھٹو سے خوفزدہ ہیں مولانا شاہ احمد نورانی، میاں طفیل محمد، مفتی محمود، ممتاز محمد خان دولتانہ اور دوسرے اکابر سیاست دانوں کے ساتھ بھٹو کی اخلاقی حد سے بھی گری ہوئی حرکات سے سیاسی جماعتوں کی قوت کا اندازہ لگایا جا سکتا تھا۔ سیاسی جماعتیں اس قابل نہ تھیں کہ خود اپنا دفاع کر سکتیں۔ خود یہ تمام سیاسی جماعتیں مل کر بھی بھٹو کے مقابلے میں ۱۹۷۶ء تک کچھ حیثیت نہ رکھتی تھیں۔ جس طرح بھٹو کو ۱۹۷۱ء میں یقین نہ تھا کہ وہ اتنی قوت کے ساتھ اسمبلی میں پہنچ جائے گا اسی طرح سیاسی جماعتوں کو بھی ۱۹۷۶ء میں علم نہ تھا کہ وہ ۱۹۷۷ء کے انتخابات میں بھٹو کا تختہ اُلٹ دیں گی۔ ایسے میں کوئی سیاسی پارٹی میرے لیے قوت کا سامان نہیں بن سکتی تھی۔ مَیں تن تنہا پوری آمریت کے سامنے کھڑا تھا۔ اور یہ جانتا تھا کہ بھٹو کے ساتھ یہ جنگ زیادہ دیر تک تنہا نہ لڑی جا سکے گی، لہٰذا میں اپنے لیے کسی ایسے موقع کی تلاش میں تھا کہ بھٹو اور میرے درمیان ٹھنی ہوئی جنگ تھوڑی دیر کے لیے رُک جائے اور مَیں بھٹو کے منتقمانہ مزاج کی بھینٹ چڑھنے کی بجائے مستقبل کے کسی محفوظ لمحہ کے لیے خود کو بچا رکھوں۔ ایسے میں ہی قدرت نے میرے لیے ایک نادر موقع فراہم کر دیا اور میں پیپلز پارٹی کو فرعون کا محل سمجھ کر اس میں داخل ہو گیا جس میں موسیٰ کی طرح ایک خاص وقت تک تحفظ حاصل کرنا تھا۔ اور انتظار کرنے لگا کہ کب مجھے قدرت موسیٰ کی طرح توانا کرتی ہے کہ میں فرعون وقت کو اس کے لاؤ لشکر سمیت غرق کر سکوں۔

بیگم نصرت بھٹو کا میرے گھر آنا

بھٹو کی پہلی شکست اس کی بیگم نصرت بھٹو کا میرے گھر آنا تھا۔ اگرچہ اس کی چال تو مجھے ٹریپ کرنے کی تھی مگر میں نے اس موقعے کو ہی اپنے لیے ڈھال بنا لینے کا فیصلہ کر لیا اور بیگم بھٹو کی اس پیش کش کو کہ میں پیپلز پارٹی میں آجاؤں تو پیپلز پارٹی مستحکم ہو سکتی ہے۔ اور بھٹو کو ان کے والد کے قتل پر دکھ ہے، ایک ایسی پس و پیش کے بعد قبول کر لیا جس سے یہ تاثر دینا مقصود تھا کہ پارٹی میں واپسی کی خواہش میری نہیں بلکہ ان کی ہے اور میں اسے قبول کر رہا ہوں۔ ۶ جولائی ۱۹۷۶ء کو بیگم بھٹو میرے گھر ۱۳۰ جے بلاک ماڈل لاہور میں آئیں۔ یوں بیگم بھٹو نے میرے اور بھٹو کے درمیان سیز فائر کرا دی اور میرے پیپلز پارٹی میں آنے سے بھٹو اب ہر طرح مطمئن ہو گئے کہ اب کسی وقت بھی ایف آئی آر حاصل کی جا سکتی ہے بھٹو نے بھی اطمینان کا سانس لیا کہ اس نے ایک دشمن کو زیر کر لیا ہے اور میں نے بھی فیصد وقت کے ہاتھوں میں دے دیا۔

ہو سکتا ہے کچھ لوگ میری پیپلز پارٹی میں شمولیت کو میری کمزوری اور بزدلی پر محمول کریں مگر جو لوگ تاریخ کا وسیع ادراک رکھتے ہیں وہ سیاست کی جنگی چالوں میں ایسے وقتی فیصلوں کی اہمیت اور اس کے دور رس نتائج کو سمجھ سکتے ہیں کہ بعض اوقات کسی بڑے مقصد کی خاطر وقتی طور پر مصلحت کوشی سے بھی کام لینا پڑتا ہے اس وقت بھٹو سے مصالحت کے فوائد نے ثابت کر دیا کہ میرا فیصلہ درست تھا اور اس وقت بھٹو سے تنہا کھلی جنگ کی ہٹ دھرمی وہ نتائج پیدا نہ کر سکتی تھی جو بھٹو کے زوال کے

بعد میری حکمت عملی کے نتیجے میں مرتب ہوتے۔ میں کسی معذرت خواہانہ روش کو اختیار کیے بغیر تاریخ سے استدلال کروں گا۔

شہنشاہ بابر نے جب دہلی کے تخت و تاج پر قبضہ کرنے کی اپنے من میں ٹھان لی تو یہ خواہش کرنا اس کا بنیادی حق تھا۔ چنانچہ جب وہ اپنے علاقہ فرغانہ سے باہر نکلا کرتا تھا تو راستے میں اس کا ایک سبز بزر رہتا تھا جو اس کا راستہ روک لیتا۔ لوگوں نے کہا: یہ کیا بات ہوئی۔ منزل دہلی اور فرغانہ عبور نہیں کر سکتے۔ تاریخ کے مطابق اس نے شیبانی خان سے صلح کی۔ حتیٰ کہ اس نے اپنی بہن کی شادی اس سے کر دی اور اس کو ساتھ ملا کر اسے یہ احساس دلایا کہ وہ اس (بابر) کی طرف سے بے فکر رہے اور پھر بعد میں اس پر حملہ کر کے اسے زیر کر لیا۔ لیکن تاریخ دان آج بابر کو اس ضمن میں کوئی دوش یا طعنہ نہیں دیتے۔ یوں بھی کسی کو یہ احساس دلانا کہ "میری طرف سے تمہیں کوئی خطرہ نہیں"— یہ دراصل ایک بہت بڑا ہتھیار ہے نہ صرف عسکری نقطۂ نظر سے بلکہ سیاسی اعتبار سے بھی —! اس بات کو بلا تکلف یوں بھی کہا جا سکتا ہے کہ میں بھٹو کو یہی احساس دلانا چاہتا تھا کہ جناب میری طرف سے آپ کو کوئی خطرہ نہیں — اور اس کے ساتھ ساتھ میں ایک ایسے وقت کا انتظار جاری رکھنا چاہتا تھا جو میرے حق میں ہو یا میرے لیے سازگار ہو۔ بلاشبہ میں اس وقت اتنا زیادہ طاقت ور نہیں تھا کہ اکیلا ہی ذوالفقار علی بھٹو سے جا ٹکراتا۔

تاریخ ہمیشہ چھوٹے واقعات کو بھول کر بڑے واقعات کو محفوظ کرتی ہے۔ اب تاریخ میں بابر کا اپنی بہن کو شیبانی خان کے عقد میں دینے کا اتنا چرچا نہیں جتنا اس کے فاتح دہلی ہونے اور برصغیر میں مغلیہ خاندان کے اقتدار کی داغ بیل ڈالنے کا ہے۔

پیپلز پارٹی میں شمولیت کے بعد میں نے پی پی سے اپنی وابستگی کو معتبر بنانے کے لیے الیکشن کے موقع پر باقاعدہ پارٹی ٹکٹ کے لیے رجوع کیا، مجھے اچھی طرح معلوم تھا کہ مجھے ٹکٹ نہیں ملے گا مگر میں نے اس کے باوجود درخواست دی تھی بلکہ جب مجھے ٹکٹ نہ ملا تو میں نے بھٹو کو باقاعدہ خط لکھا جس میں، میں نے واضح طور پر لکھا کہ مجھے ٹکٹ نہ دینے کا آپ کا فیصلہ یقیناً کسی قومی مفاد یا مصلحت کے تحت کیا ہو گا لہٰذا میں نے خود کو مصروف رکھنے کے لیے وکالت شروع کر دی ہے۔

جب بھی آپ یہ خیال کریں کہ پارٹی کو میری خدمات کی ضرورت ہے، آپ بلا تکلف اور بلا تاخیر مجھے مطلع کر دیں، میں فوراً آپ کی ہدایت پر حاضر ہو جاؤں گا۔"

گویا میں نے بھٹو کو یہ احساس نہیں ہونے دیا کہ مجھے ٹکٹ نہیں ملا تو میں اب مخالفت کروں گا یا میں اس فیصلہ سے ناراض ہوں۔ کیونکہ میں تو مسلسل بھٹو کو اس احساس میں مبتلا کرنا چاہتا تھا کہ میری (قصوری) طرف سے ان (بھٹو) کو کوئی خطرہ نہیں۔ حتیٰ کہ جب بھٹو کے خلاف قومی اتحاد کی تحریک شروع ہوئی تو قومی اتحاد کے تمام بڑے بڑے لیڈر میرے پاس آئے اور مجھے اپنے ساتھ چلنے کی دعوت دی۔ ان کا خیال تھا کہ جب میں اپنے والد کے خون آلود کپڑے لے کر جلسہ عام میں نکلوں گا تو اس سے عوام کا جوش و خروش انتہا کو چھولے گا۔ لیکن میں اس کیلئے تیار نہیں ہوا کیونکہ مجھے بخوبی احساس تھا کہ بھٹو ان میں سے کسی سے نہیں ڈرتا وہ ان کو کچھ نہیں کہے گا، جاتے جاتے بھی اس نے اگر کسی کو اپنا نشانہ بنایا تو وہ میں ہی ہوں گا۔

بھٹو نے مجھے حکم دینا چاہا

یہ ۷ر جنوری ۱۹۷۷ء کی بات ہے۔

اس روز اسمبلی کے دو اجلاس تھے۔ ایک صبح اور ایک شام کے وقت۔ یہ تو سب کو معلوم تھا کہ موجودہ اجلاس اختتام پذیر ہونے والا ہے لیکن کسی کے وہم و گمان میں یہ بات نہیں تھی آج ہی اسمبلی بھی ختم ہو جائے گی۔ صبح کے اجلاس میں بھٹو بذاتِ خود اجلاس میں موجود تھے۔

لیکن جب یہ اجلاس ختم ہوا تو وہ بدستور اپنے چیمبر میں بیٹھے رہے اور وہاں ارکانِ اسمبلی وغیرہ سے ملاقاتوں کا سلسلہ جاری رکھا۔

میں نے یہ صورت حال دیکھی تو محض دلچسپی اور باخبر ہونے کے لیے میں بھی ایم این اے ہاسٹل جانے کی بجائے وہیں رک گیا۔ میرا معمول تھا کہ اس قسم کے وقفہ یا فرصت میں، میں کوئی نہ کوئی کتاب پڑھتا رہتا تھا یا ضروری نوٹس لکھنے میں مصروف ہو جاتا۔ میں بیٹھا ایک کتاب کی یونہی سرسری طور پر ورق گردانی کر رہا تھا کہ اچانک وزیر اعظم کا اے ڈی سی میرے پاس آیا اور

بولا،

سر آپ کو پرائم منسٹر صاحب نے یاد کیا ہے۔

میں نے سر کے اشارہ سے ہاں کر دی اور وہ میری کسی دوسری بات کو سنے یا اپنی بات کی تفصیل بتائے بغیر جلدی سے واپس چلا گیا۔

میں اس پیغام کو ملنے کے بعد اٹھا۔ کتابیں سنبھال کر رکھیں اور بھٹو کے چیمبر میں چلا گیا۔ میں کمرے میں داخل ہوا تو بھٹو اپنے کمرے میں اکیلا تھا اور اپنی گھومنے والی کرسی پر بیٹھے ادھر ادھر جھومنے میں مصروف تھے۔ یقیناً اس وقت ان کا موڈ بڑا خوشگوار تھا کیونکہ ان کا سگار سُلگ رہا تھا اور جب میں اندر داخل ہوا تو عین اس وقت انہوں نے اس کا ایک گہرا کش کھینچا تھا۔

میں جا کر ان کے سامنے صوفہ پر بیٹھ گیا اور سوالیہ نظروں سے ان کی طرف دیکھا، وہ پہلے ہی مجھے بڑی گہری نظر سے دیکھ رہے تھے، ہم دونوں کی آنکھیں چار ہوئیں تو انہوں نے بھرپور مسکراہٹ میں پوچھا۔

How is life Raza?

میں نے جواب دیا۔

Not too bad. Sir.

پھر انہوں نے میرے گھر والوں کی خیریت دریافت کرنا شروع کر دی۔ میرے سب بھائیوں کے بارے میں فرداً فرداً پوچھا اور میری والدہ کی صحت کے بارے میں بھی سوال کیے —— انہوں نے اس انداز سے مجھے یہ تاثر دینا چاہا جیسے وہ مجھے اپنے بہت زیادہ نزدیک تصور کرتے

ہیں بلکہ مجھے اپنا فیملی ممبر تصور کرتے ہیں۔

کچھ دیر ادھر ادھر کی باتیں ہوتی رہیں۔ بھٹو صاحب نے اپنے بے پناہ حافظ اور یادداشت کا بھرپور استعمال کرتے ہوئے میرے قصور اور لاہور کے بعض کارکنوں اور گھریلو ملازموں تک کے بارے میں پوچھا اور کہا! یار ـــ ان کا کوئی کام ہو تو بتاؤ۔

میں نے جواب میں کہا! سب آپکو یاد کرتے ہیں۔

اس کے بعد انہوں نے ایک فائل میری طرف بڑھا دی اور کہا! LOOK AT IT!

میں نے تجسس اور حیرت کے ملے جلے جذبات سے فائل ان سے پکڑ لی اور واپس بیٹھ کر اسے کھولا تو اس میں تین چار کاغذ تھے۔ سب سے اوپر ایک بیان تھا جو انگریزی میں ٹائپ شدہ تھا۔ میں نے اسے پڑھا۔ یہ دراصل ایک اخباری بیان کا ڈرافٹ تھا جو میری طرف سے جاری کیا جانے والا تھا کیوں کہ بیان کے آخر میں میرا نام تک ٹائپ ہو چکا تھا حتیٰ کہ میرا حلقہ انتخاب تک درج تھا۔ گویا یہ ہر طرح سے مکمل ایک بیان تھا جس میں صرف اور صرف میرے دستخطوں کی کمی تھی۔

اس بیان کی عبارت سے کچھ ایسا مفہوم واضح ہوتا تھا کہ میں (قصوری) جب اپنے والد کے قتل کے بعد یو سی ایچ ہسپتال پہنچا تو تھوڑی ہی دیر میں یہ خبر پورے لاہور شہر میں پھیل گئی، چنانچہ تھوڑی ہی دیر میں سیاسی کارکنوں اور ممتاز سیاسی لیڈروں کی ایک بڑی تعداد میرے پاس وہاں سے ہسپتال آپہنچی۔ ان سیاسی لیڈروں نے وقت کی نزاکت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے میرے جذبات کو بھڑکایا اور مجھے یہ باور کرایا کہ میرے والد کے قتل میں وزیر اعظم ذوالفقار علی بھٹو کا ہاتھ ہے۔ میں (قصوری) ان سیاسی لیڈروں کی باتوں میں آگیا اور کیونکہ اس وقت میں جذبات کے رو میں بہہ چکا تھا لہذا میں نے اس وقت ان سیاسی لیڈروں کے بھڑکانے اور اکسانے پر بھٹو صاحب کا نام ایف آئی آر میں درج کرا دیا۔ اب جب کہ اس واقعہ کو ہوئے ایک معقول وقت گزر چکا تھا اور اس حادثہ کی گرد بیٹھ گئی ہے اور ساری صورت حال درج ہو چکی ہے تو جب میں پیچھے پلٹ کر ماضی کے حالات کو دیکھتا ہوں اور اپنے ذہن پر زور دے کر سارے واقعات کی بازگشت سنتا ہوں تو مجھے احساس ہوتا ہے کہ یہ (وزیر اعظم ذوالفقار علی بھٹو کا نام ایف آئی آر میں درج کرانے والی) بات کسقدر غلط اور غیر مناسب تھی، کیونکہ ایک ایسا شخص جو آکسفورڈ اور برکلے کا تعلیم یافتہ ہو اور ایک راہنما جس نے

سقوط مشرقی پاکستان کے بعد وطن عزیز کو راکھ سے اٹھا کر کہکشاں تک پہنچا دیا اور پھر ایک نیا پاکستان تعمیر کر کے وہاں جمہوریت کو فروغ دیا ہو، اسلامی کانفرنس کا انعقاد کر کے ایک تاریخ ساز کارنامہ انجام دیا ہو وہ اس کا چیئرمین بنا ہو اور جس نے اسلام کی بالا دستی کے لیے ان گنت کاوشیں انجام دی ہوں اور جس نے قانون کی حکمرانی کے لیے جد و جہد کی ہو وہ قتل ایسا مذموم اور قبیح فعل کیسے انجام دے سکتا ہے ۔ لہٰذا اب میں (قصوری)، تاریخ کے ریکارڈ کو درست کرنے کے لیے اس بیان کے ذریعے یہ واضح کرنا چاہتا ہوں کہ میں نے وزیر اعظم ذوالفقار علی بھٹو کا نام غلط فہمی کی بنا پر اور ان سیاسی عناصر کے بھڑکانے پر جو عوام دشمن ہیں ۔ ایف آئی آر میں درج کرایا تھا۔ درحقیقت میرے والد کے قتل کے باب میں وزیر اعظم ذوالفقار علی بھٹو قطعاً ذمہ دار نہیں"۔ میں نے اس سارے بیان کو غور سے پڑھا۔ میں جوں جوں اسے پڑھتا جاتا تھا۔ میرے دل و دماغ پر ایک ایک پل میں کئی کئی قیامتیں گزر رہی تھیں مگر میں نے خود پر بڑی حوصلہ مندی سے قابو پائے رکھا۔ اس دوران بھٹو مسلسل مجھے دیکھتے رہے اور سگار کے مرغولے اڑاتے رہے ۔ میں نے بیان پڑھ لیا تو اپنا نظر کا چشمہ اتار کر اسے اس فائل کے ساتھ ہی آہستہ سے میز پر رکھ دیا۔ اس سے پہلے کہ میں کچھ بولتا؛ بھٹو خود بولے :

How lucky you are? Bhutto is waiting for your autograph

اور پھر۔ ذرا رک کر بولے ۔

Alongwith F.I.R. — !

میں نے چند ساعتوں کے لیے خاموشی اختیار کی۔ اور موزوں لفظوں کو تلاش کرنے کے بعد بھٹو سے مخاطب ہو کر بولا :

مجھے یہ بیان جاری کرنے میں کوئی قباحت نہیں ۔

میرے منہ سے یہ جملہ سنتے ہی بھٹو نے دونوں ہاتھوں سے تالی بجائی اور کہا: WELL DONE انہیں قطعاً خیال نہ رہا کہ سگار کا گل تالیوں کے عمل میں ان کی گود میں جا گرا ہے ۔

میں نے کہا؛ آپ پہلے میری بات سنیئے ۔!

وہ اپنی کرسی سے اٹھتے ہوئے بولے ؛ ہاں، ہاں، بولو ۔ اور فوراً ہی آ کر میرے ساتھ بیٹھ

گئے۔

میں نے کہا: میں سمجھتا ہوں کہ آپ مجھے پارٹی میں واپس اس مقصد کے تحت لائے ہیں کہ میری واپسی سے پارٹی کو تقویت ملے۔

انہوں نے حیرت سے کہا۔ What do you mean by Taqweeat?

میں نے بتایا Strength

اور اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا: مگر جب یہ بیان شائع ہوگا تو عوام سوچیں گے کہ احمد رضا قصوری نے اپنے باپ کے خون اور قتل کے ساتھ سمجھوتہ کر کے سیاسی مفادات حاصل کر لیے ہیں۔ ظاہر ہے کہ اس سے میری شخصیت اور میرے امیج کو بڑا نقصان پہنچے گا اور یوں آپ جس مقصد کیلئے مجھے واپس پارٹی میں لائے ہیں وہ پورا نہیں ہوگا بلکہ میں سمجھتا ہوں کہ مجھے اور پارٹی دونوں کو ہی نقصان پہنچے گا۔

میں نے دیکھا کہ بھٹو نے اپنے سر پر ہاتھ پھیرا اور گہری سوچ میں چلے گئے۔ تب میں نے اپنی بات پھر شروع کر دی: چلیئے اس بات کو بھی چھوڑیئے لوگ کیا کہیں گے! فی الحال اسے ایک طرف رکھ دیجیے۔ لوگوں کا کیا ہے۔ لوگ تو جہاں بھی مل کر بیٹھتے ہیں اور بحث وغیرہ کرتے ہیں یقیناً کسی نہ کسی کو تنقید کا نشانہ بناتے ہیں۔ اس کی کوئی پرواہ نہیں کرتا مگر سیاست دانوں کے بارے میں تو لوگ پان والے کی دکان، تانگوں کے اڈے، رکشا اسٹینڈ، ہوٹلوں اور مسافر خانوں میں باتیں کرتے ہیں۔ پھر جس طرح آپ برادری اور قبیلہ والے ہیں، اسی طرح میں بھی ایک برادری رکھتا ہوں۔ جیسے میرے والد کی ایک بڑی برادری ہے۔ جیسے آپ خوشی اور غم کے موقع پر اپنے خاندان میں جاتے ہیں۔ اسی طرح میں بھی اپنی برادری میں جاتا ہوں۔ اور پھر خاندان میں تو سب لوگ یکساں ہوتے ہیں وہاں کوئی پرائم منسٹر کوئی ایم این اے، کوئی کرنیل اور کوئی ایکسپرٹ نہیں ہوتا۔ سب لوگ برابر ہوتے ہیں۔ بلکہ وہاں تو خونی رشتے ہی اصل تعارف اور حوالہ تسلیم کئے جاتے ہیں اور سب لوگ آپس میں بلا جھجک بات کرتے ہیں۔ لہٰذا جب میں برادری میں جاؤں گا تو یقیناً ہر شخص مجھ سے یہ سوال کرے گا کہ یہ تم نے کیا کیا؟ ــ تو آپ ہی بتایئے کہ میں ان کا کیا جواب دوں گا، میں اکیلا ان کو کیسے قائل کروں گا اور پھر میں ان کو کیا منہ دکھاؤں گا۔

میری یہ باتیں سنتے سنتے ہی بھٹو کے چہرے پر ایکدم آئی ہوئی، شگفتگی اور زندہ دلی ماند سی پڑ گئی۔ انہوں نے اپنی ایک ٹانگ اٹھا کر دوسری پر رکھی اور پھر اوپر والی ٹانگ کے پاؤں کو اضطرابی کیفیت میں تیزی سے حرکت دینے لگے۔ وہ کوئی کچی گولیاں نہیں کھیلے تھے، پھر وہ میرے مزاج اور عادت کو جانتے تھے۔ میری سنجیدہ گفتگو اور طرزِ استدلال سے وہ جان گئے کہ میں ان کو ٹال رہا ہوں۔ لہذا جب میں نے بات مکمل کی تو انہوں نے میری طرف دیکھنے کی بجائے چھت کو گھورنا شروع کر دیا۔ ایک بار انہوں نے اپنے ایک ہاتھ کی انگلیاں پھیلا کر بھینچ لیں اور پھر اس مُکّہ کو صوفے پر مارا۔ اور پھر ایک گہری ٹھنڈی آہ بھر کر بولے۔

OK Raza, But where is F.I.R.?

میں نے سنجیدگی سے کہا: جناب۔ اس کا کیا علم ہے۔ وہ تو تھانے کے ریکارڈ میں ہوگی۔ اور اس وقت مجھے ایف آئی آر کا کہاں ہوش تھا۔ میں تو اپنے والد کے لیے خون دیتا اور اکٹھا کرتا پھر رہا تھا، اور اگر میرے پاس اس کی نقل بھی ہوتی تو میں آپ کو ضرور دے دیتا۔ میں نے اس ایف آئی آر کا کیا کرنا ہے؟ —

یہ سن کر انہوں نے مجھے غور سے دیکھا۔

میرے چہرے کی سنجیدگی، خاموشی اور سادگی سے نجانے انہوں نے کیا مفہوم اخذ کیا ہوگا۔ بہرحال انہوں نے کہا

Well Raza then see you later.

میں نے میز پر پڑی عینک اٹھائی اور جیب میں ڈال لی۔ پھر اٹھا اور بھٹو صاحب سے اجازت چاہی۔ انہوں نے بیٹھے بیٹھے آہستہ سے کہا: Bye

ان کی آواز کے بعد کمرے میں خاموشی کی ایک دبیز اور گہری لہر پھیل گئی۔ بھٹو صاحب اکیلے رہ گئے تھے۔!!

حقیقی اسباب کا جائزہ

میرے خیال میں عملی سیاست میں دو ہی چیزیں ہیں۔ ایک تو سٹریٹجی یعنی حکمت عملی اور دوسرا

اصول و قوانین جو شخص تو اصولوں پر سمجھوتہ کرے اسے تو اصول فروش کہا جا سکتا ہے یا اسے مفاد پرست کا نام دیا جا سکتا ہے۔ لیکن اگر حکمت عملی پر سمجھوتہ کیا جائے تو یہ اس کا اتنا ہی حق ہے جتنا کہ میدان جنگ میں کسی فوجی جرنیل کا۔! اس کی مثال یوں دی جا سکتی ہے کہ اگر کوئی فوجی جرنیل شب خون مار کر فتح حاصل کرے تو شکست خوردہ یا مفتوح جرنیل یہ نہیں کہہ سکتا کہ "رات کے اندھیرے میں بغیر بتائے حملہ کرنا دلیری نہیں۔"

میری سٹرٹیجی یا حکمت عملی یہی تھی کہ میں خود کو بچاؤں اور اپنا تحفظ کروں۔ کیونکہ اگر میں بھٹو کی سازش اور عتاب کا آخر کار نشانہ بن گیا تو کسی نے میری قبر پر مینار تعمیر نہیں کرنا۔ اپنے والد کے سائے سے میں پہلے ہی محروم کر دیا گیا ہوں، اب باقی خاندان بھی زیر عتاب ہے اور پھر ستم بالائے ستم یہ کہ کوئی پارٹی، کوئی گروہ، کوئی جماعت یا طبقہ نے آگے بڑھ کر میری پشت پناہی یا دستِ تعاون نہیں بڑھایا۔ ان تمام امور پر غور و فکر کرنے کے بعد میں نے جب دیکھا کہ بھٹو نے خود اپنی بیوی کو صلح کے لیے میرے گھر بھیجا ہے تو میں نے اس موقع پر مناسب سمجھا اور دوبارہ پیپلز پارٹی میں شمولیت اختیار کر لی۔

عالمی ججوں کی موجودگی میں ضمانت

یہ ۱۲ جنوری ۱۹۷۵ء کا ذکر ہے۔

لاہور میں ان دنوں انٹرنیشنل جیورٹس کانفرنس (واپڈا آڈیٹوریم میں) منعقد ہوئی۔ اس سلسلہ میں خوب رونق لگی ہوئی تھی۔ دنیا بھر سے ماہرین قانون اور ممتاز وکلاء حضرات جمع تھے اور مجھ ایسے شخص کے لیے اس میں بڑی دل چسپی تھی۔ لیکن اچانک ایک صبح میرے گھر کو پولیس والوں نے گھیرے میں لے لیا۔ منہ اندھیرے ہی تقریباً اڑھائی سو کے لگ بھگ پولیس کے باوردی سپاہی میرے گھر پہنچ گئے اور آتے ہی فوری طور پر سب سے پہلے انھوں نے ٹیلی فون کے لائن کاٹ دیے۔ ان کی قیادت حبیب لودھی (ایس پی سٹی) اور قاضی صفدر (ڈی ایس پی) کر رہے تھے۔ جب انھوں نے گھر میں داخل ہونے کی کوشش کی تو میرے بھائیوں نے مزاحمت کی اور اس کارروائی کا سبب پوچھا جواب ملا:

قصوری صاحب کو گرفتار کرنا ہے۔

کوئی قصور؟

پتہ نہیں۔

وارنٹ ہے؟

نہیں

کوئی جواز؟

پتہ نہیں۔

کس کا حکم ہے؟

اوپر سے ہے۔

تحریری حکم ہے؟

نہیں

یہ سب کیا ہے؟

ہم مجبور ہیں۔

وارنٹ کے بغیر یہ کیسی گرفتاری ہے؟

ہم کچھ نہیں جانتے۔

کیوں گرفتار کرنا چاہتے ہیں؟

یہ بھی معلوم نہیں۔

یہ صورت حال بھانپ کر میرے بھائیوں نے ان پولیس افسران کے برملا متنبہ کر دیا کر وہ گھر کے اندر داخل ہونے کی کوشش نہ کریں ورنہ اس کے نتائج کے وہ خود ذمہ دار ہوں گے۔ ابھی یہ تکرار جاری تھی کہ میری والدہ نے نہایت جرأت اور حوصلہ کا مظاہرہ کرتے ہوئے گھر سے جا کر پڑوس سے اس وقت کے جسٹس سردار اقبال کو فون کیا جو جیورسٹس کانفرنس کے انعقاد کے سلسلہ میں نمایاں کردار ادا کر رہے تھے۔ میری والدہ نے انہیں فون پر تمام صورت حال سے آگاہ کیا اور پوچھا کیا یہی قانون ہے کہ میرے گھر پر پولیس غیر قانونی طور پر دستک دے رہی ہے اور وہ ہٹ دھرمی کے ساتھ اندر داخل ہو کر بغیر کسی وارنٹ یا جواز

کے میرے بیٹے قصوری کو گرفتار کرنا چاہتی ہے ۔۔۔۔ بلکہ انہوں نے تو جذبات کی رو میں بہہ کر یہاں تک کہہ دیا

"اگر آپ نے کوئی کارروائی نہ کی تو میں یہ سمجھوں گی کہ یہ انٹرنیشنل کانفرنس محض دنیا کی آنکھوں میں دھول جھونکنے کے مترادف ہے۔"

سردار صاحب نے بڑے تحمل اور سکون سے ان کی بات سنی اور فوری کارروائی کا یقین دلا کر فون بند کر دیا۔

تھوڑی ہی دیر کے بعد عین اس وقت کہ جب پولیس افسران میرے بھائیوں کے ساتھ تکرار اور بحث میں مصروف تھے لاہور کے (اس وقت کے) ایڈیشنل سیشن جج جناب خضر حیات بیلف کی حیثیت سے آ گئے اور مجھے ہمراہ لے کر سردار صاحب کے پاس واپڈا آڈیٹوریم پہنچے جہاں سردار صاحب کانفرنس کی کارروائی کے سلسلہ میں مصروف تھے۔

سردار صاحب نے میری والدہ کی فون پر کی گئی شکایت کو ہی قانونی درخواست تصور کرتے ہوئے میری موجودہ اور آئندہ تمام مقدمات کی ضمانت منظور کر لی اور ساتھ ہی مجھے دعوت دی کہ اگر میں چاہوں تو کانفرنس کی کارروائی میں شریک ہو جاؤں۔ انہوں نے اس فیصلہ سے کانفرنس کو بھی آگاہ کیا کہ ایک ایم این اے کی کس طرح ضمانت قبول کی گئی ہے۔

اس واقعہ کی تاریخی اہمیت یہ ہے کہ ٹیلی فون پر کی گئی شکایت کو قانونی درخواست کے طور پر قبول کرنے کا یہ واقعہ برصغیر کی تاریخ کا پہلا واقعہ تھا۔ اس سے پہلے ایسی کوئی مثال موجود نہیں کہ سائل نے فون پر عدالت سے شکایت کی ہو اور عدالت نے اس زبانی شکایت پر فوری طور پر کارروائی کر ڈالی ہو۔

غیر ملکی دورے

۱۶ر مارچ ۱۹۷۴ء کی صبح کو میں ایئر مارشل (ریٹائرڈ) اصغر خان اور پروفیسر اشتیاق حسین قریشی (مرحوم) کراچی سے بذریعہ جنیوا انگلستان کے لیے روانہ ہوئے۔ ہمیں انگلستان میں مقیم پاکستانیوں نے مدعو کیا تھا۔ ان لوگوں کا اصرار تھا کہ ہم ان کو پاکستان کے اندرونی امور اور حالات کے بارے میں آگاہ کریں۔ وہ خاص طور پر ہم سے پاکستان کے اندرونی سیاسی حالات کے بارے میں جاننا اور سننا چاہتے تھے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب بلوچستان میں فوج کی کارروائی جاری تھی۔ اور بیرونِ ملک اس بارے میں خاص چرچا تھا جس سے پاکستانی بجا طور پر تشویش کا شکار تھے۔ ملک کے اندر بھی ایک طرح کی گھٹن اور سیاسی بے چینی پائی جاتی تھی۔

سفر بڑا دلچسپ رہا۔ خاص طور پر پروفیسر اشتیاق کی عالمانہ اور فاضلانہ باتوں نے سفر کا احساس ہی نہ ہونے دیا۔ یوں محسوس ہوا جیسے ہم کسی پارک میں بیٹھے گپ شپ کر رہے ہوں اسی شام ہم جنیوا پہنچ گئے جہاں وطن کی محبت میں تڑپتے ہوئے پاکستانیوں نے ہمارا والہانہ استقبال کیا۔ ان میں ظہور الدین بٹ بیرسٹر، میاں نور اللہ (جو ڈاکٹر نذیر شہید "ایم این اے" کے چھوٹے بھائی تھے) کے نام اب بھی ذہن میں موجود ہیں تھے۔ ہوائی اڈے پر ہی اتفاقاً ہماری ملاقات جنرل یوسف سے ہو گئی جو اس وقت سوئٹزرلینڈ

میں پاکستان کے سفیر تھے۔ ان سے خاصی دلچسپ باتیں ہوتی رہیں مگر جب ان کو معلوم ہوا کہ ہم ایک سیاسی دورے پر ہیں (اور وہ بھی بھٹو حکومت کی مخالفت میں) تو انہوں نے فوراً ہی گفتگو کا رُخ بدلا اور معاً کسی مصروفیت کا بہانہ کر کے ہم سے رخصت ہو گئے اصغر خان نے مجھے کہا:

دیکھا تم نے قصوری؟

کیا؟ میں نے پوچھا

کہنے لگے:

بھٹو کی اس قدر دہشت ہے کہ پاکستان کا سفیر پاکستان کے سیاستدانوں سے باتیں کرنے سے کتراتا ہے۔

میں نے کہا:

یہ تو فوجی جرنیل تھا جو اتنی دیر بھی باتیں کرتا رہا ورنہ عام سرکاری ملازم ہوتا تو ہمیں دیکھتے ہی بھاگ جاتا۔

اگلے روز ۱۷ مارچ ۷۴ء کو ہم جنیوا سے انگلستان کے لیے روانہ ہوئے۔ وہاں کے بین الاقوامی ایرپورٹ پر ہمارا ایسا شاندار استقبال ہوا کہ اس کی مثال ماضی میں نہیں ملتی۔ کئی لوگوں نے بتایا کہ اس سے پہلے کسی سیاستدان کا اس قدر پُرجوش استقبال نہیں ہوا۔ اس استقبال کے لیے دور دراز کے علاقوں سے پاکستانی بسوں اور کاروں پر پہنچے تھے انہوں نے پاکستانی جھنڈے اٹھا رکھے تھے اور جمہوریت کے حق میں نعرے لگا رہے تھے ان کے جذبات قابل دید تھے اور الفاظ میں ان کو بیان کرنا میرے لیے ممکن نہیں۔ اس استقبال کو ترتیب دینے میں جن لوگوں نے نمایاں حصہ لیا تھا ان میں ظہور بٹ (بیرسٹر)، قاضی انیس الدین (بیرسٹر) یونس ‌ ‌ ‌ ‌ ‌ ‌ سکواڈرن لیڈر (ریٹائرڈ) ایس اے رحمان، فدا بٹ، چودھری لطیف، حاجی محمد صادق، چودھری محمد خان (بیرسٹر)، ڈاکٹر خلجی،

محی الدین، میاں نوراللہ، راجہ عنایت، راجہ جمیل، حق نواز خاں، منیر احمد اختر اور میاں ماجد کے نام قابلِ ذکر ہیں۔

ہمیں جلوس کی شکل میں قاضی انیس الدین کے گھر لے جایا گیا جہاں ہمارا قیام تھا۔ اگلے دن ۱۸ مارچ کو کانوے ہال CONVOY HALL لندن میں ہمارا پہلا جلسہ منعقد ہوا، یہ ہال لندن کے عین مرکز میں واقع ہے اور سیاسی سرگرمیوں کے لیے مشہور ہے۔ یہاں ہم نے ایک پُر ہجوم جلسے سے خطاب کیا۔ اس کے بعد ۱۹ مارچ کو ہمیں لنکن ان اولڈ ہال OLD HALL میں مدعو کیا گیا۔ اس جلسہ کا اہتمام مسٹر غضنفر گل نے کیا تھا جو اس وقت وہاں طالب علم تھے (اور ان کا تعلق نواب زادہ فیملی آف گجرات سے ہے)۔ یہ جلسہ اس لحاظ سے بڑا کامیاب تھا کہ اس میں پاکستانی طلباء کی ایک بڑی تعداد نے شرکت کی جو اپنے ہمراہ اپنے انگلستانی دوستوں کو بھی لاتے ہوتے تھے۔ ۲۰ مارچ کو ہم کو میلٹ ہال COMELT HALL لندن یونیورسٹی میں مدعو کیا گیا اس کا اہتمام مسٹر اکرم جاوید نے کیا تھا جو لندن یونیورسٹی میں (اس وقت) ایک سینئر سٹوڈنٹ تھے۔ حسب سابق یہاں بھی حاضرین کی ایک بڑی تعداد موجود تھی۔

۲۲ مارچ کو ہم لوگ ہڈرز فیلڈ HUDPERZ FIELD پہنچے وہاں ہمارا قیام حاجی صادق کے یہاں تھا جو وہاں پر ایک ممتاز تاجر کے طور پر معروف ہیں۔ وہاں پرش ہال میں ہمارا جلسہ ہوا۔ اسی شام کو ہمیں لارڈ میئر آف ہڈرز فیلڈ جان میگنف FIELD JHON MEGNIF نے ایک استقبالیہ دیا۔ جس میں ہمیں مقامی سیاست دانوں اور معززین شہر سے ملاقات کا موقع ملا۔

۲۳ مارچ کو ہم بریڈ فورڈ پہنچے اور وہاں سے جارجس ہال بیڈ فورڈ میں گئے۔ جہاں ایک شاندار جلسہ کا اہتمام کیا گیا تھا یہ ایک بڑا ہال ہے جس کی دو گیلریاں ہیں جن میں تقریباً ۹ ہزار افراد آسانی سے بیٹھ سکتے ہیں۔ جب ہم ہال میں پہنچے تو سارا ہال

کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ اس جلسہ کا اہتمام کرنے والوں میں حکیم رانا محمد یوسف، راجہ محمد یوسف
عبدالحمید چودھری اور راجہ رشید وغیرہ پیش پیش تھے۔ ۲۴ مارچ کو ہم نے میتھیو سنٹر
ہال اولڈہیم سٹریٹ میں ایک جلسہ عام سے خطاب کیا اور پھر مانچسٹر میں خطاب
کیا۔ ۲۵ مارچ کو راشڈیل کے خوبصورت شہر میں منیر احمد اختر نے ہمارے ایک
جلسہ کا بندوبست کیا۔ ۲۸ مارچ کو ہم نے ایڈنبرا یونیورسٹی کے وسیع ہال میں
وہاں کے مقامی طلباء اور پاکستانی طلباء کے ایک اجتماع سے خطاب کیا اور ۲۹
مارچ کو کنگز سٹن کے بڑے ہال میں پہنچے اور گلاسکو کے شہر میں ایک
جلسہ عام کا انتظام کیا گیا جہاں بڑی تعداد میں لوگ ہماری تقاریر سننے کے لیے آئے۔
اس سلسلہ میں بشیر مان نے بڑا نمایاں حصہ لیا۔ بشیر صاحب کا وہاں نمایاں سماجی
مقام ہے۔ وہ گلاسکو کارپوریشن میں پولیس کے امور کے انچارج ہیں اور واضح رہے
کہ لندن کے بعد گلاسکو دوسرا بڑا شہر ہے۔ ۳۰ مارچ کو ہمارے اعزاز میں ایک لنچ کا
اہتمام کیا گیا جس میں ہماری ملاقات بڑے بڑے ممتاز عمائدین سے ہوئی۔ ان میں
ممتاز شہریوں کے علاوہ بعض نامور سیاست دان بھی شامل تھے۔ اس کے علاوہ جان میکگر
مسٹر سیلی، لارڈ پراوس، لارڈ سر ویم گرے اور لارڈ میئر نے بھی اس میں شرکت کی اس دعوت
میں بھی میں نے اور ایئر مارشل صاحب نے خطاب کیا۔

۳۱ مارچ کو ہم پیٹر برو کی طرف شام کو روانہ ہوئے اور وہاں ایک
جلسہ منعقد کرانے میں راجہ عبداللہ خان، راجہ جمیل انور اور محمد خان وغیرہ پیش پیش تھے۔
یہ جلسہ بھی بڑا کامیاب رہا۔ ۲ اپریل کو مجھے ہاؤس آف کامنز HOUSE OF COMMON
کے ممبرز کیفے ٹیریا میں مجھے اور میرے رفقاء کو ایڈورس لائن (بریڈفورڈ) نے کھانے پر

بلایا۔ وہیں میں نے ہاؤس آف کامن کا اجلاس دیکھا اور مجھے وی آئی پی گیلری میں جگہ دی گئی کیوں کہ میں اپنے ملک میں رکن اسمبلی تھا اور اس اجلاس میں میرے لیے کارڈ فارن سیکرٹری آف انگلینڈ نے جاری کیا تھا۔

۳ر اپریل کو ہماری ملاقات ایمنسٹی انٹرنیشنل کے عہدیداران کے ساتھ لندن میں ہوتی۔ ۶ر اپریل کو ہم کارڈف کی طرف روانہ ہوتے اور وہاں ایک جلسہ ایم اے زیڈ خان اور ڈاکٹر ایم نواز خان نے ترتیب دے رکھا تھا۔ ۷ر اپریل کو ہم برمنگھم پہنچے اور وہاں ایک بڑے جلسہ سے خطاب کیا۔ اس جلسہ کا اہتمام حق نواز خان اور اسحاق بٹ نے کیا تھا۔ ۹ر اپریل کو کوونٹری کے مقام پر جلسہ عام ہوا۔ اس جلسہ کی صدارت لارڈ میئر آف کوونٹری نے کی اس جلسہ میں جو لوگ پیش پیش تھے ان میں ضیاء بٹ اور سلطان محمود شامل تھے۔ ۱۰ر اپریل کو مجھے ہاؤس آف کامن کے کمیٹی روم HOUSE OF COMMON میں مدعو کیا گیا تاکہ میں جنوبی ایشیا کی علاقائی سیاست کے موضوع پر اظہار خیال کروں۔ اس میٹنگ کا اہتمام کرنے والے ارکان پارلیمنٹ میں پیش پیش تھے۔ اس کے علاوہ کئی ارکان پارلیمنٹ بھی اس موضوع پر میری تقریر سننے کے لیے آئے ہوئے تھے۔

۱۱ر اپریل کو جلسہ کے لیے روانہ ہوا۔ یہاں بھی راجہ عنایت اور مرزا صفدر علی وغیرہ نے جلسہ کا اہتمام کر رکھا تھا۔ ۱۴ر اپریل کو ہم نے ہائیڈ پارک لندن کے معروف مقام سے ایک بہت بڑا اجلوس شروع کیا جس میں پورے انگلستان سے لوگ پہنچے اس کی

وجہ یہ بھی تھی کہ ہم نے اب تک پورے انگلستان کا دورہ کر کے لوگوں کو اپنے خیالات اور وطن کے حالات سے آگاہ کر دیا تھا۔ ہائیڈ پارک سے نکل کر جلوس نے لندن کی اہم سڑکوں کا چکر لگایا اور بالآخر اس کا اختتام ٹرافاگر سکوائر ______________ میں ہوا جو ایک مشہور مرکزی جگہ ہے۔ یہاں جلوس کے اختتام پر ہم نے ایک عظیم الشان جلسہ عام کیا۔ اس کا سٹیج نیلسن کالم (ایک مشہور مقام کا نام) کے اوپر لگایا گیا

تھا۔ یہ جلسہ بالکل موچی دروازے میں ہوا۔ مقررین نے بڑی دھواں دھار تقاریر کیں اور اسے مقامی ریڈیو، ٹی وی اور اخبارات نے خوب اچھی طرح کور COVER کیا۔

۲۹ اپریل کو میں نے فنانشل ٹائمز لندن کے ایک سینئر صحافی مسٹر کین گنفیر ٹرے KEN GENFER TRAY کے ساتھ ملاقات کی۔ ان سے پاکستانی سیاست پر خوب سیر حاصل گفتگو رہی۔

۳۰ اپریل کو ایک ممبر پارلیمنٹ مسٹر راک نیک فارکر جو اس وقت کی برطانوی حکومت امور خارجہ کے انڈر سیکرٹری تھے سے ملاقات ہوئی۔ ان کی اہلیہ محترمہ جو ممتاز جریدہ اکانومسٹ سے وابستہ ہیں اس موقع پر موجود تھیں۔ یہ صاحب الیگزانڈر میک فارکوہر (سول سروسز کے ممتاز رکن) کے صاحبزادے ہیں اور پاکستان بننے کے بعد حکومت پاکستان کے سیکرٹری رہ چکے ہیں۔

۴ مئی کو مجھے پاکستان کے طلباء نے پاکستان کے مسائل پر خطاب کرنے کے لیے مدعو کیا جہاں ایک بھرپور جلسہ ہوا۔ اس کا انتظام وہاں اس وقت زیر تعلیم نوجوانوں افتخار حمید اور بشیر احمد رانا نے کیا تھا۔

اس دورہ کے دوران مجھے پیرس جانے کا اتفاق بھی ہوا۔ وہاں بھی میں نے اور وہاں موجود لوگوں کو پاکستان کے احوال سے آگاہ کیا۔

میرے نظریات

یہ ایک سنگین حقیقت اور المیہ ہے کہ ہماری بیشتر پارٹیوں کے پاس نہ تو کوئی واضح حکمت عملی اور پروگرام ہے اور نہ ہی انہوں نے کوئی ہوم ورک کر رکھا ہے۔ جیسا کہ دنیا بھر کے جمہوری ملکوں میں سیاسی جماعتیں روز و شب اپنے ہوم ورک میں مصروف رہتی ہیں اور خود کو اس نقطۂ نظر سے تیار رکھتی ہیں کہ اگر انہیں کسی وقت قومی نوعیت کی کوئی ذمہ داری سونپی گئی تو وہ اس سے کماحقہ عہدہ برآ ہو سکیں۔

مجھے خوش قسمتی سے کم عمری میں ہی پاکستان کی اپوزیشن میں اعلیٰ سطح پر کام کرنے کا موقع ملا دنیا جانتی ہے کہ قومی اسمبلی کے اندر میں اپوزیشن کا ایک فعال اور متحرک رکن تھا پھر جب یو ڈی ایف یعنی یونائیٹڈ ڈیموکریٹک فرنٹ بنایا گیا تو میں اس کے بانی رکن کی حیثیت سے اس کی سنٹرل ایگزیکٹیو میں بھی رہا مجھے تقریباً تمام سیاسی جماعتوں کے سربراہوں سے گاہے بگاہے سنٹرل کمیٹی کے اجلاسوں میں گفتگو کرنے کا موقع ملا۔ اس سے میرا مجموعی تاثر یہی بنا کہ جماعتوں نے اپنا ہوم ورک

نہیں کیا اور وہ تمام عارضی اور وقتی طور پر یعنی ایڈہاک ازم پر چلتی ہیں، جیسی صورت حال سامنے آئی اس کے مطابق اخباری بیان جاری کر دیا اور پھر اگلے روز اپنا بیان اخبار میں پڑھ کر خوش ہو گئے۔ لیکن ان کی پالیسیوں میں کوئی ٹھوس منصوبہ بندی اور تسلسل نہیں ہے۔ چنانچہ یہی ہوتا ہے کہ وہ آج کچھ کہیں گے، کل کچھ اور کہیں گے۔ اسی سبب ان جماعتوں کو عوامی اور قومی سطح پر کوئی دوام حاصل نہیں ہو سکا۔ وہ اپنے موقف کو اس لیے بھی بدلتی رہتی ہیں کہ ان کی کسی یا اپنے موقف کے ساتھ کوئی کومٹ منٹ نہیں ہے۔

میں اس حوالے سے خدا کا شکر گزار ہوں کہ میں نے سیاست کے میدان میں اترنے سے پہلے ان تمام پہلوؤں پر بخوبی غور و خوض کر لیا تھا۔ چنانچہ سیاست کے خارزار کی طرف میں شوقیہ یا حادثاتی طور پر نہیں آیا تھا بلکہ اس فیصلہ کے پیچھے میری طبع، مزاج اور عقل و شعور کا پورا پورا ہاتھ تھا۔ میں جانتا تھا کہ میں اپنے کندھوں پر جو اہم اور بڑی ذمہ داری اٹھا رہا ہوں، مجھے اس ذمہ داری کو ہر حال نبھانا ہے۔ بلکہ خوش اسلوبی سے نبھانا ہے اس کیلئے میں نے ہوم ورک کیا۔

میں نے ذاتی طور پر اور نجی سطح پر لوگوں سے گہرا قریبی رابطہ رکھا ہوا تھا۔ میں ان کے ساتھ مختلف امور پر تبادلہ خیال کرتا رہتا تھا۔ یہ لوگ مجھے اپنے نقطہ نظر سے نہایت آزادانہ اور دوستانہ ماحول میں آگاہ کرتے رہتے تھے اور پھر باہمی مشورے سے کوئی ایک متفقہ اور حقیقت پسندانہ نتیجہ اخذ کرتے تھے۔ چنانچہ پانچ سال کے اس عرصہ میں جب تک میں قومی اسمبلی کا رکن رہا میں نے پالیسی سے متعلق امور پر اصولی رویہ اختیار کیا اور پھر اس پر ڈٹا بھی رہا۔ مثال کے طور پر جہاں تک خارجہ پالیسی کا تعلق ہے۔ میرا ہمیشہ سے موقف رہا ہے کہ پاکستان کو سپر پاورز کی رسہ کشی اور کشمکش میں ملوث نہیں ہونا چاہیئے۔ ہمیں اپنے تعلقات کو "دو طرفہ" بنیاد پر استوار کرنا چاہیئے نہ کہ ہمہ پہلو بنیاد پر کیونکہ ہمہ پہلو بنیاد پر استوار کیے جانے والے تعلقات میں بڑی پیچیدگیاں پیدا ہو جاتی ہیں۔ اس میں عموماً تناؤ آ جاتا ہے۔ دو طرفہ بنیاد پر تمام ملکوں سے ایسے تعلقات قائم کیے جا سکتے ہیں جس میں ملک و قوم کا وقار، سلامتی، مستقبل اور مفادات کا بخوبی تحفظ کیا جا سکتا ہے اور تعلقات بھی مساویانہ بنیادوں پر نہایت گہرے ہو سکتے ہیں۔

ایسے میں یعنی دو طرفہ تعلقات کے ماحول میں کوئی ایک ملک یہ اصرار نہیں کر سکتا، اور نہ

ہی دباؤ ڈال سکتا ہے کہ کسی تیسرے سے تعلقات قائم کر دیا نہ کرو۔ کیونکہ دوطرفہ تعلقات کا فلسفہ اور مفہوم ہی یہ ہے کہ تعلقات استوار کرنے والے دونوں ملکوں کے باہمی تعلقات خوشگوار اور مساوی سطح پر دوستانہ ہوں گے اور ان میں سے کوئی ایک کسی دوسرے پر کسی تیسرے کے بارے میں کوئی دباؤ نہیں ڈالے گا۔ ویسے بھی ہر ملک اپنے قومی وقار، دفاع اور مفادات کا بہرحال خیال رکھتا ہے۔

اصل بات یہ ہے کہ خارجہ پالیسی کی تشکیل کے وقت بہرحال یہ امر مدِنظر رکھا جاتا ہے کہ ہمیں تحفظ اور سلامتی کہاں میسر آئے گا۔ اس منظر میں دیکھا جائے تو ہمارے علاقہ کا ایک بڑا ملک بھارت ہے جس نے ہمارے وجود کو آج تک قبول ہی نہیں کیا بلکہ وہ ہر وقت اس تاک میں رہتا ہے کہ کوئی موقع ملے تو پاکستان کے حصے بخرے کر کے "اکھنڈ بھارت" کے خواب کو شرمندہ تعبیر کرے اور یوں اشوک کے دور کی یاد تازہ کر سکیں۔ بھارت نے اسی مقصد اور نصب العین کو مدنظر رکھتے ہوئے اپنی خارجہ پالیسی تشکیل دی ہے۔ (جس سے ظاہر ہے کہ ہم اختلاف کرتے ہیں) لہٰذا ۱۹۴۸ء کی جنگ کشمیر، ۱۹۶۵ء کی جنگ ستمبر اور ۱۹۷۱ء کی جنگ جس میں سقوط مشرقی پاکستان کا سانحہ رونما ہوا۔ تاریخ کا ایک ایسا ثبوت اور شواہد ہیں جنہیں نظرانداز نہیں کیا جا سکتا اور جو ہماری آنکھوں کے سامنے ہی لڑی گئیں۔ حتیٰ کہ آج بھی اگر ہماری ملکی سالمیت کو کسی جانب سے کوئی خطرہ ہے تو وہ بھارت کی طرف سے ہی ہے۔ لہٰذا بیرونی دنیا کے ساتھ تعلقات استوار کرتے ہوئے ہمیں یہ امر بہرحال ملحوظ خاطر رکھنا ہے کہ ہمیں تحفظ کہاں سے ملتا ہے اور کہاں سے ہمیں بھارت سے خطرہ کے مقابلہ میں حمایت اور مدد میسر آ سکتی ہے۔ اور اگر صورت حال یہ ہو کہ پاکستان اور بھارت کے درمیان تصادم یا معرکہ آرائی کے وقت ہمارے دوست غیر جانبدار ہو جائیں اور جب ان (دوستوں) کا کوئی مسئلہ ہو تو وہ ہم سے بھرپور تعاون اور حمایت کا تقاضا کریں تو میرے خیال میں یہ بہت مہنگا سودا ہے۔ دوطرفہ تعلقات کی بنا پر یہ امر مسلمہ ہو تو اس کا دوست اور دشمن ہمارا ہوتا اور ہمارا دوست اور دشمن اس کا ہوگا۔

اس پس منظر اور حوالے اگر صورت حال کا جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوگا کہ ہم جنوبی امریکہ

کی سیاست میں حصہ لیتے ہیں۔ ہم نکاراگوا کے مسئلہ میں الجھتے ہیں، ہم مشرق وسطیٰ میں بڑا سرگرم کردار ادا کرتے ہیں۔ غرض کہ بقول شاعر ؎

سارے جہاں کا درد ہمارے جگر میں ہے

لیکن کبھی ہم نے اس بات کا جائزہ بھی لیا ہے کہ کیا وہ تمام ملک (جن کی ہم بھرپور حمایت کرتے ہیں) مسئلہ کشمیر پر بھی وہی رائے رکھتے ہیں جو ہماری ہے اور اگر وہ ممالک جو مسئلہ کشمیر پر ہماری حمایت اس طرح نہیں کرتے جس طرح کہ ہم خود کرتے ہیں تو پھر یہ کہاں کی دانش مندی اور عقل ہے کہ ہم ان کے مسائل کو اپنے اعصاب پر سوار کر لیں۔ یہ امر ملحوظِ خاطر رہے کہ سیاست خواہ کسی بھی سطح پر ہو، اس میں "کچھ لو، کچھ دو" کا اصول کارفرما ہوتا ہے۔

بھارت کی طرف سے خطرہ کی بابت کوئی مفروضہ یا غلط فہمی نہیں بلکہ ایک ٹھوس تاریخی حقیقت ہے۔ لہٰذا ہمیں اس خطرہ سے تحفظ اور دفاع کو یقینی بنانا ہے۔ ہم چونکہ جارح یا امن دشمن نہیں لہٰذا ہمیں بہر حال ایسے دوست بنانے ہیں جو ہماری اس وقت بھرپور، مکمل اور ہر طرح سے امداد کریں۔ جب ہم اپنے دفاع کی جنگ لڑ رہے ہوں۔ جو آزمائش کی گھڑی میں بھارت کے مقابلے میں کھل کر اور مکمل طور پر ہماری اخلاقی، سفارتی، مادی اور ہر ضروری امداد کریں۔

اگر ایسے دوست نہیں ملتے، اور ایسے دوست ملتے ہیں جو ہنگامی صورت حال میں "غیر جانبداری" کا دائرہ کھینچنے کے قائل یا داعی ہیں تو میں سمجھتا ہوں کہ ان کی دوستی کے بارے میں، ہمیں زیادہ خوش فہمی کا شکار نہیں ہونا چاہیئے جو ملک حق دوستی ادا نہیں کر سکتے وہ دوستی کی بنیاد کیسے بن سکتے ہیں۔

میرے خیال میں ہماری تمام تر خارجہ پالیسی کا محور بھارت اور کشمیر ہے اور یہی ہماری دوستی کا معیار اور پیمانہ بھی ہے۔ اس مسئلہ پر جو ملک بھارت کے مقابلے میں ہماری حمایت کرتا ہے۔ وہ ہمارا دوست ہے۔ مثلاً چین ہے ۔ وہ ہمارا اس لیے قابلِ اعتماد اور گہرا دوست ہے کہ آزمائش کی ہر گھڑی میں اس نے ہمارا کھل کر ساتھ دیا، وہ ستمبر ۱۹۶۵ء کا معرکہ ہو یا ۱۹۷۱ء کی جنگ ۔ عظیم چین نے موثر اور مثبت انداز میں پاکستان کی ٹھوس امداد کی لہٰذا ہمارے عوام

کے دلوں میں چین کے لیے عزت، محبت اور تحسین کے جذبات پائے جاتے ہیں۔

یہاں میں ایک اور پہلو سے اپنا نقطہ نظر واضح کرنا چاہوں گا۔ خارجہ پالیسی ایک طرح سے داخلہ پالیسی کا ہی عکس ہوا کرتی ہے۔ اگر کسی ملک کی کوئی داخلہ پالیسی ہو اور اس کا کوئی وجود ہو تو یقیناً اس کا اثر اور عکس بیرون ملک بھی دیکھا اور محسوس کیا جا سکے گا۔ لیکن اگر ملک کے اندر ہی کسی پالیسی کا کوئی وجود نہ ہو تو بیرون ملک کیا ہو گا! گویا خارجہ پالیسی اور داخلہ پالیسی ایک اعتبار سے لازم و ملزوم ہیں۔ اگر ملک کے اندر سیاسی، سماجی، اقتصادی، معاشی اور فکری اصلاحات ہوں گی اور ان شعبوں میں پیش رفت ہو گی تو یقیناً دنیا میں اس کا چرچا ہو گا اور عالمی برادری میں اس کا ذکر ضرور ہو گا۔ مثلاً بھارتی حکومت نے سفارتی سطح پر ساری دنیا میں یہ ڈھنڈورا پیٹ رکھا ہے کہ "بھارت ہی دنیا کی سب سے بڑی جمہوریت ہے"۔ اور سچی بات تو یہ ہے کہ صرف یہی ایک نعرہ بھارت کو ایشیا کے دیگر تمام ممالک اور خصوصاً پاکستان پر دنیا بھر میں ترجیح دلانے کے لیے موثر کردار ادا کر رہا ہے۔ اس کے مقابلے میں جب پاکستان میں بار بار مارشل لاء لگتا ہے تو پاکستانی سفارت کار بھلا کس طرح ہر بار اس کے جواز کے لیے دلائل پیش کر سکتے ہیں اور وہ کیسے آزاد جمہوری دنیا کے سامنے فوجی حکومت کی وکالت کر سکتے ہیں۔

بھارت کی مثال دیکھ لیجیے۔ اس کی ساری تاریخ اور ماضی جارحیت سے عبارت ہے اس نے حیدر آباد (دکن)، جونا گڑھ اور مناودر کو ہضم کیا اور اب کشمیر کو تقریباً ہڑپ کر چکا ہے، حالانکہ اقوام متحدہ کی قراردادوں میں واضح طور پر کہا گیا ہے کہ کشمیر کا مسئلہ حق خود ارادیت کی بنیاد پر طے ہو گا۔ لیکن بھارت نے ہٹ دھرمی کی پالیسی کے تحت اپنا غاصبانہ قبضہ جاری رکھا ہوا ہے اور اسے اپنا اٹوٹ انگ قرار دیتا ہے۔ اب ہمارے دوستوں کا یہ عالم ہے کہ وہ ہماری اشک شوئی کے لیے کبھی کبھار محض اتنا کہہ دیتے ہیں۔

There should be meaningful settlement of the Kashmir issue.

میں یہ سمجھنے سے قاصر ہوں MEANINGFUL سے ان کی کیا مراد ہے۔ کیا وہ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ کشمیر کے MEANING ہم رکھ لیں اور FUL کشمیر بھارت رکھ لے۔

اس کا سبب یہ ہے کہ ہم نے اپنی خارجہ پالیسی کو اس طرح پیش اور ثابت نہیں کیا جس سے ہم اپنے قومی مقاصد کی وضاحت کر سکیں حالانکہ بڑی واضح سی بات ہے کہ ہمارے دو ہی مقاصد ہیں۔

- بھارت کے مقابلہ میں تحفظ اور سلامتی۔
- مسئلہ کشمیر کا منصفانہ حل۔

اگر کوئی ملک ان دو مقاصد کے لیے ہماری اقتصادی، فوجی، سفارتی یا اخلاقی مدد کھل کر کرے تو وہ ہمارا دوست ہے اور اگر کوئی ملک ایسا نہیں کرتا تو وہ ہمارا دوست نہیں۔

چنانچہ مجھے اصرار ہے کہ ہماری خارجہ پالیسی میں اس امر کو بنیادی حیثیت حاصل ہونا چاہیئے کہ آخر وہ کون سے ممالک ہیں جو ہمارے مسائل کے حل میں ہماری ہر طرح سے مدد کر سکتے ہیں۔ لہذا ہمیں قطعی طور پر مساوی اور برابری کی بنیاد پر دو طرفہ تعلقات قائم رکھنے چاہئیں اور حقیقی معنوں میں غیر جانبدارانہ حیثیت اختیار کرنا چاہیئے۔ خارجہ پالیسی محض دورے کرنے، گارڈ آف آنر کے معائنہ کرنے، دعوتیں اڑانے، تاریخی مقامات کی سیر کرنے اور مذاکروں کی میز پر بیٹھ کر تصویریں اتارنے کا نام نہیں، یہ ملک و قوم کی بقاء کو یقینی بناتے اور قوم کے وقار کو عالمی برادری میں اجاگر کرنے سے عبارت ہے۔

بھٹو کی خارجہ پالیسی

یہ اندازہ کرنے کے لیے کہ قیام پاکستان سے عوام بھارت سے تحفظ اور مسئلہ کشمیر کے معاملہ میں کس قدر حساس اور باشعور ہیں۔ ذوالفقار علی بھٹو مرحوم کی شخصیت سے بہتر کسی کی مثال نہیں دی جا سکتی۔ بھٹو نے بھارت سے ہزار سال تک جنگ کرنے اور جموں و کشمیر کے مظلوم عوام کی حمایت کرنے کا نعرہ لگا کر پاکستان اور خاص طور پر اہل پنجاب کے دلوں کو جیت لیا۔ اور انہوں نے (عوام نے) انہیں زمین سے اٹھا کر اپنے سر آنکھوں پر بٹھا لیا لیکن اسی بھٹو نے شملہ میں جا کر گھٹنے ٹیک دیئے۔

شملہ مذاکرات میں کسی سطح اور کسی مرحلہ پر کشمیر کا ذکر تک نہیں آیا بلکہ یوں محسوس ہوتا تھا کہ جیسے کشمیر کا معاہدہ کسی "سرد خانے" میں ڈال دیا گیا ہے لہٰذا اسی طرح بھارت سے پنجہ آزمائی اور مقابلہ

کا جنون رجو اہلِ پنجاب کی کمزوری ہے ، بھی ہوا ہو گیا۔ یہ ہماری ناکام اور خارجہ پالیسی کا ایک ثبوت ہے کہ "معاہدہ تاشقند" کے راز طشت از بام کرنے کا نعرہ لگانے والا بھٹو خود معاہدہ شملہ کر کے واپس آیا جبکہ معاہدہ شملہ ، معاہدہ تاشقند" کے مقابلے میں کہیں زیادہ وطن دشمن اور تحقیر آمیز تھا۔ کیونکہ اس کی رو سے کشمیر کے بارے میں ایک طرح سے زبان بندی تسلیم کر لی گئی تھی۔

عام طور پر پیپلز پارٹی دعویٰ کرتی ہے۔ خود بھٹو مرحوم نے بھی اس کا بڑی شدت سے شور مچایا کہ بھٹو ۹۰ ہزار جنگی قیدی رہا کرا کے واپس لے آیا"۔ اگر مسئلہ صرف جنگی قیدیوں کی رہائی کا تھا تو یہ جنگی قیدی تو اس سے بہت پہلے ہی واپس آ سکتے تھے۔ کیونکہ یہ تو مسز اندرا گاندھی کی حکومت پر ایک طرح کا اقتصادی بوجھ بنے ہوئے تھے

اصل حقیقت یہ ہے کہ ان جنگی قیدیوں کو اس لیے واپس نہیں لایا گیا کہ یہ مشرقی پاکستان کے ٹوٹنے اور تباہ ہونے کے عینی شاہد تھے۔ اگر یہ فوراً" واپس آ جاتے تو یہ پاکستان بھر کے گاؤں گاؤں اور قریہ قریہ پھیل جاتے اور اپنے اردگرد جمع ہونے والے لوگوں اور ملاقاتیوں کو اصل حقائق سے آگاہ کرتے۔ ظاہر ہے کہ اس کے نتیجہ میں عوامی سطح پر ایک ہیجان پیدا ہو جاتا۔ لہٰذا ان جنگی قیدیوں کو ایک سوچے سمجھے منصوبے کے تحت جان بوجھ کر بھارت کی قید میں رکھا گیا تاکہ جب تک بھٹو اپنی حکومت اور اقتدار کو مستحکم نہیں کرتا۔ ان کو واپس نہ لایا جائے۔

لہٰذا میں نہیں سمجھتا کہ کہ بھٹو نے اگر جنگی قیدیوں کو معاہدہ شملہ پر دستخط کر کے رہا کرا لیا تو وہ کوئی آسمان سے تارے توڑ لایا۔ یہ اس کا کوئی غیر معمولی کارنامہ نہیں اور نہ ہی یہ اس کی سفارت کاری یا خارجہ پالیسی کی کسی حکمت عملی کا ثمر قرار دیا جا سکتا ہے۔

پاک فوج

فوج کے بارے میں ، میں اس سوچ کا حامل تھا کہ فوج کا زیادہ تر بجٹ ، فوج میں زیادہ سے زیادہ تعداد میں نفری کو بھرتی کر کے ان کی تنخواہوں پر خرچ کرنے کی بجائے ، جدید اسلحہ حاصل کرنے کے لیے خرچ کیا جائے۔ کیونکہ جدید دور میں عددی برتری سے فتح حاصل نہیں کی جا سکتی ، پرانے وقتوں

میں دو لاکھ کا لشکر یقیناً "دس ہزار کے لشکر کو مار بھگاتا۔ مگر اب یہ ممکن نہیں بشرطیکہ دس ہزار کا لشکر جدید ہتھیاروں سے لیس ہو۔

فوج دو قسم کی ہونی چاہیئے۔ (۱) آرمی آف ڈیفنس ۔ یعنی وہ فوج جو ملک کی سلامتی کو درپیش خطرات کا مقابلہ کرے گی۔ (۲) آرمی آف پروڈکشن ۔ یعنی ایسے افراد پر مشتمل فوج جو کوئی بھی کام کرنے کی صلاحیت اور اہلیت رکھتے ہوں۔ اس کا نظریہ یہ ہے کہ کوئی شخص گھر میں بیکار نہیں بیٹھے گا بلکہ اسے اس فوج میں بھرتی کیا جائے گا۔ البتہ انہیں باور کرایا جائے گا کہ انہیں باقاعدہ ملازمت نہیں بلکہ "کام" دیا جا رہا ہے ۔ ملازمت ترقی یافتہ ممالک میں ہوتی ہے کیونکہ کوئی بھی ملازمت ۔ کسی شخص کو اس کی قابلیت، تجربہ، ڈگری اور معیار کے مطابق ہی دی جاتی ہے جیسا کہ امریکہ یا دوسرے ترقی یافتہ ممالک میں ہے۔ لیکن ہمارے یہاں تو اصل مسئلہ کام کا ہے۔ جیسا کہ ہمارے یہاں اکثر دیکھا گیا ہے کہ ایک بی اے پاس لڑکا اگر یہی کہتا ہے کہ کوئی کام ہو تو دے دو۔ میں کروں گا۔

چنانچہ میرا نظریہ یہ ہے کہ قوم سے وعدہ کیا جائے کہ لوگوں کو "کام" دیا جائے گا اور اسی بنیاد پر لوگوں کو بھرتی کر لیا جائے اور یوں "آرمی آف پروڈکشن" تشکیل دی جائے۔ اس کا فلسفہ یہ ہے کہ کوئی تندرست اور توانا شخص گھر نہیں بیٹھ سکتا۔

اس کی ساری تنظیم باقاعدہ فوج کی طرز پر ہی ہونا چاہیئے، اور اس کے افسران پاک فوج کے افسران ہی ہوں۔ وہی ان کی کلیدی سطح پر نگرانی کریں۔ اس فوج کو بڑے بڑے ترقیاتی منصوبوں پر کام لگا دیا جائے۔ بے شمار کام ایسے ہیں جہاں مشینیں نہیں بلکہ انسانی دست و بازو ہی کام آتے ہیں۔ مثلاً سیوریج، شجرکاری، مٹی کی بھرائی سے بنے ڈیم اور تعمیراتی کام وغیرہ۔ آرمی آف پروڈکشن کو ایسے ہی بڑے بڑے منصوبے سونپ دیئے جائیں مثلاً لاہور سے گوجرانوالہ تک کی "سپر ہائی وے" گزشتہ کئی برسوں سے تعمیر ہو رہی ہے اور عین ممکن ہے کہ یہ ہماری زندگی کے اندر راولپنڈی تک نہ پہنچ سکے ۔ لیکن اس کی بجائے اگر اس کام پر آرمی آف پروڈکشن کی ایک پوری کور لگا دی جائے۔ جس میں چار پانچ لاکھ آدمی ہوں تو یقیناً لاہور سے راولپنڈی کی سڑک چھ ماہ میں تیار ہو جائیگی۔

آرمی آف پروڈکشن کے لیے تربیت کا پروگرام یوں ترتیب دیا جائے کہ علی الصبح پی ٹی نماز، ورزش

اور ناشتے کے بعد انہیں کچھ ہتھیاروں کے استعمال کی تربیت دی جائے ۔ اس کے بعد نظریاتی طور پر تحریک اور یہیں انہیں اسلام کے محنت کے فلسفہ سے روشناس کرایا جائے ۔ انہیں احساس دلایا جائے کہ آپ لوگ مزدور نہیں بلکہ معمار ہیں اور آپ ایک نئی قوم کے درخشاں مستقبل کی بنیاد رکھ رہے ہیں اور تاریخ میں آپ کا نام معمار کے طور پر ہمیشہ یاد رکھا جائے گا ۔ انہیں دوسری پیشہ وارانہ تعلیم و تربیت دی جائے اور اس کے بعد ان باوردی جوانوں کو ان کے پراجیکٹ پر لے جایا جائے ۔

امن کے زمانے میں یہ فوج تعمیر و ترقی کا کام کرے گی لیکن جونہی ہنگامی حالات کا اعلان ہوگا یہ اپنے نزدیک ترین اور قریبی محاذ پر جا کر باقاعدہ فوج سے مل جائیں گے اور اس کے شانہ بشانہ دفاع وطن کا کردار ادا کریں گے ، باقاعدہ فوج کے ساتھ ان کا رابطہ موثر بنانے اور اس باقاعدہ فوج سے انہیں متعارف کرانے کے لیے سال میں ایک بار موسم سرما کی مشقوں کے دوران انہیں باقاعدہ فوج کے ساتھ ٹریننگ دی جائے گی اور ہر علاقہ کے آدمی کو اس کے علاقہ میں ہی رکھا جائے گا ۔ مثلاً قصور کے آدمی کو قصور کے علاقے میں ہی باقاعدہ فوج کے ساتھ تربیت دی جائے گی ۔ ظاہر ہے کہ وہ ہنگامی صورت میں کسی بھی دوسرے شخص سے زیادہ بہتر ایثار ، توجہ اور جذبے سے اس علاقہ کا دفاع کرے گا ۔

اب سوال یہ ہے کہ امن فوج کو تنخواہ کہاں سے دی جائے !

اس کا جواب یہ ہے کہ ہر شخص کو کچھ رقم تو گزارہ الاؤنس کے طور پر نقد ادا کی جائے اور کچھ ان کو "بونڈز" دیئے جائیں کہ جب ملک و قوم پر خوشحالی کا دور آئے گا تو انہیں اس کا صلہ دیا جائے گا ۔ پھر یہ بھی حقیقت ہے کہ یہ فوج پی ڈبلیو ڈی ، محکمہ جنگلات اور ایسے ہی دوسرے بے شمار محکموں سے جہاں کام کم اور گھپلے زیادہ ہو رہے ہیں قوم کو نجات دلائے گی اور ان محکموں کے بجٹ اس فوج پر خرچ ہوں گے ۔ اس کے نتیجہ میں جہاں رشوت ، بدعنوانی اور بددیانتی کی حوصلہ شکنی ہو گی وہاں تعمیر و ترقی کا کام زیادہ مؤثر ، نتیجہ خیز اور مربوط انداز میں ہوگا ۔

یہ وہ باتیں ہیں جو میں نے پیپلز پارٹی کے چیئرمین کو بارہا باور کرائیں ، اور انہیں یاد دلایا کہ آپ (بھٹو صاحب) تو قوم کی خوشحالی اور عوام کی بہبود کا نعرہ لگا کر ان کے نجات دہندہ بن کر

آگے بڑھے تھے۔ اب آپ کو خدا نے موقع دیا ہے تو کچھ کام کر جاؤ مگر اقتدار کا نشہ بڑا عجیب ہے اس میں انسان آنکھیں رکھنے کے باوجود اندھا اور بے پناہ شور سننے کے باوجود بہرہ ہو جاتا ہے۔ لیکن انہوں نے میری بات پر کوئی توجہ نہیں دی۔ کیونکہ وہ بخوبی جانتے تھے کہ اگر قوم کو اس قدر شعور اور عزت نفس دے دی گئی تو پھر اس قوم کو محض ڈنڈے کے زور پر جانوروں کی طرح ہانکنا ممکن نہیں ہوگا۔ بلکہ پھر اس پرجوش، پرعزم اور حوصلہ مند قوم کی قیادت کے لیے قومی امنگوں کے ساتھ کومٹ منٹ کی ضرورت ہو گی۔

یہاں اس وضاحت کی اشد ضرورت ہے کہ بھٹو نے الیکشن اور انتخابی مہم کے دوران عوامی فوج یا اس سلسلہ میں جتنی باتیں کی تھیں وہ تمام بے بنیاد اور جھوٹی تھیں۔ وہ دل سے کبھی نہیں چاہتا تھا کہ قوم میں اس قدر اصول پرستی، تنظیم اور شوقِ عمل آ جائے کہ وہ باشعور اور حریت پسند قوم کی حیثیت سے اپنا دفاع آپ کرنے کی قدرت حاصل کرے کیونکہ وہ بھی دوسرے حکمرانوں کی طرح قوم کو مجبور اور محتاج بنا کر رکھنا چاہتا تھا تاکہ بوقت ضرورت غریب لوگوں سے محض جذباتی نعروں اور بلند بانگ دعووں کی بنا پر ووٹ حاصل کیے جا سکیں۔

معاشی مسائل اور ان کا حل

عوام کو یاد ہو گا کہ میں نے اسمبلی کے اندر بھٹو حکومت کی طرف سے پیش کیے گئے ہر بجٹ پر بلا خوف حقیقت پسندی سے اپنا تجزیہ اور موقف بیان کیا۔ میرا بنیادی نقطہ نظر یہی تھا کہ پاکستان کی معیشت کی بنیاد زراعت ہی ہے اور جو ملک بھی پاکستان کو زراعت کی بجائے یکدم صنعت کی طرف اور زراعت سے پہلو تہی برتنے پر مشورہ دے وہ پاکستان کا خیر خواہ اور دوست نہیں لہٰذا میرا اصرار تھا کہ ہماری صنعتی معیشت دراصل زرعی معیشت کے تابع ہونا چاہیے۔ اور اگر اس اصول کو اساس تسلیم کر لیا جائے تو پھر صنعت کے شعبہ کو دو حصوں میں تقسیم کرنا ہو گا۔

- پہلا حصہ ان صنعتوں پر مشتمل ہو گا جو زرعی معیشت پروان چڑھائے، اس میں وہ صنعتیں شامل کی جا سکتی ہیں جو کھاد، ٹریکٹر، کرم کش ادویات وغیرہ فراہم کریں یعنی جن سے زرعی شعبہ کو فروغ میسر آئے۔

• دوسرا حصہ ان صنعتوں پر مشتمل ہوگا جن میں زرعی پیداوار کی کھپت ہو سکے۔

اس کے علاوہ کوئی اور صنعت جو نہ تو زرعی شعبہ کو فروغ دے اور نہ ہی زرعی شعبہ کے خام مال کی کھپت میں معاون ہو، ہمارے لیے سود مند نہیں ہو سکتی۔ بلکہ یہ ہمارے ملک و قوم کے لیے ایک مصنوعی صنعت ہوگی اور ہم اس کے متحمل نہیں ہو سکتے۔ اس قسم کی مصنوعی صنعت کے قیام کی اجازت کسی شخص کو نہیں دی جانی چاہیئے خواہ وہ کتنا ہی بااثر کیوں نہ ہو۔ مثلاً اگر کسی صدر یا وزیراعظم کا بھائی یا بیٹا یہ تجویز لے کر آئے کہ وہ کاسمیٹکس کی انڈسٹری قائم کرنا چاہتا ہے تو ہمارا جواب واضح طور پر یہ ہونا چاہیئے کہ ہماری عورتیں میک اپ کے بغیر گزارہ کر سکتی ہیں۔ یہ ملک و قوم کی ضرورت نہیں ہے۔

اگر ہم پہلے بیان کردہ دو اقسام کی صنعتیں قائم کریں تو اس سے ہماری معیشت مستحکم اور پائیدار بنیادوں پر قائم ہوگی۔

دوسرا اصول ہمیں بحیثیت قوم یہ اختیار کرنا چاہیئے کہ ہر وہ شئے جو ہم نہ تو تیار کرتے ہیں اور نہ ہی پیدا کرتے ہیں ہم اس کو استعمال نہیں کریں گے۔ اس کے نتیجہ میں ہمارا دیگر ممالک کے ساتھ (اس وقت موجود) تجارت کا عدم توازن ختم ہو جائے گا کیونکہ ہم کوئی ایسی شئے درآمد نہیں کریں گے جس کی ہمیں ضرورت نہیں۔ اس سے تجارتی توازن میں انقلابی تبدیلی آئے گی اور زرمبادلہ کے ذخائر میں اضافہ اور استحکام آئے گا اور اس کے ساتھ ملکی مصنوعات کی قومی اور سرکاری سطح پر استعمال کی ترجیحی بنیادوں پر حوصلہ افزائی کریں گے۔ درآمد شدہ اشیاء پر بڑے ٹیکس لگا دیئے جائیں گے تاکہ قومی صنعت کو دوام حاصل ہو سکے۔

زرعی شعبہ کا ایک بڑا مسئلہ یہ ہے کہ زرعی اراضی تقسیم ہوتے ہوتے اب بہت چھوٹے چھوٹے قطعات کی صورت اختیار کر گئی ہے اس کے لیے کوآپریٹو (یا امداد باہمی) کے نظام سے استفادہ کرنا ہوگا۔ اس کے تحت بڑے بڑے کوآپریٹو زرعی فارم تشکیل دیئے جا سکتے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ بعض علاقے مخصوص اجناس کے لیے مختص کر دیئے جائیں گے۔ مثال کے طور پر اگر کسی تحصیل میں کپاس کی فصل عمدہ ہوتی ہے تو وہاں کوآپریٹو زرعی فارم بنا کر صرف کپاس ہی کاشت کی جائے گی جبکہ اس وقت یہ زمین چھوٹے چھوٹے قطعات میں تقسیم کر کے کپاس، گنے، گندم وغیرہ

کے لیے استعمال ہو رہی ہے۔

میری تجویز کے مطابق جب ایک علاقہ کو کپاس کا زون قرار دیا جائے گا تو پھر وہاں صرف کپاس ہی کاشت نہیں کی جائے گی بلکہ کپاس سے متعلقہ تمام ذیلی اور ضمنی صنعتیں بھی وہیں قائم کی جائیں گی تاکہ خام مال میسر بھی آسکے اور اس کا خام مال استعمال بھی ہو سکے۔ ظاہر ہے کہ اس طرح صنعتیں مربوط اور مضبوط ہوں گی، بجائے اس کے کہ یہ بے ترتیب اور منتشر ہوں۔

اس کے علاوہ ایک اور فائدہ یہ ہوگا کہ مخصوص فصلوں کے مخصوص زون کی صورت میں ضمنی صنعتوں کے قیام کے نتیجہ میں چھوٹے چھوٹے ٹاؤن شپ قائم ہونا شروع ہوں گے اور یوں بڑے شہروں کی طرف بڑھنے والا آبادی کا دباؤ کم ہو جائے گا۔ ظاہر ہے کہ جب دیہی عوام کو دیہات میں یا اس کے نزدیک روزگار میسر آجائے گا تو وہ بڑے شہروں کا رُخ نہیں کریں گے تو یقیناً اس سے شہروں میں امن وامان کی صورت حال اور سیاسی احوال بہتر صورت اختیار کریں گے۔

اگرچہ بھٹو دیہی عوام کے جذبات سے کھیل کر آگے آیا اور اس نے "جیہڑا واہوے، او ہی کھاوے" جیسے دلفریب نعرے بلند کئے۔ اس نے بھی دیہی عوام کے سماجی و معاشی مسائل حل کرنے کے لیے سنجیدگی کے ساتھ کوئی ٹھوس کوشش نہیں کی۔ اگر فلور ملوں یا بینکوں کو قومیانے کے بھونڈے اقدامات کئے بھی گئے تو ان کی پیشگی منصوبہ بندی تیار نہیں کی گئی تھی۔ جس کے مہلک اثرات ساری قوم نے دیکھے۔

میں نے اس وقت بھی اسمبلی کے اندر بارہا اس حقیقت کی طرف نشاندہی کی تھی کہ سرمایہ کی کئی اقسام اور مراحل ہوتے ہیں۔ غلامی کے دور میں محکوم قوم کا سرمایہ اس کے آقا یا بیرونی حکمران لوٹ کھسوٹ کر لے جاتے ہیں۔ لیکن آزادی کے بعد تو آزاد ملک کے اندر موجود غیر ملکی سرمایہ میں بڑی کشش ہوتی ہے کیوں کہ آزادی کے بعد یہ قومی سرمایہ بن جاتا ہے اور یہ تصور کیا جاتا ہے کہ یہ سرمایہ دراصل اسی قوم اور ملک کے عوام کے خون پسینہ کی کمائی ہے جو آقاؤں نے استحصال کر کے حاصل کی تھی۔ چنانچہ اسے قومی ملکیت میں لے لیا جاتا ہے۔ جیسے ایران میں ڈاکٹر مصدق کے دور میں اینگلو ایرانی پٹرولیم کمپنیوں کو قومی ملکیت میں لے لیا گیا تھا۔ مگر بھٹو نے غیر ملکی ادارات چھوڑ دیئے، اپنے بنک قومیا لئے گئے۔

ایک مشکل یہ بھی ہوتی ہے کہ جب ملک و قوم کی دولت کا بڑا حصّہ چند گھرانوں تک محدود ہو جاتا ہے یعنی ارتکازِ دولت کا مرحلہ پیش آتا ہے اور گنتی کے چند افراد لاکھوں کروڑوں عوام پر دولت کے اعتبار سے اجارہ داری حاصل کر لیتے ہیں تو پھر عوام کا تجسس بڑھ کر یہ مطالبہ بن جاتا ہے کہ سوشلزم کے تحت اس سرمایہ کو سوشیلائیز کیا جائے یعنی سماجی اور عوامی مقصد کے لیے استعمال کیا جائے۔

چنانچہ نیشلائزیشن کو سوشلزم کے طور پر پیش کیا گیا اور نیشلائزڈ اداروں میں ان سرکاری افسروں کو مقرر کر دیا گیا جنہیں اقتصادی امور اور کاروبار کی نزاکت کا قطعاً شعور نہیں تھا اس کے نتیجہ میں یہ ادارے ہر اعتبار سے تباہ و برباد ہو گئے۔ بقول استاد دامن

اُتوں رولا پائی جاؤ

وچوں وچوں کھائی جاؤ

(ترجمہ: بظاہر شور و غل مچائے رکھو، مگر درپردہ خوب لوٹ مار کرو)

چنانچہ مجھے یہ کہنے میں کوئی باک نہیں کہ بھٹو کی غیر حقیقت پسندانہ اقتصادی پالیسیوں نے قوم کو ہر اعتبار سے ناقابلِ تلافی نقصان پہنچایا۔

اقتصادی اور معاشی پہلو سے مجھے اصرار ہے کہ ایک اور طریقے سے بھی سرمایہ کو متحرک کیا جا سکتا ہے اور وہ یہ ہے کہ سادگی کو حقیقی طور پر اختیار کیا جائے۔ غیر ضروری لوازمات، پراٹوکول اور ایسے ہی اللے تللے ترک کر دیئے جائیں۔ ساری دنیا جانتی ہے کہ پاکستان غریب ملک ہے اور ہم بیرونی قرضوں اور امداد کے سہارے بمشکل اپنا کام چلا رہے ہیں تو پھر آخر کس کو یہ جھوٹا تاثر دیا جا رہا ہے کہ ہم بڑے شاہ خرچ اور امیر قوم ہیں، اس کے ساتھ ساتھ سرکاری اداروں میں موجود اس روش اور صورت حال کو ختم کیا جائے کہ ایک ہی کام یا ایک ہی جیسا کام دو دو تین تین ادارے انجام دے رہے ہیں۔ اس حقیقت سے کون انکار کر سکتا ہے کہ متحدہ پاکستان کے دور میں بارہ تیرہ سیکرٹری سارے ملک کا انتظام چلاتے تھے۔ لیکن اس وقت یہ تعداد یقیناً اس سے کئی گنا زیادہ ہے جس سے ظاہر ہے کہ قومی خزانے پر ناقابلِ برداشت بوجھ پڑا ہوا ہے

تعصبات کا واحد علاج

میرے خیال میں ہمارے ملک و قوم کو اس وقت سب سے بڑا خطرہ جو درپیش ہے وہ لسانی و ثقافتی قومیت کا ہے (جس کے بارے میں، میں پہلے ہی تفصیل سے عرض کر چکا ہوں) اس کی بناء پر مختلف صوبوں میں جو احساسات اور تعصبات جنم لے رہے ہیں اس سے پاکستان کی وحدت کو سخت خطرہ لاحق ہے۔ اس کا حل میں نے پہلے بھی تجویز کیا تھا اب بھی پیش کرتا ہوں اور وہ یہ کہ زبانوں کی بنیاد پر قائم صوبوں کی موجودہ تقسیم کو ختم کر دیا جائے اور ان کے چھوٹے صوبے بنا کر ان کی تعداد میں اضافہ کر دیا جائے لیکن ان کی تقسیم اقتصادی بنیادوں (جذبِ مسابقت کے تحت) پر کی جائے۔ ہر صوبہ کے سربراہ کو لیفٹیننٹ گورنر کا نام دیا جائے۔ مثلاً پنجاب میں بہاول پور، لاہور، ملتان، راولپنڈی ڈویژن وغیرہ کو صوبہ کا درجہ دے کر الگ الگ کر دیا جائے۔ اسی طرح سندھ میں حیدر آباد، سکھر، کراچی ڈویژن کو الگ الگ صوبہ بنا دیا جائے۔ ایسا کرنے سے لسانی بنیادوں پر قائم صوبوں کا تعصب اور زہر ختم ہو جائے گا اور وہ کھچاؤ جو اس وقت موجود ہے اور جس نے اس سے پہلے مشرقی پاکستان کو بنگلہ دیش بنا دیا وہ بھی باقی نہیں رہے گا۔

میری تجویز کے مطابق صوبے بنانے کی صورت میں صوبوں کے درمیان ترقی اور معیشت کی بناء پر مقابلہ ہو گا۔ یعنی سکھر ڈویژن والے حیدر آباد ڈویژن سے مقابلہ کریں گے۔ ملتان ڈویژن والے لاہور ڈویژن سے مقابلہ کریں گے۔ یہ مقابلہ صحت مندانہ خطوط پر ترقیاتی امور کے بارے میں ہو گا۔ اس کے ساتھ ساتھ لسانی تعصبات بھی بے اثر ہو جائیں گے، اور مجموعی طور پر پاکستان کو فائدہ ہو گا، اور انتظامی نقطہ نظر سے بھی یہ ایک مفید فیصلہ ہو گا۔

اس کے ساتھ ساتھ میرا پختہ ایمان ہے کہ اس ملک میں اس وقت تک جمہوریت نہیں پنپ سکتی جب تک ضلع کی سطح پر یعنی بنیادی طور پر اس کی جڑیں مضبوط نہیں ہوں گی لہذا دورِ غلامی کی دو نشانیوں ڈپٹی کمشنر اور ایس پی کے عہدوں کو ختم کرنا بے حد ضروری بلکہ لازمی

ہے۔ اس کی بجائے ڈسٹرکٹ کونسل کی سطح پر اس کے چیئرمین کو ہی پورے ضلع کا نگراں تصور کیا جانا چاہیئے۔ مختلف محکموں کے سربراہ بھی اس کی ٹیم میں اسی طرح شامل ہوں جیسے کابینہ میں وزیر ہوتے ہیں اور اس کے ساتھ معاونت کے لیے چیف آفیسر مقرر ہو جو سرکاری افسر ہوگا، مگر یہ روایتی انداز میں بیوروکریسی کا نمائندہ نہیں ہوگا۔ پولیس کے سربراہ کے لیے چیف کانسٹیبل افسر کا عہدہ بنایا جائے۔ جو ضلع کے امور داخلہ کے سربراہ کی نگرانی میں کام کرے، اور امور داخلہ کا سربراہ ڈسٹرکٹ کونسل کے سامنے اس کی کارکردگی کا جوابدہ ہو۔ اس طریقے سے قومی سطح پر پرانے سی ایس پی اور نئے ڈسٹرکٹ مینجمنٹ گروپ (ڈی ایم جی) اور پولیس کی بالادستی کو ختم کیا جا سکتا ہے۔

یہ اس لیے بھی ضروری ہے کہ جب کوئی شخص چور دروازے سے اقتدار میں داخل ہوتا ہے یا عوامی لیڈر کا روپ دھار کر آمریت مسلط کرتا ہے تو دراصل اس کے کل پرزے یہی (موجودہ) ڈپٹی کمشنر اور ایس پی ہوتے ہیں۔ جو ہوا کا رخ دیکھ کر ہر آنے والے کے دست و بازو بن جاتے ہیں۔ ان کے تبادلے ملک کے مختلف شہروں اور علاقوں میں ہوتے رہتے ہیں، جہاں وہ سرمایہ داروں اور جاگیرداروں کے مفادات کا تحفظ کر کے خوب مال بناتے ہیں۔ بصورت دیگر (میری تجویز کی روشنی میں) اگر وہ بدعنوانی کا مرتکب ہوگا تو مقامی سطح پر ہی وہ نقاب ہو جائیگا۔

چنانچہ میرا اصرار ہے کہ ضلع کی سطح پر جمہوری اداروں کو فعال اور متحرک بنائے بغیر اس ملک میں قومی سطح پر حقیقی جمہوریت کا فروغ ناممکن ہے۔

اس طرح مرکز میں سرکاری افسر کا بڑے سے بڑا عہدہ جوائنٹ سیکرٹری کا ہونا چاہیئے جو سیاسی جماعت بھی اقتدار میں آئے وہ اپنا سیکرٹری یا ایڈیشنل سیکرٹری خود نامزد کرے۔ موجودہ صورت حال میں ہوتا یہ ہے کہ وزیر تو سیاسی جماعت سے تعلق رکھتا ہے مگر اس کے نیچے سیکرٹری سرکاری افسر ہوتا ہے اور پھر اس کے نیچے ایک طویل سلسلہ نوکر شاہی کا پھیلا نظر آتا ہے اور نوکر شاہی ایک ایسا گھوڑا ہے جو کسی بھی بڑے سے بڑے شہہ سوار کو اپنی پیٹھ پر سوار ہونے نہیں دیتا۔

اگر برسر اقتدار پارٹی اپنے سیکرٹری اور ایڈیشنل سیکرٹری اپنے ساتھ لائے تو اس کا

ایک فائدہ فوری طور پر یہ ہوگا کہ پارٹی کے اندر موجود اعلیٰ تعلیم یافتہ افراد کو بھی کام کرنے کا موقع ملے گا ان کی حوصلہ افزائی ہوگی اور ان کو سیاسی عمل میں اپنا کردار ادا کرنے میں ایک کشش محسوس ہوگی۔ موجودہ نظام میں اعلیٰ تعلیم یافتہ طبقہ سیاست میں آنے سے گریزاں رہتا ہے۔ کیونکہ ان کو علم ہے کہ جب الیکشن ہوں گے ایک اعلیٰ تعلیم یافتہ شخص کے مقابلہ میں ایک ان پڑھ یا جاگیردار اپنے وسائل اور دولت کے بل بوتے پر ٹکٹ حاصل کرکے اور اپنے اثر ورسوخ سے الیکشن جیت کر اسمبلی میں اور پھر ممکن ہے کابینہ میں چلا جائے گا۔

اس کے مقابلہ میں جب ہر پارٹی اپنے ساتھ سیکریٹری اور ایڈیشنل سیکریٹری لے کر جلے گی تو اس سے ان اعلیٰ تعلیم یافتہ افراد کی حوصلہ افزائی ہوگی۔ وہ پارٹی سے نہ صرف وابستگی اختیار کریں گے بلکہ ان کے پارٹی سیل اور دفاتر میں آزادانہ طور پر بیٹھ کر اپنے تجربہ، علم اور مہارت سے پارٹی کو فائدہ پہنچائیں گے۔ برسر اقتدار پارٹی کے تین افراد (وزیر، سیکریٹری، ایڈیشنل سیکریٹری) ہر وزارت میں ہوں گے اور جب اس پارٹی کے پاس اقتدار نہیں رہے گا تو یہ پارٹی کے ساتھ ہی رخصت ہو جائیں گے۔ ان کی خالی جگہ پر اقتدار سنبھالنے والی نئی جماعت اپنے ایسے ہی اعلیٰ تعلیم یافتہ افراد لے آئے گی۔ میرا پختہ یقین اور ایمان ہے کہ اگر قدرت نے مجھے کبھی اس ملک وقوم کی خدمت کرنے کا موقع دیا تو میں اپنی سیاسی پارٹی قائم کرکے اس میں دانشوروں، اہل الرائے اور ماہرین پر مشتمل ایک ایسا ہی سیل قائم کروں گا جو پولٹ بیورو کی طرز پر کام کرے گا تاہم اسے اپنے قول مزاج اور ضرورت کے مطابق کوئی بھی نام دیا جا سکتا ہے۔

یہی وہ طریقہ ہے جس سے سیاسی حکومتوں کو بیوروکریسی کے زہر سے محفوظ کیا جا سکتا ہے اور قوم پر ان کی گرفت کو نرم کیا جا سکتا ہے اور پھر یہ کس قدر عجیب بات ہے کہ ہمارے ملک میں ایک سیاست دان ملکی اور صوبائی سطح پر صدر، وزیر اعظم، گورنر یا وزیر اعلیٰ کے طور پر تو انتظامیہ کو چلاتا ہے۔ یہاں فوج، پولیس، بیوروکریسی اس کے ماتحت ہے مگر ضلع کی سطح پر اس کو روا نہیں رکھا گیا اور عوام کو نوکر شاہی کے رحم وکرم پر چھوڑ دیا گیا ہے۔ آخر کیا وجہ ہے کہ چیئرمین ڈسٹرکٹ کونسل ضلع کا انتظام نہیں چلا سکتا۔

عام طور پر کہا جاتا ہے کہ ضلع کا انتظام ایس پی اور ڈپٹی کمشنر کے بغیر نہیں چل سکتا۔
میں سمجھتا ہوں کہ یہ غلط مفروضہ بھی نوکر شاہی نے خود ہی پروپیگنڈہ کے ذریعے
لوگوں کے ذہنوں میں ڈالا ہے۔ اور اب وہ وقت آگیا ہے کہ عوام خود ماضی کو مدنظر رکھتے
ہوئے تلخ حقائق کی روشنی میں فیصلہ کریں کہ اصل حقیقت کیا ہے ؟

ضمیمہ نمبر ۱

مقام : پاکستان کی قومی اسمبلی ۔

تاریخ : ۱۹ر فروری ۱۹۷۳ء

مسٹر ڈپٹی سپیکر : ہاں ! مسٹر احمد رضا خان قصوری ۔

صاحبزادہ احمد رضا خان قصوری : اللہ تعالیٰ مجھے سچ ، بالکل سچ اور حقیقی معنوں میں سچ بولنے کا حوصلہ اور ہمت عطا کرے ! خداوند کریم میری مدد فرمائے ۔

میاں محمود علی قصوری : جناب مسٹر سپیکر ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

مسٹر ڈپٹی اسپیکر : کیا آپ پوائنٹ آف آرڈر پیش کرنا چاہتے ہیں ؟

میاں محمود علی قصوری : میں ایک تجویز پیش کرنا چاہتا تھا ۔ تجویز کسی وقت بھی پیش کی جا سکتی ہے ۔ آپ آج کا اجلاس ملتوی کر دیں ! تاکہ ہم کل از سرِ نو آغاز کریں !

مسٹر ڈپٹی اسپیکر : اگر معزز رکن تحریک پر تقریر کرنے کی رضاکارانہ پیش کش کر چکے ہیں ! چنانچہ ان کی تقریر ختم ہونے پر ہم آپ کی تجویز پر غور کر سکتے ہیں ۔ میں نے مسٹر احمد رضا قصوری کو تقریر کرنے کی اجازت دے دی ہے ۔

صاحبزادہ احمد رضا خان قصوری : جناب صدر ! میاں محمود علی قصوری کی تجویز مان لینے میں کوئی حرج نہیں ۔ میں کل تقریر کر لوں گا ۔

مسٹر ڈپٹی اسپیکر : جی نہیں ۔ ہمیں آئین بنانا ہے اور ہمیں رات نو بجے تک بیٹھنا ہوگا ۔

ملک محمد اختر : اگر یہ اپنی تقریر جاری نہیں رکھنا چاہتے تو میں خلا پُر کرنے کو یہاں موجود ہوں ۔

مسٹر ڈپٹی سپیکر: مجھے افسوس ہے۔ میں مسٹر احمد رضا خان قصوری کو موقع دے چکا ہوں۔ اب کسی کو بات نہ کرنی چاہیئے۔ معزز رکن اپنی تقریر جاری رکھیں۔

صاحبزادہ احمد رضا خان قصوری: اگر چاہیں تو ملک محمد اختر میرے بجائے خطاب فرمائیں۔

مسٹر ڈپٹی سپیکر: اس صورت میں آپ کو اپنی تقریر کے وقت کی قربانی دینا ہوگی۔ اسی لیے تو میں آپ سے کہہ رہا ہوں۔ براہِ کرم آپ تقریر جاری رکھیں۔

صاحبزادہ احمد رضا خان قصوری: بہتر ہے، جناب! (مداخلت)

مسٹر ڈپٹی اسپیکر: براہ کرم گفتگو نہ کریں۔ آرڈر!

صاحبزادہ احمد رضا خان قصوری: مسٹر پریذیڈنٹ، سر! مجھے اس اعزاز پر فخر ہے کہ اس بلند پایہ ایوان میں، جہاں ہم دستوری مسودے پر غور کرنے کے لیے جمع ہوئے ہیں بحث کا آغاز کروں۔ جیسا کہ مسٹر پیرزادہ نے اپنے افتتاحیہ خطاب میں کہا۔ یہ موقع بڑی تاریخی اہمیت کا حامل ہے کہ آئین کی تشکیل کے لیے ہمارا اجتماع ہوا ہے مگر یہ ساعت حد درجہ بدبخت بھی ہے کہ آج کا یہ اجتماع آدھے پاکستان پر مشتمل ہے۔ آج کے ہمارے اس اجتماع میں مشرقی پاکستان کے ایک سو سترھ ارکان موجود نہیں اور اس ایوان میں بیٹھ کر ہمارے اسمبلی کے ان عظیم ارکان کی یاد ستاتی ہے جو شروع میں لیگل فریم ورک آرڈر کے تحت آئین ساز اور وفاقی قانون ساز اسمبلی کے لیے منتخب ہوئے تھے۔ مگر ہماری بدنصیبی کہ وہ یہاں حاضر نہیں ہیں۔ اور وہ یہاں کیوں موجود نہیں! ہمیں اس پہلو کا بھی کھوج لگانا ہوگا۔ وہ اس لیے موجود نہیں کہ اقلیتی جماعت کے قائد نے اکثریتی جماعت کے قائد کو برباد کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا، کسی بھی ملک میں جب اقلیتی جماعت کا قائد اکثریتی جماعت کو تہس نہس کرنے کا فیصلہ کرتا ہے تو ہمیشہ انتشار جنم لیتا ہے ہمیشہ بحران پیدا ہوتا ہے اور ہمیں اس ملک میں بحرانی کیفیت اس وجہ سے دیکھنا پڑی کہ قائد موصوف پر اقتدار اور صرف اقتدار کا بھوت سوار تھا اور اس نے حصولِ اقتدار کے لیے ملک تباہ کر دیا۔ مسٹر پریذیڈنٹ! یہی وہ لیڈر تھا جس نے ۱۴ر فروری ۱۹۷۱ء کو پشاور میں کہا تھا کہ پیپلز پارٹی قومی اسمبلی کے آئندہ اجلاس میں شرکت نہ کرے گی۔ کیونکہ ہمیں "دوہرا یرغمال" بنا لیا جائے گا اور یہ کہ ہم مذبح خانے میں جا رہے ہوں گے۔ پھر اسی قائد نے ۲۸ر فروری کو لاہور میں کہا تھا۔ جو کوئی بھی ڈھاکہ جائے گا اس کی ٹانگیں توڑ دی جائیں گی اور ڈھاکہ جانے والا ایک طرف کا ٹکٹ لے کر جائے گا۔"

مسٹر ڈپٹی اسپیکر: مسٹر احمد رضا خان! ضوابط کے مطابق میں آپ سے درخواست کروں گا کہ آپ اصولوں پر بات کریں۔

صاحبزادہ احمد رضا خان قصوری: میں اصولوں کی طرف آرہا ہوں۔ میں آپ کو آئین کی تاریخ بتا رہا ہوں، اگر مسٹر پیرزادہ آئین کی تاریخ بیان کر سکتے ہیں، تو میں بھی اسی تاریخ کے حوالے سے بات کر سکتا ہوں۔

مسٹر ڈپٹی سپیکر: انہوں نے کسی کو مغلظات نہیں بکیں اور میں اس بلند پایہ ایوان کے کسی رکن کو کسی شخص کے بارے میں مغلظات بکنے کی اجازت نہیں دے سکتا۔

صاحبزادہ احمد رضا خان قصوری: میں مغلظات نہیں بک رہا۔ میں تو فقط تاریخ بیان کر رہا ہوں۔ اگر کسی کے لیے تاریخ کو ہضم کرنا مشکل ہو تو یہ میرا قصور نہیں۔ تاریخی حقائق کے بیان سے مجھے کوئی شخص نہیں روک سکتا۔

مسٹر ڈپٹی اسپیکر: صدر کے بارے میں اور چیئرمین کے بارے میں یہ کلمہ گستاخانہ ہے۔ صدر اجلاس کے بارے میں آپ نے جو رائے زنی کی وہ گستاخانہ ہے۔

صاحبزادہ احمد رضا خان قصوری: میں نے کوئی رائے زنی نہیں کی۔ صدر اجلاس کے بارے میں ایسی رائے زنی کرنے والا کم از کم میں ہرگز نہ ہوں گا۔ میں ہائی کورٹ بار کا رکن ہوں۔ اور میں اس امر سے آگاہ ہوں کہ خوش خلقی کیا شے ہے اور صدر اجلاس کی عزت و تکریم کیسے کی جاتی ہے۔ اس بارے میں آپ کی جانب سے سبق آموزی پر میں آپ کا شکر گزار ہوں۔

میں موضوع کی طرف آرہا ہوں۔ میں کہہ رہا تھا۔ اس لیڈر نے اعلان کیا کہ جو بھی جائے گا، یک طرفہ ٹکٹ پر جائے گا اور اس لیڈر نے ۱۴؍ مارچ ۱۹۷۱ء کو کراچی کے پٹیل پارک میں کہا! "اُدھر تم ادھر ہم": مجھے مغربی پاکستان میں اکثریت حاصل ہے اور تمھیں مشرقی پاکستان میں، چنانچہ مشرقی پاکستان میں الگ اور مغربی پاکستان میں الگ انتقال اقتدار ہونا چاہیے۔ وہ جانتا تھا کہ اکثریتی جماعت اس کی ایک بات ماننے کے لیے تیار نہیں۔ پانچ نکات پر اتفاق ہو گیا تھا۔ فقط ایک نکتے پر اتفاق نہ ہوا تھا اور وہ "اقتدار میں شرکت" کا نکتہ تھا۔ اکثریتی جماعت کا لیڈر اگر شرکت اقتدار پر آمادہ نہ تھا تو میں قصوروار نہیں۔ اکثریتی جماعت کا لیڈر اگر شرکت اقتدار پر آمادہ نہ تھا تو پنجاب قصوروار

اکثریتی جماعت

نہیں۔

کالیڈر اگر شرکت اقتدار پہ تیار نہ تھا تو پاکستان کے لاکھوں محنت کش قصور وار نہیں، مگر میرے ملک کو نقصان کیوں پہنچا۔؟ میرے ملک کو ذلت و رسوائی سے دو چار کیوں ہونا پڑا۔؟ اس کی ذمہ داری کسی پر عائد نہیں ہوتی، سوائے اس شخص کے جس پر حصولِ اقتدار کا بھوت سوار تھا۔ تاریخ اس مجرم کو پکڑے گی۔ تاریخ اس شخص کو رائے عامہ کے کٹہرے میں لاکھڑا کرے گی اور اس شخص کو جواب دینا ہوگا، وہ بچ کر نہ جا پائے گا۔

مسٹر ڈپٹی سپیکر: مسٹر احمد رضا قصوری! اس ایوان کو پاکستان پیپلز پارٹی کی تاریخ سے کوئی دل چسپی نہیں۔

صاحبزادہ احمد رضا خان قصوری: مجھے تو تاریخ ریکارڈ کرانے میں بہت دلچسپی ہے۔

مسٹر عبدالحفیظ پیرزادہ: میں پوائنٹ آف آرڈر پیش کرنا چاہتا ہوں۔

مسٹر ڈپٹی سپیکر: براہ کرم آپ اپنی نشست پر تشریف رکھیں۔

مسٹر عبدالحفیظ پیرزادہ: اس شخص کو بتایا جانا چاہیئے کہ وہ اپنی آواز اس طرح بلند نہ کرے۔ اس کا کسی کو ڈر نہیں۔ وہ لوگوں کو ڈرا نہیں سکتا۔ اس ایوان میں صدر کی ذات زیر بحث لائی جا رہی ہے جو ضابطے کی رو سے جائز نہیں۔ اسے ایوان کے ضابطوں کا علم ہونا چاہیئے۔ وہ ایسے الفاظ استعمال نہیں کر سکتا۔

مسٹر ڈپٹی سپیکر: مسٹر احمد رضا قصوری! جیسا کہ آپ نے کہا، آپ عدالت عالیہ کے معروف وکیل ہیں، میں فقط یہ گزارش کروں گا کہ آپ اس سلسلے میں ضابطے بھی دیکھ لیں۔

صاحبزادہ احمد رضا خان قصوری: میں کئی ضابطے بتا سکتا ہوں۔ میری ساری تقریر ضابطوں سے مزین ہو گی۔

مسٹر عبدالحفیظ پیرزادہ: میں ان سے درخواست کروں گا کہ وہ صدر کی ذات کے بارے میں بات نہ کریں۔

صاحبزادہ احمد رضا خان قصوری: لیاری یا ملیر کے معزز رکن! براہ کرم تم بیٹھ جاؤ۔

مسٹر عبدالحفیظ پیرزادہ! تم لیاری کے عوام کا توہین آمیز تذکرہ کر رہے ہو۔؟

مسٹر ڈپٹی سپیکر! انہیں تحقیر آمیز الفاظ استعمال نہ کرنے چاہئیں۔ ہمیں تاریخ سے سروکار نہیں، انہیں ضابطوں کے مطابق موضوع پر بحث کرنا چاہیئے۔ ان کی اطلاع کے لیے، میں ان کی توجہ ضابطہ ۷۰ کی جانب

دلاؤں گا۔

صاحبزادہ احمد رضا خان قصوری! جناب والا! اس ایوان کی دوسری جانب سے اگر کوئی رکن تقریر کر رہا ہو تو آپ کو انہی ضابطوں کی پیروی کرنا ہوگی۔

مسٹر ڈپٹی اسپیکر: یہ آپ مجھ پر چھوڑ دیں مسٹر احمد رضا خان قصوری! میں جب اس کرسی پر بیٹھا ہوں، تو سب ارکان میرے لیے برابر ہوتے ہیں اور آپ کو ضابطہ ۶۰ ضرور دیکھنا چاہیئے۔

صاحبزادہ احمد رضا خان قصوری: میں ضابطے جانتا ہوں۔ میں چیچوکی ملیاں سے نہیں آیا۔

مسٹر ڈپٹی سپیکر! یہ آپ کا دعویٰ ہے کہ آپ ضابطے جانتے ہیں۔ کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ آپ ضابطہ ۶۰ کے بارے میں ایوان کو کچھ بتانا پسند فرمائیں گے۔؟ اسے پڑھیے گا نہیں، آپ بتائیے، ضابطہ ۶۰ کیا ہے، میری آپ سے فقط یہ گزارش ہے کہ آپ اچھی تقریر کریں۔ حزب اختلاف کی جانب سے آپ بحث کا آغاز کر رہے ہیں۔ آپ کو اچھی تقریر کرنی چاہیئے۔ اور اسی لیے میں آپ سے کہہ رہا ہوں کہ آپ ضابطے ملاحظہ کریں اور اچھی تقریر کریں۔

صاحبزادہ احمد رضا خان قصوری! کیا میں تقریر وہیں سے شروع کروں جہاں میں نے چھوڑی تھی! جناب والا! میں عرض کر رہا تھا کہ ملک یکے بعد دیگرے بحرانوں سے دوچار ہے، آج ہماری عزت و ناموس خاک میں مل چکی ہے۔ ہماری فوجوں کو شکست سے دوچار ہونا پڑا۔ ہم اپنے نصف سے زائد ملک سے ہاتھ دھو بیٹھے۔ ہماری سرحدوں کو خطرہ ہے۔ یہ ہے (آج کی) صورت حال۔

مسٹر ڈپٹی سپیکر! اگلا نکتہ! بات دہرائیے گا نہیں۔

صاحبزادہ احمد رضا خان قصوری! ہم گھمبیر اخلاقی بحران اور تاریخی کرب کے سائے تلے آج یہاں اکٹھے ہوئے ہیں۔ ہم پر تاریخ کی جانب سے یہ فرض عائد ہوتا ہے۔ تاریخ کے ساتھ ہمارا قول و قرار ہے کہ ہم اس ملک کو بچائیں جو مقتل بنا ہوا ہے اور جس کی عالیشان عمارت ملبے میں تبدیل ہو چکی ہے۔ ہمیں "خشت واژ" اس ملک کی تعمیر کرنا ہے۔ ہمیں اس ملک کو صحیح بنیادوں پر تعمیر کرنا ہے اور یہی وجہ ہے کہ ہم آج یہاں ایسے آئین کی تشکیل کے لیے جمع ہوئے ہیں، جو دلپذیر اور قابلِ عمل ہو، کیونکہ آئین تو ملک کے لیے ڈھانچے اور بنیاد کی حیثیت رکھتا ہے۔ آئین ہی وہ بنیادیں فراہم کرتا ہے جس پر ہم جلیل و جمیل عمارت تعمیر کر سکتے ہیں، شہرہ آفاق عمارت بنا سکتے ہیں۔ آئین تو لوگوں کے مابین مل جل کر رہنے

کا معاہدہ ہوتا ہے۔ یہ وفاقی اکائیوں کا مساوات بھی اکٹھے مل کر رہنے کا متفقہ عزم ہوتا ہے۔ کوئی بھی شخص اس دعوے کی بنیاد پر کہ ہمیں اکثریت حاصل ہے آئین سازی نہیں کر سکتا۔ کوئی جماعت بھی انفرادی طور پر دستور نہیں بنا سکتی کیونکہ ہم دستوری سازی کسی خاص جماعت کے لیے نہیں کر رہے۔ ہم دستور کسی خاص نسل کے لیے بھی تشکیل نہیں دے رہے۔ اس کے برعکس ہم آئندہ نسلوں کے لیے دستور بنا رہے ہیں، ہم ایسا دستور بنا رہے ہیں جو بدلتے ہوئے حالات کے تقاضے پورے کرتا رہے۔ ایسا دستور جو پچاس سال بعد بھی پاکستان کے عوام کی ضروریات کو پورا کرے۔ ان کے مطالبات سے ہم آہنگ ہو اور ان کی امنگوں کو پروان چڑھائے۔ لہٰذا ہمیں پاکستان کے مختلف صوبوں میں رہنے والے عوام کے لیے باہمی اتحاد و اتفاق، برادرانہ ارتباط اور محبت و یگانگت کے عظیم الشان محل کے لیے بنیادیں رکھنا ہیں۔ اسی اساس پر دستور کو قائم ہونا چاہیے۔ چنانچہ اکثریتی جماعت یہ دعویٰ نہیں کر سکتی کہ ہمیں دستور سازی کے اعزاز پر اجارہ داری حاصل ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ آئین کو قوم کی متفقہ رائے پر استوار ہونا چاہیے۔ اگر بلوچستان سے تعلق رکھنے والے پانچ ارکان دستور اساسی پر اتفاق نہیں کرتے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ وفاق کی ایک اکائی نے اکٹھے مل کر زندگی گزارنے کے قومی معاہدے میں شرکت سے انکار کر دیا ہے، لہٰذا کوئی شخص یہ دعویٰ اگر سکتا کہ چونکہ ہمیں اکثریت حاصل ہے، اس لیے خان قیوم خان کے الفاظ میں "ہم آئین کو بلڈوز کر سکتے ہیں" (یعنی اکثریت کے دباؤ سے رکاوٹیں ہٹا کر دستور بنا سکتے ہیں۔) اور یہ عجیب بات ہے کہ وہ خود بھی بل ڈوزر لگتے ہیں، لیکن اس کے باوجود کوئی شخص بھی اس طرح دستور سازی نہیں کر سکتا۔

مسٹر خان عبدالقیوم خان: میرا خیال ہے، کسی اور رکن نے لفظ بل ڈوزر کا استعمال کیا تھا۔ مجھے افسوس ہے، میں نے لفظ بل ڈوزر کا استعمال نہیں کیا تھا۔

صاحبزادہ احمد رضا خان قصوری: کیا آپ ویسے نظر نہیں آتے۔؟

ایک رکن: میاں محمود علی کے بارے میں کیا خیال ہے!

صاحبزادہ احمد رضا خان قصوری: وہ سٹیم رولر ______ لگتے ہیں۔ تو جناب والا! میں عرض کر رہا تھا، اکثریت یہ نہیں کہہ سکتی کہ ہم آئین کو بل ڈوز کر سکتے ہیں یا یہ کہ ہم سٹیم رولنگ کے ذریعے دستور منظور کر سکتے ہیں۔ اسی طرح جب ہم ڈھاکہ جا رہے تھے، پی پی پی نے کہا: ہم ڈھاکہ جانا نہیں چاہتے، کیونکہ اکثریتی جماعت آئین کو بل ڈوز کرنے کا منصوبہ بنا رہی تھی۔

یہ وہ چند خدشات تھے، جن کا برسرِ عام اظہار کیا گیا۔ میں پہلے عرض کر چکا ہوں۔ اختلافات تو فقط ایک

نکنے پر تھا۔ پانچ نکات پر تو مکمل اتفاق ہو چکا تھا، تاہم قوم میں اتفاق رائے دستور کی بنیاد فراہم کرتا ہے۔

جناب والا! ہمارے سامنے دستور سازی کے دو عظیم اجتماعات کی مثالیں موجود ہیں۔ ہمارے سامنے فرانس کی مثال ہے۔ جہاں ایک سو پچھتر سال بعد "ایسٹیٹ جنرل" کو وجود میں لایا گیا اور تیسری ایسٹیٹ نے ۲۲ جون ۱۷۸۹ء کو فیصلہ کیا کہ اس کی نشست بطور قومی اسمبلی ہو۔ تیسری اسٹیٹ میں جس کی نشست بطور قومی اسمبلی ہوئی مختلف نقطہ ہائے نظر کے لوگ شریک تھے۔ ان کا تعلق کورڈیلیر کلب اور جیکوبنز کلب سے تھا۔ یہ مختلف سیاسی جماعتیں بنیادی معاملات پر مختلف آراء رکھتی تھیں۔ مگر کورڈیلیر اور جیکوبنز جماعتوں میں دستور کے مسئلے پر اتفاق رائے ہو گیا۔ کیونکہ انہوں نے محسوس کیا کہ انہیں فرانس کے عظیم عوام کو بنیادی دستاویز تیار کر کے دینی ہے۔ پھر ہمارے پاس امریکہ میں ۱۷۸۹ء کی فلاڈلفیا کونسٹی ٹیوشنل کنونشن کی مثال ہے۔ جس میں تیرہ ریاستوں کے لیڈر جمع ہوئے اور انہوں نے آئین (کی تشکیل) کے ذریعے ریاست ہائے متحدہ امریکہ کو جنم دیا، جناب والا! پھر یہ بھی ہے کہ ان میں قومی سطح پر اتفاق رائے ہوا۔ کیونکہ آئین ہمیشہ اتفاق رائے کی بنیاد پر ظہور پذیر ہوتے ہیں دساتیر کبھی جماعتی بنیادوں پر نہیں بنائے جاتے، کیونکہ جو آئین جماعتی بنیادوں پر استوار ہو، وہ اس جماعت کے اقتدار سے الگ ہونے پر چھکا لگا کر بونڈری سے باہر پھینک دیا جاتا ہے۔ اس ملک میں ہم نے دیکھا ہے کہ دستور کو سوٹ کی مانند اپنے سائز کے مطابق کاٹ لیا جاتا ہے، چنانچہ چشم تصور سے ملاحظہ کیجیے کہ دستور بنانے والے شخص کے اقتدار سے رخصت ہونے پر جب خان قیوم خان جیسا بھاری بھرکم شخص آیا تو یہ کہتے ہوئے کہ دستور بہت تنگ ہے اس نے دستور پھاڑ دیا۔ اور کچھ عرصے بعد جب ڈاکٹر مبشر جیسا دبلا پتلا انسان آیا تو کہنے لگا یہ دستور تو بہت ڈھیلا ہے، بہت کھلا ہے اور اس نے اسے اپنی مرضی کے مطابق دوبارہ سلوایا۔ آئین کو سوٹ کی مانند نہ ہونا چاہیئے۔ کہ اگر ڈاکٹر مبشر پہنے تو بہت ڈھیلا لگے، اور مسٹر قیوم خان پہنے تو بہت تنگ ہو، اور اس کی دھجیاں اڑادی جائیں۔

مسٹر خورشید حسن میر: میاں محمود علی قصوری کے علم میں ہے کہ ابھی ایوان میں، آئے ہیں یہ بات لانی چاہیئے کہ مسٹر احمد رضا قصوری ان سے اپنا سوٹ بدلنا چاہتے ہیں۔

صاحبزادہ احمد رضا خان قصوری: میرا ایک دوست تھا جس کی شکل و صورت میرے دوست معزز وزیر بے محکمہ سے ملتی جلتی تھی۔ میں نے اس کا نام "کدو" رکھا ہوا تھا۔

مسٹر ڈپٹی سپیکر: میں آپ سے درخواست کروں گا کہ معزز رکن کے بارے میں بولا ہوا لفظ واپس لیا جائے۔

صاحبزادہ احمد رضا قصوری : وہ میرے دوست ہیں۔

مسٹر ڈپٹی سپیکر : نہیں، نہیں! میرا خیال ہے وکیل ہونے کے ناطے سے آپ اس امر سے آگاہ ہیں کہ آپ نے کیسا کنایہ استعمال کیا ہے۔

مسز خورشید حسن میر : میں صدرِ مجلس سے درخواست کروں گا کہ یہ لفظ ریکارڈ پر رہنے دیا جائے ایسے الفاظ ان پر خوب صادق آتے ہیں۔ کیونکہ ایسی گفتگو انہیں پسند ہے۔ یہ لفظ ریکارڈ پر رہنا چاہیئے تاکہ ریکارڈ ان کی شخصیت کی عکاسی کرتا رہے۔

مسٹر ڈپٹی سپیکر : اس بلند پایہ ایوان کے کسی معزز رکن کے بارے میں اس طرح کا کوئی لفظ استعمال نہ ہونا چاہیئے۔

صاحبزادہ احمد رضا خان قصوری : میں ریکارڈ کو سفید رکھنے کے لیے لفظ واپس لیتا ہوں آیئے ہم پھر "سیاہ سفید" سے گفتگو کا آغاز کریں۔

مسٹر ڈپٹی سپیکر : ٹھیک ہے۔

صاحبزادہ احمد رضا خان قصوری : تو جناب والا! میں عرض کر رہا تھا کہ جب دستور ساز اسمبلی کا اجلاس ہو تو اس میں کوئی حزب اختلاف ہوتی ہے اور نہ حزب اقتدار۔ دستور ساز اسمبلی کا ہر رکن اپنے ضمیر، پاکستان کے عوام اور تاریخ سے کیے گئے قول و قرار کے معاملہ میں اتنا ہی ذمہ دار ہوتا ہے، جتنا اس ملک کے اعلیٰ ترین عہدے پر فائز کوئی فرد ہو سکتا ہے، چنانچہ آئین ساز اسمبلی کے اجلاس میں ہر رکن کی مساوی حیثیت ہوتی ہے، ہم میں سے ہر ہر رکن پاکستان کے سارے عوام کے سامنے جوابدہ ہوتا ہے۔ لہٰذا یہاں نہ کوئی حکومت موجود ہوتی ہے اور نہ کوئی حزب اختلاف، یہاں تو فقط ضمیر موجود ہوتا ہے اور ہمیں آئین ضمیر کے مطابق بنانا ہوگا، کیونکہ ہم میں سے کوئی بھی حکومت یا حزب اختلاف کی نمائندگی نہیں کر رہا، ضمیر ہے، تاریخی قول و قرار ہیں اور پاکستان کے عوام اور آئندہ نسلوں کی جانب سے عائد شدہ اخلاقی فریضہ ہے، چنانچہ یہ ہمارا اخلاقی فرض ہے کہ ہم پاکستان کے عوام کو ایسا دستور دیں، جس کی اساس مستحکم ہو، یہ آئندہ صدیوں تک زندہ رہے پائندہ رہے۔ ریاست ہائے متحدہ امریکہ کے دستور کی مانند جو آج بھی حد درجہ مضبوط و معقول اور قابل عمل ہے۔ وہاں کے بارے میں ہم یہ نہیں سنتے کہ ایک جرنیل آیا اور اس نے دستور کو منسوخ کر دیا، وہاں کے بارے میں ہم یہ نہیں سنتے کہ ایک سیاسی آمر مسلط ہو گیا۔ دساتیر ہمیں اداروں کے احترام کا درس دیتے ہیں۔ ہم جب شخصیتوں کی

پرستش شروع کر دیتے ہیں تو ملک ہمیشہ خطرے سے دوچار ہو جاتا ہے اور یہ ملک اس طرح کی سیاسی افراتفری، اقتصادی انتشار اور بین الاقوامی معیار سے اس لیے دوچار ہوا کہ ہمارا تمام تر دار ومدار شخصیات پر رہا۔ یہی وجہ ہے اس ملک پر ہمیشہ یہ خوف طاری رہتا ہے کہ اگر فلاں فلاں آدمی اقتدار میں نہ رہا تو پھر کیا ہو گا۔ آدمی مر بھی سکتا ہے، کسی نے حضرت عمرؓ سے دریافت کیا: آپ انتظامیہ کے فلاں اہم شخص کو کیوں تبدیل فرما رہے ہیں؟ لوگوں نے ان سے پوچھا: اگر اس شخص کو تبدیل کیا گیا۔ تو اس کی جگہ کس کی تقرری ہو گی؟ حضرت عمرؓ نے سوال کیا" کیا اسے موت نہیں آ سکتی؟" جواب ملا: جی ہاں۔ موت آ سکتی ہے۔ اس پر حضرت عمرؓ نے جواب میں فرمایا: یہ سمجھ لو وہ فوت ہو گیا ہے اور ہمیں اس کی جگہ نئے شخص کو مقرر کرنا ہے"۔ لہٰذا جناب والا! ہم ملک کا مستقبل شخصیتوں سے وابستہ نہیں کر سکتے، مگر ہمارے ملک میں ملکی مستقبل شخصیتوں سے وابستہ کرنے کی ریت رہی ہے اور اسی لیے ہمیں بحران، افراتفری اور انتشار کا سامنا کرنا پڑا۔ جناب والا، خان عبدالقیوم خان مضبوط مرکز پر ایمان رکھتے ہیں۔ انہیں مضبوط مرکز دے دیجیے۔ ہم استحکام کی بات کرتے ہیں۔ استحکام ہے کیا؟ استحکام کا مطلب ہے، اپنی ذات کا استحکام مضبوط مرکز کے معنی ہیں۔ مرکز ذات میں انہماک۔ خارجی حقائق سے مراد ہے داخلی حقائق، وجہ؟ وہ شخص اپنی ذات کے لیے سب کچھ چاہتا ہے۔ ہم اداروں کا قیام نہیں چاہتے۔ لوگ ملکی اداروں کے تابع نہیں، اگر شخصیتیں اداروں کی تابع ہوں تو ایسی اصطلاحات ایسے نعروں کی ضرورت نہ ہو گی۔ میکاولی نے ایک بار کہا تھا! اگر تمہیں عوام کے حقوق غصب کرنا ہوں، تو ان سے بلند بانگ دعووں میں گفتگو کرو۔ کھوکھلے دعوے جو قوم کو چکرا دیں: "لوگ سوچتے رہیں، وہ ان کے مفاہیم اور توجیہات میں الجھے رہیں اور خان قیوم خان کے پوتے تک کو بھی تحفظ مل جائے۔ یہ نہیں ہونا چاہیے کہ آئین خان قیوم خان کو تحفظ فراہم کر دے مگر ان کے بیٹے کو زنداں کے حوالے کر دیا جائے۔ ہمیں ایسا آئین نہیں چاہیے، جس کی خان قیوم خان وکالت کرتے ہیں۔ ہمیں اچھے ادارے درکار نہیں۔ یہی نہیں بلکہ ہم ایسی فضا پیدا کریں کہ ہم اداروں کا احترام کرنے لگیں۔ ان اداروں کو تقدس حاصل ہونا چاہیے اور ہماری سوچ یہ ہونی چاہیے کہ آدمی آئے، آدمی جائے، مگر ادارے ضرور قائم رہیں۔ یوں ہم اس ملک کو پھر سے پٹڑی پر نہیں ڈال سکتے، لیکن اگر ہم اسے پٹڑی پر ڈالنے کا عزم کریں، اپنی منزل مقصود کی جانب بڑھنے کا عزم کریں، تو اس صورت میں ہمیں آج پاکستان سٹیٹ بنک کی عمارت میں پاکستان کے عوام کو ان کی ضروریات اور تمناؤں اور ان کے ضمیر کے عین مطابق قابل عمل، معقول اور زندہ و پائندہ دستور۔ قابل قبول دستور دینے کا ہمیشہ ہمیشہ کے لیے فیصلہ کرنا ہو گا۔ ایسا دستور جو عوام کے ذوق سے مطابقت رکھتا ہو۔ وقت کی ضرورت ہے،

عوام کے ذوق سے کیا مراد ہے! یہ دراصل دستور بنانے والے شخص کے ذوق ہی کا تو نام ہے۔ باقی سب فرسودہ باتیں ہیں۔ مجھے افسوس ہے، مجھے یہ سب کچھ بیان کرنا پڑا، لیکن میں نے یہ سب کچھ پاکستان میں آئین سازی کی تاریخ کا ریکارڈ صحیح رکھنے کے لیے بیان کیا ہے۔

جنابِ والا! وزیر قانون مسٹر پیرزادہ نے اپنی قدرے طویل تقریر میں "پارٹی وہپ" (WHIP)، وہ شخص جو پارلیمنٹ میں پارٹی کے ارکان کو لانے، لے جانے، اکٹھا کرنے اور ان میں نظم و ضبط پیدا کرنے کا ذمہ دار ہوتا کا تذکرہ کیا ہے۔ انہوں نے فرمایا ہے! پارٹی وہپ کی شان میں گستاخی نہیں کی جاسکتی۔ جناب والا! پہلی بات تو یہ کہ آئین سازی میں وہپ کا کوئی وجود نہیں ہوتا۔ وہپ کی تین اقسام ہیں، یک رُخا، دو رُخا اور سہ رُخا وہپ پارٹی کے ارکان کو نقطہ بتاتا ہے کہ فلاں وقت اور فلاں مقام پر اجلاس ہوگا۔ جس میں ووٹ نہ لیے جائیں گے۔ دو رخا: فلاں وقت اور فلاں مقام پر اجلاس ہوگا۔ جس میں ووٹنگ کا امکان ہے۔ سہ رُخا، فلاں وقت اور فلاں مقام پر اجلاس ہوگا۔ جس میں ووٹنگ لازماً ہوگی۔ مگر انگریزوں کے پارلیمانی نظام میں اس امر کا کوئی ذکر اذکار نہیں کہ وہپ کے ذریعے ارکان کو خاص نہج پر ووٹ دینے کی ہدایت کی جاسکتی ہے۔ اگر پارٹی مجلس قانون ساز کو کسی خاص سمت ووٹ ڈالنے کی ہدایت جاری کرے تو اس سے ایوان کے مقتدرِ اعلیٰ ہونے پر حرف آتا ہے اس نکتے پر انگلستان میں بڑی بحث ہوئی تھی۔

جنابِ والا! ۱۹۳۵ء میں مسٹر اٹیلی نے "لیبر پارٹی صحیح تناظر میں" کے عنوان سے ایک مضمون لکھا۔ اس مضمون میں مسٹر اٹیلی نے یہ نقطۂ نظر پیش کیا کہ ایوان سے باہر کیے گئے، لیبر پارٹی کے فیصلوں کا اطلاق پارلیمان کے جماعتی ارکان پر ہوتا ہے۔ ۱۹۳۵ء میں مسٹر اٹیلی کے اس مضمون کا کسی نے نوٹس نہ لیا۔ مگر ۱۹۴۵ء میں جب مسٹر ونسٹن چرچل نے مسٹر اٹیلی کو (اپنے ہمراہ) پوٹسڈم کانفرنس میں لے جانے کا فیصلہ کیا تو مسٹر ہیرالڈ لاسکی صدر لیبر پارٹی نے کہا: مسٹر اٹیلی پوٹسڈم کانفرنس میں لیبر پارٹی کے ڈسپلن تلے رہتے ہوئے شرکت کریں گے۔ مسٹر ونسٹن چرچل نے یہ بات تسلیم نہ کی اور پھر ایک بحث چھڑ گئی۔ یہ بحث اس نتیجے پر پہنچی کہ ایوان سے باہر کیے گئے پارٹی کے فیصلوں کی پابندی ارکانِ پارلیمنٹ پر عائد نہیں ہوسکتی، کیونکہ اگر پارٹی کے ارکان پارلیمان مذکورہ فیصلوں کے پابند قرار دیئے جائیں، تو اس سے پارلیمان کے مقتدرِ اعلیٰ (SOVEREIGN) ہونے کی مکمل نفی ہوگی جبکہ پارلیمان "عوام کی حاکمیت" کی امین ہے، اس طرح تو جمہوریت تباہ ہو جائے گی۔ جنابِ والا! ہٹلر بھی کسی ناگہانی انقلاب، کسی فوجی انقلاب کے ذریعے اقتدار میں نہ آیا تھا۔ ہٹلر نے ووٹ اور جمہوریت کے راستے اقتدار حاصل کیا

تھا۔ ہٹلر پارلیمان کے ذریعے آمر بن بیٹھا۔ ہٹلر کسی فوجی انقلاب کے ذریعے آمر نہ بنا تھا، وہ پارلیمان کے توسط سے آمر بنا۔ جناب والا! ۱۹۳۲ء میں اس نے ریشتاغ (پارلیمان) کی عمارت کو نذرِ آتش کیا۔ اس نے اپنے تمام مخالفین بالخصوص اپنی ہی پارٹی کے غیر متفقین (DISSIDENTS) اور کمونسٹ گرفتار کر لیے، اور اس نے خوفزدہ پارلیمان کے ذریعے جو آمر سے ہر وقت خائف رہتی تھی، وہ قانون منظور کرایا جسے اختیار دینے والا، مجاز بنانے والے یعنی (ENABLING LAW) کہا جاتا ہے، مگر اس قانون کے ذریعے اس نے تمام اختیارات خود حاصل کر لیے اور "جرمن فیورر" بن بیٹھا، اور ایک روز وہ بڑی لاپرواہی کے عالم میں پارلیمنٹ میں آیا اور کہنے لگا "شرفائے گرامی! مجھے آپ کی ضرورت نہیں۔ آپ اپنے اپنے گھر کی راہ لیں"۔ تو دیکھا آپ نے، وہ کسی ناگہانی انقلاب کے ذریعے حاکم نہ بنا تھا۔ جناب والا! اس نے جرمن پارلیمنٹ کے آتشزنی کے واقعے کی آڑ لے کر اپنے مخالفین کو چن چن کر دھر لیا۔

اس ملک میں بالخصوص تاریخی موڑ پر جب ہم دستور پر غور کرنے کو تھے۔ ریشتاغ کی آتشزنی کی مانند "ناجائز اسلحہ کا غل غپاڑہ" مچایا جا رہا ہے۔ آج ان لوگوں کا تعاقب کیا جا رہا ہے۔ جو آمرانہ آئین کے خلاف ڈٹ جانے کو ہیں۔ مسٹر سپیکر، سر، یہ تلاش اب بھی جاری ہے۔ آپ گھر چلے جائیں۔ ہو سکتا ہے، آپ کے گھر سے بھی چند مشین گنیں برآمد ہوں۔ آمرانہ قوانین سے اپنی کھال بچائیے۔ یہاں، ہم تو فقط آپ کے حق میں قراردادیں منظور کر سکیں گے۔ لیکن آپ آہنی سلاخوں کے پیچھے بند ہوں گے اور سر، خان قیوم خان تک بھی آپ کو بچانے کی پوزیشن میں نہ ہوں گے۔ سر! اگر ان قوانین سے آپ محفوظ نہیں، تو ہم چوہدری ظہور الٰہی کو کیسے بچا سکتے ہیں، میاں طفیل محمد کو کیسے بچا سکتے ہیں، اصغر خان کو کیسے بچا سکتے ہیں، عوام الناس کو کیسے بچا سکتے ہیں۔ یہ پکڑ دھکڑ اسی انداز کی ہے جیسی (ہٹلر کے دور میں) جرمن پارلیمنٹ کی عمارت کو نذرِ آتش کیے جانے کے بعد ہوئی، اس کا انتظام بڑی سلیقہ مندی سے ہوا۔ میری معلومات کے مطابق، توپ و تفنگ کی آمد اب بھی جاری ہے، میرے ٹھینگے سے!

(MY LEFT BLOODY FOOT)

مسٹر ڈپٹی سپیکر: یہ غیر پارلیمانی ہے۔

صاحبزادہ احمد رضا قصوری: جناب والا! میں اپنے الفاظ واپس لیتا ہوں میں بعض اوقات جذباتی ہو جاتا ہوں۔ جناب والا! میں نوجوان جو ہوں۔ تو جناب والا! میں نہایت ادب کے ساتھ اس ایوان میں

عرض گزار تھا کہ اس پکڑ دھکڑ کا نشان کون بنے گا! وہ لوگ جو اس پارلیمنٹ کے اندر یا پارلیمنٹ کے باہر دستور کی مخالفت کریں گے۔ آپ نے دیکھ لیا ہے، چوہدری ظہور الٰہی دھر لیے گئے، آپ نے یہ بھی دیکھ لیا ہے، مولانا طفیل محمد دھر لیے گئے، آپ یقیناً یہ بھی دیکھ لیں گے کہ اصغر خان بھی دھر لیے جائیں گے اور غالباً آپ یہ بھی دیکھ لیں گے کہ مجھے بھی دھر لیا جائے گا۔ میں اس سے نا آشنا نہیں، لیکن میں بقیہ پاکستان کو صحیح وسالم رکھنے، قائداعظم کا پاکستان سلامت رکھنے کے لیے اپنے خون کا آخری قطرہ تک بھی بہانے کو تیار ہوں۔ میں نے ان سیاہ بخت سازشی قوتوں سے ٹکرانے کا تہیہ کر لیا ہے جو میرے ملک کے عوام کی آزادی چھیننا چاہتی ہیں، جو میرے ملک کے بنیادی تصور، ملکی بقا کو نیست و نابود کرنے کے درپے ہیں۔ میں ان کے خلاف ڈٹ جاؤں گا اور میں اپنے دوست، خان قیوم خان سے گزارش کروں گا کہ وہ پچیس سال پرانے ہتھکنڈوں کو بھول جائیں کہ فلاں فلاں دشمنِ پاکستان ہے اور فلاں ابنِ فلاں غدار ہے۔

مسٹر عبدالقیوم خان: پوائنٹ آف آرڈر۔ جناب والا! میرے فاضل دوست اس ایوان کے ایک رکن کے گھر سے اسلحے کی برآمدگی کا حوالہ دے رہے ہیں۔ یہ معاملہ عدالت میں پیش ہے۔ اس معاملے سے میرا کوئی تعلق نہیں۔ اگر انہیں اس پر کہ دستور کا مرکز و محور میں ہوں یا میرا بار بار تذکرہ کر کے کوئی فرحت یا کوئی اطمینان محسوس ہوتا ہے تو الگ بات ہے، مگر یہ معاملہ عدالت میں جا چکا ہے، اور زیرِ تحقیقات ہے۔ میں معزز رکن سے درخواست کروں گا کہ وہ پیشِ عدالت معاملے پر تبصرہ کرنے سے گریز کریں۔

صاحبزادہ احمد رضا خان قصوری: اس بزرگانہ مشورے پر میں آپ کا شکر گزار ہوں۔

مسٹر ڈپٹی سپیکر: مسٹر احمد رضا قصوری: تقریر کے دوران تو یہ امر آپ کے پیشِ نظر ہوتا ہو گا کہ قومی اسمبلی یا آئین ساز اسمبلی پر کون کون سے ضوابط کا اطلاق ہوتا ہے۔ بہر حال محبِ وطن انسان کی مانند براہِ کرم آپ احتیاط برتیں تاکہ آپ کی تقریر سے کسی کو اذیت محسوس نہ ہو۔

صاحبزادہ احمد رضا خان قصوری: میں کسی کو جسمانی اذیت پہنچانا نہیں چاہتا، ورنہ ۔ ۔ ۔ ۔

مسٹر ڈپٹی سپیکر: آپ نے جیسا کہ کہا: آپ جذباتی ہیں، تو جذبات کی رو میں ملکی مفادات فراموش نہ کیجیے۔ ہاں فرمائیں!

صاحبزادہ احمد رضا خان قصوری: تو جناب والا! ہٹلر نے اپنی پارلیمانی جماعت سے کیا کہا! میں اس

کے اپنے الفاظ دہراتا ہوں: "اگر آج ہمارا عمل، بشمول پارلیمان مختلف ہتھیاروں سے مدد لیتا ہے، تو اس کا مقصد یہ نہیں کہ پارلیمانی پارٹی کا وجود نقطۂ نظام پارلیمان کے مقاصد حاصل کرنے کے لیے ہے۔ ہمارے نزدیک پارلیمان مقصود بالذات نہیں، بلکہ یہ تو حصول مقصد کا ایک ذریعہ ہے۔ ہم محض برائے اصول پارلیمانی پارٹی نہیں۔ کیونکہ ایسی سوچ تو سارے نظریے کا بطلان ہوگی۔ ہم آئینی مجبوری کے تحت پارلیمانی پارٹی ہیں اور یہ مجبوری ہم پر دستور نے ڈالی ہے۔ دستور ہمیں مجبور کرتا ہے کہ ہم ایسے ذرائع استعمال کریں اور اسی لیے جو فتح ہم نے ابھی حاصل کی ہے، اس کا مطلب فقط یہ ہے کہ ہم نے محاربے کے لیے نیا ہتھیار جیت لیا ہے قوم کی قسمت کا فیصلہ پارلیمانی اکثریت کو نہیں کرنا اور ہم جانتے ہیں کہ اس انتخاب میں جمہوریت کو جمہوریت ہی کے ہتھیار کے ذریعے شکست دینا ہوگی"۔

تو جناب والا! یہ ہٹلر کے الفاظ تھے اور اگر کوئی شخص ہٹلر کے نقش قدم پر چلنا چاہتا ہو تو اسے رائز اینڈ فال آف دی تھرڈ رئیش، ہٹلر کی نام نہاد جمہوریت کے عروج و زوال کا مطالعہ ضرور کرنا چاہیے، مگر میرا خیال ہے جو لوگ اس کے نقشِ قدم پر چلتے ہیں انہوں نے فقط عروج کا حال پڑھا ہے۔ زوال کا حال وہ گھر جا کر پڑھیں گے۔ میرا انہیں مشورہ ہے کہ وہ زوال کی کہانی بھی پڑھیں، کیونکہ یہ زوال بڑا ہی دردناک تھا۔ زوال کی یہ کہانی ہمیں بعض ایسے واقعات کو قریب سے جاننے کا موقع دیتی ہے۔ جن کے باعث جرمن سلطنت کا جسم مفلوج ہو کر رہ گیا تھا۔ ہمیں اس سے سبق سیکھنا چاہیے۔

جناب والا! میں جانتا ہوں، آپ کیا کہنے والے ہیں۔ میں اس نکتے کی جانب بھی آرہا ہوں۔ میں آپ کے ذہن سے واقف ہوں۔ بہر حال میں نے نفسیات کا کچھ مطالعہ کیا ہوا ہے، تو جناب والا! شق ۲۷۰ جس کے تحت یحییٰ خان کے قوانین کو آئینی تحفظ دیا گیا، عاصمہ جیلانی کیس میں جب اس شخص کو غاصب قرار دیا جا چکا ہے، تو کیا پاکستان کی مقتدر اسمبلی کے لیے موزوں ہوگا کہ یحییٰ خان کے نافذ کردہ قوانین کو جائز قرار دے! وہ غدار جس نے اس ملک کو تباہ کیا، اور وہ غدار جو میرے قبضے میں نہیں ہے۔ وہ غدار تو حکومت کے قبضے میں ہے۔ وہ حکومت کی تحویل میں مرغوب شراب نوش فرما رہا ہے، اس کے کتے بھی اس کے ساتھ ہیں، اس کی وہسکی بھی اس کے پاس ہے۔ اس کا ٹیپ ریکارڈ بھی اس کے پاس ہے، اور عورتیں بھی اس سے سوشل ملاقاتیں کرنے جاتی ہیں، کیا یہ ہاؤس اریسٹ (قید خانہ) ہے یا پاکستان کے عوام (کے غیظ و غضب) سے غدار کو محفوظ رکھنے کا بہانہ؟ یہ تحفظ اسے قومی خزانے کے خرچ پر فراہم کیا جا رہا ہے۔ کیونکہ اگر آپ ایک ایسے

شخص کے گھر پر گارڈ متعین کرتے ہیں جس کا اسے کوئی حق نہیں پہنچتا تو کیا یہ قومی سرمائے کا ضیاع نہیں ؟ میرے عزیز دوستو! تم قومی دولت کے خرچ پر ایک غدار کو تحفظ مہیا کر رہے ہو، جس کے بارے اس ملک کے ایک لیڈر نے حمود الرحمٰن کمیشن کی رپورٹ کے ایک حصے کا انکشاف کرتے ہوئے کہا کہ اسے غاصب اور غدار قرار دے دیا گیا ہے، بہر حال وہ لیڈر مولانا نورانی نہیں جو ایسا بیان دینے پر سولی چڑھائے جاتے۔ وہ انتہائی مقتدر لیڈر ہے۔ اسے کسی سے صلاح مشورے کرنے کی ضرورت نہیں۔ مولانا نورانی تو فقط ہیڈ پارک میں ایسی تقریر کر سکتے ہیں، جس پر وہ پھانسی کی سزا کے مستحق گردانے جائیں۔ پروفیسر غفور احمد بھی موچی دروازے میں ایسی ہی تقریر کر سکتے ہیں، لیکن ہم کچھ نہیں کر سکتے۔ ہم مجبور و لاچار ہیں، مگر وہ لیڈر مجبور و لاچار نہیں۔ غدار اس کی تحویل میں ہے۔ وہ عراق کے اتاشی کی طرح ملک چھوڑ کر نہیں گیا۔ کاش آپ نے اسے ملک سے باہر بھیج دیا ہوتا۔ اس سے آپ کا مقصد پورا ہو جاتا، کیونکہ اس ملک میں کی گئی ہر سازش میں سب سے پہلا کام جو کیا گیا وہ یہ تھا کہ ثبوت مٹا دیا گیا۔ لیاقت علی خان کے قاتل کو موقع واردات ہی پر ختم کر دیا گیا، کیونکہ قاتل کو ٹھکانے لگانے سے ثبوت ختم ہو کر ان کا مقصد پورا ہو گیا۔ عراق کے اتاشی کو ملک سے باہر جانے کی اجازت دینے سے بھی مقصد حل ہو گیا، کیونکہ یوں ثبوت مٹ گیا، اور ہر کس و ناکس کے خلاف موثر پکڑ دھکڑ آسان ہو گئی ایک غدار کو یہ تمام سہولتیں کیوں دی جائیں ؟ اس کے قوانین ہماری تاریخ کا جزو بن جائیں گے اور آئندہ نسلوں کو ہمارے چہروں پر کالک ملی نظر آئے گی۔ یہ معزز ایوان ان قوانین کی توثیق کیوں کرے ؟ مسٹر پیرزادہ ! اس منطق کی وضاحت فقط آپ ہی کر سکتے ہیں۔ اس منطق کی وضاحت کے لیے میں خود کو عجیب و غریب استعداد کا مالک نہیں سمجھتا۔

مسٹر عبدالحفیظ پیرزادہ : آپ منطق سے کورے ہیں۔

مسٹر ڈپٹی سپیکر : جی ہاں، وہ اس کا ثبوت بھی فراہم کر رہے ہیں۔

مسٹر عبدالحفیظ پیرزادہ : درست فرمایا۔ مجھے افسوس ہے، مجھے یہ بات کہنا پڑی وہ میرا نام لے رہے ہیں اور براہ راست مجھ سے مخاطب ہیں ! چنانچہ مجھے افسوس ہے کہ مجھے جواب دینا پڑا۔

صاحبزادہ احمد رضا خاں قصوری : آپ کو دوبارہ موقع ملے گا۔

مسٹر عبدالحفیظ پیرزادہ : وہ منطق سے عاری ہیں، مجھے ان سے اتفاق ہے۔

مسٹر ڈپٹی سپیکر : وہ دوسروں کی نسبت ضابطوں سے اچھی طرح واقف ہیں۔ انہیں ضابطوں کا ہم سب سے زیادہ علم ہوگا۔

لیس پلیز : مجھ سے مخاطب ہوں، مسٹر احمد رضا ! آپ تو تمام ضابطوں سے آگاہ ہیں۔

صاحبزادہ احمد رضا خان قصوری : کہ رہا تھا ، آپ نے تسلیم ، تو جناب والا! مسودہ آئین کی شق نمبر ایک سے، مشرقی پاکستان کے الفاظ بالکل ہی خارج کر دیئے گئے ہیں۔ مشرقی پاکستان کا کوئی ذکر نہیں ہے۔ وہ وفاق کی بھرریڑ کیوں لگاتے ہیں۔ یہ عجیب و غریب معاملہ ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ ہم بالواسطہ طور پر بنگلہ دیش کو تسلیم کرنے کی کوشش کر رہے ہیں، جو بھارتی جارحیت کی ناجائز اولاد ہے، جو بیرونی طاقت اور اس ملک کے بعض سیاسی عناصر اور شخصیتوں کی ملی بھگت کا نتیجہ ہے، ہم اسے قانونی حیثیت دے رہے ہیں، آئینی حیثیت دے رہے ہیں۔ یہ غلط بات ہے! پاکستان کے عوام اس صورت حال کو قبول نہ کریں گے۔ آپ نے جس خوب صورت آئینی طرز بیان، آئینی انداز اظہار کے ذریعے بنگلہ دیش کو تسلیم کرنے کی کوشش کی ہے، اسے پاکستان کے عوام خوب سمجھتے ہیں، یکے بعد دیگرے افتاد پر افتاد پڑنے کے بعد لوگ اب بہت سمجھ دار ہو گئے ہیں، وہ تجربہ کار ہو گئے ہیں۔ وہ روز بروز زیادہ عقل مند ہوتے جا رہے ہیں۔ دیکھئے! آپ فقط اٹارنی جنرل کے مشورے پر عمل پیرا ہو کر پاکستان کے لوگوں کو دھوکہ نہیں دے سکتے خواہ اٹارنی جنرل بہت ذہین آدمی ہی کیوں نہ ہوں اس کی ذہانت فقط قانون کی عدالت تک ہے، عوام کی عدالت میں اس ذہانت کا جادو نہیں چل سکتا۔ وہ ذرا موچی دروازے میں عوام کی عدالت کے سامنے بنگلہ دیش کے بارے میں یہ دلیل دے کر تو دکھائے اور اگر وہاں سے صحیح سالم نکل آئے تو پھر کہنا۔ یہی تو بات ہے، تو جناب والا! میرے ملک کے ایک جزو لاینفک کو وفاق کی تعریف میں کیوں شامل نہیں کیا گیا؟ کاش میں اس ہاتھ کو توڑ سکوں، جس نے میرے ملک کے جزو لاینفک کو توڑ پھینکا ہے۔ بند دروازوں کے پیچھے ہونے والی سازشوں میں جو کچھ ہو رہا ہے، اسے پاکستان کے لوگ برداشت نہیں کریں گے۔ میں تو "نئے پاکستان" کی ترکیب پر ایمان نہیں رکھتا۔ میرا ایمان تو فقط قائداعظم کے پاکستان پر ہے۔ میں تو فقط ایک پاکستان کو جانتا ہوں اور وہ ہے قائداعظم کا پاکستان "مسلم بنگال"، "نیا پاکستان" کی نئی تراکیب تراشی جا رہی ہے۔ "نیا پاکستان کیوں؟ اس لیے کہ آپ نئے پاکستان کے قائد عوام ہوں۔ یہ ٹھیک نہیں۔ لوگوں کی قسمت سے نہ کھیلئے، پاکستان کے عوام کو کھلونے نہ سمجھئے۔ یہ نہ سمجھیے کہ فقط آپ حکمت و دانائی میں بقراط ثانی ہیں۔ یہ گمان نہ کیجیے کہ فقط آپ ہی سیاست سمجھتے ہیں۔ ایوان کی اس جانب ذہین تر لوگ موجود ہیں جو آپ کے ہر ہر اشارے کو سمجھتے ہیں، آپ کی ہر ہر حرکت کا مطلب جانتے ہیں۔ اب کہا جا رہا ہے، ہمالیہ رو اٹھے گا۔ اگر پاک فوج کو جان بوجھ کر بھارتی افواج سے شکست دلوائی جائے، تو بلاشبہ ہمالیہ رو اٹھے گا۔

(مداخلت)

مسٹر ڈپٹی سپیکر : براہ کرم آپس میں باتیں نہ کریں۔ آرڈر! آپ نے چالیس منٹ لے لیے ہیں۔

صاحبزادہ احمد رضا خان قصوری! جناب والا! وقت کی کوئی قید نہیں۔ میں دستور پر بول رہا ہوں۔

(مداخلت)

مسٹر ڈپٹی سپیکر! انہیں بولنے دیں، آپ لوگ مداخلت نہ کریں۔

ضابطوں کی رو سے صدرِ اجلاس کو وقت مقرر کرنے کا اختیار حاصل ہے اور آپ چیلنج نہ کیجیے۔

ہاں، تو جاری رکھیں۔

صاحبزادہ احمد رضا خان قصوری! تو جناب والا! مشرقی پاکستان، پاکستان کا جزو لاینفک ہے۔ اس سوال پر میں اس وقت بحث کروں گا جب میں ترمیم پر گفتگو کروں گا کہ میں نے ترمیم بھی پیش کر دی ہے۔ فی الحال اس خاص مسئلے پر میں اس بلند پایہ ایوان کا وقت نہ لوں گا، کیونکہ یہ بجائے خود ایک طویل بحث کا موضوع ہے۔ میں نے اس مسئلے کا عمیق جائزہ لیا ہے۔ غور کیا ہے اور یہ دعویٰ غلط نہ ہوگا، اگر میں کہوں کہ میں اس کا ماہر ہوں۔ سیاسی خیالات، بین الاقوامی تجارت اور بین الاقوامی تعلقات کے لحاظ سے، میں اس پہلو کی ترمیم پر بحث کے دوران جائزہ لوں گا، کیوں کہ اس خاص مسئلے پر میں نے بذاتِ خود ترمیم پیش کی ہوئی ہے اور اس وقت میں اس پہلو پر تقریر کا حق محفوظ رکھتے ہوئے اگلے نکتے کی طرف آتا ہوں۔

تو جناب والا! شق نمبر ۲ میں کہا گیا ہے کہ پاکستان کا سرکاری مذہب اسلام ہوگا۔ اس سے عوام کا مطالبہ کاملاً پورا نہیں ہوتا۔ اس ملک کے عوام چاہتے ہیں کہ ان قوانین کو جو قرآن اور سنت سے متصادم ہیں اس حد تک کالعدم قرار دیا جائے، جس حد تک کہ یہ قرآن و سنت کے منافی ہیں۔ پاکستان کے عوام تو ایسا اسلام ہی چاہتے ہیں۔ جنابِ والا! یہ ملک مسلم نیشنلزم کی بنیاد پر وجود میں آیا جب پاکستان بنا، تو یہ پنجابیوں کے لیے نہ بنا تھا، یہ سندھیوں کے لیے نہ بنا تھا، یہ پٹھانوں کے لیے نہ بنا تھا، یہ سندھیوں یا بلوچیوں یا مشرقی پاکستان کے لوگوں کے لیے نہ بنا تھا۔ یہ اسلام کے لیے بنا تھا، اسلام کا قلعہ بنا تھا۔ یہ مسلمانوں کے لیے دارالسلام کے طور پر بنایا گیا تھا! کیونکہ مسلمانوں کے نزدیک ہندوستان ان کے لیے "دارالحرب" بن گیا تھا۔ ارضِ پاکستان کا وجود برصغیر کے ہر گوشے میں رہنے والے مسلمانوں کی مشترکہ مساعی کا نتیجہ ہے اور جب پاکستان بنایا گیا تو اقتصادی وضاحت نہ کی گئی تھی کہ پاکستان کی معیشت کے کیا نقش و نگار ہوں گے۔ اس ملک کے سیاسی ڈھانچے کے متعلق بھی وضاحت نہ کی گئی تھی، لیکن غیر منقسم ہندوستان کے ہر ہر گوشے سے فقط ایک ہی صدا اٹھی تھی۔ گونج رہی تھی اور وہی اصلِ پاکستان ہے۔

پاکستان کا مطلب کیا؟

معروف برٹش بٹالین ایسٹ سرے رجمنٹ جس کے کرنل شوم برگ کے ہمراہ
نواب محمد احمد خان جبکہ لیفٹیننٹ جنرل کول دائیں سے پہلے کھڑے ہیں۔

احمد رضا قصوری اور ذوالفقار علی بھٹو لاہور ایئرپورٹ سے باہر آ رہے ہیں ۔
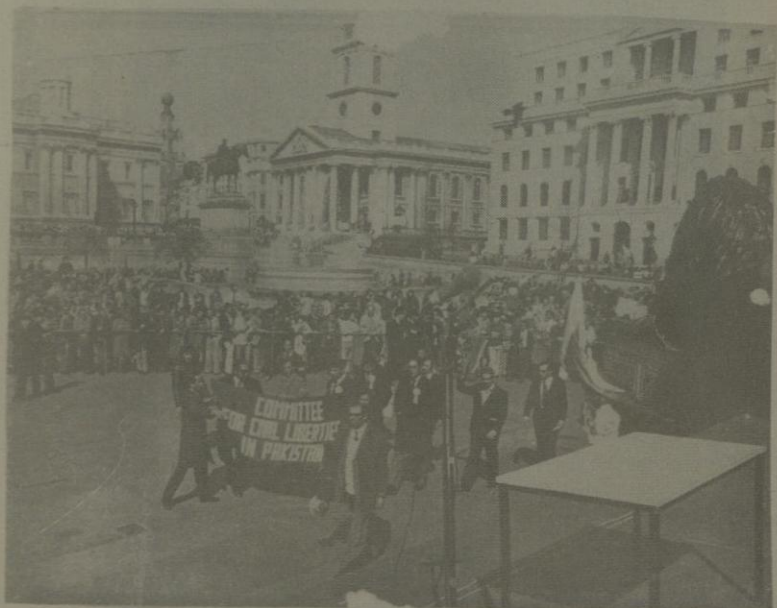
ٹریفالگر سکوائر میں شہری آزادیوں کی بحالی کے لیے جلوس کی قیادت احمد رضا قصوری

اور ائیر مارشل اصغر خان کر رہے ہیں ۔

برٹش آرٹلری رجمنٹ جس میں نواب محمد احمد خاں بائیں سے چوتھے۔

پیپلز پارٹی کے بانی ذوالفقار علی بھٹو سے ساتھ پیپلز پارٹی کے سرکردہ رہنماؤں
کا گروپ فوٹو احمد رضا قصوری، میاں محمود علی قصوری، خورشید حسن میر، غلام
مصطفیٰ کھر اور دوسرے کیمپ جیل لاہور میں بھٹو کے کیس کی پیروی کرتے ہوئے جنوری ۱۹۶۹ء
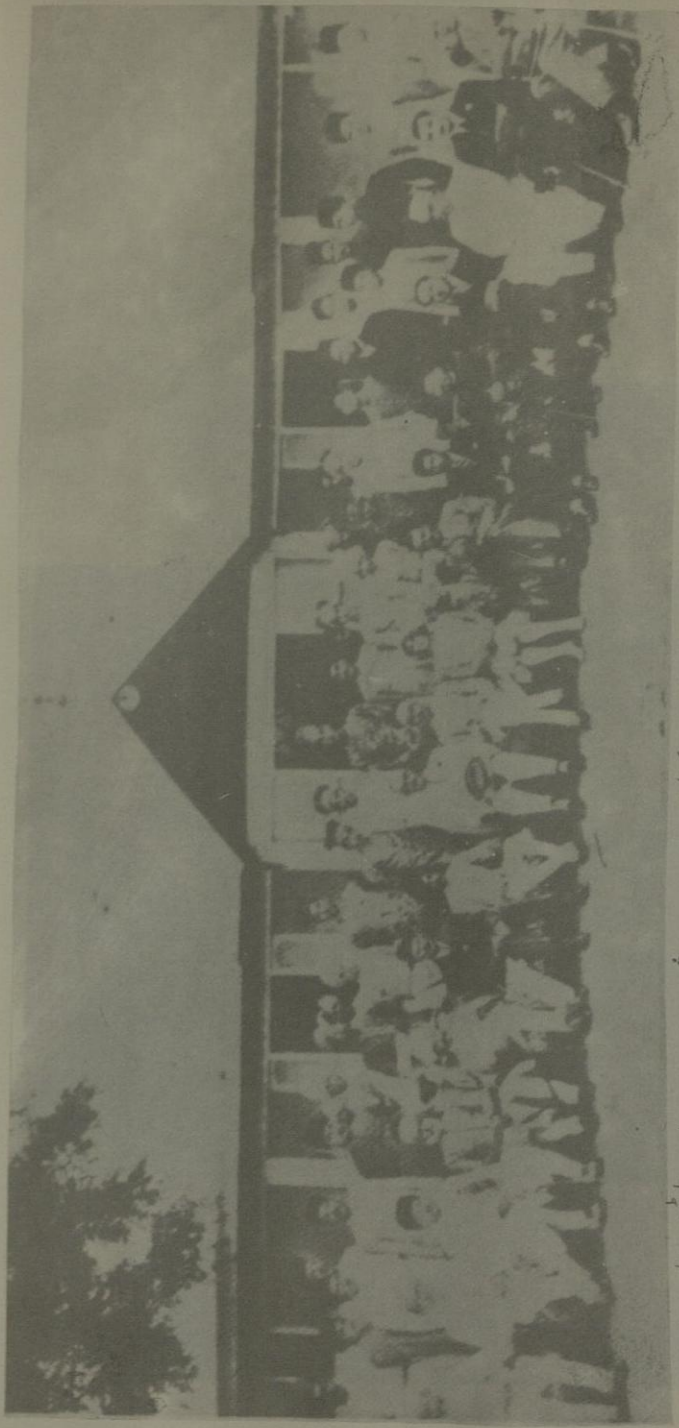
برطانوی ریذیڈنٹ کے پرائیویٹ سیکرٹری نواب امین الدین احمد خان آف لوہارو کی شادی کے موقع پر کیپٹن محمد ایوب خان (فیلڈ مارشل ایوب خان) اے۔ڈی سی ٹو برٹش ریذیڈنٹ حیدر آباد ۱۹۳۱ء۔

احمد رضا قصوری کے بڑے بھائی خضر حیات قصوری
پر قاتلانہ حملہ زخمی خضر حیات قصوری کیساتھ مصنف

احمد رضا قصوری عوام کے کندھوں پر

لاہور میں پولیس کے سپاہی احمد رضا اور بارک اللہ خان کو گرفتار کر رہے ہیں۔

گورنمنٹ کالج کرکٹ ٹیم جو کہ یونیورسٹی چیمپئن تھی احمد رضا قصوری دائیں طرف کھڑے ہیں۔

لاالہ اللہ محمد رسول اللہ

اگر پاکستان کا مطلب لاالہ اللہ محمد رسول اللہ ہے تو ہمیں وہ تمام قوانین جو اسلامی اصولوں کے خلاف ہیں قرآن وسنت کے مطابق بنانا ہوں گے اور چونکہ ہم نے آج تک پاکستان کا مفہوم، پاکستان کا مطلب متعین نہیں کیا، اس لیے ہم آدھے ملک سے محروم ہوگئے۔ اسی وجہ سے ہمارے فوجیوں کو شکست ہوئی۔ ہمارے فوجی جب لڑتے ہیں، تو وہ پنجاب کے دفاع کے لیے نہیں لڑتے، وہ سندھ کے دفاع کے لیے نہیں لڑتے، وہ تو صرف اسلام کے دفاع کیلئے لڑتے ہیں وہ تو اس لیے لڑتے ہیں کہ اگر وہ کام آئے تو "شہید" ہونگے۔

روح محمدؐ تم پر آکر سلام دے گی جس کے لیے وہ شہادت دیتے ہیں۔

تو مسٹر پریذیڈنٹ! یہ نظریہ پاکستان کی بنیاد ہے اگر یہی نظریہ پاکستان کی اصل اساس ہے تو کیوں نہ اس کی نئے سرے سے بنیاد رکھی جائے، کیونکہ ہم از سر نو کام کا آغاز کر رہے ہیں، ہم زیرو پوائنٹ سے آغاز کر رہے ہیں! چنانچہ ہمیں پاکستان کی بنیادیں نظریاتی اساس پر قائم کرنی چاہئیں جو اسلام ہی ہو سکتا ہے۔

جناب والا! میں آپ کے توسط سے وزیر قانون سے گزارش کروں گا کہ رشق ۲ میں، یہ اضافہ بھی کرا دیا جائے کہ اگر کوئی قانون قرآن وسنت کے احکامات کے خلاف ہوا تو خلاف ورزی کی حد تک کالعدم قرار پائے گا۔ اگر یہ اضافہ کر دیا جائے، تو مجھے بہت خوشی ہوگی اور یہ ان کے لیے بھی مناسب ہوگا، کیونکہ پیپلز پارٹی کا ایک نعرہ یہ بھی ہے کہ "اسلام ہمارا دین ہے"۔ یہ ان کے منشور کے خلاف نہیں۔ یہ ان کے منشور کے عین مطابق ہوگا اور میرا خیال ہے، انہیں یہ اضافہ کر دینا چاہیئے۔

اس کے بعد، جناب والا! نظر بندی کے قوانین میں۔ حراست کے ان قوانین میں کہا گیا ہے کہ وہ حقائق جن کا اظہار مفاد عامہ میں نہیں، بتائے نہ جائیں گے۔ یہ بڑا آسان طرز بیان ہے۔ اس بات کا فیصلہ کون کرے گا کہ کسی شخص کی نظر بندی سے متعلق خاص حقائق مفاد عامہ میں ہیں یا نہیں۔ کون طے کرے گا؟ نظر بندی کی دستاویز پر دستخط کرنے والا سیکرٹری! ہم عوام کی قسمت کو، لوگوں کی آزادی کو، سیکرٹری داخلہ کی من مانی من کی موج سے وابستہ نہیں کر سکتے۔ سیکرٹری داخلہ تو کہہ سکتا ہے کہ ان خاص حقائق کا اظہار مفادِ عامہ میں نہیں، جناب والا! یہ حصہ حذف کر دینا چاہیئے، کیونکہ جب آپ کسی کو حراست میں لیتے ہیں تو آپ کو اسے حراست میں لینے کی وجہ سے بھی آگاہ کرنا چاہیئے۔ آپ فرانس کا سا کلی مختاری کا نظام رائج نہیں کر سکتے، سلطنت فرانس میں کل مختاری کا نظام تھا اور انقلاب فرانس سے پہلے فرانس کے کسی بھی باشندے کو وارنٹ "خط دگوشہ"

جاری کر کے بسٹائل کی دیواروں کے پیچھے بھیجا جا سکتا تھا اور جناب والا! آپ کو معلوم ہے، بسٹائل کا کیا حشر ہوا! فرانس میں جب انقلاب آیا تو لوگ سیدھے بسٹائل گئے اور انہوں نے یہ کہتے ہوئے بسٹائل کی اینٹ سے اینٹ بجا دی:

یہ علامت ہے کل مختاری کی، یہ علامت ہے بربریت کی اور یہ علامت ہے ظلم وستم کی "۔

مسٹر ڈپٹی سپیکر: میں معزز رکن سے درخواست کروں گا کہ انہیں آج کا اجلاس ملتوی کیے جانے سے پہلے اپنی تقریر مکمل کر لینی چاہیے۔

صاحبزادہ احمد رضا خان قصوری: میں رات دس بجے تک اپنی تقریر ختم کر لوں گا۔

مسٹر ڈپٹی سپیکر: میں ایوان کا وقت بچانا چاہتا ہوں۔

صاحبزادہ احمد رضا خان قصوری: میں نئے نکات پیش کر رہا ہوں۔

مسٹر ڈپٹی سپیکر: اگر کوئی معزز رکن کسی بات کا بار بار اعادہ کرے تو اسے روکنے کا مجھے حق حاصل ہے۔ معزز رکن کو وہ ضابطہ معلوم ہے جو اعادے سے، تکرار سے، باز رہنے کی تائید کرتا ہے۔ میں ہر معزز رکن سے گزارش کروں گا کہ یہ نکتہ ذہن نشین کر لیا جائے۔ مجھے آپ سے اتفاق ہے کہ یہ بحث بڑی گرانقدر ہے۔ ہم نے عوام سے کامل غور و خوض کے بعد جلد از جلد آئین سازی کا وعدہ کر رکھا ہے۔ ہمیں اعادے اور تکرار سے کام نہ لینا چاہیے۔ آپ وزیر قانون کے ہمراہ کل سپیکر کے چیمبر میں جا کر کوئی باہمی فیصلہ کر سکتے ہیں۔

مسٹر عبدالحفیظ پیرزادہ: میں نے جو اعلان کیا تھا کہ ہم مسودے کی پہلی خواندگی کے لیے دو ہفتے دینے کا ارادہ رکھتے ہیں، تو اس سے میرا یہ مطلب نہ تھا کہ اس ایوان کے ایک فریق کو تقریر کے لیے دو ہفتے دیے جائیں۔ ہماری جانب سے بھی کئی ارکان تقریر کرنا چاہتے ہیں۔ وہ (حزب اختلاف) مقررین کے نام بتا دیں۔

مسٹر ڈپٹی سپیکر: پارلیمانی طریق کار کے مطابق مختلف جماعتوں کے لیڈروں کو مل بیٹھ کر مسودے کی تین خواندگیوں کے لیے کوئی فارمولا وضع کرنا چاہیے۔ وہ وقت کی قید لگانے پر رضا مند ہو جائیں یا یہ فیصلہ کریں کہ پہلی خواندگی اتنے دن میں ہو گی، دوسری اتنے دن میں اور تیسری اتنے دن میں۔ اگر کوئی اس کے لیے تیار نہ ہو، تو مجھے ڈر ہے جو بھی ایوان کے اجلاس کی صدارت کر رہا ہو گا، اسے وہ مدت ذہن میں رکھنا ہو گی۔ جس میں اس بلند پایہ ایوان کو ملک کا دستور مکمل کر لینا چاہیے۔ میں پارٹیوں کے لیڈروں سے درخواست کروں گا کہ وہ کوئی متفقہ فارمولا بنا لیں۔ صاحبزادہ قصوری! آپ اپنی تقریر جاری رکھیں۔

صاحبزادہ احمد رضا خان قصوری: آپ اجلاس ملتوی کر دیں، تا کہ قائدین، سپیکر کے چیمبر میں مل بیٹھیں

میں اپنی تقریر کل شروع کروں گا۔

مسٹر ڈپٹی سپیکر: قبل اس کے کہ میں معزز رکن کی درخواست قبول کروں، میں چاہوں گا کہ صدر اور اسلحہ کی برآمدگی کے متعلق صاحبزادہ احمد رضا قصوری کے بعض جملے سرکاری ریکارڈ سے حذف کر دیے جائیں۔

صاحبزادہ احمد رضا خان قصوری: آپ ایسا نہیں کر سکتے۔

مسٹر ڈپٹی سپیکر: جب صدرِ اجلاس بول رہا ہو تو کسی کو بولنے کا حق نہیں۔

صاحبزادہ احمد رضا خان قصوری: مجھے وضاحت کرنے کی اجازت دیں پلیز!

مسٹر ڈپٹی سپیکر: آرڈر پلیز! آرڈر! میں جب بول رہا ہوں۔ تو کسی کو بولنے کی اجازت نہیں۔ آپ تو ضابطوں سے واقف ہیں۔

صاحبزادہ احمد رضا خان قصوری: آپ کو میری تقریر کا "جھٹکا" نہ کرنا چاہیئے۔

مسٹر ڈپٹی سپیکر: وہ تمام جملے حذف کر دیے جائیں، جن کا تعلق کسی کے ہاں سے بھی اسلحہ کی برآمدگی سے ہے۔

صاحبزادہ احمد رضا خان قصوری: آپ میری ساری تقریر کو ریکارڈ سے خارج کر دیں۔

مسٹر ڈپٹی سپیکر: وہ جملے اسمبلی کی کارروائی کا حصہ نہ ہونے چاہئیں۔

صاحبزادہ احمد رضا خان قصوری: اس سے کسی کا بھلا نہ ہوگا۔

میاں محمود علی قصوری: پوائنٹ آف آرڈر۔

مسٹر ڈپٹی سپیکر: براہِ کرم آپ تشریف رکھیں۔ میں جب کوئی فیصلہ سنا رہا ہوں تو کوئی پوائنٹ آف آرڈر پیش نہ کرنا چاہیئے۔ میں معزز ارکان کے علم میں یہ بات لانا چاہوں گا کہ سپیکر کے فیصلہ پر، جو میں سنا چکا ہوں اور جو قطعی ہے، کسی کو پوائنٹ آف آرڈر پیش نہ کرنا چاہیئے۔

میاں محمود علی قصوری: آپ ازراہِ نوازش ضابطے کی نشاندہی تو فرما دیں۔

مسٹر ڈپٹی سپیکر: حوالے کے لیے دیکھیے، ضابطہ ۸، (۳) (ب) صدر پاکستان کی ذات پر الزام تراشی۔ میں اپنا فیصلہ سنا چکا ہوں۔

میاں محمود علی قصوری: میں آپ کے فیصلے کو چیلنج نہیں کر رہا۔

مسٹر عبدالقیوم خان: صدرِ اجلاس کے فیصلے کے بعد کوئی پوائنٹ آف آرڈر نہ اٹھانا چاہیئے۔

مسٹر ڈپٹی سپیکر: وہ کچھ اور کہہ رہے ہیں۔

صاحبزادہ احمد رضا خان قصوری: آپ تو کہیں گے ہی۔ آپ کی تو روزی لگی ہے۔ بھٹو صاحب سے۔

میاں محمود علی قصوری: میں آپ کے فیصلے پر کوئی عذر نہیں کر رہا۔

مسٹر عبدالقیوم خان: آپ عذر پیش نہیں کر سکتے۔ فیصلہ دیا جا چکا ہے۔

مسٹر ڈپٹی سپیکر: ہم ان کی بات سن تو لیں۔

میاں محمود علی قصوری: آپ نے ضابطہ ۸، (۳) (ب) کا حوالہ دیا ہے۔ آپ نے چونکہ ضابطہ ۸، (۳) (ب) کا حوالہ دیا ہے، اس لیے میں اس ضابطے کی حدود و وسعت آپ کے نوٹس میں لا رہا ہوں۔ مگر بعض اور بھی باتیں ہیں جو آپ نے فرمائی ہیں۔ آپ کو ضوابط ہی سے فیصلہ تلاش کرنا ہوگا۔

مسٹر ڈپٹی سپیکر: آپ بہت سینئر وکیل ہیں اور جانتے ہیں کہ ناجائز اسلحہ کی برآمدگی زیر بحث نہ لانا چاہیے میرا خیال ہے، میرا فیصلہ قطعی ہے۔

اگر آپ پسند فرمائیں، تو کل صبح ساڑھے نو بجے ہم سوموار کے علاوہ صبح کے اجلاس (صبح کے وقت) کیا کریں گے۔

۲۰ فروری ۱۹۷۳ء

مسٹر سپیکر: ہاں، مسٹر احمد رضا قصوری: آپ اپنی تقریر شروع کریں۔

صاحبزادہ احمد رضا خان قصوری: مسٹر پریذیڈنٹ! میں نے کل اپنی تقریر کے دوران ان دو مراحل کا ذکر کیا تھا، جب ہم آئین سے محروم اس ملک کو آئین دینے والے تھے کہ بعض سیاہ بخت سازشی قوتوں نے گٹھ جوڑ کر لیا اور مزاحم ہوئے تاکہ یہ ملک دستور سے محروم ہی رہے۔ آخر میں، میں نے یہ بھی کہا تھا کہ بعض جذباتی بیانات دیئے گئے۔ اور ان جذباتی بیانات کے تحت ملک کی سیاسی فضا مکدر ہو گئی۔ جذباتی اور حد درجہ غیر سیاسی بیانات کیا تھے؟ "اُدھر تم، اِدھر ہم" جو جائے گا، ٹانگیں توڑ دیں گے۔ جو جائے گا۔ یک طرفہ ٹکٹ پر جائے گا۔"

مسٹر سپیکر: اگر آپ ایک ہی بات کا بار بار اعادہ کرتے رہے تو میں (آپ کی جگہ) کسی اور معزز رکن کو تقریر کی اجازت دے دوں گا۔

مسٹر عبدالحفیظ پیرزادہ: کل صدر کی ذات کو بھی نہ چھوڑا گیا۔ ہمارے تعاون کی کوئی حد ہے۔ ہم جانتے ہیں کیا ہو رہا ہے۔ کیا یہ آئین پر بحث ہے۔!

مسٹر سپیکر: آپ آئین پر بحث کریں۔

صاحبزادہ احمد رضا خان قصوری: کل میں شق ۹ پر بحث کر رہا تھا۔۔۔۔

مسٹر ممتاز علی بھٹو: مسٹر سپیکر، سر! ہم یہاں آئین سازی کے لیے جمع ہوئے ہیں۔ یہ آئین ساز اسمبلی ہے۔ میری گزارش ہے کہ یہاں شائستگی کو ملحوظ خاطر رکھا جائے اور بحث کا مناسب معیار پیش نظر رہنا چاہیئے۔ اگر بحث کا معیار یہی رہا، تو ہم دستور تشکیل نہ کر پائیں گے۔ ہم اینٹ کا جواب پتھر سے دیں گے۔ ہم نے بہت صبر کر لیا ہے۔ کل سے ذاتی حملے کئے جا رہے ہیں۔ صبر کی ایک حد ہوتی ہے۔ میں آپ کے توسط سے حزب اختلاف کے ارکان سے اپیل کروں گا کہ ہم آئین پر بحث کریں۔ ہم مناسب معیار قائم رکھیں۔ ہم دشنام طرازی سے کام نہ لیں۔ یہ افسوسناک بات ہوگی۔ اتنی پستی تک جانا تو مشکل ہے۔ مگر ہم ان سے نمٹ لیں گے۔

صاحبزادہ احمد رضا خان قصوری: میں چیلنج قبول کرتا ہوں۔ مسٹر سپیکر! میں بنیادی حقوق پر مشتمل شق ۱۰ پر بحث کر رہا کر رہا تھا۔ میں عرض کر رہا تھا کہ اس شق میں ایک دفعہ تحریر ہے کہ سیکرٹری داخلہ کو یہ اختیار حاصل ہوگا کہ وہ نظر بندی کئے جانے والے شخص کو نظر بندی کی وجوہات سے آگاہ نہ کرے اور سیکرٹری داخلہ نوکر شاہی کا فرد ہونے کے ناطے سے اسلام آباد کے آرام دہ ماحول میں بیٹھے بیٹھے ہمیشہ یہ کہہ سکتا ہے کہ ان مخصوص حقائق کا اظہار مفادِ عامہ میں نہیں۔ یہ خاص شق تمام استحقاقات، تمام حقوق عملاً عفو کر لیتی ہے۔ جو ایک ہاتھ سے تو نظر بند شخص کو دیئے گئے ہیں، مگر اس شق کے تحت دوسرے ہاتھ چھین لیے گئے ہیں۔ یہ تو الفاظ سے کھیلنا ہوا۔ مداری پن ہوا۔ یہ قانونی تراکیب کا تمسخر ہوا۔ یہ ختم ہونا چاہیئے۔ چنانچہ مجھے امید ہے کہ ہم اس خاص شق پر غور کریں گے۔ یہ جملہ استثنائیہ حذف کیا جانا چاہیئے۔

مسٹر سپیکر: کون سا جملۂ استثنائیہ۔

(مداخلت)

صاحبزادہ احمد رضا خان قصوری: مسٹر حنیف خان: کرسی صدارت پر بیٹھ کر آپ بہت فیصلے صادر کر سکتے ہیں۔ اب آپ اس ایوان کے محض، ایک رکن ہیں۔ آپ کو شائستہ رویہ اختیار کرنا چاہیئے۔ شائستگی کا

اطلاق آپ پر بھی ہوتا ہے، آپ ضابطوں سے ماورا نہیں۔

(مداخلت)

صاحبزادہ احمد رضا خان قصوری: اس خاص شق میں، میں بعض ترامیم تجویز کروں گا۔

مسٹر سپیکر: دیکھیے، اس وقت ہم مسودے کے عام اصولوں پر بڑے بڑے نکات پر بحث کر رہے ہیں۔ ہم شق وار غور نہیں کر رہے۔ ہم جب اس شق پر غور کریں گے، تو آپ ترمیم پیش کر سکتے ہیں۔

صاحبزادہ احمد رضا خان قصوری: یہ بہتر ہوتا، اگر اس خاص شق میں بعض دفعات موجود ہوتیں مثلاً اگر کسی کو نظر بند کیا گیا، اسے اے کلاس دی جائے گی۔ اسے ایسی جیل میں رکھا جائے گا جو اس کے گھر کے قریب ترین ہو، اگر کسی کو زنداں کے حوالے کر دیا اور بالآخر یہ ثابت ہو گیا کہ اس کی گرفتاری غیر قانونی تھی، تو وہ حکومت پر ہرجانے کا دعویٰ کر سکے گا۔

مسٹر سپیکر: میں معزز رکن کی توجہ ضابطہ ۰ ۲ کی جانب مبذول کرانا چاہوں گا، جس کے مطابق: جس روز ضابطہ ۵۹ کے تحت کوئی تحریک پیش کی جائے یا کسی بعد کے دن جس پر تحریک پر بحث ملتوی کر دی گئی ہو، مسودے کے اصولوں اور عام شقوں پر بحث کی جا سکتی ہے، مگر مسودے کی تفصیلات پر اصولوں کی وضاحت کے سلسلے میں ضرورت سے زیادہ بحث نہیں کی جا سکتی۔

صاحبزادہ احمد رضا خان قصوری: ٹھیک ہے، جناب والا۔

مسٹر سپیکر: آپ کو بھی ضابطوں کا مطالعہ کرنا چاہیے۔

صاحبزادہ احمد رضا خان قصوری: ٹھیک ہے۔ مجھے ان ضابطوں کا بخوبی علم ہے؛ چونکہ دوسروں کے معاملے میں درگزر کرنے سے کام لیا گیا، میں سمجھا، میرے معاملے میں بھی درگزر سے کام لیا جائے گا۔ اب میں شق ۱۴۱ کی طرف آتا ہوں۔

مسٹر سپیکر: آپ شق وار بحث نہ کریں۔

صاحبزادہ احمد رضا خان قصوری: درست، بنیادی حقوق میں چادر اور چار دیواری کی خلوت کو، پردہ داری کو، تحفظ کی ضمانت نہیں دی گئی، مسٹر پریذیڈنٹ! آپ جانتے ہیں، ہمارے ٹیلی فون ٹیپ کیے جاتے ہیں، ہماری گفتگو پر قدغن لگایا گیا ہے، سی آئی ڈی کے ادارے ہمارا تعاقب کرتے ہیں اور اس اسمبلی کی نابیوں اور کیفے ٹیریا میں آپ کو مہمان کم اور سی آئی ڈی کے افراد زیادہ ملیں گے۔ کیا ہمیں پردہ داری کا یہی حق دیا گیا ہے! ہمارے ٹیلی فونوں میں

خاص آلات نصب کیے گئے ہیں، جن کے ذریعے ٹیلی فون پر گفتگو اگر نہ بھی ہو رہی ہو، تو وہ لوگ انٹیلی جنس ہیڈ کوارٹرز کے پر لطف ماحول میں بیٹھ کر ہماری باتیں سنتے ہیں۔ یہ ہے حق پردہ داری جو وہ ہمیں دے رہے ہیں اور جناب والا! کسی بھی مہذب معاشرے میں گھر کی پردہ داری (چار دیواری کے تحفظ) کا حق اہم ترین بنیادی حقوق میں شامل ہوتا ہے۔

مسٹر سپیکر! آپ کی یہی خواہش ہے، آپ گھر کی پرائیویسی کا احترام چاہتے ہیں۔

صاحبزادہ احمد رضا خان قصوری! میں چاہتا ہوں، دستور ہمیں گھر کی پرائیویسی کے حق کی ضمانت دے۔

(مداخلت)

مسٹر سپیکر! مسٹر احمد رضا خان! آپ ان مجموعی اصولوں کو زیر بحث لائیں جن پر مسودہ مبنی ہو۔

صاحبزادہ احمد رضا خان قصوری! میں مجموعی اصولوں پر ہی بحث کر رہا ہے اور اب بھی میں انہی کی طرف آتا ہوں۔ پھر بنیادی حقوق میں املاک کے بارے میں ایک شق ہے۔

(مداخلت)

صاحبزادہ احمد رضا خان قصوری! بنیادی حقوق میں اس شرط کا اضافہ کر دیا گیا ہے کہ مسودہ آئین کی شق ۲۳ کے تحت ہم کسی کی املاک لے سکتے ہیں۔ دستور کی اس شق پر بڑی بحث ہو رہی ہے اور ایوان میں اس جانب بیٹھے ہمارے فاضل دوست ٹیلی ویژن، ریڈیو، ایوان میں اس جانب بیٹھے بعض افراد اور ایوان کے باہر بعض اہم لیڈروں کے ذریعے ان لیڈروں کو جو اس خاص شرط کے مخالف ہیں۔ رجعت پسند ہونے کا طعنہ دے رہے ہیں، کہہ رہے ہیں۔ یہ کہنا بہت آسان ہے، مگر اپنی ذات کا جائزہ لینا، دل کو ٹٹولنا بہت مشکل ہے۔ آپ کو اس امر کا بھی جائزہ لینا چاہیئے۔ کہ آپ کر کیا رہے ہیں۔ یہ کہنا بہت آسان ہے کہ میں سوشلسٹ ہوں اور یہ کہ میں پاکستان کے عوام کے استحصال کا خاتمہ چاہتا ہوں۔ یہ بہت بلند آہنگ الفاظ ہیں، جنہیں کوئی ہر وقت دہرا سکتا ہے، مگر پاکستان کے عوام کو یہ حقیقت حال دیکھنا ہے، اور حقیقت حال کیا ہے! جب حکومت روٹی، کپڑا، اور مکان کی باتیں کرتی ہیں۔ تو "جشن لاڑکانہ" اور "جشن بہاولپور" کیوں؟ کیا یہ سوشلسٹ معیشت ہے؟ ملک افلاس کے ہاتھوں مرا جا رہا ہے، اس ملک کی معیشت عملاً تہس نہس ہو چکی ہے اور اس کے باوجود جشن پر جشن منائے جا رہے ہیں۔ ہم ان جشنوں کے ذریعے سفارت کاروں کو کیسے قائل کر سکتے ہیں۔؟

مسٹر سپیکر! آپ مسودہ قانون پر بحث کر رہے ہیں۔ معیشت کے بارے میں آپ کا یہ تبصرہ کیسے برمحل ہے۔

(مداخلت)

مسٹر سپیکر: اگر آپ غیر متعلق گفتگو کرتے رہے! میں آپ کو تیسری بار خبردار کرتا ہوں کہ آپ برمحل گفتگو کریں۔

صاحبزادہ احمد رضا خان قصوری: مجھے علم ہے میری تقریر ختم کر دی جائے گی۔

مسٹر سپیکر: اگر آپ غیر متعلق گفتگو کرتے رہے تو آپ کو تقریر ختم کرنا ہوگی۔

صاحبزادہ احمد رضا خان قصوری: منصور کو حق بولنے کی پاداش میں سولی پر چڑھا دیا گیا، یہ سبق میں نے اسلام سے سیکھا ہے کہ جابر سلطان کے سامنے کلمۂ حق بلند کرنا بہترین جہاد ہے۔

(مداخلت)

مسٹر سپیکر: ہر ایک پر، میرا خیال ہے۔ کل آپ نے بہت وقت لیا تھا۔

صاحبزادہ احمد رضا خان قصوری: مسٹر سپیکر! میں اس خاص دفعہ پر بحث کر رہا تھا۔

مسٹر سپیکر: کسی خاص دفعہ پر بحث نہ کیجیے۔

صاحبزادہ احمد رضا خان قصوری: تو اب جناب والا! شق نمبر ۴۲ پر بڑی بحث ہوئی ہے اور ایوان کے دوسری جانب کے لوگ کہہ رہے ہیں کہ یہ خاص شق شامل کر کے وہ سوشلسٹ ہو گئے ہیں۔ وہ چشم زدن میں سوشلسٹ بن گئے ہیں۔ پاکستان کے مکھو کھا محنت کشوں کے بڑے حمایتی۔ مگر یقین کیجیے وہ سوشلسٹ نہیں وہ تو فقط "یار باش" ہیں۔ جی ہاں، مجھے اس سے اتفاق ہے، وہ یار باش ہیں۔ وہ مرسڈیز کاریں لیے پھرتے ہیں۔ وزراء کی جانب سے اچھی کاروں کا مطالبہ کیا جا رہا ہے کہ ان کی اقامت گاہیں سنٹرلی ہیٹڈ (CENTRALLY - HEATED) مرکزی طور پر گرمائش کے انتظام والی "ہوں! مجھے وہ کار نہیں چاہیئے۔" ان کا چلن تو یہ ہے اور اس کے باوجود وہ سوشلسٹ ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں۔ ایک وزیر نے کبھی کار میں سفر نہ کیا تھا۔ اب اس کے پاس بڑی ساری کار ہے۔ آپ کا سوشلزم کیا ہے؟ کیا اپنے لیے دولت جمع کرنا اور دوسروں کی املاک حاصل کرنے پر فخر کرنا آپ کا سوشلزم ہے۔ کیا آپ یہی کچھ کرنا چاہتے ہیں؟ کیا یہ خاص شق اسی لیے ہے؟ یہ خاص شق سیاسی مخالفین کو زچ کرنے کے لیے استعمال کی جائے گی، سیاسی انتقام لیا جائے گا اور میں جانتا ہوں یہ خاص شق ان لوگوں کے خلاف استعمال ہوگی، جو حکومت کی پالیسیوں کے مخالف ہیں، میں جانتا ہوں، ایک خوشگوار صبح کو اخبارات میں فرمان شائع ہو سکتا ہے کہ مسٹر احمد رضا کا قصور میں واقع مکان حکومت نے حاصل کر لیا ہے، کیونکہ قصور میں بہت سے نابینا لوگ ہیں۔ میں یہ نہ کہوں گا کہ قصور میں کوئی نابینا نہیں ہیں تو

اس مقصد کے لیے اپنا مکان دے دوں گا۔ مگر جب یہ حکومت تبدیل ہوگی اور ہم یہ حکم جاری کریں گے کہ لاڑکانہ میں بھی اندھے رہتے ہیں اور ہمیں لاڑکانے میں (ان کے لیے) ایک مکان چاہیئے۔ تو وہ شخص جس کا لاڑکانے میں مکان ہے کہے گا، یہاں نابینا لوگ نہیں ہیں (لاڑکانے میں یا تو "تنگ نظر لوگ" ہیں یا "حد درجہ تنگ نظر لوگ ہیں") اور اگر کوئی اندھا ہے بھی تو میں سب سے زیادہ اندھا ہوں، لہذا براہ کرم یہ مکان مجھے لوٹا دیں کہ میں واحد اندھا انسان ہوں۔

مسٹر ممتاز علی بھٹو: میں مسٹر قصوری کو لاڑکانے آنے کی دعوت دیتا ہوں، بشرطیکہ وہ آئیں۔ اگر وہ آئیں، تو انہیں جو چاہیں ملے گا۔

سردار شوکت حیات خان، وزیر اعلیٰ انہیں لاڑکانے کے نزدیک سکھر میں (سب کچھ) دیں گے۔

مسٹر ممتاز علی بھٹو: جہاں سے بھی ہوا میں انہیں لاکر دوں گا۔

(مداخلت)

مسٹر سپیکر: آرڈر! پلیز آرڈر!

صاحبزادہ احمد رضا خان قصوری: اب جناب والا! دستور میں شامل اس خاص شق کی توجیہہ و تشریح کے سلسلے میں بڑی بحث ہوئی ہے۔ جیسا کہ میں پہلے عرض کر رہا تھا۔ اس شق کے ذریعے وہ انتقامی کارروائیاں کریں گے۔ اس شق کے ذریعے سیاسی انتقام لیے جائیں گے۔ مجھے تو یہی خدشہ ہے۔ لیکن اگر آپ قوانین بناتے ہیں اور ان قوانین کا فقط قصور پر اطلاق ہوتا ہے یا سرگودہا میں ملک انور علی نون یا حیدر آباد میں علی احمد تالپور پر یا دادو میں مسٹر جتوئی پر یا سکھر اور جیکب آباد پر اطلاق ہوتا ہے، تو یہ کوئی قوانین نہیں۔ کیونکہ قانون تو وہ ہوتا ہے جس کے آگے سب برابر ہوں۔ اگر آپ یہ ضمانت دے سکیں کہ قانون کے آگے ہر شخص برابر ہے، تو میں اس (شق ۲۴) کا پرزور حامی ہوں، کیونکہ کم از کم میں اس بات پر فخر کر سکتا ہوں کہ میں آپ سب سے زیادہ ترقی پسند ہوں۔ مگر میں جانتا ہوں کہ یہ خاص اصول آئین میں اس لیے نہیں لایا گیا کہ آپ سوشلسٹ ہیں۔ یہ آئین کا حصہ اس لیے بنایا جا رہا ہے، کیونکہ آپ اپنے سیاسی مخالفین سے سیاسی انتقام لینا چاہتے ہیں اور ہم آپ کو ایسا اختیار نہ دیں گے کہ وہ جرمن پارلیمنٹ کی مانند اپنے ہاتھ کاٹ ڈالے۔ جس نے انیبلنگ لاء منظور کر کے جرمن فیورر کو کل اختیارات سے مسلح کر دیا، جس کے بعد جرمن فیورر نے فرمایا! "شرفائے گرامی! مجھے آپ کی ضرورت نہیں۔ آپ اپنے اپنے گھر تشریف لے جائیں"۔ اب یہ وہ پارلیمنٹ ہے جو پاکستان کے عوام کی کسٹوڈین ہے اور یہاں بیٹھے

ہوئے ہمیں رائے عامہ کے تمام شعبوں کے اقتصادی، سماجی اور سیاسی مفادات کی نگرانی کرنا ہے۔ یہ ہمارا اخلاقی، سیاسی اور تاریخی فریضہ ہے اور ہم یہ فریضہ بلا خوف و خطر اور بلا رو رعائیت انجام دینا ہے۔ اگر آپ یہ عظیم فریضہ انجام دیں جس کی ذمہ داری تاریخ نے آپ کے کندھوں پر ڈالی ہے، تو آپ تاریخ میں زندہ و پائندہ رہیں گے۔ آپ پاکستان کی تاریخ کے اوراق میں آئین کے "تاسیسی بانی" کہلائیں گے۔ ایسے آئین کے جو پاکستان کے عوام کو اقتصادی، سیاسی اور سماجی تحفظ فراہم کرے۔ ہم اس ملک کے لیے ایسا ہی دستور چاہتے ہیں اور یہی ہماری کوشش ہونی چاہیئے۔

مسٹر سپیکر، سر! اب آئیے انتظامیہ کی جانب، ہم نے وزیرِاعظم کو مکمل اختیارات دے دیے ہیں۔ اس مخصوص آئین کے تحت، اگر اسے منظور کر لیا گیا، وہ عملاً "سویلین ڈکٹیٹر" بن جائے گا اور جناب والا! یہ ملک ان آمروں سے بُری طرح بھرا ہوا ہے۔ اس ملک میں ہم نے بہت آمر دیکھ لیے۔ ہم مستقبل میں مزید کوئی آمر دیکھنا نہیں چاہتے۔ لارڈ ایکٹن کا قول ہے: "اقتدار بگاڑ پیدا کرتا ہے اور اقتدار کامل بھرپور بگاڑ پیدا کرتا ہے۔" چنانچہ ہمیں اس کا سدِباب کرنا چاہیئے۔ اگر کوئی بے ایمان شخص اس ملک کا وزیرِاعظم بن جائے تو یقیناً ان اختیارات کے باعث وہ ملک کو تباہ کر سکتا ہے اور اس ملک کا عملاً "سویلین ڈکٹیٹر" بن سکتا ہے۔ اس آئین کے تحت ایک اچھا آدمی بھی راقتدار میں) آسکتا ہے اور بُرے آدمی کے آنے کا بھی امکان ہے، کیونکہ ہم آئین کسی خاص زمانے یا کسی مخصوص نسل کے لیے نہیں بنا رہے۔ فی الحقیقت ہمیں آئندہ نسلوں کے مفادات کو بھی پیشِ نظر رکھنا ہے۔ آئندہ نسلوں میں سے کوئی شخص وزیرِاعظم بن کر ان تمام (اختیارات) سے کام لیتے ہوئے ملک کی سیاسی صورتِ حال کو تباہ کر سکتا ہے، ہمیں اس امر کو بھی ملحوظ خاطر رکھنا ہوگا، کہ وزیرِاعظم کو تو کامل اختیارات حاصل ہیں، مگر صدر کو فقط اکیس توپوں کی گھن گرج وصول کرنے کا اختیار ہے۔ اگر ہم چاہتے ہیں کہ وزیرِاعظم کو زبردست اختیارات حاصل ہوں، تو ہمیں صدر کو بھی محکم اختیارات دینا ہوں گے، تاکہ توازن قائم رہے۔ جہاں تک وزیرِاعظم کے اختیارات کا تعلق ہے، وہ صدر کے تمام احکامات پر توثیقی دستخط کریں گے، جب تک وزیرِاعظم صدر کے کسی حکم یا فرمان پر توثیقی دستخط ثبت نہیں کرتے، قانون کی نگاہ میں اسے کوئی وقعت حاصل نہ ہوگی۔ یہ بڑا عجیب و غریب اصول ہے جو آئین میں داخل کیا گیا ہے۔

مسٹر سپیکر: براہِ کرم آپ تشریف رکھیں، اجلاس بیس منٹ کے لیے ملتوی کیا جاتا ہے۔ ہم گیارہ بج کر بچاس منٹ پر پھر ملیں گے۔

مسٹر سپیکر: صاحبزادہ احمد رضا قصوری! آپ اپنی تقریر جاری رکھیں۔

صاحبزادہ احمد رضا خان قصوری: مسٹر سپیکر سر! میں وزیراعظم کے اختیارات پر بحث کر رہا تھا، جیسا کہ میں نے اس بلند پایہ ایوان میں پہلے عرض کیا، اس خاص آئین کے تحت وزیراعظم عملاً سول ڈکٹیٹر ہوگا اور اب میں اسے ثابت کروں گا۔ کیونکہ یہ بات میں نے کہی ہے۔ یہ وکیل کی عادت ہے کہ وہ نہ صرف کوئی بات کہتا ہے بلکہ وہ دلائل کے ذریعے اسے ثابت بھی کرتا ہے۔ ہم مدلل بات کرتے ہیں، کیونکہ ہم فقط بیان بازی پر ایمان نہیں رکھتے۔ اس آئین کے تحت وزیراعظم سادہ اکثریت کے ذریعے منتخب ہوگا۔ ایک بار جب وہ اس ایوان کی سادہ اکثریت سے منتخب ہو جائے، تو طریقہ یہ ہونا چاہیئے کہ یہ ایوان اسے سادہ اکثریت ہی کے ذریعے اقتدار سے الگ کر سکے۔ اس ملک میں ہم برطانوی پارلیمانی نظام رائج کرنا چاہتے ہیں، ہم جب اپنے ملک کی سیاست میں ایک خاص نظام رائج کرتے ہیں، تو لامحالہ ہمیں اس نظام کو تمام حقوق و فرائض سمیت نافذ کرنا چاہیئے، مگر ہم تو ایسا نظام رائج کرنے کی کوشش کر رہے ہیں، جس میں حقوق تو سارے شامل ہوں، مگر فرائض میں سے کچھ بھی نہ ہو۔ برطانوی پارلیمانی نظام کے فرائض میں بھی یہ شامل ہے کہ وزیراعظم کو کسی بھی وقت سادہ اکثریت پر مبنی عدم اعتماد کے ووٹ کے ذریعے اقتدار سے الگ کیا جا سکتا ہے، کیونکہ وہ ایوان کے سامنے جوابدہ ہوتا ہے۔ وزیراعظم ایوان کا مالک اور ایوان کے سامنے جوابدہ ہوتا ہے۔ اسے ایوان کے فیصلے پر، یعنی عدم اعتماد کے ذریعے گھر بھیجا جا سکتا ہے۔ اب، جناب! اس خاص نظام میں ہم نے وزیراعظم کو خصوصی تحفظ فراہم کیا اور یہ تحفظ "استحکام" کے نام پر دیا گیا ہے، جیسا کہ میں نے پہلے بھی عرض کیا تھا، یہ فرسودہ تراکیب اس ملک میں اپنی ذات کے استحکام کے لیے استعمال کی گئیں ہیں۔ یہ پامال اصطلاحات ان لوگوں نے استعمال کیں، جنہوں نے آئین سازی کی۔ مضبوط مرکز سے ان کی مراد "خود مرکزی"، استحکام سے ان کا مطلب ہے، ذاتی استحکام، چنانچہ استحکام کا نام لے کر وہ پاکستانی سیاست میں استحکام اپنی ذات کے لیے چاہتا ہے، وہ چاہتا ہے کہ یہ خاص شق پندرہ سال تک آئین کا حصہ رہے، تاکہ وہ اقتدار پر فائز رہے، یہ ان کی دلیل ہے، بڑی آسان دلیل بڑی اچھی دلیل، ذاتی مفادات کی نگہداشت کے لیے دلیل، بالعموم ایک انسان پندرہ سال سے زیادہ عرصہ اقتدار پر فائز نہیں رہ سکتا؛ چنانچہ یہ مخصوص دلیل ملکی استحکام کے لیے نہیں بلکہ شخصی استحکام کے لیے ہے۔ کیونکہ اس شخص کو پندرہ برس تک اقتدار میں رہنے کی امید ہے۔ اس ملک کا اگر استحکام درکار ہے، تو ہمیں مستحکم ادارے قائم کرنے چاہئیں آپ شخصیات کو تحفظ فراہم کر کے ملک کو استحکام نہیں بخش سکتے۔ آپ مستحکم ادارے قائم کر کے ہی اس ملک کو استحکام بخش سکتے ہیں اور پندرہ سال تک استحکام تو زیادہ سے زیادہ شخصی استحکام ہوگا ملکی نہیں۔ آپ یہ نہیں کہہ سکتے! پندرہ سال تک استحکام اور اس کے بعد عدم استحکام! چنانچہ یہ حد درجہ گمراہ کن دلیل ہے۔ یہ آئین کہتا ہے کہ ان پندرہ

برس میں اگر کوئی شخص وزیراعظم کے خلاف عدم اعتماد کی قرارداد منظور کرانا چاہتا ہے تو اس قرارداد میں متبادل وزیراعظم کا نام تحریر ہونا چاہیئے اور قرارداد کو ایوان کی دوتہائی اکثریت حاصل ہونی چاہیئے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ پہلی بار وزیراعظم بننے والا شخص تو سادہ اکثریت کی بنا پر وزیراعظم بن گیا، مگر اس کے بعد کا وزیراعظم پارلیمان سے دوتہائی اکثریت حاصل کرے، یہ کہا جاتا ہے، قانون کی نگاہوں میں سب برابر ہیں۔ قدرتی انصاف کی حکمرانی کا اصول اس امر کا متقاضی ہے کہ قانون کے آگے سب برابر ہوں، مگر یہاں تو مساوات ہے ہی نہیں، کیونکہ ایک شخص سادہ اکثریت کے بل بوتے پر وزیراعظم بن جاتا ہے اور اس کا جانشین پارلیمان سے دوتہائی اکثریت حاصل کرنے پر پیدا ہوتا ہے۔ علاوہ ازیں عدمِ اعتماد کی قرارداد پر غور کے دوران وزیراعظم ایوان کو توڑ سکتا ہے۔ اب میں ثابت کروں گا کہ اس خاص ایوان میں، یا اس ایوان میں، جو ہم دو سو دس ارکان پر مشتمل رکھنا چاہتے ہیں، آخر کار ہوگا کیا؟ دو سو دس کی دوتہائی ایک سو چالیس ارکان ہوئے۔ تو جس روز ایوان میں وزیراعظم کے خلاف عدمِ اعتماد کی قرارداد پیش ہو۔ اگر اس روز ایوان میں فقط ایک سو چالیس ارکان حاضر ہوں تو وزیراعظم اپنے واحد ووٹ کی بنا پر پھر بھی ملک کا وزیراعظم رہے گا، کیونکہ ایک سو چالیس ووٹ حاصل کرنا عدمِ اعتماد کی قرارداد پیش کرنے والوں کی ذمہ داری ہے، فرض کیجئے اگر ایک سو انتالیس ارکان کہہ اٹھیں، مسٹر پرائم منسٹر! ہمیں تمہاری صورت پسند نہیں، تم دفع ہو جاؤ اور وزیراعظم جواباً کہے، اگر آپ مجھے بدصورتی کی بنا پر باہر نکال رہے ہیں، تو میری بھی سن لیں۔ آپ کی بات غلط ہے، کیونکہ ۲۱۰ میں سے ۱۴۰ ووٹ حاصل کرنے کی ذمہ داری تم پر ہے، تم جو میرے خلاف عدمِ اعتماد کی تحریک پیش کر رہے ہو۔ اگر وہ یہ محسوس کرے کہ عدمِ اعتماد کی قرارداد جو اسے ہٹانے کے لیے ناگزیر ہے، منظور کر لی جائے گی۔ اگرچہ اس نظام کے تحت وزیراعظم کے خلاف عدمِ اعتماد کی قرارداد منظور ہونے کا کوئی امکان نہیں، تو فرض کیجیے عدم اعتماد کی تحریک پیش ہو جاتی ہے، اس میں متبادل وزیراعظم کا نام بھی تحریر ہے اور دوتہائی اکثریت بھی موجود ہے، وہ کہے گا! ٹھیک ہے، تم مجھے نکالنا چاہتے ہو، لیکن میں تم سب کو نکال باہر کر رہا ہوں، اور یوں وہ اسمبلی توڑ دے گا، لہٰذا عملاً اس ایوان کو عدمِ اعتماد کی منظوری کا اختیار حاصل نہیں اور وزیراعظم، مسٹر پریذیڈنٹ سر! عملی طور پر اس ملک کا مضبوط ترین انسان بن جائے وہ دنیا میں سب سے زیادہ طاقتور انتظامی سربراہ بن جائے گا، اور وزیراعظم اتنا طاقتور بن جائے گا کہ مجھے یہ کہاوت یاد آ رہی ہے جب لڑکی کی شادی ہوتی ہے، تو بزرگ لوگ عموماً دعا مانگتے ہیں، یہ بچی چلنے لگی ہے تو بچی تیرا ڈھولا جلائے اور کھٹولا آئے، جس پرائم منسٹر کا اس ہاؤس میں ڈولا آئے گا کھٹولا ہی جائے گا، اس کی تو

ارتھی نکالنی پڑے گی ، یہاں سے ، وہ اتنا طاقتور ہے کہ جیتے جی اس ایوان سے نہ نکلے گا۔

مسٹر سپیکر! آپ اسے کتنی بار دہرانا چاہتے ہیں! آپ کو اپنے وقت کا بھی احساس ہونا چاہیے۔

صاحبزادہ احمد رضا خان قصوری! چنانچہ، یہ بڑی عجیب و غریب شق ہے اس کے علاوہ جناب والا! پاکستان کی مسلح افواج میں وزیر اعظم کے نام پر کمیشن نہ دیا جائے۔ مسٹر پریذیڈنٹ سر! وزیر اعظم، سربراہ مملکت نہیں، وہ سیاسی کھیل میں ریفری نہیں، وہ خود کھلاڑی ہے ۔ وہ سیاست دان ہے، وہ سربراہ حکومت ہے، سربراہِ مملکت نہیں، سربراہ مملکت اور سربراہ حکومت میں بہت فرق ہوتا ہے۔ سربراہ حکومت سیاسی کھیل کھیلتا ہے، جب کہ سربراہ مملکت ریفری کے فرائض انجام دیتا ہے، ریفری کا کام ہے جب 'کیرڈ' ہو جائے تو وہ سیٹی بجا دے اور اگر آپ ریفری کو بھی ہاکی پکڑا دیں، تو وہ بھی کھیل کے میدان میں جا کر کود ے گا اور نتیجۃً سیٹی بجانے والا کوئی نہ ہو گا اور کیرڈ پر کیرڈ ہوتی چلی جائے گی۔ اس ملک کو "سیاسی کیرڈوں" کا خمیازہ بھگتنا پڑا۔ اس ملک کو اس لیے نقصان پہنچا کہ ہم نے فٹ بال کے ضوابط کے تحت کرکٹ کھیلا، ہمیں کرکٹ، کرکٹ سمجھ کر کھیلنا چاہیے۔ ہم جب وزیر اعظم کے نام پر فوج میں کمیشن دینے لگیں، تو یہ فوج، سیاسی فوج بن جائے گی۔ کیونکہ وزیر اعظم مشترکہ نہیں اور اس طرح آپ پاکستان کی مسلح افواج جن پر حقیقی معنوں میں فخر کر سکتے ہیں، ایسی مسلح افواج جنہیں پاکستان کی سالمیت اور سلامتی کا تحفظ کرنے کی صلاحیت ہے۔ وزیر اعظم کے نام پر کمیشن دے کر ہم مسلح افواج میں سیاست کیوں رائج کریں! علاوہ ازیں، جناب والا! اس طرح ہم صد درجہ منظم فوج سے محروم ہو جائیں گے اور ہماری فوج مشرق وسطیٰ کی فوج کے طرز پر ہو گی اور ہر چھ ماہ بعد یہاں فوجی انقلاب آیا کریں گے۔ تو جناب والا! ہمیں فوج میں سیاست نہ داخل کرنی چاہیے اور کمیشن جیسا کہ دنیا بھر میں تسلیم شدہ اصول ہے، ہمیشہ سربراہ مملکت کے نام پر دیا جاتا ہے، مگر میں یہ جاننے سے قاصر ہوں کہ یہ دفعہ وزیر قانون نے کہاں سے چرا کر مسودہ آئین میں کھپا دی ہے۔ خیر مجھے امید ہے کہ بحث کا اختتام کرتے وقت وہ اس کی وضاحت کریں گے۔ تاہم یہ ہمارے آئین کی صد درجہ مغالطہ آلود دفعہ ہے۔

اب جناب والا! اس ایوان کے استحقاق کا بھی تذکرہ ہو جائے۔ آج اس ایوان میں استحقاق کے موضوع پر بڑی کارآمد بحث ہوئی اور مجھے یاد ہے۔ ملک جعفر نے، پیپلز پارٹی کے مسٹر ڈنگل فٹ نے (اگرچہ وہ سیاسی طور پر لیمپنگ فٹ" ۔ یعنی لنگڑا ۔ ہے) اس ایوان کے استحقاق کے موضوع پر طویل تقریر فرمائی۔ جناب والا! اس ملک کے پٹواری تک کو بھی کچھ استحقاق حاصل ہے اور اگر کوئی شخص بلا استحقاق ہے تو وہ قومی اسمبلی کا

بے چارہ رکن ہے، جسے چوہدری ظہور الٰہی کی طرح قومی اسمبلی میں شرکت کے لیے آتے ہوئے گرفتار کیا جا سکتا ہے۔ اس کی سے املاک یہاں موجود کئی ارکان کی مانند چھینی جا سکتی ہیں اور حاجی مولا بخش سومرو کی طرح اس کے گھر میں لوٹ مار کی جا سکتی ہے۔

مسٹر اسپیکر: معزز رکن! اب بار بار پھر اعادے سے کام لے رہے ہیں۔

صاحبزادہ احمد رضا خان قصوری: میں اب دستور کی بات کر رہا ہوں اور اس بحث کا حوالہ زیر بحث مسودہ آئین کے سلسلے میں دے رہا ہوں۔

مسٹر سپیکر: نہیں نہیں وہ بحث ختم ہو چکی ہے۔ اگر آپ نے پہلے کہی ہوئی باتوں کا اعادہ کیا، تو میرا خیال ہے مجھے آپ کی جگہ کسی اور کو تقریر کی دعوت دینا ہوگی۔

(مداخلت)

مسٹر سپیکر: موجودہ آئین میں کہاں لکھا ہے کہ کوئی آئینی استحقاقات نہیں!

صاحبزادہ احمد رضا خان قصوری: آئین میں ناکافی استحقاقات ہیں۔ میں اسی ضمن میں بات کر رہا ہوں۔

مسٹر سپیکر! یہ کون سی شق ہے؟ آپ اس بارے میں کچھ بھی نہیں جانتے۔ آپ اس پر اس لیے بحث کر رہے ہیں، کیونکہ صبح آپ نے یہ بات سنی تھی۔

صاحبزادہ احمد رضا خان قصوری: یہ شق ۶۹ ہے۔ مجھے ان پڑھ جاہل نہ سمجھیے: یہ خیال نہ کیجیے کہ میں چھانگا مانگا سے آیا ہوں۔

ڈاکٹر سید محمود عباس بخاری: جناب والا! میرا چھانگا مانگا کے حلقے سے تعلق ہے۔

(مداخلت)

ڈاکٹر سید محمود عباس بخاری: تو آپ انہیں کہہ دیں کہ وہ خود کو قصور تک محدود رکھیں۔ یہ زیادہ مناسب ہوگا۔

مسٹر عبدالحفیظ پیرزادہ: معزز رکن نے مسودہ آئین کے بارے میں حد درجہ غلط رائے قائم کر رکھی ہے انہوں نے بار بار غلط باتیں کہی ہیں، انہوں نے کہا ہے، مشرقی پاکستان کا ذکر نہیں، حالانکہ اولین شق میں اس کا ذکر ہے، وہ حد درجہ غلط فہمی میں مبتلا ہیں۔

صاحبزادہ احمد رضا خان قصوری: مشرقی پاکستان کا بطور صوبہ کہاں ذکر ہے؟

مسٹر عبدالحفیظ پیرزادہ: رولز آف ریلیونسی (موضوع سے گفتگو کے ضوابط) کے بجائے ہمیں ان کے معاملے میں رولز آف لونیسی (دیوانگی کے ضوابط) کا اطلاق کرنا چاہیئے۔

صاحبزادہ احمد رضا خان قصوری: تو اس صورت میں آپ سب کو یہ ایوان خالی کرنا ہوگا۔ مسٹر عبدالحفیظ پیرزادہ انہیں تنہا ہی یہاں رہنے دیا جائے۔

مسٹر سپیکر: میرا خیال ہے، آپ نے کافی وقت لے لیا ہے۔

صاحبزادہ احمد رضا خان قصوری: جناب والا! میں تقریر کر رہا ہوں، میں تمام شقوں کو زیر بحث لا رہا ہوں۔

(مداخلت)

صاحبزادہ احمد رضا خان قصوری: اس ایوان کو یہ استحقاق حاصل ہونا چاہیئے کہ اس کے کسی رکن کی بھی گرفتاری عمل میں نہ آئے۔ کسی رکن کو نظر بند نہ کیا جائے، کسی رکن کو مقدمے قائم کر کے تنگ نہ کیا جائے اور دنیا کے کئی ممالک کے ارکان پارلیمان کو یہ استحقاقات حاصل ہیں، اگر آپ فقط اینگلو سیکسن (انگریزی الاصل) نظام کو دیکھیں تو اینگلو سیکسن نظام میں یہ استحقاقات نہیں، مگر آپ دیکھیں گے کہ اینگلو سیکسن نظام ہی قانون کی حاکمیت ہے۔ اینگلو سیکسن نظام میں اس بات کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا کہ کسی رکن پارلیمان کو پارلیمان میں شرکت کے لیے آتے ہوئے راہ میں گرفتار کر لیا جائے گا۔ یہ بات خواب و خیال میں بھی نہیں آسکتی۔ اگر آپ اینگلو سیکسن نظام کی آڑ لے رہے ہوں کہ یہ استحقاقات وہاں موجود نہیں، تو اس صورت میں یہ بات یاد رکھنی چاہیئے کہ میگنا کارٹا سے شروع ہو کر ۱۶۲۸ء کے قانون حقوق تک ان کی "قانون کی حاکمیت" کی تاریخ بہت طویل ہے، مگر اس ملک میں جہاں سیاسی پکڑ دھکڑ روز کا معمول ہے، جہاں لوگ سیاسی طور پر کینہ پرور ہیں۔ اس طرح کے استحقاقات آئین میں ضرور شامل ہونے چاہئیں۔

مسٹر سپیکر: ٹھیک ہے، آگے چلیئے۔!

صاحبزادہ احمد رضا خان قصوری: اس کے بعد جناب والا! یہ بھی لکھا ہے کہ جب سپریم جوڈیشل کونسل کا اجلاس ہو تو اس کا فیصلہ یا اس کا ریفرنس (حدود تحقیقات) پارلیمان کے سامنے پیش ہونا چاہیئے۔ جناب والا! یہ عجیب و غریب اصول ہے۔ میں شق کا حوالہ نہیں دے رہا۔ میں اصولوں کی بات کر رہا ہوں۔ کیونکہ جب میں شقوں کی بات کروں یا اصولوں کی بات کرتا ہوں تو آپ فرماتے ہیں، شقوں کی بات کرو اور شقوں کا حوالہ دو،

اس طرح میں حد درجہ کنفیوز ہوں (مجھے کچھ پتہ نہیں چلتا) کہ آپ کیا چاہتے ہیں، میں شقوں کی بات کروں یا اصولوں کی ؟ اگر آپ شق کا حوالہ چاہتے ہیں تو میں حوالہ پیش کر سکتا ہوں۔

مسٹر سپیکر! کیا یہ میری غلطی ہے کہ آپ اتنے کنفیوز ہیں۔!

صاحبزادہ احمد رضا خان قصوری: میں کنفیوز نہیں، مجھے کنفیوز کیا جا رہا ہے۔

تو جناب والا! آئین کی یہ خاص شق کہ سپریم جوڈیشل کونسل کا ریفرنس پارلیمان کے حضور پیش کیا جائے، حد درجہ بدنیتی پر مبنی ہے۔ کیونکہ اس طرح تو ہم عدلیہ کی آزادی کی راہ میں رکاوٹ کھڑی کر رہے ہوں گے اس ملک میں اگر کوئی ادارہ صحیح وسالم محفوظ رہا ہے، تو وہ عدلیہ کا ادارہ ہے۔ ہم نے دیگر تمام اداروں کو عملاً تباہ کر دیا ہے۔ ہم نے سول سروسز کو تباہ کر دیا ہے۔ ہم نے سیاسی اداروں کو تباہ کر دیا ہے۔ ہم نے پاک فوج کو تباہ کر دیا ہے اور اب پاکستان کے عوام کا آخری سہارا، آخری امید۔ جس کے در پر اس ملک کا ہر مظلوم اس اعتماد کے ساتھ دستک دے سکتا ہے کہ اسے انصاف ملے گا۔ اس خاص ادارے کو بھی جان بوجھ کر تباہ کیا جا رہا ہے۔ برباد کیا جا رہا ہے اور سیاسی عمل کا غلام بنایا جا رہا ہے، مجھے ایک واقعہ معلوم ہے، عدالت عظمیٰ کے ایک جج کو خاص نہج پر فیصلہ سنانے کی ہدایت دی گئی اور جج نے اس مرحلے پر فائل پر تحریر کیا کہ مجھ پر اثر ورسوخ استعمال کیا جا رہا ہے، چنانچہ میں اس فائل سے دستبردار ہوتا ہوں۔

میرے دوستو! اس ملک میں اب بھی ایسے جج موجود ہیں جو انتظامیہ کے احکامات کو ٹھکرا سکتے ہیں، جن کے دل میں خوفِ خدا ہے اور جنہیں دادرسی، عدل گستری اور انصاف سے بے پناہ پیار ہے۔ آپ ان ججوں کو پارلیمان کے ماتحت کر کے، جماعتی سیاست کے تابع رکھ کر خوفزدہ کرنا چاہتے ہیں۔ نہیں، آپ عدلیہ کے اس عظیم ادارے کو تباہ نہیں کر سکتے، پاکستان کے عوام کو یہ ادارہ حد درجہ عزیز ہے اور پاکستان کے عوام اس عظیم ادارے کی، جہاں سے انہیں انصاف ملتا ہے، حفاظت کی صلاحیت رکھتے ہیں۔

جناب والا! اس ادارے کو کمزور کر دیا گیا ہے۔ انتظامی ٹریبونلز کے فیصلوں کو عدالت عالیہ اور عدالت عظمیٰ میں چیلنج نہیں کیا جا سکتا۔ عدالت عالیہ عبوری حکم جاری نہیں کر سکتی۔ آپ نے ایسی دفعہ شامل کر دی ہے، جس کی رو سے ایک خاص معاملے پر جو عوام کا معاملہ ہے۔ عدالت عالیہ عبوری حکم جاری نہ کر سکے گی۔ خواہ اسے یہ یقین بھی کیوں نہ ہو جائے کہ بادی النظر میں یہ مقدمہ عبوری دادرسی کا متقاضی ہے، کیونکہ عبوری دادرسی کا اصول یہ ہے کہ اگر آپ کسی قانونی عدالت میں یہ ثابت کر دیں۔ حتمی طور پر ظاہر کر دیں کہ بادی النظر میں

بات صحیح ہے، تو اس بدیہی ثبوت کی بنا پر آپ عبوری حکم حاصل کر لیتے ہیں۔ عبوری حکم امتناعی جاری ہو جاتا ہے، مگر یہ اختیار جو عدالت عالیہ کا اہم ترین اختیار ہے۔ اس آئینی شق کے ذریعے چھین لیا گیا ہے۔ اگر اس خاص شق کو منظور کر لیا گیا، تو یہ حکومت تاریخ میں ایسی حکومت کے طور پر یاد رکھی جائے گی، جس نے اس ملک کے آخری ادارے کو تباہ کر دیا، جس پر اس ملک کی اصل بنیادیں استوار تھیں۔ آپ شق ۲۰۲(۴) کے ذریعے عدالت عالیہ کا یہ اختیار چھین رہے ہیں۔ اگر آپ کسی کی املاک ہتھیا لیں، تو مظلوم دادرسی کے لیے عدالت کا دروازہ نہیں کھٹکھٹا سکتا۔ یہ بعض منفی شقیں ہیں جو آپ نے آئین پر ٹھونسی ہیں اور اس کے باوجود آپ کا اخلاقی فریضہ ہے کہ ایک متفقہ آئین بنائیں۔ آپ کسی مخصوص جماعت کیلئے آئین سازی نہیں کر رہے، بلکہ ہم پاکستان کے سارے عوام اور آئندہ نسلوں کیلئے دستور تشکیل دے رہے ہیں۔

پھر، جناب والا! عبوری آئین میں ریفرنڈم کی ایک بڑی مفید شق تھی۔ وہ بھی واپس لے لی گئی ہے۔ یہ بہت ہی مفید شق تھی۔ آپ عوام کے پاس جانے سے کیوں خائف ہیں! آپ تو خود کو عوامی حکومت کہتے ہیں۔ عوامی میلہ، عوامی طاقت، عوامی کار، عوامی ہوائی جہاز، عوامی فکس اپ، عوامی قائد، عوامی مارشل لاء، اگر آپ اتنے ہی عوامی ہیں، تو آپ ریفرنڈم کے ذریعے عوام کے پاس جانے سے کیوں ڈرتے ہیں اور میں میاں محمود علی قصوری کا شکر گزار ہوں کہ انہوں نے عبوری آئین میں یہ شق رکھی تھی، آپ نے تیر کے ایک ہی وار میں آئین کے جسم میں سے یہ شق خارج کر دی۔ یہ شق کم از کم قیوم خان کے جسم میں داخل کی جا سکتی تھی۔ مگر آپ نے خارج کر دی۔

اس کے علاوہ، جناب والا! عبوری آئین میں (OMBUDSMAN) (محتسب) کا ایک ادارہ تھا۔ مسودہ آئین میں وہ بھی نہیں رہے۔ پھر ہمارے پاس چیف الیکشن کمشنر کا ادارہ تھا۔ اب چیف الیکشن کمشنر کی تقرری صدر کریں گے۔ اس کی تقرری پاکستان کے چیف جسٹس کی سفارشات پر ہونی چاہیئے۔ کیونکہ ہم جانتے ہیں کہ اس ملک میں انتخابات میں دھاندلی کی روایات چلی آ رہی ہیں۔ فیصل آباد، ڈیرہ غازی خان، اور نارووال کے انتخابات میں ہم نے پاکستان کے عوام کے آزادانہ حق رائے دہی، آزادانہ انتخابات کی کیسی تصویر دیکھی ہے، کیسی تصویر؟ اگر اس تصویر کو بیرونی ممالک میں پیش کیا جائے، تو کیا ہم جمہوری ملک کی عظیم جمہوریہ پر صحیح فخر کر سکتے ہیں؟

جناب والا! چیف الیکشن کمشنر کی تقرری پاکستان کے چیف جسٹس کی سفارشات پر عمل میں آنی چاہیئے۔ کیونکہ ہمیں آج بھی پاکستان کی عدلیہ پر اعتماد ہے۔ اگرچہ

اس ادارے کو تباہ کرنے، ختم کرنے کے لیے مسلسل کوششیں کی گئیں۔

مسٹر سپیکر: میں آپ کو دس منٹ مزید دے سکتا ہوں۔

صاحبزادہ احمد رضا خان قصوری: ٹھیک ہے جناب والا!

مسٹر عبدالحفیظ پیرزادہ: میں مداخلت کرنا چاہوں گا۔ میں نے اس جانب بیٹھے شرفا کو بار بار کہا کہ وہ کچھ بتائیں تو کون کون تقریر کرنا چاہتا ہے اور ان کا اہم ترین مقرر کون ہوگا۔ اگر وہ ایسا نہیں کرتے تو ہمارے لیے بڑی مشکلات پیدا کریں گے۔ کوئی حد ہونی چاہیئے۔ جب تک لوگ موضوع سے متعلق رہیں، وہ تقریر کر سکتے ہیں۔ ہم نے ان کے دلائل کئی بار سنے ہیں۔ خواہ کچھ ہو، ہم آئین کے موضوع سے ہٹ کر ملک کی سیاست پر آجاتے ہیں۔ اب کیا باقی ہے؟ ہم نے ان گنت بار وہی دلائل سنے ہیں۔

مسٹر سپیکر: میں نے انہیں دس منٹ دیے ہیں۔

سردار شوکت حیات خان: ہم نے اس جانب کے معزز رکن سے ملاقات کرنے سے کبھی انکار نہیں کیا جہاں تک آئین کا تعلق ہے۔ اس ایوان کا ہر رکن برابر ہے اور یہ میری طرف سے مناسب نہ ہوگا، اگر میں ان سے جا کر کہوں کہ فلاں فلاں تقریر کرے اور فلاں فلاں تقریر نہ کرے۔ یہ ان ارکان کا لاینفک حق ہے۔ جنہیں اس ملک کا آئین تیار کرنے کے لیے منتخب کیا گیا ہے کہ انہیں وقت ملے، انہیں اس معاملے پر وقت ملے اور مجھے یقین ہے، میرے معزز دوست، وزیر قانون، میری باری اور دوسروں کی باری پر بردباری سے کام لیں گے۔ ہم ان جتنے عالم فاضل نہ ہوں، مگر ہم اس ملک کے لیے کچھ عرض کرنا چاہتے ہیں کہ ہمارا تعلق اسی ملک سے ہے۔ آئین ہماری آئندہ نسلوں کے بھی کام آئے گا اور ہم سب کو اس کام سے دلچسپی ہے اور اس لیے، جناب والا! میں آپ سے نہایت مودبانہ اور عاجزانہ گزارش کروں گا کہ وقت کی قید نہ لگائی جائے۔

مسٹر سپیکر: دو دن تک تقریر سننے کے بعد بھی۔

صاحبزادہ احمد رضا خان قصوری: ہم نے بھی معزز وزیر کی دو دن تک تقریر سنی ہے۔

مسٹر عبدالحفیظ پیرزادہ: یہ میرا استحقاق تھا۔ میں نے مسودہ آئین پیش کیا تھا۔

مسٹر سپیکر: انہوں نے (تقریر میں) سارے مسودے کا احاطہ کیا، مگر کبھی کسی بات کو دہرایا نہیں۔ اگر ایک ہی بات کی بار بار تکرار ہو۔ تو میں اسے روکنے پر مجبور ہوں۔ مسٹر احمد رضا قصوری نے مسلسل تکرار سے کام لیا۔

مسٹر سپیکر: ہاں تو مسٹر احمد رضا خان قصوری۔

صاحبزادہ احمد رضا خان قصوری: تو محتسب کی طرز پر ہمیں آئین میں مسلح افواج کے کمیشن کی شق رکھنا ہوگی۔ کیونکہ ہمیں معلوم ہے، مسلح افواج میں بعض حد درجہ ذہین افسروں پر، ان کے کسی قصور کے بغیر ان کے جونیئر ترقی پا کر انہیں پیچھے چھوڑ جاتے ہیں۔

مسٹر سپیکر: اب ہر بات دہرائی گئی ہے۔ آپ پھر مسلح افواج کی طرف آ گئے ہیں۔ اس پر آپ پہلے بحث کر چکے ہیں۔

صاحبزادہ احمد رضا خان قصوری: میں محتسب کے طرز پر مسلح افواج کے لیے کمیشن کے بارے میں بحث کر رہا ہوں جو بالکل نیا موضوع ہے۔

مسٹر سپیکر: آپ پہلے کہہ چکے ہیں کہ وزیر اعظم تقرری کریں گے اور اسی طرح کی اور باتیں۔

صاحبزادہ احمد رضا خان قصوری: میں یہ نیا نکتہ بیان کر رہا ہوں۔

مسٹر سپیکر: آپ کوئی اور نیا نکتہ بیان کریں۔

صاحبزادہ احمد رضا خان قصوری: اس ملک میں ہمیں مسلح افواج کا کمیشن لازماً قائم کرنا چاہیئے۔ جس کے حضور مظلوم افسر جا سکے۔ کمیشن کے در پر دستک دے سکے اور عبوری آئین میں محتسب کے طرز پر داد رسی پا سکے۔

مسٹر سپیکر: آپ ترامیم پیش کر سکتے ہیں۔

صاحبزادہ احمد رضا خان قصوری: جناب والا! میں کئی ترامیم پیش کروں گا۔ کئی حقائق بیان کروں گا۔ سفیروں کی تعیناتی اور معاہدوں کی توثیق کا استحقاق پارلیمان کو حاصل ہونا چاہیئے۔ ہمارے سامنے امریکی سینٹ کی مثال ہے۔ تمام معاہدوں اور سفیروں کی تقرری کی توثیق امریکی سینٹ کرتی ہے۔ کیونکہ عوام کے نمائندوں کو انتظامیہ کے فعل کی جانچ پڑتال کرنی چاہیئے۔ جوابدہی کیا ہے؟ نمائندے منتخب کرنے والے جمہوری نظام کے ذریعے ہم عوام کے نمائندے چنے گئے ہیں۔ اس پارلیمان میں ہم عوام کی مجموعی خواہش کی نمائندگی کرتے ہیں اور جب ہم انتظامیہ کے کسی خاص فعل کی جانچ پڑتال کرتے ہیں یا منظوری دیتے ہیں تو اس طریق کار کو عوام کے سامنے جوابدہی کہتے ہیں۔ اپنے ملک میں ہم نے دیکھا ہے کسی بھی شخص کو سفیر بنایا جا سکتا ہے۔ مجھے معلوم ہوا، حال ہی میں ایک ایسے شخص کو سفیر مقرر کیا گیا جو پارلیمان کے انتخابات میں دو بار شکست کھا گیا تھا۔ اکثر اوقات لوگوں کو سیاسی رشوت دے کر سفیر بنایا گیا۔ اگر پارلیمان کو حکومت کی پالیسیوں کی جانچ پڑتال کا حق حاصل ہوتا تو

ان تقریروں کو پارلیمان میں چیلنج کیا جا سکتا تھا۔ پارلیمان کا جواب ہوتا: "نہیں جناب صدر! ہمیں آپ سے اتفاق نہیں۔ آپ نے فقط عبوری مدت کے لیے ایک خاص شخص کو سفیر مقرر کیا تھا۔ مگر اب ہم نے اس کا ریکارڈ دیکھا ہے۔ اس کی ذاتی فائل دیکھی ہے اور ہم اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ ذہانت کے اعتبار سے، تعلیمی اعتبار سے اور سیاسی اعتبار سے یہ شخص اس خاص ملک میں سفارتکاری کی اہلیت نہیں رکھتا۔" مگر اس ملک میں ہم دیکھتے ہیں کہ راتوں رات تقرریاں ہو جاتی ہیں اور صبح کو ہمیں ریڈیو یا اخبارات سے ان تقرریوں کا علم ہوتا ہے۔ پھر معاہدوں پر دستخط کیے جاتے ہیں۔ اس ملک کے سربراہ مملکت بیرون ملک تشریف لے جاتے ہیں، اور اس معصوم پارلیمان کو کانوں کان خبر نہیں ہوتی۔ وہاں جو کچھ ہوتا ہے، صیغہ راز میں رہتا ہے۔ اس کے باوجود ہم خود کو عوامی نمائندہ کہتے ہیں، ہم کس قسم کے عوامی نمائندے ہیں۔ جب ہم کو یہ علم نہیں ہوتا کہ ہمارے سربراہ مملکت سے کسی سربراہ مملکت نے کیا بات چیت کی۔ وزارت امورِ خارجہ میں کیا ہو رہا ہے۔ ہمارے خارجہ تعلقات کا انتظام کیسے چل رہا ہے، یکایک ہمیں معلوم ہوتا ہے، فلاں ملک سے ہم نے تعلقات منقطع کر لیے۔ یکایک ہمیں پتہ چلتا ہے۔ دوسرے ملک کا ناجائز اسلحہ برآمد ہوا، اور یہ واقعات اس ایوان میں پیش نہیں ہوتے، جو پاکستان کے عوام کی مجموعی منشا کا نگہبان ہے۔ ان تقرریوں کی پارلیمان سے توثیق ہونی چاہیے۔

مسٹر سپیکر: ٹھیک ہے۔ میرا خیال ہے۔ جب شقوں پر بحث ہوگی، تو آپ کو تقریر کا کافی موقع ملے گا۔

صاحبزادہ احمد رضا خان قصوری: اس آئین کی شق ۱، ۲ میں کہا گیا ہے کہ یہ اسمبلی آئندہ پانچ سال تک قائم رہے گی۔ مجوزہ آئین کے تحت، قومی اسمبلی دو سو دس ارکان اور سینٹ ساٹھ ارکان پر مشتمل ہوگی، مگر مسودہ قانون کی شق ۱، ۲ کی رو سے ایک سو چھیالیس ارکان کی یہ اسمبلی پانچ سال تک قائم رہے گی۔ شق ۲، ۲ کی مطابق، سینٹ کے ارکان کی تعداد چوالیس ہوگی۔ ظاہر ہے یا تو اس آئین کا پانچ سال بعد اطلاق ہوگا یا اگر اس آئین کا اطلاق (پہلے) ہونا ہے، تو دو صورتیں پیدا ہوں گی۔ اگر اس آئین کا نفاذ ہونا ہے تو اس کے تحت تو ملک میں عام انتخابات کی تجویز پہلے ہی شامل ہے، کیونکہ دو مطالب کے علاوہ اور کوئی مفہوم نہیں نکلتا۔ ایک مفہوم تو یہ ہے کہ آئین پانچ سال بعد لاگو ہوگا، اور دوسرا مفہوم یہ کہ دو سو دس نشستیں پُر کرنے کے لیے عام انتخابات ہوں گے۔ اس مخصوص شق کی کوئی تیسری توجیہہ نہیں ہو سکتی۔

جناب والا! کہتے ہیں۔

When Head of States are despot men
Conference rooms turn pleasure den

War are faught in Liquor's Cup
Courage con science all dry up

Women for their pleasure sing
Like nightingales upon the wing

Victory traced in word of imagery
Despot dark shadow of reality

While valiant men with courage blaze
Ruling despot on wanton gaze

So give not seat of power of command
To men who gratify what their whims demand

Give not honour of the Nation treasure
To be destroyed for a despot pleasure

جب سربراہان مملکت جابر ہوں تو
مجالس مشاورت قحبہ خانے بن جاتی ہیں۔
جنگیں مے ناب کے جام میں لڑی جاتی ہیں
تہور اور ضمیر کے سوتے خشک ہو جاتے ہیں
گانے والیاں ہر وقت ان کا دل بہلاتی ہیں
محوِ پرواز بلبلوں کی مانند
قوتِ متخیلہ کے پروں پر فتح کے ترانے گاتی ہیں

جابر تو حقیقت کے تاریک سایے ہیں
دلاوروں کی جرأت روشنی پھیلاتی ہے
جابر حکمران آوارہ عورتیں تکتے رہتے ہیں
اقتدار یا حکمرانی کا کوئی عہدہ نہ دیجیے
ان لوگوں کو جو من کی ترنگ کے مطیع و منقاد ہیں
قوم کے (قسمت کے، خزانے) (کی نگہبانی) کا اعزاز نہ بخشیے

کہ کہیں جابر حکمران اپنی نفسانی خواہشات پر اسے قربان نہ کر ڈالے

مسٹر سپیکر: آرڈر پلیز۔ مسٹر احمد رضا خان قصوری، کیا آپ کوئی کتاب پڑھ رہے ہیں۔؟

صاحبزادہ احمد رضا خان قصوری: نہیں جناب والا! یہ میری اپنی نظم ہے۔ میں ذرا سی دیر میں اپنی نشست پر بیٹھ جاؤں گا، میں اپنی بحث ختم کرنے کو ہوں۔ مسٹر پریذیڈنٹ، سر! میں ایوان کے اس جانب بیٹھے اپنے دوستوں سے دوبارہ عرض کروں گا کہ ہم آئین کی کسی خاص جماعت، کسی خاص فرد یا کسی خاص نسل کے لیے تشکیل نہیں دے رہے۔ ہم ایک آئین بنا رہے ہیں جو زندہ و پائندہ رہنے والے اور قابل عمل ہو اور آئندہ نسلوں کے بھی کام آئے، اگر اس قسم کا آئین نہ بنایا گیا تو مجھے اپنی تقریر کے اختتام پر حبیب جالب کی نظم کی طرف آپ کی توجہ مبذول کرانا ہوگی:

دیپ جس کا محلات ہی میں جلے — چند لوگوں کی خوشیوں کو لے کر چلے
وہ جو سایے میں ہر مصلحت کے پلے — ایسے دستور کو صبح بے نور کو
میں نہیں مانتا میں نہیں مانتا

تم نے صدیوں سے چھینا ہمارا سکوں — اب نہ ہم پہ چلے گا تمہارا فسوں
چارہ گر دردمندوں کے بنتے ہو کیوں — تم نہیں چارہ گر کوئی مانے مگر
میں نہیں مانتا، میں نہیں مانتا
ایسے دستور کو صبح بے نور کو
میں نہیں مانتا میں نہیں مانتا

مسٹر سپیکر: مسٹر احمد رضا خان قصوری، براہ کرم آپ تشریف رکھیں۔

صاحبزادہ احمد رضا خان قصوری: میں نے کلمہ حق کہہ دیا ہے۔ آپ کچھ نہیں کر سکتے۔

دستاویزات

ZULFIKAR ALI BHUTTO
H. Pk.
(BAR-AT-LAW)

(1)

"AL-MURTAZA"
BHUTTO COLONY
LARKANA.
November 4th '66

Dear Ahmed Raza,

It was not necessary for you to remind me when we met. I remember perfectly well and how can I forget a man with such burning faith in the cause of his country? Pakistan is a young land as a Nation. It faces gargantuan problems which require courage and the vitality of youth. Then maintain your fervour and you will see how the rhythm keeps pace with those who hear the true music of our beloved land.

It was a pleasure to meet you and your friends in Lahore. Believe me, I was completely overwhelmed by the affection and regard of all you young and devoted men. I am indeed thankful to you for the generous sentiments you have expressed in your letter. I did no more than to perform my duty according to the mandate of the people of Pakistan. I naturally feel greatly elated and

ZULFIKAR ALI BHUTTO
H. Pk.
(BAR-AT-LAW)

(1)

"AL-MURTAZA"
BHUTTO COLONY
LARKANA.

encouraged by the high evaluation you and other kind friends have made of my services. Pakistan's direction has been set by Allah and by the forces of history. We cannot be an exception to a self-generating law. Viet Nam has blazed a new trail and we cannot escape its lessons. A small country is pitted against the "Greatest Power on Earth". How can Jammu and Kashmir remain in bondage in such circumstances?

I have been in Larkana for quite some time but tomorrow I am going to Karachi and hope to see you in Lahore towards the end of this month. It was nice to hear from you. Please give Mr. Awan and other friends my regards. I wonder if Mr. Awan received the letter I wrote him in the third week of last month?

Look after yourself,

Yours sincerely,

Zulfikar Ali Bhutto

Bhutto Colony
Larkana
21st March 1967

My dear Mr Ahmad Raza,

Thank you very much for your letter of 10th February. I have already congratulated you on being unanimously elected as the Secretary of the Kasur Bar Association. I am not only certain that you will function as a very effecient and capable Secretary but that you have much greater success ahead of you. All you need to do is to maintain the strength of your belief~~s~~ and your courage.

Hope we meet again soon. With best wishes.

Yours sincerely,
Zulfikar Ali Bhutto
(Z. A. Bhutto)
H.PK.

Letter No:- 4

70, Clifton
Karachi-6

8th October, 1968

My dear Raza,

Thank you for your letter of 5th October. I am glad to learn from it that you continue to do your work most diligently. It makes me feel very happy when I see you working for the party in this spirited fashion. Please keep up the good work. The times ahead are not going to be easy but I am confident that people like you will gain in stature as the crisis grows. The party needs men of crisis and I see in you the making of such a man. Be efficient and vigilant. Look at problems deeply and do not react superficially. We have to nail each lie and bury it deep into the ground. Whenever the government or others try to injure our interest, we must retaliate with speed and with wisdom. We must never allow the initiative to pass out of our hands. If all of us work in this way, Insha-Allah, we shall succeed in our historic mission. Please be active in your propaganda especially in spots from which information, true or false, spreads like fire. I hope I will be able to see you soon. I intend visiting Lahore in the near future.

Finally, I hope that all of you will cooperate in the preparations for the Peshawar convention and tour. Such onerous assignments cannot succeed without the co-operation of the whole party. Please keep in touch with Hayat Mohammad Khan. Find out how many people from the Punjab zone intend visiting that region for this purpose. Hayat Mohammad Khan must be given adequate notice of the plans of others so that he is not taken unaware.

With best wishes,

Yours sincerely,

Zulfikar Ali Bhutto

(Zulfikar Ali Bhutto)
H.Pk.

Sahibzada Ahmad Raza Khan,
Advocate,
Organizer,
Pakistan People's Party,
Kasur Sub-Division,
Outside Kot Fateh Din Khan,
KASUR.

۳۹۵

Page No :- 36
Letter No :- 9

70, Clifton -
Karachi-6

10th August 1968

My dear Ahmad Raza,

Thank you for your un-dated letter which I received on my return a couple of days ago. It is very thoughtful of you to have inquired about my sister whose conditions remains static which in itself is a matter of gratification in such a dreadful disease. Unfortunately, her husband has been transferred to Pakistan and the doctors informed me that it was essential for her to stay in Europe for at least another eight months to complete her treatment. According to them, there was no other alternative, so with great difficulty arrangements have been made for her to stay in London for about eight more months to complete her treatment. In this connection I am happy I went to Germany to meet her and also to assist her in making arrangements for her stay in London for the time required to complete her treatment.

I am thankful to you for also taking prompt action to counter the malicious and mean propaganda of the Government. It is really so deplorable and trivial that in the ordinary course of events it would be contemptuous to take any notice of it. The people either trust their leaders or they do not, I am not going around from place to place making explanations to absurd allegations. I am not going to assume a defensive position. It is for the Party to effectively destroy all the seeds of such mischievous propaganda. I think you have done good work in this connection and I congratulate you. When Dr. Mubashshar returns to Lahore he will give you more details of the background for you to take into account. I have also made careful note of your other suggestions. Dr. Mubashshar informs me that you are doing good work in Kasur. I am glad to hear that and I knew that this would be so.

With best wishes,

Yours sincerely,

Zulfikar Ali Bhutto

(Zulfikar Ali Bhutto)
N.Pk.

Sahibzada Ahmad Raza Khan,
Advocate,
Outside Kot Fateh Din Khan,
KASUR.

4-K Gulberg II
Lahore

July 9, 1969

Dear Ahmad Raza,

You will remember that I talked to you about your alleged interview published in Daily Mashriq. The interview attributed your support for One Unit. As the Party policy with regard to One Unit is quite clear in view of the resolution, of the Punjab and Bahawalpur Committee in which you were present and by virtue of the public announcement of the same by the Chairman on or about 23rd March, considerable misgiving have been created by this statement attributed to you. Accordingly I had requested you to contradict the news item. I have not yet seen the contradiction.

I am, therefore, to request you to issue a written contradiction to the news items published in the Mashriq and to send two signed copies of the same to me for record.

Best wishes.

Yours sincerely,

(Mubashir Hasan)
Member Pamphlets Committee

Mr. Ahmad Raza Khan Qasuri,
Lahore.

MOHAMMAD HANEEF RAMAY
Member, Principles Committee, Pakistan People's Party
Editor, Weekly NUSRAT, Chowk Anarkali, Lahore.
PHONES, RES : 54626 - OFFICE : 68606

LAHORE: 5th February, 1970.

Dear Mr. Ahmad Raza Khan,

Chairman Bhutto has directed me to request you that you should please make yourself available to travel to regions other than your own to address public meetings.

Chairman Bhutto's tour of the country has created a great upsurge for the Party and its programme. Now the responsibility of keeping up the tempo rests on the party organization. There is a great load of work on the Chairman. People from every nook and corner of the country are requesting him to come and address them. It is physically impossible for him to reach every where, especially when time is limited and he has many other important problems to look into.
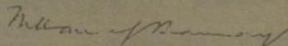
You would agree that if good speakers like you travel more often and address public gatherings, not only in their own regions but also in other regions, it would help consolidate the public support generated by Chairman Bhutto's historic tours of the Punjab, Sind and Frontier.

Kindly send your consent. An announcement may be made in this respect so that all branches of the Party know that your services would be available to them. Kindly let me know the address at which Party branches should contact you. Your telephone number is also required.

Party branches will be advised to give you sufficient notice but if the notice is short, you are requested to cooperate with them as far as possible in view of the pressing needs and party interests.

With best regards.

Yours sincerely,

(MOHAMMAD HANEEF RAMAY)

Sind Secretariat,

Karachi, 25th Jan. 41.

My dear Khan —

Very many thanks for your letter of 28th December congratulating me on joining the Muslim League. Although for some time past I was not in the Muslim League, still I had strong inclinations towards it which have now culiminated into my joining the League and I believe this is the most opportune time which I have caught hold of to join it and have thus done my duty to strenghen the cause of the Mussalmans in the whole of India. I am glad to know that you have liked my idea to join the League. I am looking forward to meet you some time as we have not met for a very long time past.

Yours sincerely

M. B.

NEW DELHI.

On behalf of the Government of India, it gives me great pleasure to convey to you my thanks for the service which you have rendered to the Indian Army and to India, and for the contribution which you have made towards winning the war.

I wish you happiness and prosperity on your return to civil life.

C. J. Auchinleck

General.

Nawabzada M.A.Khan,
Honorary Magistrate &
Hony. Assistant Recruiting Officer,
K.A.S U R.

Dated.
7-11-46.

MEMBER

LEGISLATIVE ASSEMBLY

UNITED PROVINCES

My dear Mr. [illegible] Ahmad

Herewith a letter for Sir Sikandar. Please put it through & then post it.

Thanks for your congratulations on [illegible]'s betrothal to [illegible].

I hope you & yours are all well.

My love to your wife & children.

Affly

[illegible]

"اِدھر ہم، اُدھر تم" کا نعرہ لگانے والوں کو اقتدار منتقل نہیں کیا جا سکتا

مشرقی پاکستان کے عوام صرف مغربی پاکستان کے محب وطن رہنماؤں سے تعاون کریں گے: احمد رضا

لاہور ۱۹ جولائی (سٹاف رپورٹر) پیپلز پارٹی رضا گروپ کے چیئرمین اور قومی اسمبلی کے منتخب رکن احمد رضا خان قصوری نے کہا ہے کہ ادھر ہم ادھر تم کا انتشار پسند نعرہ لگانے اور شیخ مجیب کو غدار بنگال کہنے والوں کو اقتدار منتقل نہیں کیا جا سکتا۔ احمد رضا قصوری جو آج سے چند ماہ پیشتر مسٹر بھٹو کے دست راست تھے نے انکشاف کیا ہے کہ مسٹر بھٹو کسی نہ کسی طرح حکومت میں شامل ہونا چاہتے تھے اور انتخابات کے بعد ۲۵ مارچ تک ساری تگ و دو اقتدار میں شمولیت کے سوا کچھ نہیں تھی۔ احمد رضا قصوری نے کہا کہ مسٹر بھٹو آئین پر یقین نہیں رکھتے اور وہ بار بار کہہ چکے ہیں کہ ملکی مسائل آئین سے حل نہیں ہو سکتے اس لئے انہیں شیخ مجیب الرحمن سے کسی آئینی مسئلے پر کوئی اختلاف نہیں تھا۔ انہوں نے مزید کہا کہ اگر مسٹر بھٹو آئین اور دستور پر یقین رکھنے والوں میں سے ہوتے تو کم از کم اپنی پارٹی کے لئے ایک آئین ضرور بناتے۔ احمد رضا قصوری نے بھٹو گروپ سے اختلافات کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ ملک کے تمام مسائل جو جاگیردار سرمایہ دار ٹولے کے پیدا کردہ ہیں اس کا سب سے بڑا حصہ کنونشن لیگ کو چھوڑ کر پیپلز پارٹی میں شامل ہو گیا ہے۔ انہوں نے کہا کہ مشرقی پاکستان کے عوام سمجھتے ہیں کہ وہ جن آلام و مشکلات کا شکار ہوئے ہیں اس میں مسٹر بھٹو اور ان کے ساتھیوں کا بھی بہت بڑا حصہ ہے اس لئے مشرقی پاکستان کے لوگ کبھی مسٹر بھٹو کی قیادت قبول نہیں کر سکتے۔ مسٹر احمد رضا قصوری نے یقین ظاہر کیا کہ مشرقی پاکستان کے عوام صرف مغربی پاکستان کے محب وطن راہنماؤں سے تعاون کریں گے اور ان مغربی پاکستانی راہنماؤں کی حمایت نہیں کریں گے جو اب کالعدم عوامی لیگ کے چند مفاد پرست راہنماؤں کو ساتھ ملا کر اقتدار پر قبضہ کرنے کے منصوبے بنا رہے ہیں۔ انہوں نے کہا کہ مسٹر ظہیر الدین کے بیان نے اس منصوبے کے غبارے سے ہوا نکال دی ہے۔ چیئرمین رضا گروپ نے بتایا کہ بہت جلد وہ اور ان کی پارٹی کے نمائندے مشرقی پاکستان جا رہے ہیں جہاں وہ سیاسی کارکنوں، عوام اور دیگر لوگوں سے ملاقات کریں گے اور اس کی روشنی میں ان کی پارٹی (رضا گروپ) لائحہ عمل تیار کرے گی۔

احمد رضا قصوری گرفتار کر لئے گئے

لاہور ۱۶ دسمبر (نمائندہ جنگ) پولیس تھانہ سول لائنز نے آج قومی اسمبلی کے رکن مسٹر احمد رضا قصوری کو شاہراہ قائداعظم پر گرفتار کر لیا۔ ان کی گرفتاری تعزیرات پاکستان کی دفعات ۵۰۶، ۳۳۲ اور ۳۵۳ کے تحت عمل میں لائی گئی ہے۔ ان پر الزام ہے کہ انہوں نے پولیس کے ایک اے ایس آئی کو گریبان سے پکڑ کر جھنجھوڑا اور اسے گالیاں دیں۔

دو وزرائے اعظم اور مغربی و مشرقی پاکستان میں علیحدہ علیحدہ اقتدار کی منتقلی کا تصور ملک کی سیاسی تقسیم کا تصور تھا

بھٹو نے تمام اہم فیصلے پارٹی کی مرکزی کمیٹی سے صلاح مشورے کے بغیر ہی کئے

اس مرحلے پر اقتدار منتقل نہیں کیا جا سکتا

احمد رضا خاں قصوری کی راولپنڈی میں پریس کانفرنس

راولپنڈی ۲۰ مارچ (اسٹاف رپورٹر) پاکستان پیپلز پارٹی (رضا گروپ) کے چیئرمین اور قومی اسمبلی کے منتخب رکن مسٹر احمد رضا خاں قصوری نے مسٹر ذوالفقار علی بھٹو کو پاکستان پیپلز پارٹی کا خود ساختہ چیئرمین قرار دیتے ہوئے ان پر دو وزرائے اعظم اور مغربی اور مشرقی پاکستان میں الگ الگ پارلیمنٹ کے ذریعے علیحدہ علیحدہ اقتدار منتقل کرنے کے تصور کا خالق ہونے کا الزام لگایا اور اس تصور کو ملک کو سیاسی طور پر دو حصوں میں تقسیم کے مترادف قرار دیا۔

مسٹر احمد رضا قصوری نے آج راولپنڈی میں ایک پریس کانفرنس سے خطاب کرتے ہوئے یہ انکشاف بھی کیا کہ مسٹر بھٹو نے قومی اسمبلی کے ۳ مارچ کے اجلاس کے بائیکاٹ کا اہم اعلان کرنے سے پہلے پارٹی کی مرکزی کمیٹی یا قومی اسمبلی کے ارکان سے کوئی مشورہ نہیں کیا تھا۔ مسٹر قصوری نے جو ان کے اپنے بیان کے مطابق پارٹی کی از سر نو تنظیم کے سلسلے میں راولپنڈی آئے ہیں اور یہاں دو روز قیام کریں گے یہ اعلان کیا کہ ملک میں سیاسی سرگرمیوں پر پابندیاں ختم ہوتے ہی وہ پیپلز پارٹی کے ارکان کا وسیع پیمانے پر ایک کنونشن طلب کریں گے جس میں پارٹی کا آئین ایک مہینے کے اندر اندر تیار کرنے کا انتظام کیا جائے گا اور اس کے بعد ملک گیر سطح پر جماعتی انتخابات کرائے جائیں گے۔ انہوں نے یہ واضح کیا کہ وہ عبوری چیئرمین ہیں اور جماعتی انتخابات میں پارٹی کے کسی بھی عہدے کے لئے امیدوار نہیں ہوں گے۔ انہوں نے کہا کہ مسٹر بھٹو پارٹی کے چیئرمین تھے جو صرف ایک سال کے لئے تھا۔ اور چونکہ نہ تو مستقل آئین بنایا گیا ہے اور نہ ہی جماعتی انتخابات کرائے گئے ہیں۔ اس لئے مسٹر بھٹو کی چیئرمین شپ ختم ہو چکی ہے۔ اسی لئے میں نے پارٹی کا ایک بانی ممبر ہونے کی حیثیت سے پارٹی ممبروں کی بھاری اکثریت کے مشورے سے مسٹر بھٹو کو چیئرمین کے عہدے سے خارج کر دیا ہے۔ [illegible] ممبروں کی کل تعداد ایک سو ہے۔

روٹی کپڑا۔ مکان

مسٹر قصوری نے مسٹر بھٹو کے ساتھ اپنے اختلافات کی نوعیت تفصیل کے ساتھ بیان کرتے ہوئے اس بات پر افسوس کا اظہار کیا کہ عام انتخابات کے بعد سے پارٹی کی قیادت نے دنیا کے ہر مسئلے پر بیان جاری کئے لیکن ایک مسئلے پر کچھ نہیں کہا۔ انہوں نے کہا کہ یہ مسئلہ روٹی کپڑا اور مکان کا ہے اور اسی کا تعلق عوام کے لئے روٹی کپڑا اور مکان کے نعرے سے ہے جس کی بنیاد پر پارٹی نے انتخابات میں کامیابی حاصل کی تھی۔ اس مسئلے پر پارٹی کی خاموشی کی وجہ یہ ہے کہ جن سیاسی خاندانوں، [illegible]، وڈیروں اور چودھریوں کو عام انتخابات میں شکست ہوئی تھی وہ نام نہاد دوسرے دروازے سے پارٹی کی اونچی کرسیوں پر پہنچ چکے ہیں اور انہوں نے پارٹی کو روٹی کپڑا اور مکان کے بارے میں خاموش رہنے پر مجبور کر دیا ہے۔

اسی سلسلے میں مسٹر قصوری نے مسٹر بھٹو کے اس دعوے کو غلط قرار دیا کہ "یہ میری پارٹی ہے اور لوگوں نے مجھے ووٹ دیئے ہیں"۔ مسٹر قصوری کا کہنا تھا کہ عوام نے ووٹ کسی شخص کو نہیں دیئے اور انہوں نے ووٹ بھی روٹی کپڑے اور مکان کی بنیادی ضروریات کے پیش نظر اس پارٹی کو دیئے جس نے ان ضروریات کو اپنا انتخابی نعرہ بنایا تھا۔ مسٹر احمد رضا خاں قصوری نے مسٹر بھٹو کی [illegible] کو مجموعہ قرار دیتے ہوئے پی پی پی کے سلسلے میں [illegible] کو نشانہ پیش کیا۔

انہوں نے کہا کہ یہ دونوں کام مسٹر بھٹو نے مرکزی پارٹی کی [illegible] پر شروع کر دیئے تھے اور [illegible] کا مقصد یہ بیان کیا گیا تھا

پیپلز پارٹی (رضا گروپ) کے چیئرمین مسٹر احمد رضا قصوری راولپنڈی میں ایک پریس کانفرنس سے خطاب کر رہے ہیں (فوٹو: نوائے وقت)

[illegible] • ایک ملاقات • [illegible]

"ہم نے ایوب خان کے وزیر خارجہ کا ساتھ نہیں دیا،
ہم نے تو اس بھٹو کی مدد کی جو فلیٹیز میں بیٹھا رویا کرتا تھا........"

بھٹو مغالطہ آمیز نعروں کے بادشاہ ہیں

• —— میں ایسے سوشلزم پر لعنت بھیجتا ہوں جس میں اللہ اور رسولؐ کا انکار شامل ہو۔

• —— اسلام نے قارون کی دولت کو حرام مگر عثمانؓ کی دولت کو جائز قرار دیا ہے

سوال:۔ آپ کی ابتدائی زندگی کن مراحل سے گزر کر سیاست کے خارزاروں تک پہنچی؟

جواب:۔ میں ۲۰ ستمبر ۱۹۲۹ء کو قصور میں پیدا ہوا۔ ہر چند کہ میرے والد صاحب انگریزی سکولوں اور کالجوں کے تعلیم یافتہ اور ایچیسن کالج کے فارغ التحصیل تھے مگر میری والدہ کی انتقال بیت کے باعث مجھے پرائمری تک قصور میں ایک ایسے سکول سے تعلیم حاصل کرنا پڑی۔ جہاں عام لڑکوں کے ساتھ ٹاٹ پر بیٹھ کر پڑھنا پڑتا، اسی ابتدائی تعلیم کا فیض تھا کہ مجھے عوامی زندگی اور اس کے مسائل و مصائب سے دلچسپی پیدا ہوئی اور میں سمجھتا ہوں کہ لاشعوری طور پر بھی میری اس ذہنی ساخت کا باعث بنی جس پر میں آج گامزن ہوں۔

میٹرک سنٹرل ماڈل سکول لاہور سے کیا اور گورنمنٹ کالج لاہور میں چلا گیا یہاں میں انگریزی مباحثوں میں حصہ لیتا رہا اور سال رواں کا بہترین انگریزی مقرر تسلیم ہونے کے بعد چار سال تک اپنے اس اعزاز کو برقرار رکھا، تھرڈ ائر میں تھا کہ سیکرٹری تعلیم مسٹر ایم شریف نے یونیورسٹی آرڈیننس کا مسودہ تیار کیا۔ گورنمنٹ نے منظوری دے دی تو یہ آئین ہم طالب علموں پر لاگو ہو گیا طلباء میں اس کے خلاف ایک زبردست تحریک پیدا ہوئی۔ میں نے اس میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ کراچی اور پشاور کے دورے کیے، ملک بھر کے طالب علموں سے رابطہ قائم کیا اور سیمینار کرائے جس میں یونیورسٹی آرڈیننس کا کچا چٹھا پوری طرح کھولا گیا اس کے بعد طلباء کے اضطراب نے ایک جلوس کی صورت اختیار کر لی میں اس جلوس میں پورے جوش و خروش کے ساتھ شامل ہوا یہ ایک بہت بڑا جلوس تھا گورنر ہاؤس کے دروازے پر جا کر ختم ہوا۔ تب نواب امیر محمد خان مرحوم گورنر تھے۔ ان کے حکم سے طالب علموں پر گولی چل گئی۔ تین طالب علم شہید ہوئے مگر حکومت نے اس خبر کو خفیہ رکھا کوہستان نے خبر دی تو دو ماہ کے لیے اس پر پابندی لگا دی گئی۔ میں گرفتار ہو گیا ـــــ گویا یونیورسٹی آرڈیننس کا پہلا شکار میں ہی تھا!ـــــ بات دور نکل گئی ـــــ بی اے کرنے کے بعد میں نے لاء کالج سے قانون کی ڈگری لی اور وکالت کرنے لگا مگر اس کے ساتھ ہی ساتھ سیاست سے میری دلچسپی بدستور رہی اور جہاں جہاں مجھے موقع ملا، ایوبی آمریت کے خلاف آواز اٹھاتا رہا تا آنکہ اس دورِ استبداد کی جانکنی کا وقت آ گیا۔ بھٹو صاحب وزارت سے نکل کر باہر آئے تو عوام نے انہیں ہاتھوں ہاتھ لیا۔ ہم لوگ چونکہ ایوب کو نکالنا چاہتے تھے لہٰذا بھٹو سے ہمارا خیال یہ تھا کہ وہ گھر کے بھیدی کی حیثیت سے اس جدید راون کی لنکا ڈھانے میں ہماری مدد کریں گے تب بھٹو صاحب فلیٹیز میں ٹھہرے ہوئے تھے میں نے انہیں پارٹی بنانے کی دعوت دی اور یہ بھی کہا کہ اگر وہ کسی وجہ سے تنہا یہ کام نہ کر سکتے ہوں تو میں ان کا ساتھ دینے کو تیار ہوں بھٹو صاحب راضی ہو گئے ہم نے مل کر پارٹی کا ایک خاکہ بنایا سو بنیادی ممبر اکٹھے کیے اور قصور ڈیا ہاؤس سے ٹرسٹ سے پیپلز پارٹی بنانے کا اعلان کر دیا گیا میں نے بھٹو صاحب سے کہا کہ قصور مجھے شاہ کی نگری ہے اور مجھے شاہ

سنے کہا ہے کہ

پنچھ آنکھیاں بجا بڑ بھید اے

ہم ہر مشکل وقت میں آپ کے پروگرام کا ساتھ دیں گے جبکہ پارٹی کو جنگی عشور بنایا گیا اور نعرے تجویز کئے گئے؟

اس وقت تک ہم بھٹو کو محض گفتار کے غازی کی حیثیت سے جانتے تھے۔

حسن ظن کی بنا پر ہمارا اندازہ تھا کہ وہ کردار کے بھی غازی ہوں گے ——— تب بہت سی پارٹیوں نے مجھے شمولیت کی دعوت دی جو میں نے نامنظور کر دی اور بھٹو کا ساتھ دیا ——— ہم نے یہ پارٹی ایک پروگرام کو عملی شکل دینے کے لیے بنائی تھی ——— افسوس کہ وقت کے ساتھ ساتھ بھٹو یہ وعدے فراموش کرتے گئے ہم نے انہیں بار بار یاد دلایا کہ ہمارا قائد کوئی آدمی نہیں بلکہ پارٹی پروگرام ہے مگر بھٹو صاحب متوقع اقتدار کے نشہ میں اس درجہ مست تھے کہ ان کے کانوں پر جوں بھی نہیں رینگی، بھٹو صاحب سے میرے مطالبات یہ تھے،

۱۔ پارٹی کے انتخابات کرائے جائیں اور نامزدگیاں ختم کر دی جائیں!

۲۔ پارٹی کا کوئی مستقل آئین بنایا جائے۔

بھٹو نے ان مطالبات سے اغماض کیا اور نوبت یہاں جا رسید کہ پارٹی کے بنیادی ممبر کی حیثیت سے میں نے انہیں پارٹی کی رکنیت سے خارج کر دیا۔

سوال :۔ بھٹو صاحب آٹھ برس تک ایوب خاں کے وزیر رہے اور اس دوران میں ایوبی آمریت کے ساتھ ان کا رشتہ ہمیشہ گہرا رہا کیا آپ نے بھٹو کا یہ کردار سرے سے فراموش کر دیا تھا!

جواب :۔ جی نہیں! مجھے یہ سب کچھ یاد تھا۔ مگر اسلامی تاریخ بتاتی ہے کہ ابو سفیان جیسا شخص بھی ایک روز مسلمان ہو گیا اور خالد بن ولید بھی آخر سیف اللہ بن گئے ——— بنا بریں ہم نے بھٹو پر اعتبار کیا اندازہ یہی تھا کہ وہ اپنے پروگرام کو عملی شکل دینے کی کوشش کریں گے؛

ہم نے ایوب خاں کے وزیر خارجہ کا ساتھ نہیں دیا ہم نے تو اس بھٹو کی مدد کی تھی جو قلیلہ عرصے میں بیچارہ رویا کرتا اور جسے ہم تسلیاں دیا کرتے تھے مگر سات اور سترہ دسمبر کے انتخابی نتائج کے گھمنڈ نے ثابت کر دیا کہ بھٹو صاحب ایک آمر ہیں، ان میں اور سندھ کے مخدوموں، پیروں یا وڈیروں میں کوئی فرق نہیں وہ بلحاظ ایک وڈیرے ہیں انسان کے دماغ سے اس "بڑائی" کی بو نکالی نہیں جا سکتی!

سوال :۔ ۱۹۶۹ء میں بھٹو نے گول میز کانفرنس میں شریک ہونے سے انکار کر دیا تو کیا آپ نے محسوس نہ کیا کہ وہ غلطی پر ہیں!

جواب :۔ جی نہیں؛ تب میں انہیں درست سمجھتا تھا کیونکہ وہ "عوام کی گول میز" کا نعرہ لگاتے تھے۔ واقعہ یہ ہے کہ بھٹو صاحب مغالطہ آمیز نعروں کے بادشاہ ہیں مگر پشاور کی پریس کانفرنس میں جب انہوں نے یہ اعلان کیا کہ پیپلز پارٹی اسمبلی کے اجلاس میں حصہ نہیں لے گی تو مجھ پر ان کی شخصیت آشکارا ہو گئی، میں نے جان لیا کہ بھٹو صاحب حصول اقتدار کے لیے قانونی راستوں پر ایمان نہیں رکھتے۔ وہ انارکی کے ذریعے برسر اقتدار آنا چاہتے ہیں مگر اس کے باوصف میں نے ان سے بات چیت کرنا مناسب سمجھا اور ان سے سوال کیا کہ کیا اسمبلی عوام کی گول میز کانفرنس نہیں! ظاہر ہے کہ تمام عوام مل کر آئین نہیں بنا سکتے آئین تو عوامی نمائندوں ہی کو بنانا ہے اور عوامی نمائندے عوامی اسمبلی ہی میں جا کر آئین بنا سکتے ہیں! بھٹو صاحب میرے اس سوال پر آئیں بائیں شائیں کرنے لگے اور ان سے کوئی جواب بن نہ پڑا، سچی بات تو یہ ہے کہ بھٹو آئین کے راستے میں رکاوٹ بننا چاہتے اور جیسا کہ عرض کیا وہ "لا قانونیت" کے بل پر اقتدار حاصل کرنا چاہتے ہیں ——— اب انہیں کون سمجھائے کہ اس قسم کی تحریکوں میں کوئی اور بھی آ سکتا ہے۔ ان کا اقتدار کوئی ضروری نہیں ہے MOVEMENTS اور میرا تو یہ ایمان ہے کہ کوئی لیڈر خواہ وہ کتنا

احمد رضا قصوری نے اس وقت مسٹر بھٹو کا ساتھ دیا جب وہ سیاسی میدان میں یکہ و تنہا تھے ——— انہوں نے ہر کڑے اور اوکھے وقت میں بھٹو کی رفاقت کی لیکن انتخابات کے بعد جب مسٹر بھٹو کے عوامی دعوے بکھرنے لگے تو احمد رضا قصوری نے اقتدار کی تمام ترغیبوں کو ٹھکرا کر بھٹو سے علیحدگی اختیار کر لی اپنے عقائد کے لئے احمد رضا قصوری کے اس ایثار کی بناء پر "چٹان" نے ان کا انٹرویو حاصل کیا۔ ہمارے سوالات اور ان کے جوابات نذر قارئین ہیں ———

بڑائی کیوں نہ ہو خیبر محاذی نمائندوں سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتا فی الحال انتخابات عوامی خواہشات کا ایک تھرما میٹر ہیں!

سوال :۔ انتخابات کے بعد بھٹو صاحب نے "اُدھر تم ، ادھر ہم" کا جو نعرہ لگایا آپ اس کے بارے میں کیا کہتے ہیں!

جواب :۔ میرے نزدیک یہ خطرناک ترین نعرہ تھا اور میں نے بھٹو سے کہا بھی کہ وہ ایک خوفناک ناٹک کھیل رہے ہیں۔ میری یہ صدا بھی بصحرا ثابت ہوئی تو میں نے بھٹو صاحب سے اختلافات کا کھلم کھلا اظہار کر دیا۔ بھٹو صاحب ملکی تاریخ میں وہ پہلے سیاستدان تھے جنہوں نے "دو ایوان" کا نعرہ لگایا۔ میں خود بھی قانون اور سیاست کا طالب علم ہوں۔ میں ایمانداری سے یہ محسوس کرتا ہوں کہ یہ نعرہ دراصل "دو پاکستان" کا نعرہ تھا ــــــ قائداعظمؒ نے "دو قومی نظریہ" پیش کیا اور قائد عوام نے "دو ایوانی" ــــــ پہلا نظریہ مسلمانوں کی سالمیت اور بقا کا ضامن تھا مگر دوسرا نظریہ پاکستان کو تباہ کرنے کی ایک افسوسناک کوشش! میں نے بھٹو صاحب سے کہا کہ مجیب ہم سے زیادہ اکثریت لے کر آیا ہے (اس وقت مجیب کا یہ رول معلوم نہیں تھا) اسے قانون بنانے کا حق ہے ہمارا رول محض اپوزیشن کا ہو گا مگر بھٹو صاحب کے اعصاب پر اقتدار کا بخار اس طرح چڑھ چکا تھا کہ وہ تمام قومی مفادات کو پس پشت ڈال کر بھی اسے حاصل کرنے کے متمنی تھے!

جنوری ۱۹۷۱ء میں جب بھٹو صاحب اپنے ہمراہ مشیروں کی ایک کھیپ لے کر ڈھاکہ گئے۔ تو انہوں نے قوم کو یہ تاثر دیا کہ ڈھاکہ میں آئینی امور پر بات چیت ہو گی۔ اصل میں بھٹو صاحب وزارتوں کی تقسیم کے لیے ڈھاکہ گئے تھے ان کی خواہش یہ تھی کہ انہیں "نائب وزیراعظم + وزیر خارجہ" کا عہدہ ملے اور اس طرح وہ اندرون ملک و بیرون ملک اپنی ڈفلی بجا سکیں مگر مجیب نے بر روایت ان کی اس خواہش پر بات چیت کرنے سے انکار کرتے ہوئے پہلے آئین کا مطالبہ کیا، نتیجۃً بھٹو کی تمبیر ڈی کی گئی!

سوال :۔ پیپلز پارٹی آئے دن جو "خفیہ اجلاس" کرتی ہے اس کا مدعا کیا ہے!

جواب :۔ میں نے پہلے کئی خفیہ اجلاسوں میں حصہ لیا ہے اور یقین کیجئے کہ ان میں سوائے گپ بازی یا بھٹو کی شان میں قصیدے پڑھنے کے اور کچھ نہیں کیا جاتا! اگر کوئی آدمی ان قصیدوں سے قطع نظر تنقید شروع کرے تو اسے آئندہ اجلاس میں گھسنے کی اجازت نہیں ملتی اور ایسے لوگ میری طرح "پارٹی میں رہ کر بھی، پارٹی میں نہیں رہتے" اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ پارٹی کے سو بنیادی ممبروں میں سے ساٹھ میرے ساتھ ہیں مگر بھٹو صاحب ہمارے لیے دماغی امراض کے ہسپتال تجویز کرتے پھر رہے ہیں!

سوال :۔ آپ کی نگاہ میں موجودہ بحران کا حل کیا ہے!

جواب :۔ بالفعل اس ملک کو ایک عمر فاروقؓ کی ضرورت ہے۔ جس کے دل میں خدا کا خوف ، رسولؐ کی محبت ، ایمان کی پختگی ، فطری قیادت اور عوامی ہمدردی کے جذبات ہوں ..... ! بدقسمتی سے ہمارے ملک میں قیادت کا شدید فقدان ہے ــــ ہماری قوم واقعتۃً ایک زندہ قوم ہے اور بقول اقبالؒ

ذرا نم ہو تو یہ مٹی بڑی زرخیز ہے ساقی!

قوموں پر ابتلا بھی آتے ہیں اور ہماری قوم پر ابتلاء کا دور آیا ہوا ہے بلکہ یوں کہیے کہ اس سے قبل بھی ہماری قوم دو ابتلاؤں سے گزر چکی ہے پہلی دفعہ ۱۹۴۷ء میں اسے آزمائش کی سان پر کسا گیا اور دوسری دفعہ ۱۹۶۵ء میں ان دونوں موقعوں پر ہماری قوم نے جس دلیری اور شجاعت کا مظاہرہ کیا وہ اپنی مثال آپ ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ اب بھی قوم ہی ملک کو بچا رہی ہے ــــــ اور بھارت نے بغیر اعلان کے جس جنگ کا آغاز کر رکھا ہے

۱۰ اگست ۱۹۷۱ء

تہران میں مسٹر بھٹو کی سرگرمیوں کی تحقیقات کرائی جائے

تمام سیاسی لیڈروں کو ایک پلیٹ فارم پر جمع ہو جانا چاہیے، احمد رضا قصوری

وہاڑی ۲۰ جون (سٹاف رپورٹر) پیپلز پارٹی رضا گروپ کے چیئرمین جناب احمد رضا خاں قصوری نے تہران میں مسٹر بھٹو کے قیام کے دوران سی آئی اے کے چیف مسٹر رچرڈ ہیلم کی تہران میں موجودگی اور نکسن کے مشیر خاص مسٹر کسنگر کے تہران میں قیام کو معنی خیز قرار دیتے ہوئے صدر پاکستان آغا محمد یحییٰ خاں سے مطالبہ کیا کہ وہ مسٹر بھٹو کی ان سرگرمیوں کی اعلیٰ سطح پر تحقیقات کرائیں۔ انہوں نے کہا کہ کسی بھی شخص کو اس بات کی ہرگز اجازت نہیں دی جانی چاہیے کہ وہ ملک کے داخلی مسائل کو کسی دوسرے ملک میں جا کر موضوع بحث بنائے۔ مسٹر قصوری آج یہاں ایک پریس کانفرنس سے خطاب کر رہے تھے۔ انہوں نے کہا کہ تہران میں قیام کے دوران عجب سیاسی حل کے بارے میں مسٹر بھٹو کا بیان کسی محب وطن شہری کا بیان نہیں ہو سکتا۔ انہوں نے کہا کہ مسٹر بھٹو نے کراچی آ کر اس بیان کی جو تردید کی ہے اس سے اس مسئلے کی نزاکت اور شدت کم نہیں ہو جاتی کیونکہ مسٹر بھٹو کے

یہ بیان صرف پاکستان رکے لیے دیا ہے۔ انہیں چاہیے تھا کہ وہ تہران میں ہی اس امر کی تردید کر دیتے۔ انہوں نے مسٹر بھٹو اور ان کی پارٹی کے دیگر ارکان کی تہران میں بات چیتوں پر بھی گہری تشویش کا اظہار کیا کہ یہ ملک کی تاریخ میں اپنی نوعیت کا پہلا واقعہ ہے کہ کسی سیاسی پارٹی نے ملک سے باہر جا کر سازش کی ہو۔ مسٹر قصوری نے بھٹو کے دست راست مسٹر غلام مصطفیٰ کھر کے اس بیان کو کہ انہیں تہران میں پیسوں کی کمی ہو گئی تھی

ایک مضحکہ خیز قرار دیتے ہوئے کہا کہ مسٹر بھٹو کو سندھ کے جنید مارے اور کراچی کے صنعت کاروں کی جانب سے کافی پیسہ مل رہا ہے۔

مسٹر قصوری نے تمام سیاسی پارٹیوں کے لیڈروں سے اپیل کی ہے کہ وہ ملک کی موجودہ صورت حال کے پیش نظر ایک پلیٹ فارم پر جمع ہو کر ملک کی سالمیت اور تحفظ کے لیے کام کریں۔

'PPP now turns into Convention League'

By A Staff Correspondent

Mr. Ahmed Raza Kasuri, an MNA-elect of West Pakistan said in Dacca on Wednesday that the People's Party has now turned into a reconstituted Convention Muslim League with the Secretary-General of the party (Mr. Bhutto) upgrading his position as Chairman.

Mr. Kasuri who was elected on PPP ticket told me in an interview on Wednesday that the PPP Chairman has deviated from the party principles and is now surrounded by his old colleagues of the Convention League. In fact, Mr. Kasuri said, 80 per cent of the MNAs and MPAs of the PPP are former Convention Leaguers.

In this connection he cited the names of some of the MNAs-elect including Mr. Z.A. Bhutto. Among others are Mr. Golam Mustafa Jatoi, Mr. Mustafa Khar, Mr. Miraj Khaled, Moulana Kauser Niazi, Nawab Sadiq Rashid, Mr. Ezaz Ali Talpur, Mr. Ali Hasan Mangi, Malik Muzaffar, and Pir Golam Rasul Shah. The number of the Conventionists elected as MPAs on PPP ticket is also equally large, Mr. Kasuri said.

Criticising Mr. Bhutto and his "sycophants" for shedding crocodile tears for the East Pakistanis, Mr. Kasuri described Mr Bhutto and his followers as "political vultures" who have rushed to this province to trade on the miseries and tragedies of the unfortunate brethren in East Pakistan.

The young MNA-elect from the Punjab blamed Mr. Bhutto for his calculated "misdeeds" since the last elections. Mr. Bhutto did this only for power and nothing else Raja Kasuri said.

Mr. Kasuri said that the present crisis in the country had sparked when Mr. Bhutto had threatened that he would physically eliminate the National Assembly members who would attend the March 3 session of the Assembly. He said that "facist elements of the PPP had assaulted me in Karachi when I reached there from Lahore on way to Dacca for attending the National Assembly session in Dacca".

Mr. Kasuri who is the Chairman of the rival PPP faction (Raza group) said that he was also pelted upon by PPP elements at the Karachi airport on Sunday last while he was on his way to Dacca.

Mr. Bhutto had once described the National Assembly as a slaughter house and he refused to come to Dacca for the National Assembly session on the plea that he and his men would be double hostages in East Pakistan, Mr. Kasuri recalled. "Now I ask is the Dacca Intercontinental where Mr. Bhutto's men are staying at present a slaughter house and whose hostages they are in Intercontinental"? Mr. Kasuri said that the PPP socialist leaders are confining themselves within the four walls of the posh Intercontinental Hotel guarded by a contingent of armed personnel.

Mr. Kasuri said that the PPP leaders are of course hostages of their erratic statements and irresponsible political games and lust for power.

Mr. Kasuri further said that when the 'shrewd' Conventionists realised that the toiling millions of Pakistan got allergic to the name of Convention Muslim League they put the tag of People's Party on the Convention Muslim League signboard.

Raza Kasuri said that the PPP is trying to enlist support of the East Pakistani Conventionist renegades and opportunists of other parties.

He said "my confrontation with Mr. Bhutto began when I tried to uphold the basic principles of the PPP and opposed the Conventionists and feudal lords in the party". He said that whatever might be the strength of his group, he would continue his struggle for the realisation of people's rights.

Criticising the PPP goodwill delegation Mr. Kasuri said, a godwill delegation is generally sent to foreign countries. Have the PPP leaders come to Nepal or Bhutan on a goodwill mission, Mr. Kasuri asked.

If the mission had any goodwill for East Pakistanis it ought to have come in April not now on the eve of by-elections, he observed. Mr. Kasuri said that the PPP leaders have come to share the booties now.

A lawyer by profession Mr. Kasuri is accompanied by another Central Committee member of his party Mr. Sher Ali Khan and will undertake a tour of some places of the province.

Mr. Kasuri and Mr. Sher Ali called on the PDP chief Mr. Nurul Amin on Wednesday afternoon. They also met Mr. Abdus Salam Khan, former East Pakistan PDP chief in the evening.

[illegible]

باغ لگانے والے اور تھے
پھل کھانے والے اور ہیں

—— باغی کے قلم سے

[illegible]

باغ لگانے والے اور تھے۔

پھل کھانے والے اور ہیں۔

مسلم سٹوڈنٹس پاور کے زیر اہتمام برکت علی اسلامیہ ہال میں ایک جلسہ میں چوہدری ظہور الٰہی، خواجہ محمد رفیق، میاں منظور بشیر اور احمد رضا قصوری دائیں سے بائیں خطاب کر رہے ہیں۔ فوٹو جاوداں

قصوری اینڈ قصوری

پیپلز پارٹی سے یُوں جا رہے ہو جیسے
تم کو پتہ نہیں ہے کیا شے ہے جی حضوری
ہم کو بھی کچھ بتاؤ، معتوب کیوں ہوا تنے
احمد رضا قصوری ! محمود علی قصوری

• اصغر علی کوثر

بھٹو اسلام دوست ہیں، نہ سوشلسٹ اور نہ جمہوریت پسند

میں نے پارٹی کا دستور بنا کر انتخابات کرانے کا مطالبہ کیا تھا۔ احمد رضا قصوری

لاہور ۳ مئی (پ پ ا) پیپلز پارٹی کے رکن قومی اسمبلی مسٹر احمد رضا خاں قصوری نے کہا ہے کہ وہ حلف اٹھا کر یہ بات کہنے کے لئے تیار ہیں کہ مسٹر ذوالفقار علی بھٹو نہ ہی اسلام دوست ہیں اور نہ ہی سوشلسٹ۔ آج یہاں پریس کانفرنس سے خطاب کرتے ہوئے انہوں نے کہا کہ قصور کے عوام میرے ساتھ ہیں انہوں نے مجھے ووٹ دیئے تھے مسٹر بھٹو کو نہیں۔ پیپلز پارٹی کے نوجوان رہنما نے کہا کہ کل مجھے اس احاطے میں داخل تک ہونے کی اجازت نہیں دی گئی جہاں مسٹر بھٹو کو تقریر کرنا تھی اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ مسٹر بھٹو جمہوریت کے بھی قائل نہیں ہیں مسٹر بھٹو کے کل کے بیان پر افسوس کا اظہار کرتے ہوئے انہوں نے کہا کہ مسٹر بھٹو نے اپنے بیان میں یہ کہا تھا کہ اگر دوسری پارٹیاں دوسرے ملکوں کی طرف دیکھ سکتی ہیں تو وہ بھی کسی بیرونی ملک کی طرف دیکھ سکتے ہیں ملک میں ہر شخص کے لئے کافی جگہ موجود ہے مسٹر قصوری نے کہا کہ میں نے کراچی میں مسٹر بھٹو کو بتا دیا تھا کہ پارٹی میں بحران ہے میں نے انہیں تجویز پیش کی تھی کہ اختلاف کو ایک دستور بنا کر ہی طے کیا جا سکتا ہے اور اس دستور کے لئے ہمیں پارٹی کے کارکنوں کا ایک کنونشن بلانا ہوگا دستور سازی کے ایک ماہ بعد پارٹی کے انتخابات منعقد کرائے جائیں اور پارٹی کے دستور کی ایک شق یہ ہو کہ پارٹی کے کسی رکن قومی یا صوبائی اسمبلی کو پارٹی کے کسی عہدے پر انتخاب لڑنے کی اجازت نہیں ہوگی اور کارکنوں کو پارٹی کے صول بنانے کا موقع دیا جائے گا۔

احمد رضا خاں قصوری

صدر نکسن کے نام احمد رضا قصوری کا خط

جنگی قیدیوں کی واپسی کے لئے انسانیت کے نام پر کوشش کرنے کی اپیل

راولپنڈی۔ ۱۲ جولائی (چیف رپورٹر) تحریک استقلال کے رکن قومی اسمبلی صاحبزادہ احمد رضا خان قصوری نے صدر بھٹو کے دورہ امریکہ کے موقع پر صدر نکسن اور امریکی کانگرس کے ارکان کے نام ایک خط ارسال کیا ہے جس میں ان سے اپیل کی گئی ہے کہ وہ اپنی پہلی فرصت میں پاکستان کے ۹۳ ہزار جنگی قیدیوں کو بھارتی ظلم و ستم سے آزاد کرنے کی کوشش کریں۔ انسانیت کے نام پر یہ اپیل سینیٹر ہمفری۔ سینیٹر ایڈلائی سٹیفنسن۔ سینیٹر فلبرائٹ، سینیٹر جیکب جاوٹس، سینیٹر کیس، سینیٹر پرسی، سینیٹر چرچ، سینیٹر رابرٹ ٹیلن اور سینیٹر ٹنی جیسی اہم شخصیتوں کو بھی ارسال کی گئی ہے اس میں کہا گیا ہے۔

"میں اس خط کے ذریعہ انصاف، انسانی حقوق اور جذبہ ہمدردی کے نام پر آپ سے اپیل کرتا ہوں کہ اپنا بہترین اثر و رسوخ استعمال کرتے ہوئے کانگرس پر زور دیں اور عالمی سربراہوں اور عالمی تنظیموں کی توجہ اس سنگین انسانی مقصد کی طرف مبذول کرائیں۔ جو کہ عالمی ضمیر کے لئے ایک چیلنج کی حیثیت رکھتا ہے یہ مقصد ۹۳ ہزار پاکستانی جنگی قیدیوں کی رہائی کے بارے میں ہے جو غیر قانونی۔ غیر اخلاقی طور پر اور جنیوا کنونشن ۱۹۴۹ء کی خلاف ورزی کے طور پر بھارت میں قید و بند کی صعوبتیں برداشت کر رہے ہیں۔ اب جبکہ امریکہ کے جنگی قیدی رہا ہو گئے ہیں پاکستانی جنگی قیدی اب بھی بھارتی درندوں کے چنگل میں ہیں جہاں ان کی حالت زار بد سے بدتر ہوتی جا رہی ہے وہ طبی سہولتوں سے محروم ہیں انہیں سخت جسمانی اذیتیں پہنچائی جا رہی ہیں اور ان میں سے کافی تعداد کو بڑی بے رحمی سے شہید کر دیا گیا ہے آپ ایسے ملک کے شہری اور سربراہ ہیں جو ہمیشہ جمہوریت، بنیادی حقوق اور قانون کی بالادستی کا علمبردار رہا ہے مجھے یقین ہے کہ آپ پہلی فرصت میں اس انسانی مسئلہ کو جلد از جلد حل کرانے کی بھرپور کوشش کریں گے اور ۹۳ ہزار بدقسمت خاندانوں کے ان عزیزوں کو بھارتی تسلط سے آزاد کرائیں گے تاکہ وہ خوبصورت زندگی سے دوبارہ ہمکنار ہو سکیں۔ آپ کا

احمد رضا خان قصوری"

Raza Kasuri's call to work unitedly for greater Pakistan

(By Our Staff Reporter)

Mr. Ahmed Raza Khan Kasuri, Chairman of the Pakistan People's Party (Raza Group) appealed to the people of East and West Pakistan to work unitedly to make stronger and greater Pakistan.

He said Pakistan had been created on the basis of the two-nation theory and people of Bengal made the greatest contribution in making the freedom movement of the Muslims of the sub-continent a success. He said by and large people of Bengal were patriotic and they always remained in the forefront of the freedom movement.

He said it was in Bengal where Muslims fought against tyranny of the Hindus and got the separation of the province. It was Bengal where the foundation of the Muslim League was laid in 1905 and again it was Shere-Bangla A.K. Fazlul Huq who moved The Lahore Resolution which paved the way for the creation of Pakistan in 1947.

He asked the leaders of the West Pakistan to fight for the rights of the people of East Pakistan and in turn leaders of East Pakistan should give a call for greater and stronger Pakistan.

Mr. Kasuri said he had faith in the people of Pakistan and was confident they would tide over the present crisis with which the nation was faced today. He thought present crisis could be overcome by the willing cooperation and mutual understanding of the people of the two wings. He said the need of the hour was to make Pakistan politically strong, economically [illegible] and militarily [illegible] [illegible] enlarge the areas of understanding and cooperation some of the Governors in the provinces of West Pakistan should be from East Pakistan.

Mr. Kasuri also demanded that Political Parties act be annulled to enable regrouping of the members in the National Assembly.

DIFFERENCES WITH BHUTTO

Giving the reasons for his differences with Mr. Z.A. Bhutto Mr. Kasuri said he deviated from the programme of the party on the basis of which he won election in West Pakistan. He said People's Party in West Pakistan were successful because it promised it would provide food, shelter and clothing to the people. Soon after winning the election Mr. Bhutto started crying for transfer of power and tried to sidetrack the election promises. He accused Mr. Bhutto of creating a crisis in the country by propounding the theory of "double hostages, "slaughter house and "two majority party".

He said Mr. Bhutto had threatened if the National Assembly session was convened in Dacca on March 3 his party would observe strike in West Pakistan and those MNAs who would go to attend the session from West Pakistan would not be allowed to come back.

He also propounded that there were two majority party namely People's Party in West Pakistan and now outlawed Awami League in East Pakistan and hence power should be transferred to the People's Party in West Wing and to the Awami League in Eastern Wing. He went to the extent of saying there should be two Prime Ministers in the country. Fortunately he did not demaned two Pakistan.

He said soon after the elections the jagirdars, vaderas and vested interests tried to strengthen their position in the party and Mr. Bhutto came under their influence and started deviating from the party programme. He said Mian Mahmud Ali Kasuri who joined the party when it became very strong was made Vice-President of the party ignoring the claims of many senior workers and leaders who had made sacrifices for the party.

EXAMPLES

He cited two examples where Mr. Bhutto after giving green signal to the members of the party dissociated himself from [illegible]. He said in Pakistan Progressive Papers affairs when they were about to take over the papers suddenly Mr. Bhutto completly dissociated himself and the party from the movement.

He said same thing happened in respect of Lyallpur strike which in the beginning had blessing of the party chief but when many workers including prominent leaders were arrested he issued a statement saying People's Party was not connected with this movement.

Mr. Kasuri said when in a telegram to the President he demanded that agriculture income tax should be levied on jagirdars Mr. Bhutto strongly opposed it. He said Mr. Bhutto had turned the party into the Convention Muslim League. He said the people's party was making confusion and aggressive postures in West Pakistan not for the rights of the people but to grab power. He was of the view the main issue facing the country today was it restoration of democracy and not transfer of power for which Mr. Bhutto was clamouring. If democracy was restored power would be automatically transferred to the people.

ANNOUNCEMENT WELCOMED

Mr Kasuri welcomed the President's announcement that National Assembly would meet on December 27 and describe it as a right step He hoped with the commencement of the National Assembly session much of the misunderstanding and bitterness would be gradually removed as it would provide opportunity to the members to have understanding and cooperation.

Replying to a question he said he was not in favour of transfer of powers in the provinces of West Pakistan beore the National Assembly session.

He denied the allegation that he was being used by vested interests against Mr. Bhutto and added in the past Mr. Bhutto was used several times by the vested interests.

Replying to a question he said [illegible] should be [illegible].

لاہور — موچی دروازہ کے باہر

سیاسی مشاعرہ

پولیس کے مصرع طرح پر اپوزیشن کا دو غزلہ

بہترین جہاد جابر سلطان کے سامنے کلمۂ حق کہنا ہے (حدیث پاک)

روزنامہ نوائے وقت لاہور راولپنڈی

بدھ ۱۳ نومبر ۱۹۷۴ء

ایک اور سیاسی قتل؟

لاہور کی فیشن ایبل آبادی — شادماں کالونی — کے ایک اہم چوک میں گزشتہ اتوار کی رات قومی اسمبلی کے رکن اور تحریک استقلال کے سیکرٹری اطلاعات صاحبزادہ احمد رضا قصوری کی کار پر گولیوں کی بوچھاڑ کا جو المناک سانحہ ہوا ہے اور جس میں نواب محمد احمد خاں جاں بحق ہو گئے ہیں اس کی ہر وہ شخص شدید مذمت کرے گا جس میں انسانیت کی ذرا سی بھی رمق ہے اس افسوسناک سانحہ پر اظہار افسوس اور اس کی مذمت کے ضمن میں اب تک جو بیانات منظر عام پر آئے ہیں ان میں اسے سیاسی قتل کی وارداتوں کی ایک کڑی قرار دیا گیا ہے البتہ حکومت پنجاب کے ایک پریس نوٹ میں یہ دعویٰ کیا گیا ہے کہ اس ضمن میں حکومت کا دامن ہر طرح سے پاک ہے اور بعض عناصر مخصوص مفادات کے تحت اس سانحہ کو سیاسی قتل قرار دینے اور اس قتل کی ذمہ داری عائد کرنے کے لیے بے سروپا الزام تراشی شروع کر دی ہے۔ پریس نوٹ میں بتایا گیا ہے کہ وزیر اعلیٰ پنجاب نے ہر قسم کے شک و شبہ کے امکانات دور کرنے کی غرض سے اس سانحہ کی تحقیقات ہائی کورٹ کے ایک جج کی صدارت میں کرانے کا فیصلہ کیا ہے چنانچہ لاہور ہائی کورٹ کے مسٹر جسٹس شفیع الرحمان فوری طور پر تحقیقات شروع کر رہے ہیں۔ ادھر اعلیٰ پولیس حکام نے قومی اسمبلی کے رکن مسٹر احمد رضا قصوری پر قاتلانہ حملہ اور اس میں ان کے والد نواب محمد احمد خاں کی ہلاکت کے سلسلہ میں درج ہونے والی ابتدائی پولیس رپورٹ سربمہر کر دی ہے۔

ہم یہ عرض کرنے کی پوزیشن میں نہیں کہ اس ہولناک المیہ میں حکمران پارٹی کے ان عناصر کا ہاتھ ہے جنہیں خود وزیر اعظم بھٹو نے چوروں۔ دستہ گیروں بدمعاشوں غنڈوں وغیرہ کا نام دیا ہے یا کوئی اور ہاتھ کار فرما ہے۔ ہمیں وزیر اعلیٰ حنیف رامے کے اس بیان پر اعتبار نہ کرنے کی بھی کوئی وجہ نظر نہیں آتی کہ احمد رضا قصوری پر قاتلانہ حملہ میں حکومت کا ہرگز ہاتھ نہیں اور مجرموں کا سراغ لگانے کی پوری کوشش کی جائے گی۔ ہمارے پاس کوئی ایسی دلیل بھی نہیں جس کی بدولت اس المیہ کو سیاسی وار قرار دینے والے وابستگان سیاست کے بیانات کی تردید کی جا سکے۔ اب ہائی کورٹ کے ایک جج صاحب کو تحقیقات پر مامور کیا گیا اور امید کرنی چاہئے کہ وہ اصل مجرموں کا سراغ لگانے میں کوئی دقیقہ فرو گزاشت نہیں کریں گے لیکن ہم یہ عرض کئے بغیر نہیں رہ سکتے کہ گزشتہ تین ساڑھے تین سال میں خواجہ محمد رفیق۔ ڈاکٹر نذیر احمد۔ نذیر جاوید۔ عبدالصمد اچکزئی۔ مولوی شمس الدین۔ چودھری محمد اقبال اور متعدد دوسرے سیاسی رہنماؤں کے قتل۔ خان عبدالولی خان۔ ریٹائرڈ ایئر مارشل اصغر خان ایسے کئی رہنماؤں پر قاتلانہ حملوں نے ہمیں تشدد و لاقانونیت کی سیاست کا جو باب دیا ہے یہ المیہ اس میں ایک اضافہ ہی کہا جائے گا۔ مسٹر احمد رضا قصوری پر یہ پہلا قاتلانہ حملہ نہیں تھا اس سے پہلے بھی ان کی جان لینے کی کوشش کی جا چکی ہے۔

یہ بڑی عجیب بات ہے کہ وزیر اعظم ذوالفقار علی بھٹو نے اپنی پارٹی کے جن عناصر کو دستہ گیر، چور، غنڈے، سمگلر اور بدمعاش کا نام دیا ہے وہ اگرچہ قانون کو ہاتھ میں لینے کے مجرم بنتے ہیں لیکن ان کے بارے میں شاذ ہی کبھی یہ سننے میں آیا ہے کہ وہ کبھی تشدد و لاقانونیت کا نشانہ بنے ہیں لیکن جو لوگ جمہوریت اور جمہوری حقوق کا نام لیتے ہیں انہیں خاک و خون میں لوٹنا پڑتا اور گولیوں کی بوچھاڑیں سہنا پڑتی ہیں۔ پاکستان جمہوریت کی راہ پر گامزن ہے۔ جمہوریت تحمل، برداشت، رواداری اور بات کہنے کے ساتھ بات سننے کے حوصلہ کا مسلک ہے۔ اس میں تشدد و لاقانونیت کی کوئی گنجائش نہیں۔ جمہوری نظام میں مہذب و شائستہ زندگی اور انتشار و افراتفری کے درمیان صرف اور صرف منظم سیاسی جماعتیں حائل ہوتی ہیں۔ سیاسی تربیت و تنظیم ہی معاشرے کو انارکی سے نجات دلا کر شرافت و شائستگی اور قانون کی عملداری سے ہمکنار کرنے کا موجب بنتی ہے۔ سیاسی جماعتیں جب اس بنیادی حقیقت کو فراموش کر دیں یا سیاسی مخالفین کو دبانے، کچلنے اور خاموش کرنے کے لئے جمہوریت کے مہذب و شائستہ آداب کو پس پشت ڈال کر تشدد و لاقانونیت کو شعار بنانے لگیں تو پھر بگاڑ پیدا ہوتا ہے اور مہذب و شائستہ جمہوری زندگی کی بجائے وہ انتشار و افراتفری پیدا ہوتی ہے جو بے خدا کمیونسٹ اور سوشلسٹ معاشروں کا بنیادی تقاضا ہوا کرتی ہے۔ ہم سوشلسٹ معاشرہ قائم کرنے کے آرزو مند وابستگان اقتدار سے یہ پوچھنا چاہتے ہیں کہ کیا یہ روز افزوں انتشار، افراتفری اور انارکی ہمیں اسی بھیانک فضا کی طرف تو نہیں لے جا رہی جو سوشلسٹ معاشروں میں سوشلزم کے ابتدائی زمانے میں رونما ہوئی تھی؟

وزیر اعلیٰ پنجاب جناب حنیف رامے نے اس صوبے میں قانون و شائستگی کی حکمرانی کا یقین دلایا تھا۔ اس حقیقت سے قطع نظر کہ ایسا کوئی دن شاذ ہی گزرتا ہو جب پنجاب بھر میں قتل و غارت گری کی چھ سات وارداتیں نہ ہوتی ہوں اور دفعہ ۱۴۴ کی پابندیوں (جن میں اسلحہ لے کر چلنے کی پابندی بھی شامل ہے) کے باوجود مہلک آتشیں اسلحہ کے بے محابا استعمال کی خبریں منظر عام پر آتی ہوں ہم وزیر اعلیٰ سے پوچھنا چاہتے ہیں کہ حکومت اس ہولناک سانحہ کی ذمہ دار نہ بھی ہو وہ لوگوں کے جان و مال کے تحفظ کی ضمانت دینے کے قابل کب ہو گی؟ ان دنوں جب کہ پولیس پارٹیاں سر شام لاہور کی ناکہ بندی کر لیتی ہے اور مجرموں یا اسلحہ کی تلاش میں رکشے۔ ٹیکسیاں۔ کاریں، بسیں۔ ٹرک رکوا کر مشتبہ عناصر کی نگرانی کرتی ہیں خود کار اسلحہ سے لیس حملہ آور شادماں کالونی میں کس طرح پہنچ گئے؟ ایئر مارشل (ریٹائرڈ) اصغر خان کے بقول پاکستان میں قریباً دو درجن سیاسی قتل ہو چکے ہیں۔ یہ سیاسی قتل اور قاتلانہ حملہ کی وارداتوں کا سلسلہ آخر کب رکے گا؟ کیا اختلاف رائے۔ جمہوریت اور جمہوری حقوق کی بات کرنا اور استحصال و غنڈہ گردی کی مخالفت اتنا ہی بھیانک گناہ ہے کہ ایسی باتیں کرنے والوں کو جمہوریت [illegible] قانون شکن اور سماج دشمن عناصر گولیوں کا نشانہ بنائیں؟

حمید رضا قصوری کیخلاف بھٹو کی انضباطی کارروائی

میرے گھر میں پارٹی کی بنیاد رکھی گئی تھی، یہی اس کا مدفن ہوگا

بھٹو کے آمرانہ عزائم کو خاک میں ملا دیا جائے گا، حمید رضا قصوری

...صوبے میں پیپلز پارٹی کے دو گروہوں میں زبردست تصادم ۱۵ افراد زخمی

...گروہوں کو منتشر کرنے کے لئے پولیس کا لاٹھی چارج

مشرقی پاکستان کے حالات بہتر ہیں اب ہمیں اقتدار دیا جائے

عوام حصول اقتدار کے لیے صبر کریں لیکن تیار بھی رہیں: بھٹو

بھٹو صاحب! میرے ساتھ آپ بھی اپنا دماغی معائنہ کرائیے: قصوری

احمد رضا خاں قصوری

لاہور، ۹ مئی (پی پی آئی) پاکستان پیپلز پارٹی کے قومی اسمبلی کے منتخب رکن جناب احمد رضا خاں قصوری نے جناب ذوالفقار علی بھٹو سے دریافت کیا ہے کہ انہوں نے میرے دماغی معائنے کے لئے ڈاکٹروں کے جس بورڈ کی تشکیل کا اعلان کیا ہے وہ پی ایچ ڈی ڈاکٹروں پر مشتمل ہوگا یا ڈاکٹر آف میڈیسن پر۔ پیپلز پارٹی کے چیئرمین کی پریس کانفرنس کے بارے میں اپنا ردعمل ظاہر کرتے ہوئے انہوں نے کہا کہ جناب بھٹو نے پاکستان پیپلز پارٹی کے نئے چیئرمین کی حیثیت میں عہدہ سنبھالنے پر مجھے مبارکباد دے کر میرا قانونی درجہ تسلیم کر لیا ہے۔ جناب قصوری نے کہا کہ اگر جناب بھٹو نے میرا معائنہ کرنے کے لئے ڈاکٹروں پر مشتمل ایک بورڈ قائم کرنے کا فیصلہ کرلیا ہے تو انہیں یہ بتانا چاہیے کہ وہ جانبدار بورڈ ہوگا۔

انصاف کا تقاضا تو یہ ہے کہ چیف الیکشن کمشنر ممتاز ڈاکٹروں پر مشتمل ایک غیر جانبدار بورڈ مقرر کریں اور ہم دونوں اپنا طبی معائنہ کرانے کے لئے خود کو بورڈ کے سامنے پیش کریں دریں اثناء جناب احمد رضا خاں قصوری نے انکشاف کیا کہ انہیں کراچی، لاہور، راولپنڈی، لائلپور، شیخوپورہ جھنگ اور سرگودھا سے پیپلز پارٹی کے کارکنوں کی طرف سے

صدر بھٹو نومبر میں بنگلہ دیش کو تسلیم کرنے کا وعدہ کر چکے ہیں:

آئندہ ماہ پارٹی کنونشن میں وعدہ پورا کرنے کی تائید حاصل کی جائیگی

میرے خلاف جھوٹے مقدمے چلائے گئے تو اہم رازوں سے پردہ اٹھا دوں گا: احمد رضا قصوری

پولیس کی گاڑیوں میں تصادم۔ چار ارکان قومی اسمبلی زخمی

چوہدری محمد اقبال کی حالت نازک۔ تین ارکان قومی اسمبلی ہسپتال میں!

اسلام آباد ۱۷ دسمبر (چیف رپورٹر) قومی اسمبلی کا اجلاس ختم ہونے کے بعد آج رات پولیس کی دو گاڑیوں کے ٹکرانے سے قومی اسمبلی کے چار ارکان زخمی ہو گئے ان میں سے شیخوپورہ کے ایم این اے چوہدری محمد اقبال کی حالت نازک ہے زخمیوں کو اسلام آباد کے پولی کلینک میں داخل کیا گیا ہے یہ حادثہ سوا نو بجے اسمبلی کی عمارت اور ایم این اے ہاسٹل کے درمیان پیش آیا اس وقت وزیر اعظم مسٹر [illegible] اسمبلی کے اجلاس میں شرکت کے بعد واپس جا رہے تھے کہ ان کے عقب میں آنے والی پولیس کی [illegible] سے بھری ہوئی ایک پولیس بس اور فیڈرل سیکورٹی فورس کی ایک جیپ آپس میں ٹکرا گئیں ایم این اے ہاسٹل اسمبلی کی عمارت کے قریب واقع ہے اور اجلاس ختم ہونے کے بعد ممبروں کی اکثریت پیدل ہی ہاسٹل کی طرف جاتی ہے حادثہ کے وقت بھی ایم این اے حضرات اکٹھے جا رہے تھے اسمبلی کے چیف وہپ سردار عبدالعلیم چوہدری [illegible] اور چوہدری مختار احمد کو پولیس کی [illegible] گاڑی نے ٹکر ماری اور [illegible] تینوں ایم این اے سخت زخمی ہوئے انہیں مختلف گاڑیوں میں ڈال کر پولی ہسپتال لے جایا گیا جبکہ ایف ایس ایف کی جیپ [illegible] دفتر کی عمارت کے نزدیک سڑک سے ہٹ کر رک گئی حادثہ کی وجہ سے [illegible] سے ارکان اسمبلی سینیٹرز اور عام لوگ کھڑے تھے [illegible] جیپ کے نیچے زخمی احمد رضا قصوری کی جیپ کے نیچے اچانک کوئی انسان نظر آیا جس کا جسم جیپ کے دو [illegible] میں پھنسا ہوا تھا احمد رضا قصوری کے کہنے پر [illegible] آدمیوں کی مدد سے فوراً جیپ کو اٹھایا گیا تو نیچے چوہدری محمد اقبال بے ہوش پڑے تھے اس وقت وزیر قانون مسٹر عبدالحفیظ پیرزادہ اپنی کار میں ادھر سے گزر رہے تھے احمد رضا نے ان کی کار کو روکا لیکن وزیر قانون مسٹر عبدالحفیظ پیرزادہ اور احمد رضا

چوہدری محمد اقبال کو شدید زخمی حالت میں ہسپتال لے گئے جہاں تینوں ایم این اے پہلے ہی زخمی حالت میں موجود تھے ان سب کو فوری طبی امداد دی گئی چوہدری اقبال محمد اور سردار عبدالعلیم کو فوراً آپریشن تھیٹر لے جایا گیا چوہدری اقبال محمد رات گئے تک بے ہوش تھے ان کی بائیں ٹانگ فریکچر ہو گئی ہے اور سر پر شدید زخم آئے ہیں ان کی نازک حالت کے پیش نظر سی ایم ایچ راولپنڈی اور کراچی کے دماغی سرجری کے ماہرین کو طلب کر لیا گیا ہے

احمد رضا قصوری اور خضر حیات کو ہلاک کرنے کی کوشش

مخالف فریق نے فائرنگ کر کے دونوں کو زخمی کر دیا

قصور میں احتجاجی جلوس۔ آج ہڑتال ہو گی

لاہور ۶ ارجنوری (پ پ ا) قومی اسمبلی کے منتخب رکن اور پیپلز پارٹی (پروگریسو گروپ) کے چیئرمین مسٹر احمد رضا قصوری اور ان کے بھائی مسٹر خضر حیات کو ہلاک کرنے کی کوشش کی گئی ان کے مخالف فریق نے فائرنگ کر کے انہیں زخمی کر دیا مسٹر احمد رضا قصوری کے قریبی ذرائع نے آج یہاں بتایا کہ یہ واقعہ اس وقت پیش آیا جب مسٹر احمد رضا قصوری الدان کے بھائی جگی جے گھروں کے ایک کیمپ کا معائنہ کرنے کے لئے گئے ہوئے تھے۔ اس موقع پر مخالف فریق کے چند افراد نے مسٹر احمد رضا قصوری کو کھینچ کر ایک کار میں زبردستی بٹھانے کی کوشش کی۔ مسٹر قصوری اور ان کے بھائی نے حملہ آوروں کی مزاحمت کی جس پر حملہ آوروں نے بے تحاشا فائرنگ شروع کر دی۔ مسٹر احمد رضا قصوری کو دو گولیاں لگیں جب کہ ان کے بھائی کو تین گولیاں اور کلہاڑی کے زخم آئے مجروحین کو سول ہسپتال قصور میں طبی امداد کے لئے داخل کر دیا گیا اور مسٹر قصوری کی ایک ٹانگ سے گولیاں نکال دی گئیں۔ ان کے بھائی کو لاہور کے ایک ہسپتال میں داخل کر دیا گیا ہے۔ پیپلز پارٹی پروگریسو گروپ کے ان ذرائع نے اس واقعہ کی شدید مذمت کی ہے اور انہوں نے بطور احتجاج اپنا کاروبار بند کر دیا۔ اس واقعہ کے خلاف ایک جلوس بھی نکالا گیا۔ ان ذرائع کے مطابق کل قصور میں ہڑتال ہو گی اور جلوس نکالا جائے گا۔

یہ کس کا لہو ہے؟

- پیپلز پارٹی کے دورِ اقتدار میں ہونے والے سیاسی قتلوں اور ظلم و استبداد کی ایک اور تاریخی دستاویز۔
- نواب محمد احمد خان کے قتل کا پس منظر، عدالتی تحقیقات کارروائی، بھٹو کا عدالت کے اندر ردِ عمل۔
- بھٹو کے خلاف مقدمہ قتل کی سماعت کے دوران عالمی دباؤ پیش کشیں اور احمد رضا قصوری کا استقلال۔
- بین الاقوامی لیڈروں کی اپیلیں۔ احمد رضا قصوری کا غیر ملکی دورہ۔

ایک چہرے کے ساتھ کئی چہرے بے نقاب ہوتے ہیں۔

احمد رضا قصوری کی دوسری نئی کتاب